وَيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ ؕ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۹۸﴾ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَاۤ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۹﴾

ع ۱۲ / ۱

دیہات والے کفرونفاق میں زیادہ سخت ہیں اور اسی لائق ہیں کہ اللہ نے اپنے رسول پر جو کچھ اتارا ہے اس کے حدود سے بے خبر رہیں۔ اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔ اور دیہاتیوں میں ایسے بھی ہیں جو خدا کی راہ میں خرچ کو ایک تاوان سمجھتے ہیں اور تمہارے لئے زمانہ کی گردشوں کے منتظر ہیں۔ بری گردش خود انھیں پر ہے اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ اور دیہاتیوں میں وہ بھی ہیں جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس کو اللہ کے یہاں قرب کا اور رسول کے لئے دعائیں لینے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ ہاں بے شک وہ ان کے لئے قرب کا ذریعہ ہے۔ اللہ ان کو اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ یقیناً اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ ۹۷-۹۹

حدیث میں آیا ہے کہ جس نے دیہات میں سکونت اختیار کی وہ سخت مزاج ہو جائے گا (من سکن البادیۃ جفا) شہر کے اندر علمی ماحول ہوتا ہے، تعلیمی ادارے قائم ہوتے ہیں۔ وہاں علم وفن کا چرچا رہتا ہے۔ جب کہ دیہات میں لوگوں کو اس کے مواقع حاصل نہیں ہوتے۔ اسی کے ساتھ دیہات کے لوگوں کے رہن سہن کے طریقے اور ان کے معاشی ذرائع بھی نسبتاً معمولی ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دیہات کے لوگوں کے اندر زیادہ گہرا شعور پیدا نہیں ہوتا۔ ان کی طبیعت میں سختی اور ان کے سوچنے کے انداز میں سطحیت پائی جاتی ہے۔ ان کے لئے مشکل ہوتا ہے کہ وہ دین کی نزاکتوں کو سمجھیں اور ان کو اپنے اندر اتاریں۔

اللہ ہر بات کو جانتا ہے اور اسی کے ساتھ وہ حکیم اور رحیم بھی ہے۔ وہ دیہات کے لوگوں، بالفاظ دیگر عوام، کی اس کمزوری سے باخبر ہے اور اپنی حکمت ورحمت کی بنا پر انھیں اس کی پوری رعایت دیتا ہے۔ چنانچہ ایسے لوگوں سے خدا کا مطالبہ یہ نہیں ہے کہ وہ گہری معرفت اور اعلیٰ دین داری کا ثبوت دیں۔ وہ اگر نیک نیت ہوں تو خدا ان سے سادہ دین داری پر راضی ہو جائے گا۔

عوام کی دین داری یہ ہے کہ وہ سچے دل سے خدا کا اقرار کریں۔ اپنے اندر اس احساس کو تازہ رکھیں کہ آخرت کا ایک دن آنے والا ہے۔ وہ اپنی کمائی کا ایک حصہ خدا کی راہ میں دیں اور یہ سمجھیں کہ اس کے ذریعہ سے انھیں خدا کی قربت اور برکت حاصل ہوگی۔ وہ خدا کی نمائندگی کرنے والے پیغمبر کو خوش کر کے اس کی دعائیں لینے کے طالب ہوں۔ یہ دین داری کی عوامی سطح ہے، اور اگر آدمی کی نیت میں بگاڑ نہ ہو تو اس کا خدا اس سے اسی سادہ دین داری کو قبول کرے گا۔

لیکن اگر عوام ایسا کریں کہ وہ خدا اور اس کے احکام سے بالکل غافل ہو جائیں۔ ان کو دین سے اتنی بے تعلقی ہو کہ دین کی راہ میں کچھ خرچ کرنا ان کو جرمانہ معلوم ہونے لگے۔ اسلام کی ترقی سے انھیں وحشت ہوتی ہو، تو بلاشبہ وہ ناقابل معافی ہیں۔ عوام کی کم فہمی کی بنا پر ان کو یہ رعایت تو ضرور دی جاسکتی ہے کہ ان سے گہری دین داری کا مطالبہ نہ کیا جائے۔ لیکن ان کی کم فہمی اگر سرکشی اور اسلام کے ساتھ بے وفائی کی صورت اختیار کرلے تو وہ کسی حال میں بخشے نہیں جاسکتے۔

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۰۰﴾ وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۭۛ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ڀ مَرَدُوْا عَلَي النِّفَاقِ ۣ لَا تَعْلَمُهُمْ ۭ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ۭ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾

اور مہاجرین و انصار میں جو لوگ سابق اور مقدم ہیں اور جنھوں نے خوبی کے ساتھ ان کی پیروی کی، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے۔ اور اللہ نے ان کے لئے ایسے باغ تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہی ہے بڑی کامیابی۔ اور تمھارے گرد و پیش جو دیہاتی ہیں ان میں منافق ہیں اور مدینہ والوں میں بھی منافق ہیں۔ وہ نفاق پر جم گئے ہیں۔ تم ان کو نہیں جانتے، ہم ان کو جانتے ہیں۔ ہم ان کو دہرا عذاب دیں گے۔ پھر وہ ایک عذاب عظیم کی طرف بھیجے جائیں گے۔ ۱۰۰ — ۱۰۱

خدا کے دین کی دعوت جب بھی شروع کی جائے تو دو میں سے کوئی ایک صورت پیش آتی ہے۔ یا تو ماحول اس کا دشمن ہو جاتا ہے۔ ایسے ماحول میں دین کے لئے پکارنے والے اجنبی بن جاتے ہیں۔ وہ اپنی جگہ کے اندر بے جگہ کر دیے جاتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو مہاجر (چھوڑنے والا) کہا جاتا ہے۔ دوسری صورت وہ ہے جب کہ ماحول خدا کے دین کی دعوت کے لئے سازگار ثابت ہو۔ ایسے ماحول میں جو لوگ دین کے داعی بنتے ہیں ان کے ساتھ یہ حادثہ پیش نہیں آتا کہ ان کا سب کچھ ان سے چھن جائے۔ یہ دوسری قسم کے لوگ اگر ایسا کریں کہ وہ پہلے لوگوں کا سہارا بن کر کھڑے ہو جائیں تو یہی انصار (مدد کرنے والے) قرار پاتے ہیں۔ دور اول میں مکہ کے حالات نے وہاں کے مسلمانوں کو مہاجر بنا دیا اور مدینہ کے حالات نے وہاں کے مسلمانوں کو انصار کی حیثیت دے دی۔

خدا کی رضامندی اور اس کی جنت کسی آدمی کو یا تو مہاجر بننے کی قیمت پر ملتی ہے یا انصار بننے کی قیمت پر۔ یا تو وہ

خدا کے لئے اتنا یکسو ہو کہ دنیا کے سرے اس سے چھوٹ جائیں۔ یا اگر وہ اپنے کو صاحب وسائل پاتا ہے تو اپنے وسائل کے ذریعہ وہ اول الذکر گروہ کی محرومی کا بدل بن جائے۔ دور اول کے مسلمان (صحابہ کرام) اس ہجرت ونصرت کا کامل نمونہ تھے۔ بعد کے مسلمانوں میں جو لوگ اس ہجرت ونصرت کے معاملہ میں اپنے پیش رووں کی تقلید کریں گے وہ بالتبع اس مقدس خدائی گروہ میں شامل ہوتے چلے جائیں گے۔ خدا کچھ لوگوں کو محروم کرتا ہے تاکہ ان کے اندر انابت کا جذبہ ابھرے اسی طرح خدا کچھ لوگوں کو محرومی سے بچاتا ہے تاکہ وہ محروموں کی مدد کرکے خدا کے لئے خرچ کرنے والے بنیں۔ یہ خدا کا منصوبہ ہے۔ جو لوگ اس کا ثبوت نہ دیں سو وہ ایسے لوگ ہیں جو خدا کے منصوبہ پر راضی نہ ہوئے اس لئے خدا بھی آخرت کے دن ان سے راضی نہ ہوگا۔

"وہ اللہ سے راضی ہو گئے" یعنی جس کو اللہ نے ایسے حالات میں اٹھایا کہ اس کو سب کچھ چھوڑنے کی قیمت پر دین کو اختیار کرنا پڑا تو وہ اس میں ثابت قدم رہا۔ اسی طرح جس کے حالات کا تقاضا یہ ہوا کہ وہ اپنے اثاثہ میں ایسے دینی بھائیوں کو شریک کرے جن سے اس کا تعلق صرف مقصد کا ہے نہ کہ رشتہ داری کا تو وہ بھی اس پر راضی ہو گیا۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے اللہ کی خوشی حاصل کی اور یہی وہ لوگ ہیں جو جنت کے ابدی باغوں میں داخل کئے جائیں گے۔

منافق وہ ہے جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرے مگر جب ہجرت اور نصرت کی قیمت پر دین دار بننے کا سوال ہو تو اس کے لئے اپنے کو راضی نہ کر سکے۔

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٠٢﴾ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿١٠٣﴾ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿١٠٤﴾ وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿١٠٥﴾ وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿١٠٦﴾

کچھ اور لوگ ہیں جنھوں نے اپنے قصوروں کا اعتراف کر لیا ہے۔ انھوں نے ملے جلے عمل کئے تھے، کچھ بھلے اور کچھ برے۔ امید ہے کہ اللہ ان پر توجہ کرے۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ تم ان کے مالوں میں سے صدقہ لو، اس سے تم ان کو پاک کرو گے اور ان کا تزکیہ کرو گے۔ اور تم ان کے لئے دعا کرو۔ بے شک تمھاری دعا ان کے لئے وجہ تسکین ہوگی۔

اللہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے۔ اور وہی صدقات کو قبول کرتا ہے۔ اور اللہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔ کہو کہ عمل کرو، اللہ اور اس کا رسول اور اہلِ ایمان تمہارے عمل کو دیکھیں گے اور تم جلد اس کے پاس لوٹائے جاؤ گے جو تمام کھلے اور چھپے کو جانتا ہے۔ وہ تم کو بتا دے گا جو کچھ تم کر رہے تھے۔ کچھ دوسرے لوگ ہیں جن کا معاملہ ابھی خدا کا حکم آنے تک ٹھیرا ہوا ہے، یا وہ ان کو سزا دے گا یا ان کی توبہ قبول کرے گا، اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔ ۱۰۶ — ۱۰۲

کچھ ایسے لوگ ہیں جن کی طبیعتوں میں اگرچہ شر نہیں ہوتا۔ وہ معمول والے دینی اعمال بھی کرتے رہتے ہیں۔ مگر جب دین کا کوئی ایسا تقاضا سامنے آتا ہے جس میں اپنے بنے ہوئے نقشہ کو توڑ کر دین دار بننے کی ضرورت ہو تو وہ اپنی زندگی اور مال کو اس طرح دین کے لئے نہیں دے پاتے جس طرح انھیں دینا چاہئے۔ قوت فیصلہ کی کمزوری یا دنیا میں ان کی مشغولیت ان کے لئے دین کی راہ میں اپنا حصہ ادا کرنے میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ ایسے لوگ اگرچہ قصوروار ہوتے ہیں۔ تاہم ان کا قصور اس وقت معاف کر دیا جاتا ہے جب کہ یاد دہانی کے بعد وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرلیں اور شرمندگی کے احساس کے ساتھ دوبارہ دین کی طرف لوٹ آئیں۔

اعتراف اور شرمندگی کا ثبوت یہ ہے کہ ان کے اندر از سر نو دینی خدمت کا جذبہ پیدا ہو۔ وہ اپنے احساس گناہ کو دھونے کے لئے اپنے محبوب مال کا ایک حصہ خدا کی راہ میں پیش کریں۔ جب ان کی طرف سے ایسا ردعمل ظاہر ہو تو پیغمبر کو تلقین کی گئی کہ اب انھیں ملامت نہ کرو بلکہ ان کو نفسیاتی سہارا دینے کی کوشش کرو۔ ان کو دعائیں دو تاکہ ان کے دل کا بوجھ دوبارہ ایمانی عزم و اعتماد میں تبدیل ہو جائے۔

خدا کے نزدیک اصل برائی غلطی کرنا نہیں ہے بلکہ غلطی پر قائم رہنا ہے۔ جو آدمی غلطی کرنے کے بعد اس کی تاویلیں ڈھونڈنے لگے وہ برباد ہو گیا اور جو شخص غلطی کا اعتراف کرکے اپنی اصلاح کرلے وہ خدا کے نزدیک قابل معافی ٹھہرا۔

غلطی کرنے کے بعد آدمی ہمیشہ دو امکانات کے درمیان ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرلے۔ دوسرا یہ کہ وہ ڈھٹائی کرنے لگے، جو شخص اپنی غلطی کا اعتراف کرلے اس کے اندر تواضع پیدا ہوتی ہے۔ وہ دوبارہ خدا کی رحمتوں کا مستحق بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص ڈھٹائی کا طریقہ اختیار کرے وہ گویا خدا کے غضب کے راستہ پر چل پڑا۔ وہ اپنے کو بے خطا ثابت کرنے کے لئے جھوٹی تاویلیں کرے گا۔ ایک غلطی کو نبھانے کے لئے وہ دوسری بہت سی غلطیاں کرتا چلا جائے گا۔ پہلے شخص کے لئے خدا کی رحمت ہے اور دوسرے شخص کے لئے خدا کی سزا۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ

يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَٰذِبُونَ ﴿١٠٧﴾ لَا تَقُمْ فِيهِ أَبَدًا ۚ لَّمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى ٱلتَّقْوَىٰ مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَن تَقُومَ فِيهِ ۚ فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَن يَتَطَهَّرُوا ۚ وَٱللَّهُ يُحِبُّ ٱلْمُطَّهِّرِينَ ﴿١٠٨﴾ أَفَمَنْ أَسَّسَ بُنْيَٰنَهُۥ عَلَىٰ تَقْوَىٰ مِنَ ٱللَّهِ وَرِضْوَٰنٍ خَيْرٌ أَم مَّنْ أَسَّسَ بُنْيَٰنَهُۥ عَلَىٰ شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَٱنْهَارَ بِهِۦ فِى نَارِ جَهَنَّمَ ۗ وَٱللَّهُ لَا يَهْدِى ٱلْقَوْمَ ٱلظَّٰلِمِينَ ﴿١٠٩﴾ لَا يَزَالُ بُنْيَٰنُهُمُ ٱلَّذِى بَنَوْا رِيبَةً فِى قُلُوبِهِمْ إِلَّآ أَن تَقَطَّعَ قُلُوبُهُمْ ۗ وَٱللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿١١٠﴾

ع ١٣ ٢

اور ان میں ایسے بھی ہیں جنھوں نے ایک مسجد بنائی نقصان پہنچانے کے لئے اور کفر کے لئے اور اہل ایمان میں پھوٹ ڈالنے کے لئے اور اس لئے تاکہ کمین گاہ فراہم کریں اس شخص کے لئے جو پہلے سے اللہ اور اس کے رسول سے لڑ رہا ہے۔ اور یہ لوگ قسمیں کھائیں گے کہ ہم نے تو صرف بھلائی چاہی تھی اور اللہ گواہ ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔ تم اس عمارت میں کبھی کھڑے نہ ہونا۔ البتہ جس مسجد کی بنیاد اول دن سے تقویٰ پر پڑی ہے وہ اس لائق ہے کہ تم اس میں کھڑے ہو۔ اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ پاک رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ کیا وہ شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خدا سے ڈر پر اور خدا کی خوشنودی پر رکھی یا وہ شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد ایک کھائی کے کنارے پر رکھی جو گرنے کو ہے۔ پھر وہ عمارت اس کو لے کر جہنم کی آگ میں گر پڑی۔ اور اللہ ظالم لوگوں کو راہ نہیں دکھاتا۔ اور یہ عمارت جو انھوں نے بنائی ہمیشہ ان کے دلوں میں شک کی بنیاد بنی رہے گی بجز اس کے کہ ان کے دل ہی ٹکڑے ہو جائیں۔ اور اللہ علیم وحکیم ہے۔ ۱۱۰-۱۰۷

زندگی کی تعمیر کی دو بنیادیں ہیں۔ ایک تقویٰ، دوسرے ظلم۔ پہلی صورت یہ ہے کہ خدا کے ڈر کی بنیاد پر زندگی کی عمارت اٹھائی جائے۔ آدمی کی تمام سرگرمیاں جس فکر کے ماتحت چل رہی ہوں وہ فکر یہ ہو کہ اس کو اپنے تمام قول وفعل کا حساب ایک ایسی ہستی کو دینا ہے جو کھلے اور چھپے سے باخبر ہے اور ہر ایک کو اس کے حقیقی کارناموں کے مطابق جزا یا سزا دینے والا ہے۔ ایسا شخص گویا مضبوط چٹان پر اپنی عمارت کھڑی کر رہا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی اس قسم کے اندیشہ سے خالی ہو۔ وہ دنیا میں بالکل بے قید زندگی گزارے۔ وہ کسی پابندی کو قبول کئے بغیر جو چاہے بولے اور جو چاہے کرے۔ ایسے شخص کی زندگی کی مثال اس عمارت کی سی ہے جو ایسی کھائی کے کنارے اٹھادی گئی ہو جو بس گرنے ہی والی ہو اور اچانک ایک روز اس کا مکان اپنے مکینوں سمیت گہرے کھڈ میں گر پڑے۔

جو لوگ ظلم کی بنیاد پر اپنی زندگی کی عمارت اٹھاتے ہیں ان کے جرائم میں سب سے زیادہ سخت جرم وہ ہے جس کی مثال مدینہ میں مسجد ضرار کی صورت میں سامنے آئی۔ اس وقت مدینہ میں دو مسجدیں تھیں۔ ایک آبادی کے اندر مسجد نبوی۔ دوسری مضافات میں مسجد قبا۔ منافق مسلمانوں نے اس کے توڑ پر ایک تیسری مسجد تعمیر کر لی۔ اس قسم کی کارروائی بظاہر

اگرچہ دین کے نام پر ہوتی ہے مگر حقیقۃً اس کا مقصد ہوتا ہے اپنی قیادت اور پیشوائی کو قائم رکھنے کی خاطر دعوت حق کا مخالف بن جانا۔ جو لوگ اپنی خود پرستی کی وجہ سے دعوت حق کو قبول نہیں کر پاتے وہ اس کے خلاف محاذ بناتے ہیں، اس کے خلاف تخریبی کارروائیاں کرتے ہیں۔ ان کی منفی سرگرمیاں مسلمانوں کو دو گروہوں میں بانٹ دیتی ہیں۔ ایسے لوگ اپنے تخریبی عمل کو دین کے نام پر کرتے ہیں حتیٰ کہ وہ مسلّمہ دینی شخصیتوں کو اپنے اسٹیج پر لانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ لوگوں کی نظر میں انھیں اعتماد حاصل ہو جائے۔

یہ لوگ اپنی اندھی دشمنی میں بھول جاتے ہیں کہ حق کی مخالفت دراصل خدا کی مخالفت ہے جو خدا کی دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ایسے لوگوں کے لئے جو چیز مقدر ہے وہ صرف یہ کہ وہ حسرت و افسوس کے ساتھ مریں اور اللہ کی رحمتوں سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جائیں۔

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۚ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ ۖ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ وَالْقُرْآنِ ۚ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ ۚ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُم بِهِ ۚ وَذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿١١١﴾ التَّائِبُونَ الْعَابِدُونَ الْحَامِدُونَ السَّائِحُونَ الرَّاكِعُونَ السَّاجِدُونَ الْآمِرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنكَرِ وَالْحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللَّهِ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١١٢﴾

بلاشبہ اللہ نے مومنوں سے ان کے جان اور ان کے مال کو خرید لیا ہے جنت کے بدلے۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں۔ پھر مارتے ہیں اور مارے جاتے ہیں۔ یہ اللہ کے ذمہ ایک سچا وعدہ ہے، تورات میں اور انجیل میں اور قرآن میں۔ اور اللہ سے بڑھ کر اپنے وعدہ کو پورا کرنے والا کون ہے۔ پس تم خوشیاں کرو اس معاملہ پر جو تم نے اللہ سے کیا ہے۔ اور یہی ہے سب سے بڑی کامیابی۔ وہ توبہ کرنے والے ہیں۔ عبادت کرنے والے ہیں۔ حمد کرنے والے ہیں۔ خدا کی راہ میں پھرنے والے ہیں۔ رکوع کرنے والے ہیں۔ سجدہ کرنے والے ہیں۔ بھلائی کا حکم کرنے والے ہیں۔ برائی سے روکنے والے ہیں۔ اللہ کی حدوں کا خیال رکھنے والے ہیں۔ اور مومنوں کو خوش خبری دے دو۔ ۱۱۲ — ۱۱۱

اللہ کا مومن بننا اللہ کے ہاتھ اپنے آپ کو بیچ دینا ہے۔ بندہ اپنا مال اور اپنی زندگی اللہ کو دیتا ہے تاکہ اللہ اس کے بدلے میں اپنی جنت اسے دے دے۔ یہ دراصل حوالگی اور سپردگی کی تعبیر ہے۔ کسی بھی چیز سے حقیقی تعلق ہمیشہ حوالگی اور سپردگی کی سطح پر ہوتا ہے۔ تعلق کا یہی درجہ اللہ کے معاملہ میں بھی مطلوب ہے۔ جنت کی ابدی نعمتیں کسی کو کامل حوالگی کے بغیر نہیں مل سکتیں۔

جب آدمی خدا کے دین کو اس طرح اختیار کرتا ہے تو دین کا معاملہ اس کے لئے کوئی علیحدہ معاملہ نہیں رہتا۔ بلکہ وہ اس کا ذاتی معاملہ بن جاتا ہے۔ اب وہی اس کی دلچسپیوں اور اس کے اندیشوں کا مرکز ہوتا ہے۔ دین اگر مال کا تقاضا کرے تو وہ اپنا مال اس کے لئے حاضر کر دیتا ہے۔ دین کے لئے اپنے وقت اور اپنی صلاحیت کو وقف کرنا پڑے تو وہ اپنے وقت اور اپنی صلاحیت کو اس کے لئے پیش کر دیتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر وہ مرحلہ آجائے جب کہ اپنے وجود کو مٹا کر یا مال سے بے مال ہونے کا خطرہ مول لے کر دین میں اپنا حصہ ادا کرنا ہو تو اس سے بھی وہ دریغ نہیں کرتا۔

جو لوگ اس طرح اپنے کو اللہ کے حوالے کریں ان کے اندر کس قسم کے انفرادی اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی حساسیت اتنی بیدار ہو جاتی ہے کہ غلطی ہوتے ہی وہ اس کو جان لیتے ہیں اور فوراً اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتے ہیں۔ وہ اللہ کے لئے بچھ جانے والے ہوتے ہیں۔ وہ خدا کی عظمتوں کو اس طرح پا لیتے ہیں کہ ان کے قلب اور زبان سے بے اختیار اس کا اظہار ہونے لگتا ہے۔ وہ سائح ہو جاتے ہیں، یعنی انسانی دنیا سے نکل کر خدائی دنیا میں جانا ان کے لئے زیادہ سکون کا باعث ہوتا ہے۔ خدا کے آگے جھکنا ان کے لئے محبوب چیز بن جاتا ہے۔ جو بھی ان کے ربط میں آتا ہے اس کو بھلائی کے راستہ پر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنے سامنے کسی کو برائی کرتے دیکھتے ہیں تو اس کو روکنے کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ خدا کی حد بندیوں کے معاملہ میں حد درجہ چوکنا ہو جاتے ہیں، وہ حدود اللہ کے اس طرح نگہبان بن جاتے ہیں جس طرح باغبان اپنے باغ کا —— یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے خدائی انعامات کی خوش خبری ہے۔

خدا کی جنت تمام قیمتی چیزوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ مگر خدا کی جنت ایک موعود انعام ہے، وہ نقد انعام نہیں۔ جنت کی اسی موجل نوعیت کا یہ نتیجہ ہے کہ لوگ جنت کو چھوڑ کر حقیر فائدوں کی طرف بھاگے جا رہے ہیں۔

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ﴿١١٣﴾ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَنْ مَوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ ۚ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ ﴿١١٤﴾ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ إِذْ هَدَاهُمْ حَتَّىٰ يُبَيِّنَ لَهُمْ مَا يَتَّقُونَ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿١١٥﴾ إِنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۚ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ﴿١١٦﴾

نبی کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں روا نہیں کہ مشرکوں کے لئے مغفرت کی دعا کریں، چاہے وہ ان کے رشتہ دار ہی ہوں جب کہ ان پر کھل چکا کہ یہ جہنم میں جانے والے لوگ ہیں۔ اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لئے مغفرت کی دعا مانگنا صرف

اس وعدہ کے سبب سے تھا جو اس نے اس سے کر لیا تھا۔ پھر جب اس پر کھل گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو وہ اس سے بے تعلق ہو گیا۔ بے شک ابراہیم بڑا نرم دل اور بردبار تھا۔ اور اللہ کسی قوم کو، اس کو ہدایت دینے کے بعد گمراہ نہیں کرتا جب تک ان کو صاف صاف وہ چیزیں بتا نہ دے جن سے انھیں بچنا ہے، بے شک اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ اللہ ہی کی سلطنت ہے آسمانوں میں اور زمین میں، وہ جلاتا ہے اور وہی مارتا ہے۔ اور اللہ کے سوا نہ تمھارا کوئی دوست ہے اور نہ مددگار۔ ۱۶ — ۱۱۴

ایک شخص کافر و مشرک ہو اور اس کے سامنے اتمام حجت کی حد تک دین کی دعوت آجائے، اس کے باوجود وہ ایمان نہ لائے تو خدا کے قانون کے مطابق وہ جہنمی ہو جاتا ہے۔ ایسے شخص کے لئے اس کے بعد نجات کی دعا کرنا گویا ایمان کو بے وقعت بنانا اور خدائی انصاف کی تردید کرنا ہے، یہی وجہ ہے کہ ایسی دعا سے منع کر دیا گیا۔

تاہم آیت میں مِن بَعدِ مَا تَبَیَّنَ کا لفظ بتاتا ہے کہ اس حکم کا تعلق زمانہ رسالت کے مشرکین سے ہے جن کے بارے میں وحی کے ذریعہ بتا دیا گیا تھا کہ وہ جہنمی ہیں۔ ان آیات کا پس منظر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ آپ منافقین کی نماز جنازہ نہ پڑھیں اور ان کے حق میں مغفرت کی دعا نہ کریں (التوبہ ۸۴) یہ بات مدینہ کے منافقوں کو بہت ناگوار ہوئی۔ انھوں نے اس کو لے کر آپ کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ وہ کہتے کہ یہ نبی تو نبی رحمت ہیں اور اپنے کو ابراہیم کا پیرو بتاتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے بھائیوں اور اپنے رشتہ داروں کے لئے استغفار سے روکتے ہیں۔ حالاں کہ ابراہیم کا حال یہ تھا کہ اپنے مشرک باپ کے لئے بھی انھوں نے مغفرت کی دعا کی۔

جواب دیا گیا کہ ابراہیم بڑے دردمند اور انسانیت کے غم میں گھلنے والے تھے۔ اپنے اس جذبہ کے تحت انھوں نے عہد کر لیا کہ وہ اپنے مشرک باپ کے حق میں خدا سے دعا کریں گے۔ مگر جب وحی نے تنبیہ کی تو اس کے بعد وہ فوراً اس سے باز آ گئے۔

اللہ نے ہر آدمی کے اندر برائی کی فطری تمیز رکھی ہے۔ جب آدمی کے سامنے ایک ایسا پیغام آتا ہے جو اس کو برائی سے روکتا ہے تو اس کا وجود اندر سے اس کی تصدیق کرتا ہے۔ اس کے دل کے اندر ایک خاموش کھٹک پیدا ہوتی ہے۔ آدمی اگر اس کھٹک کو نظر انداز کر دے، وہ فطرت کی گواہی کے باوجود بچنے والی چیز سے نہ بچے تو اس کی فطری حساسیت کمزور پڑ جاتی ہے، یہاں تک کہ دھیرے دھیرے بالکل مردہ ہو جاتی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو گمراہ کرنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ "ہدایت دینے کے بعد گمراہ کرنا"، کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ اس کا خطرہ مسلمانوں کے لئے بھی اسی طرح ہے جس طرح غیر مسلموں کے لئے۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ

الْعُسْرَةِ مِنْ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيغُ قُلُوبُ فَرِيقٍ مِنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ إِنَّهُ بِهِمْ رَءُوفٌ رَحِيمٌ ﴿١١٧﴾ وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خُلِّفُوا حَتَّى إِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوا أَنْ لَا مَلْجَأَ مِنَ اللَّهِ إِلَّا إِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿١١٨﴾

اللہ نے نبی پر اور مہاجرین و انصار پر توجہ فرمائی جنھوں نے تنگی کے وقت میں نبی کا ساتھ دیا، بعد اس کے کہ ان میں سے کچھ لوگوں کے دل کجی کی طرف مائل ہو چکے تھے۔ پھر اللہ نے ان پر توجہ فرمائی۔ بے شک اللہ ان پر مہربان ہے رحم کرنے والا ہے۔ اور ان تینوں پر بھی اس نے توجہ فرمائی جن کا معاملہ اٹھا رکھا گیا تھا۔ یہاں تک کہ جب زمین اپنی وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی اور وہ خود اپنی جانوں سے تنگ آ گئے اور انھوں نے سمجھ لیا کہ اللہ سے بچنے کے لیے تو خود اللہ کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں۔ پھر اللہ ان کی طرف پلٹا تاکہ وہ اس کی طرف پلٹ آئیں۔ بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔ ۱۱۷ - ۱۱۸

غزوۂ تبوک کے موقع پر ایک گروہ وہ نکلا جس نے اپنا بہترین اثاثہ اسلام کے حوالے کر دیا۔ ان کی فصل کٹنے کے لیے تیار تھی مگر وہ اس کو چھوڑ کر ایک ایسے سفر پر روانہ ہو گئے جس میں سخت گرمی کے تین سو میل طے کر کے وقت کی سب سے بڑی طاقت ور سلطنت کا مقابلہ کرنا تھا۔ سامان کی کمی کا یہ حال تھا کہ ایک ایک اونٹ پر کئی کئی آدمیوں کی باری لگی ہوئی تھی۔ کھانے کے لیے بعض اوقات صرف ایک کھجور ایک آدمی کے حصہ میں آتی تھی۔ تاہم یہ انتہائی سخت مرحلہ صرف ارادوں کے امتحان کے لیے سامنے لایا گیا تھا۔ جب ارادہ کرنے والوں نے ارادہ کا ثبوت دے دیا تو خدا نے دشمن کے اوپر رعب طاری کر دیا۔ وہ مقابلہ کے میدان سے ہٹ گئے اور مسلمان خون بہائے بغیر کامیاب و کامراں ہو کر واپس آ گئے۔

دوسرا طبقہ معترفین (التوبہ ۱۰۲) کا تھا۔ یہ لوگ اپنے دنیوی مشاغل کی وجہ سے سفر پر روانہ نہ ہو سکے۔ تاہم فوراً ہی بعد ان کو محسوس ہو گیا کہ انھوں نے غلطی کی ہے۔ ان کے اندر اعتراف اور شرمندگی کی آگ بھڑک اٹھی۔ ان کے آنسوؤں کی کثرت نے ان کے عمل کی کمی کی تلافی کر دی۔ خدا نے ان کو بھی اپنی رحمتوں کے سایہ میں جگہ دے دی۔ کیونکہ انھوں نے عاجزانہ طور پر اپنی غلطی کو مان لیا تھا۔

تیسرا گروہ مخلّفین (۱۱۸) کا تھا۔ یہ تین نوجوان کعب بن مالک، مرارۃ بن ربیع، ہلال بن امیہ تھے۔ وہ اگرچہ سفر پر نہ نکلنے کو اپنی کوتاہی سمجھتے تھے مگر ان کے اندر توبہ و انابت کا اتنا شدید احساس پہلے مرحلہ میں نہیں ابھرا تھا جو مطلوبہ معیار کے مطابق ہو۔ چنانچہ ان کے ساتھ معاشرتی بائیکاٹ کا معاملہ کیا گیا۔ یہ لوگ اس مقاطعہ کے باوجود مطلق

رہ سکتے تھے۔ وہ اپنے گھر اور اپنے باغوں میں مشغول ہو جاتے۔ وہ بڑھی اور ناوفاداری کے راستوں پر چلنا شروع کر دیتے۔ وہ ناراض عناصر کے ساتھ مل کر اپنی علیحدہ جمعیت بنا لیتے۔ وہ عام مسلمانوں سے الگ اپنا ایک جزیرہ بنا کر اس کے اندر اپنی خوشیوں کی دنیا بسا سکتے تھے۔ مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ خدا اور رسول سے دوری کے احساس نے ان کو اس قدر پریشان کر دیا کہ نہ باہر ان کے لئے سکون کی کوئی جگہ نظر آئی اور نہ اپنے دل کے اندر ان کے لئے سکون کا کوئی گوشہ باقی رہا۔ بالفاظ دیگر ان کی پریشانی اختیارانہ تھی نہ کہ مجبورانہ۔ ان کی اس روش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا دل پگھل اٹھا۔ ۵۰ دن میں وہ توبہ و انابت کے مطلوبہ معیار پر پہنچ گئے۔ اس کے بعد انھیں بھی معاف کر دیا گیا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ﴿١١٩﴾ مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِنَ الْأَعْرَابِ أَنْ يَتَخَلَّفُوا عَنْ رَسُولِ اللَّهِ وَلَا يَرْغَبُوا بِأَنْفُسِهِمْ عَنْ نَفْسِهِ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ لَا يُصِيبُهُمْ ظَمَأٌ وَلَا نَصَبٌ وَلَا مَخْمَصَةٌ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَطَئُونَ مَوْطِئًا يَغِيظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُونَ مِنْ عَدُوٍّ نَيْلًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهِ عَمَلٌ صَالِحٌ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿١٢٠﴾ وَلَا يُنْفِقُونَ نَفَقَةً صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً وَلَا يَقْطَعُونَ وَادِيًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللَّهُ أَحْسَنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٢١﴾

اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ رہو۔ مدینہ والوں اور اطراف کے بدویوں کے لئے زیبا نہ تھا کہ وہ اللہ کے رسول کو چھوڑ کر پیچھے بیٹھ رہیں اور نہ یہ کہ اپنی جان کو اس کی جان سے عزیز رکھیں۔ یہ اس لئے کہ جو پیاس اور تھکان اور بھوک بھی ان کو خدا کی راہ میں لاحق ہوتی ہے اور جو قدم بھی وہ کافروں کو رنج پہنچانے والا اٹھاتے ہیں اور جو چیز بھی وہ دشمن سے چھینتے ہیں ان کے بدلے میں ان کے لئے ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے۔ اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ اور جو چھوٹا یا بڑا خرچ انھوں نے کیا اور جو میدان انھوں نے طے کئے وہ سب ان کے لئے لکھا گیا تاکہ اللہ ان کے عمل کا اچھے سے اچھا بدلہ دے۔ ۲۱ - ۱۱۹

انسانی زندگی اجتماعی زندگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر آدمی کا اپنے ذوق اور رجحان کے اعتبار سے ایک حلقہ بن جاتا ہے جس میں وہ اپنے روز و شب گزارتا ہے۔ جو لوگ اللہ سے ڈرنے والے ہوں اور ایمان کے راستہ پر چلنا چاہیں ان کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنی صحبتوں اور ملاقاتوں کے لئے ان لوگوں کو چنیں جو سچے لوگ ہوں۔ یعنی جن کے دل کا خوفِ خدا ان کی زندگی کی روش بن گیا ہو۔ جن کے قول اور عمل کے درمیان مطابقت پائی جاتی ہو۔

سچوں کے ساتھ رہ کر آدمی سچا بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ جھوٹوں کا ساتھ پکڑے تو بالآخر وہ خود بھی جھوٹا بن جائے گا۔

آدمی کے سامنے ایسے مواقع آتے ہیں جب کہ جان کو خطرہ میں ڈال کر اسلام کی خدمت کرنے کا سوال ہو۔ جب بھوک پیاس کا مقابلہ کرکے اسلام کے لئے اپنا حصہ ادا کرنا ہو۔ جب اپنے کو تھکا کر خدا کی راہ میں آگے بڑھنا ہو۔ جب دشمنوں کا خطرہ مول لے کر اپنے کو اسلام کی صف میں شامل کرنا ہو۔ جب اپنی پرسکون زندگی کو برہم کرکے خدا اور رسول کا ساتھ دینا ہو۔ ایسے مواقع پر آدمی احتیاط اور بچاؤ کا طریقہ اختیار کرکے پیچھے بیٹھ جانے کو پسند کرتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ یہی تو وہ مواقع ہیں جب کہ وہ خدا کے ساتھ اپنے تعلق کا عملی ثبوت پیش کرسکتا ہے۔ جب کہ وہ جنت کے لئے اپنی امیدواری کو خدا کی نظر میں قابل قبول ثابت کرسکتا ہے۔

غزوۂ تبوک کے موقع پر پیچھے رہنے والوں میں ایک ابوخیثمہ انصاری بھی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روانگی کے بعد وہ اپنے باغ میں گئے۔ وہاں خوش گوار سایہ تھا، بیوی نے پانی چھڑک کر زمین کو ٹھنڈا کیا، چٹائی کا فرش بچھایا، تازہ کھجور کے خوشے لاکر سامنے رکھے اور ٹھنڈا پانی پینے کے لئے پیش کیا۔ ابوخیثمہ دنیوی آسانیوں ہی کی خاطر تبوک کے سفر پر نہ جاسکے تھے۔ مگر جب جانے والے اور رہنے والے کے درمیان فرق اس انتہائی نوبت کو پہنچ گیا جو اب ان کے سامنے تھا تو ابوخیثمہ اس کو برداشت نہ کرسکے۔ انھوں نے کہا "میں یہاں باغ کے سایہ میں ہوں اور خدا کے بندے لو اور گرمی میں کوہ و بیابان طے کر رہے ہیں"۔ انھوں نے تلوار سنبھالی اور تیز رفتار اونٹنی پر سوار ہو کر اسی وقت روانہ ہو گئے۔ یہاں تک کہ گرد و غبار میں اٹے ہوئے قافلۂ تبوک سے جا ملے۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَافَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ﴿١٢٢﴾

ع ۱۵

اور یہ ممکن نہ تھا کہ اہل ایمان سب کے سب نکل کھڑے ہوں۔ تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک حصہ نکل کر آتا تاکہ وہ دین میں سمجھ پیدا کرتا اور واپس جا کر اپنی قوم کے لوگوں کو آگاہ کرتا تاکہ وہ بھی پرہیز کرنے والے بنتے۔ ۱۲۲

قرآن کی یہ آیت ایک اعتبار سے زیر بحث صورت حال سے متعلق ہے اور دوسرے اعتبار سے وہ ایک کلی حکم کو بتا رہی ہے۔ ایک طرف وہ بتاتی ہے کہ مدینہ کے اطراف میں بسنے والے دیہاتیوں کی تعلیم و تربیت کس طرح کی جائے۔ دوسری طرف اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا تعلیمی نظام اور نئی نسلوں کے لئے اس کا تربیتی ڈھانچہ کن اصولی بنیادوں پر قائم ہونا چاہئے۔

تعلیم ایک ایسا کام ہے جس میں آدمی کو دوسری مشغولیتوں سے فارغ ہو کر شامل ہونا پڑتا ہے۔ اب اگر سارے لوگ بیک وقت تعلیمی کام میں لگ جائیں تو زندگی کی دوسری سرگرمیاں، مثلاً حصول معاش کی کوششیں، متاثر ہو جائیں گی۔ اسلام کا یہ طریقہ نہیں کہ ایک کام کو بگاڑ کر دوسرا کام انجام دیا جائے۔ اس لئے حکم دیا گیا کہ باری باری کا اصول مقرر کرو۔ کچھ لوگ تعلیم کے مرکز میں آئیں تو کچھ اور لوگ دوسری سرگرمیوں کو انجام دینے میں لگے رہیں۔ اس طرح دونوں کام بیک وقت انجام پاتے رہیں گے۔

اس آیت میں اسلامی تعلیم کے لئے تفقہ فی الدین کا لفظ آیا ہے۔ اس سے مراد معروف فقہی تعلیم نہیں ہے جو شکل دین (بمقابلہ روح دین) کے تفصیلی علم کا نام ہے اور جس کے نتیجہ میں دین کا علم مسائل کے علم کے ہم معنی بن گیا ہے۔ یہاں تفقہ فی الدین کا مطلب خدا کے اتارے ہوئے اساسی دین کو جاننا اور اس میں سمجھ حاصل کرنا ہے۔ اس سے مراد وہ علم ہے جو حق شناسی پیدا کرے جو بنیادی حقیقتوں سے آدمی کو باخبر کرے اور آخرت کی بنیادوں پر زندگی کی تعمیر کرنا سکھائے۔

آیت میں تفقہ فی الدین (تعلیم دین) کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ آدمی قوم کے اوپر انذار کا کام کرنے کے قابل ہو سکے۔ انذار کے معنی ہیں ڈرانا۔ قرآن میں یہ لفظ آخرت کے مسئلہ سے ڈرانے اور ہوشیار کرنے کے لئے آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی تعلیم سے ایسے افراد تیار ہوں جو قوموں کے اوپر خدا کی طرف سے منذر بن کر کھڑے ہو سکیں۔ تاکہ لوگ خدا سے ڈریں اور دنیا کی زندگی میں اس روش سے بچیں جو انھیں آخرت کے ابدی عذاب کی طرف لے جانے والی ہو۔ اسلامی تعلیم دعوت الی اللہ کی تعلیم کا نام ہے نہ کہ معروف معنوں میں صرف مسائل فقہ یا جزئیات شرع کی تعلیم کا۔

اس اعتبار سے اسلامی تعلیم کا نصاب دو خاص چیزوں پر مشتمل ہونا چاہئے:

۱۔ قرآن و سنت

۲۔ وہ علوم جو مدعو کی نسبت سے ضروری ہوں۔ مثلاً مخاطب کی زبان، اس کے طرز فکر اور اس کی نفسیات، وغیرہ

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ قَٰتِلُوا۟ ٱلَّذِينَ يَلُونَكُم مِّنَ ٱلْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا۟ فِيكُمْ غِلْظَةً ۚ وَٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّ ٱللَّهَ مَعَ ٱلْمُتَّقِينَ ﴿١٢٣﴾ وَإِذَا مَآ أُنزِلَتْ سُورَةٌ فَمِنْهُم مَّن يَقُولُ أَيُّكُمْ زَادَتْهُ هَٰذِهِۦٓ إِيمَٰنًا ۚ فَأَمَّا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ فَزَادَتْهُمْ إِيمَٰنًا وَهُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ﴿١٢٤﴾ وَأَمَّا ٱلَّذِينَ فِى قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا إِلَىٰ

رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾ وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ ۭ هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا ۭ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

اے ایمان والو، ان کافروں سے جنگ کرو جو تمھارے آس پاس ہیں اور چاہئے کہ وہ تمھارے اندر سختی پائیں اور جان لو کہ اللہ ڈرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور جب کوئی سورہ اترتی ہے تو ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ اس نے تم میں سے کس کا ایمان زیادہ کردیا۔ پس جو ایمان والے ہیں ان کا اس نے ایمان زیادہ کردیا اور وہ خوش ہو رہے ہیں۔ اور جن لوگوں کے دلوں میں روگ ہے تو اس نے بڑھا دی ان کی گندگی پر گندگی۔ اور وہ مرنے تک کافر ہی رہے۔ کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ وہ ہر سال ایک بار یا دو بار آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں، پھر بھی نہ توبہ کرتے ہیں اور نہ سبق حاصل کرتے ہیں۔ اور جب کوئی سورہ اتاری جاتی ہے تو یہ لوگ ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں کہ کوئی دیکھتا تو نہیں، پھر چل دیتے ہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں کو پھیر دیا اس وجہ سے کہ یہ سمجھ سے کام لینے والے لوگ نہیں ہیں۔ ۱۲۳-۱۲۷

"قریب کے منکروں سے جنگ کرو" کے الفاظ بتاتے ہیں کہ اسلامی جدوجہد کوئی بے منصوبہ جدوجہد نہیں ہے بلکہ اس میں ترتیب کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ پہلے قریب کی رکاوٹوں پر قابو پانے کی کوشش کی جائے گی اور اس کے بعد دور کی رکاوٹوں سے نپٹا جائے گا۔ اسی سے یہ بات بھی نکلی کہ سب سے پہلا مجاہدہ خود اپنے نفس سے کیا جانا چاہئے۔ کیونکہ آدمی کے سب سے قریب اس کا اپنا نفس ہوتا ہے۔ باہر کے دشمنوں کی باری اس کے بعد آتی ہے۔ پھر اسلام دشمنوں سے بھی اولاً جو چیز مطلوب ہے وہ سختی (غلظہ) ہے یعنی وہ مضبوطی جو دشمنوں کے لئے رعب کا باعث بن جائے (اذ کان ذلك يوقع المهابة لنا في صدورهم والرعب في قلوبهم (تفسیر جصاص)

اسی کے ساتھ ضروری ہے کہ دشمنوں سے مقابلہ کی ساری کارروائی تقویٰ کی بنیاد پر کی جائے۔ تقویٰ (خوف خدا) کی روش ہی مسلمانوں کے لئے نصرت خداوندی کی ضامن ہے۔ تقویٰ سے ہٹتے ہی وہ خدا کی مدد سے محروم ہو جائیں گے۔

وہ خدا سے دور ہو جائیں گے اور خدا ان سے۔

تقویٰ گویا بندے اور خدا کے درمیان نقطۂ ملاقات ہے۔ جب آدمی خدا سے ڈرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو اس مقام پر لاتا ہے جہاں خدا اسے دیکھنا چاہتا تھا، جہاں خدا نے اسے بلا رکھا تھا۔ ایسی حالت میں تقویٰ ہی آدمی کو خدا کے قریب کرنے والا بن سکتا ہے نہ کہ کوئی دوسری چیز۔ جب خدا اپنے بندے کو متقی کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہے تو وہ اس بندے کی طرف کیسے متوجہ ہوگا جو غیر متقی کے روپ میں اس کے سامنے آئے۔

قرآن نے اپنی یہ خصوصیت بیان کی ہے کہ اس کی آیتوں کو سن کر مومنین کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔ مگر اضافۂ ایمان کا تعلق آدمی کی اپنی قلبی صلاحیت پر ہے نہ کہ صرف آیتوں کے سن لینے پر۔ ڈیڑھ ہزار سال پہلے جب قرآن اترا تو اس کے الفاظ ابھی صرف الفاظ تھے، وہ تاریخی واقعہ نہیں بنے تھے۔ اس وقت قرآن کی اہمیت کو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے تھے جو حقیقت کو اس کی مجرد صورت میں دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ ظاہر پرست منافقین کے اندر یہ صلاحیت نہ تھی۔ ان کو قرآن کے الفاظ صرف الفاظ معلوم ہوتے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ چند الفاظ کا مجموعہ کسی کے یقین واعتماد میں اضافہ کا سبب کیسے بن جائے گا۔ چنانچہ جب کوئی نئی آیت اترتی تو وہ یہ کہہ کر مذاق اڑاتے کہ عربی کے ان الفاظ نے تم میں سے کس کے ایمان میں اضافہ کیا۔

اس بات کو آدمی اس وقت تک سمجھ نہیں سکتا جب تک وہ تاریخ کو حذف کر کے قرآن کو اس کے مجرد روپ میں دیکھنے کی نظر نہ پیدا کرے۔ آج "قرآن" کے لفظ کے ساتھ وہ تمام تاریخی عظمتیں شامل ہو چکی ہیں جو نزول قرآن کے وقت موجود نہ تھیں اور بعد کو ہزار سال سے زیادہ عرصہ میں اس کے گرد جمع ہوئیں۔

مگر زمانۂ نزول میں قرآن کی حیثیت مجرد ایک کتاب کی تھی۔ اس وقت ظاہر بیں انسان اس کو صرف ایک "کتاب" کے روپ میں دیکھتا تھا نہ کہ تاریخ ساز صحیفہ کے روپ میں۔ وہ لوگ جو قرآن کو اس کی چھپی ہوئی عظمت کے ساتھ دیکھ رہے تھے جب وہ قرآن سے غیر معمولی تاثر قبول کرتے تو ظاہر بینوں کی سمجھ میں نہ آتا۔ وہ کہتے کہ آخر یہ ایک کتاب ہی تو ہے۔ پھر ایک لفظی مجموعہ میں وہ کون سی خاص بات ہے کہ لوگ اس سے اس قدر متاثر ہو رہے ہیں۔

خدا ایسے لوگوں کو بار بار مختلف قسم کے جھٹکے دیتا ہے تاکہ ان کے دل کی حساسیت بڑھے اور وہ باتوں کو زیادہ گہرائی کے ساتھ پکڑنے کے قابل ہو جائیں۔ مگر جب آدمی خود نصیحت نہ لینا چاہے تو کوئی خارجی چیز اس کی نصیحت کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔ نصیحت لینے والی کوئی بات سامنے آئے اور آدمی اس کو نظر انداز کر دے تو اس کا یہ عمل اس کو نصیحت کے معاملہ میں بے حس بنا دیتا ہے۔

"وہ ہر سال ایک بار یا دو بار آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں مگر وہ نہ توبہ کرتے اور نہ سبق حاصل کرتے"۔ یہاں آزمائش سے مراد قحط، مرض، بھوک وغیرہ میں مبتلا کیا جانا ہے۔ اس قسم کی آفتیں آدمی کی زندگی میں بار بار پیش آتی ہیں مگر وہ ان سے توبہ اور عبرت کی غذا نہیں لیتا — توبہ حقیقۃً تذکر کے نتیجہ کا دوسرا نام ہے۔

ہر آدمی کے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ سال میں ایک دو بار ضرور کچھ غیر معمولی واقعات پیش آتے ہیں۔ یہ واقعات خدائی حقیقتوں کی طرف اشارہ کرنے والے ہوتے ہیں۔ کبھی وہ خدا کے مقابلے میں انسان کی بے چارگی کو یاد دلاتے ہیں۔ کبھی وہ آخرت کے مقابلے میں موجودہ دنیا کی بے وقعتی کو ظاہر کرتے ہیں۔ ایسے مواقع آدمی کے لیے اس بات کا امتحان ہوتے ہیں کہ وہ ان کو اپنے لیے سبق بنائے، وہ مادی واقعات میں غیر مادی حقائق

کو دیکھ لے ۔

سبق والی چیز سے آدمی سبق کیوں نہیں لے پاتا ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک چیز کو دوسری چیز سے مربوط نہیں کر پاتا ۔ دنیا کے واقعات سے سبق لینے کے لیے یہ صلاحیت درکار ہے کہ آدمی ایک بات کو دوسری بات سے جوڑ کر دیکھنا جانتا ہو ۔ وہ ظاہری واقعہ کو چھپی ہوئی حقیقت سے ملا کر دیکھ سکے ۔ وہ پیش آنے والی چیز کے آئینہ میں اس چیز کو پڑھ سکے جو ابھی پیش نہیں آئی ۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۲۹﴾ ع ۱۶

تمھارے پاس ایک رسول آیا ہے جو خود تم میں سے ہے ۔ تمھارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے ۔ وہ تمھاری بھلائی کا حریص ہے ۔ ایمان والوں پر نہایت شفیق اور مہربان ہے ۔ پھر بھی اگر وہ منہ پھیریں تو کہہ دو کہ اللہ میرے لئے کافی ہے ۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ۔ اسی پر میں نے بھروسہ کیا ۔ اور وہی مالک ہے عرش عظیم کا ۔ ۱۲۸ – ۱۲۹

اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تصویر بتائی گئی ہے کہ اسلام کی جدوجہد میں ان کا سارا اعتماد صرف ایک اللہ پر ہے ۔ وہ لوگوں کو جس خدا کی طرف بلانے کے لئے اٹھے ہیں وہ ایسا خدا ہے جو سارے اقتدار کا مالک ہے ۔ تمام خزانوں کی کنجیاں اس کے پاس ہیں ۔ رسول اسی ایمان و یقین کی زمین پر کھڑا ہوا ہے ۔ اس لئے بالکل فطری ہے کہ اس کا سارا بھروسہ صرف ایک خدا پر ہو ۔ وہ ہر قسم کی مصلحتوں اور اندیشوں سے بے پروا ہو کر حق کی خدمت میں لگا رہے ۔

پھر یہ بتایا کہ خدا کا رسول لوگوں کے حق میں حد درجہ شفیق اور مہربان ہے ۔ وہ دوسروں کی تکلیفوں پر اس طرح کڑھتا ہے جیسے کہ وہ تکلیف خود اس کے اوپر پڑی ہو ۔ وہ حرص کی حد تک لوگوں کی ہدایت کا طالب ہے ۔ دعوتِ حق کی جدوجہد کے لئے اس کو جس چیز نے متحرک کیا ہے وہ سراسر خیر خواہی کا جذبہ ہے نہ کہ کوئی شخصی حوصلہ یا قومی مسئلہ ۔ ۔ وہ خود لوگوں کی بھلائی کے لیے اٹھا ہے نہ کہ اپنی ذاتی بھلائی کے لیے ۔

عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: لوگ پروانوں کی طرح آگ میں گر رہے ہیں اور میں ان کی کمر پکڑ کر ان کو آگ میں گرنے سے روک رہا ہوں (الا وانی آخذ بحجز کم ان تهافتوا فی النار کتهافت الفراش والذباب) مسند احمد

رسول کی اس تصویر کی شکل میں حق کے داعی کی تصویر ہمیشہ کے لئے بتادی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے داعی کے اندر دو خاص صفات نمایاں طور پر ہونی چاہئیں۔ ایک یہ کہ اس کا بھروسہ صرف ایک اللہ پر ہو۔ دوسرے یہ کہ مدعو کے لئے اس کے دل میں صرف محبت اور خیر خواہی کا جذبہ ہو، اس کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ اگرچہ مدعو کی طرف سے طرح طرح کی شکایتیں پیش آتی ہیں۔ اس کے اور داعی کے درمیان قومی اور مادی جھگڑے بھی ہوسکتے ہیں۔ ان سب کے باوجود یہ مطلوب ہے کہ داعی ان تمام چیزوں کو نظر انداز کرے اور مدعو کے لئے رحمت و رأفت کے سوا کوئی اور جذبہ اپنے اندر پیدا نہ ہونے دے۔

داعی کو ردعمل کی نفسیات سے بلند ہونا پڑتا ہے۔ اس کو یک طرفہ طور پر ایسا کرنا پڑتا ہے کہ وہ مدعو کا خیر خواہ بنے، خواہ مدعو نے اس کے خلاف کتنا ہی زیادہ قابل شکایت رویہ کیوں نہ اختیار کیا ہو۔ داعی خدا کے لیے جیتا ہے اور مدعو اپنی ذات کے لیے۔

ابتدائے اسلام میں جن لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا ان کے لئے آپ کا ساتھ دینا اپنی بنی بنائی زندگی کو اجاڑ دینے کے ہم معنی بن گیا۔ اس سے کچھ لوگوں کے اندر یہ خیال پیدا ہوا کہ رسول ہمارے لئے مصیبت بن کر آیا ہے۔ مگر یہ وہی بات ہے جو عین مطلوب ہے۔ حق کی دعوت اسی لئے اٹھتی ہے کہ لوگوں کو بتایا جائے کہ ان کی قوتوں اور صلاحیتوں کا مصرف آخرت کی دنیا ہے نہ کہ موجودہ دنیا۔ اس لئے اگر رسول کا لایا ہوا دین اختیار کرنے میں دنیوی نقشہ بگڑتا ہوا نظر آئے تو اس پر آدمی کو مطمئن رہنا چاہئے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی متاع کو خدا نے آخرت کے لئے قبول کر لیا۔

سُوۡرَةُ یُوۡنُسَ مَکِّیَّةٌ وَّہِیَ مِائَةٌ وَّتِسۡعُ اٰیَاتٍ وَّاَحَدَ عَشَرَ رُکُوۡعًا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الٓرٰ ۟ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ الۡحَکِیۡمِ ﴿۱﴾ اَکَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنۡ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی رَجُلٍ مِّنۡہُمۡ اَنۡ اَنۡذِرِ النَّاسَ وَ بَشِّرِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنَّ لَہُمۡ قَدَمَ صِدۡقٍ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ؕؔ قَالَ الۡکٰفِرُوۡنَ اِنَّ ہٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۲﴾

آیاتہا ۱۰۹ سورہ یونس مکیہ رکوعاتہا ۱۱

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

الف لام ر، یہ پُرحکمت کتاب کی آیتیں ہیں۔ کیا لوگوں کو اس پر حیرت ہے کہ ہم نے انھیں میں سے ایک شخص پر وحی کی کہ لوگوں کو ڈراؤ اور جو ایمان لائیں ان کو خوش خبری سنا دو کہ ان کے لئے ان کے رب کے پاس سچا مرتبہ ہے۔ منکروں نے کہا کہ یہ شخص تو کھلا جادوگر ہے۔ ۲-۱

پیغمبر کا کلام انتہائی محکم دلائل پر مبنی ہوتا ہے۔ وہ اپنے غیر معمولی انداز کی بنا پر خود اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے بول رہا ہے۔ اس کے باوجود ہر زمانہ میں لوگوں نے پیغمبر کا انکار کیا۔ اس کی وجہ انسان کی ظاہر پرستی ہے۔ پیغمبر اپنے معاصرین کی نظر میں عام انسانوں کی طرح بس ایک انسان ہوتا ہے۔ اس کے گرد ابھی عظمت کی وہ تاریخ جمع نہیں ہوتی جو بعد کے زمانہ میں اس کے نام کے ساتھ وابستہ ہو جاتی ہے۔ اس لئے پیغمبر کے زمانہ کے لوگ پیغمبر کو محض ایک انسان سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ وہ پیغمبر کو نہ خدا کے بھیجے ہوئے کی حیثیت میں دیکھ پاتے اور نہ مستقبل میں بننے والی تاریخ کے اعتبار سے اس کا اندازہ کر پاتے جب کہ ہر آدمی اس کی پیغمبرانہ عظمت کو ماننے پر مجبور ہوگا۔

پیغمبر کا کلام سراپا اعجاز ہوتا ہے جو سننے والوں کو بے دلیل کر دیتا ہے۔ مگر منکرین اس کی اہمیت کو گھٹانے کے لئے یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ ادبی ساحری ہے۔ وہ دلیل کے میدان میں اپنے آپ کو عاجز پاکر اس کے اوپر عیب لگانے لگتے ہیں۔ اس طرح وہ پیغمبر کے کلام کی صداقت کو مشتبہ کرتے ہیں۔ پیغمبر کا کلام جن لوگوں کو مفتوح کر رہا تھا ان کے بارے میں یہ تاثر دیتے ہیں کہ وہ محض سادگی میں پڑے ہوئے ہیں، ورنہ یہ سارا معاملہ الفاظ کے فریب کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ زبان کی جادوگری ہے نہ کہ کوئی واقعی اہمیت کی چیز۔

پیغمبر کا اصل مشن انذار و تبشیر ہے۔ یعنی خدا کی پکڑ سے ڈرانا اور جو لوگ خدا سے ڈر کر دنیا میں رہنے کے لئے تیار ہوں ان کو جنت کی خوش خبری دینا۔ پیغمبر اس لئے آتا ہے کہ لوگوں کو اس حقیقت واقعہ سے آگاہ کر دے کہ آدمی اس دنیا میں آزاد اور خود مختار نہیں ہے اور نہ زندگی کا قصہ آدمی کی موت

کے ساتھ ختم ہو جانے والا ہے۔ بلکہ موت کے بعد ابدی زندگی ہے اور آدمی کو سب سے زیادہ اسی کی فکر کرنا چاہئے۔ جو شخص غفلت برتے گا یا سرکشی کرے گا وہ موت کے بعد کی دنیا میں اس حال میں پہنچے گا کہ وہاں اس کے لئے دکھ کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔

ظاہر پرست انسان ہمیشہ یہ سمجھتا رہا ہے کہ عزت اور ترقی اس شخص کے لئے ہے جس کے پاس دنیا کا اقتدار ہے، جو دنیا کی دولت کا مالک ہے۔ پیغمبر بتاتا ہے کہ یہ سراسر دھوکا ہے۔ یہ عزت و ترقی تو وہ ہے جو موجودہ عارضی زندگی میں انسانوں کے درمیان ملتی ہے۔ مگر عزت اور ترقی دراصل وہ ہے جو مستقل زندگی میں خدا کے یہاں حاصل ہو۔ وہی عزت و ترقی حقیقی ہے اور اسی کے ساتھ دائمی بھی۔

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ ۖ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ ۖ مَا مِنْ شَفِيعٍ إِلَّا مِنْ بَعْدِ إِذْنِهِ ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۚ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿٣﴾ إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا ۖ وَعْدَ اللَّهِ حَقًّا ۚ إِنَّهُ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ بِالْقِسْطِ ۚ وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ شَرَابٌ مِنْ حَمِيمٍ وَعَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿٤﴾

بے شک تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں (ادوار) میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر قائم ہوا۔ وہی معاملات کا انتظام کرتا ہے۔ اس کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش کرنے والا نہیں۔ یہی اللہ تمہارا رب ہے پس تم اسی کی عبادت کرو، کیا تم سوچتے نہیں۔ اسی کی طرف تم سب کو لوٹ کر جانا ہے، یہ اللہ کا پکا وعدہ ہے۔ بے شک وہ پیدائش کی ابتدا کرتا ہے، پھر وہ دوبارہ پیدا کرے گا تاکہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے ان کو انصاف کے ساتھ بدلہ دے۔ اور جنھوں نے انکار کیا ان کے انکار کے بدلے ان کے لئے کھولتا پانی اور دردناک عذاب ہے۔ ۴-۳

کائنات میں مختلف قسم کی چیزیں ہیں۔ علمی مطالعہ بتاتا ہے کہ ان چیزوں کا ظہور بیک وقت نہیں ہوا بلکہ تدریج کے ساتھ ایک کے بعد ایک ہوا ہے۔ قرآن اس تدریجی تخلیق کو چھ ادوار (Periods) میں تقسیم کرتا ہے۔ یہ دوری تخلیق ثابت کرتی ہے کہ کائنات کی پیدائش شعوری منصوبہ کے تحت ہوئی ہے۔ پھر کائنات کا مطالعہ یہ بھی بتاتا ہے کہ اس کا نظام حد درجہ محکم قوانین کے تحت چل رہا ہے۔ ہر چیز ٹھیک اسی طرح عمل کرتی ہے جس طرح مجموعی تقاضے کے تحت اسے عمل کرنا چاہئے۔ یہ واقعہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اس کارخانہ کائنات کا ایک زندہ مدبر ہے جو ہر لمحہ اس کا انتظام کر رہا ہے۔

کائنات کا یہ حیران کن نظام خود ہی پکار رہا ہے کہ اس کا مالک اتنا کامل اور اتنا عظیم ہے جس کے یہاں کسی سفارش کی سفارش چلنے کا کوئی سوال نہیں۔ کائنات اپنی خصوصیات کے آئینہ میں اپنے خالق کی خصوصیات کو بتارہی ہے۔

ساری کائنات میں "قسط" کا نظام قائم ہے۔ یہاں ہر ایک کے ساتھ یہ ہو رہا ہے کہ جو کچھ وہ کرتا ہے اسی کے مطابق نتیجہ اس کے سامنے آتا ہے۔ ہر ایک کو وہی ملتا ہے جو اس نے کیا تھا اور ہر ایک سے وہ چھن جاتا ہے جس کے لئے اس نے نہیں کیا تھا۔ زمین کا جو حصہ رات کے اسباب جمع کرنے وہاں تاریکی پھیل کر رہتی ہے اور زمین کا جو حصہ روشنی کے اسباب پیدا کرے اس کے اوپر روشن سورج چمک کر رہتا ہے۔

یہ مادی نتائج کا حال ہے۔ مگر اخلاقی نتائج کے معاملہ میں دنیا کی تصویر بالکل مختلف نظر آتی ہے۔ انسان نیکی کرتا ہے اور اس کو نیکی کا پھل نہیں ملتا۔ انسان سرکشی کرتا ہے مگر اس کی سرکشی اپنا نتیجہ دکھائے بغیر جاری رہتی ہے۔ خالق کی جو مرضی اس کی دوسری مخلوقات میں چل رہی ہے اس کی وہی مرضی انسان کے معاملات میں کیوں ظاہر نہیں ہوتی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کی زندگی میں خدائی انصاف کے ظہور کو خدا نے بعد کو آنے والی دنیا کے لئے مؤخر کر دیا ہے۔ پہلی زندگی انسان کو عمل کے لئے دی گئی ہے، دوسری زندگی اس کو اپنے عمل کا نتیجہ پانے کے لئے دی جائے گی۔ اور دوسری زندگی کا ظہور یقیناً اتنا ہی ممکن ہے جتنا پہلی زندگی کا ظہور۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۝ اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ ۝

اللہ ہی ہے جس نے سورج کو چمکتا بنایا اور چاند کو روشنی دی اور اس کی منزلیں مقرر کر دیں تاکہ تم برسوں کا شمار اور حساب معلوم کرو۔ اللہ نے یہ سب کچھ بے مقصد نہیں بنایا ہے۔ وہ نشانیاں کھول کر بیان کرتا ہے ان کے لئے جو سمجھ رکھتے ہیں۔ یقیناً رات اور دن کے الٹ پھیر میں اور اللہ نے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں پیدا کیا ہے ان میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو ڈرتے ہیں۔ ۶-۵

سورج ہماری زمین سے نہایت درست فاصلہ پر قائم ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ ہمارے لئے روشنی اور حرارت جیسی نعمتوں کا خزانہ بنا ہوا ہے۔ اگر اس اندازہ میں فرق ہو جائے تو سورج ہمارے لئے سورج نہ رہے

بلکہ آگ کا جہنم بن جائے، وہ زندگی کے بجائے موت کا پیغام ثابت ہو۔ چاند ایک حد درجہ ریاضیاتی حساب کے مطابق اپنے مدار پر ٹھیک ٹھیک گردش کرتا ہے۔ اسی بنا پر یہ ممکن ہوتا ہے کہ چاند بذات خود بے نور ہونے کے باوجود ہمارے لئے نہ صرف ٹھنڈی روشنی دے بلکہ مہینہ اور سال کی قدرتی تقویم بھی فراہم کرے۔ یہ فلکیاتی نشانیاں ثابت کرتی ہیں کہ اس کائنات میں گہری مقصدیت ہے، اور مقصدیت والی کائنات کا آخری انجام بے مقصد نہیں ہو سکتا۔

پھر ہماری دنیا میں رات کے بعد دن کا آنا مادی تمثیل کی زبان میں اس اخلاقی حقیقت کو بتا رہا ہے کہ موجودہ دنیا میں یہ قانون نافذ ہے کہ تاریکی کے بعد روشنی پھیلے، اندھیرے کے بعد اجالے کا ظہور ہو۔ یہاں حقوق کی پامالی کے بعد حقوق کی ادائگی کا نظام آنے والا ہے۔ انسان کی سرکشی کی جگہ خدائی انصاف کو غلبہ ملنے والا ہے۔ یہاں اس وقت کا آنا مقدر ہے جب کہ دھاندلی ختم ہو اور حق کے اعتراف کا ماحول چاروں طرف قائم ہو جائے۔

آخرت کی حقیقتوں کو خدا نے نشانیوں کے انداز میں ظاہر کیا ہے۔ بالفاظ دیگر، خدا موجودہ دنیا میں دلیل کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے نہ کہ محسوس مشاہدہ کے روپ میں۔ پھر خدا جس روپ میں اپنا جلوہ دکھاتا ہے اسی روپ میں ہم اس کو پا سکتے ہیں نہ کہ کسی اور روپ میں۔

خدا نے اس دنیا میں ہدایت کے راستے کھول رکھے ہیں مگر یہ ہدایت انھیں کا مقدر ہے جو خدائی نقشہ کے مطابق اس کی پیروی کرنے کے لئے تیار ہوں۔ یہاں وہی لوگ صحیح راستہ پر چلنے کی توفیق پائیں گے جو دلیل کی زبان میں بات کو سمجھنے اور ماننے کے لئے تیار ہوں۔ جو لوگ سچی دلیل کے آگے نہ جھکیں وہ گویا خدا کے آگے نہیں جھکے۔ انھوں نے خدا کو نہیں مانا۔ ایسے لوگوں کو اپنے لئے جہنم کے سوا کسی اور چیز کا انتظار نہ کرنا چاہئے۔

زمین و آسمان میں اگرچہ بے شمار نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں مگر وہ انھیں لوگوں کے لئے سبق بنتی ہیں جو ڈر رکھنے والے ہیں۔ ڈر یا اندیشہ وہ چیز ہے جو آدمی کو سنجیدہ بناتا ہے۔ جب تک آدمی کسی معاملہ میں سنجیدہ نہ ہو وہ اس معاملہ پر پورا دھیان نہیں دے گا اور نہ اس کے پہلوؤں کو سمجھے گا ——

پوری کائنات ایک زبردست تخلیقی توازن میں جکڑی ہوئی ہے۔ یہ اس بات کا کھلا ہوا اشارہ ہے کہ کائنات کا مالک ایسا مالک ہے جو انسان کو پکڑنے کی طاقت رکھتا ہے۔ اسی طرح پہلی زندگی جس کا ہم تجربہ کر رہے ہیں وہ اس کا یقینی ثبوت ہے کہ دوسری زندگی بھی ممکن ہے۔ موجودہ دنیا میں مادی نتائج کا نکلنا مگر اخلاقی نتائج کا نہ نکلنا تقاضا کرتا ہے کہ ایک اور دنیا بنے جہاں اخلاقی نتائج اپنی پوری صورت میں ظاہر ہوں۔ یہ سب انتہائی محکم باتیں ہیں مگر ان کا محکم ہونا وہی شخص جانے گا جو اندیشہ کی نفسیات کے تحت زندگی کے معاملہ کو دیکھتا ہو۔

إِنَّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنُّوا بِهَا وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غَافِلُونَ ۝٧ أُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝٨ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ يَهْدِيهِمْ رَبُّهُمْ بِإِيمَانِهِمْ ۖ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ ۝٩ دَعْوَاهُمْ فِيهَا سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ ۚ وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝١٠ ع

بے شک جو لوگ ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی پر راضی اور مطمئن ہیں اور جو ہماری نشانیوں سے بے پروا ہیں، ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا بہ سبب اس کے جو وہ کرتے تھے۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے، اللہ ان کے ایمان کی بدولت ان کو پہنچا دے گا۔ ان کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی نعمت کے باغوں میں۔ اس میں ان کا قول ہوگا کہ اے اللہ تو پاک ہے۔ اور ملاقات ان کی سلام ہوگی۔ اور ان کی آخری بات یہ ہوگی کہ ساری تعریف اللہ کے لیے ہے جو رب ہے سارے جہان کا۔ ۱۰-۷

جہنم کس کے لیے ہے ــــــ ان لوگوں کے لیے جو اس دن کو بھولے ہوئے ہوں جب کہ خدا سے ان کا سامنا ہوگا۔ جو آخرت کی ابدی نعمتوں کے مقابلہ میں دنیا کی عارضی چیزوں پر راضی ہو گئے ہوں۔ جن کا یہ حال ہو کہ دنیا میں انھیں جو کچھ امتحان کے طور پر ملا ہے اسی پر وہ مطمئن ہو جائیں۔ جو غیر خدائی چیزوں میں اتنا دل لگالیں کہ خدا کی طرف سے ظاہر کی جانے والی حقیقتوں سے غافل ہو جائیں۔ یہ سب خدا کے نزدیک جہنمی راستوں میں چلنا ہے، اور جو لوگ جہنمی راستوں میں چل رہے ہوں وہ آخر کار جہنم کے سوا اور کہاں پہنچیں گے۔

"اللہ انھیں ان کے ایمان کی وجہ سے جنت کی منزل تک پہنچائے گا"۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان آدمی کے لیے رہنمائی ہے۔ وہ آدمی کو غلط راہوں سے بچا کر صحیح راستہ پر چلاتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اس کو حقیقی منزل تک پہنچا دیتا ہے۔

ایمان خدا کی دریافت ہے۔ جس آدمی کو ایمان حاصل ہو جائے اس کو علم کا سرا ہاتھ آجاتا ہے، وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ ہر معاملہ میں صحیح مقام سے اپنی سوچ کا آغاز کر سکے۔ وہ فکری بے راہ روی سے بچ کر فکری صحت کا مالک بن جائے۔ مزید یہ کہ خدا کو ماننا کسی کتابی فلسفہ کو ماننا نہیں ہے۔ یہ ایک زندہ خدا کو ماننا ہے جو بالآخر تمام انسانوں کو اپنے یہاں جمع کر کے ان کا حساب لینے والا ہے۔ اس طرح ایمان آدمی کے اندر اپنے انجام کے بارے میں اندیشہ کی کیفیت پیدا کر کے اس کو انتہائی سنجیدہ انسان بنا دیتا ہے۔ وہ اپنے کو مجبور پاتا ہے کہ

اپنی تمام کارروائیوں کو صحیح اور غلط کی روشنی میں دیکھے اور صرف صحیح رخ پر چلے اور غلط رخ پر چلنے سے ہمیشہ پرہیز کرے۔

اس طرح ایمان آدمی کو صحیح فکر بھی دیتا ہے اور اسی کے ساتھ وہ قوت تمیز بھی جو اس کے لئے مستقل عملی رہنما بن جائے۔

آخرت کی جنت ان لوگوں کے لئے ہے جنھوں نے دنیا میں اپنے آپ کو اس کا مستحق ثابت کیا ہو۔ آخرت خدا کے براہ راست جلووں میں سرشار ہونے کا مقام ہے، وہاں بسنے کا موقع صرف ان لوگوں کو ملے گا جو دنیا میں خدا کے بالواسطہ جلووں سے سرشار ہوئے تھے۔ آخرت میں لوگوں کے دل ایک دوسرے کے لئے سلامتی اور خیر خواہی کے جذبات سے بھرے ہوئے ہوں گے، اس لئے وہاں کی آبادی میں وہی لوگ جگہ پائیں گے جنھوں نے دنیا میں اس بات کا ثبوت دیا تھا کہ دوسروں کے لئے ان کے دل میں سلامتی اور خیر خواہی کے سوا کوئی دوسرا جذبہ نہیں۔

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ إِلَيْهِمْ أَجَلُهُمْ ۖ فَنَذَرُ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿١١﴾ وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْبِهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّ كَأَنْ لَمْ يَدْعُنَا إِلَىٰ ضُرٍّ مَسَّهُ ۚ كَذَٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٢﴾

اگر اللہ لوگوں کے لئے عذاب اسی طرح جلد پہنچا دے جس طرح وہ ان کے ساتھ رحمت میں جلدی کرتا ہے تو ان کی مدت ختم کر دی گئی ہوتی۔ لیکن ہم ان لوگوں کو جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے ان کی سرکشی میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ اور انسان کو جب کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہم کو پکارتا ہے۔ پھر جب ہم اس سے اس کی تکلیف کو دور کر دیتے ہیں تو وہ ایسا ہو جاتا ہے گویا اس نے کبھی اپنے کسی برے وقت پر ہم کو پکارا ہی نہ تھا۔ اس طرح حد سے گزر جانے والوں کے لئے ان کے اعمال خوش نما بنا دئے گئے ہیں۔
۱۲ — ۱۱

خدا کا قانون یہ ہے کہ کوئی شخص قابل انعام عمل کرے تو اس کا عمل فوراً اس کے اعمال نامہ میں شامل کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص قابل سزا فعل کا ارتکاب کرتا ہے تو خدا اس کو ڈھیل دیتا ہے تاکہ وہ کسی نہ کسی موڑ پر متنبہ ہو کر اپنی اصلاح کرے۔ خدا کا یہ قانون انسان کے لئے بہت بڑی رحمت ہے، ورنہ انسان اتنا ظالم ہے کہ وہ ہر وقت برائی کرنے پر آمادہ رہتا ہے، اور اگر لوگوں کو ان کی برائیوں پر فوراً پکڑا جانے

لگے تو ان کی مہلت عمر بہت جلد ختم ہو جائے اور زمین کی پشت چلنے والے انسانوں سے خالی ہو جائے۔

دنیا کی زندگی میں سرکش وہ لوگ بنتے ہیں جو دنیا میں یہ سمجھ کر رہیں کہ مرنے کے بعد انھیں خدا کا سامنا نہیں کرنا ہوگا۔ جو پکڑ کے اندیشہ سے خالی ہو کر زندگی گزارتے ہیں۔ جو سمجھتے ہیں کہ وہ آزاد ہیں کہ جو دھاندلی چاہیں کریں اور جو فساد چاہیں پھیلائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان سچائی اور انصاف کے ساتھ معاملہ کرنے کا ایک ہی حقیقی محرک ہے۔ اور وہ یہ کہ آدمی یہ سمجھے کہ سب طاقت وروں کے اوپر ایک طاقت ور ہے۔ ہر آدمی اس کے آگے بے بس ہے۔ وہ ایک دن تمام انسانوں کو پکڑے گا اور ہر ایک مجبور ہوگا کہ اپنے بارے میں اس کے فیصلہ کو تسلیم کرے۔

دنیا کا نظام اس طرح بنا ہے کہ آدمی بار بار کسی نہ کسی تکلیف یا حادثہ کی زد میں آجاتا ہے، آدمی محسوس کرنے لگتا ہے کہ خارجی طاقتوں کے مقابلہ میں وہ بالکل بے بس ہے۔ اس وقت آدمی بے اختیار ہو کر خدا کو پکارنے لگتا ہے۔ وہ خدا کی قدرت کے مقابلہ میں اپنے عجز کا اعتراف کر لیتا ہے۔ مگر یہ حالت صرف اس وقت تک رہتی ہے جب تک وہ مصیبتوں کی گرفت میں ہو، مصیبت سے نجات پاتے ہی وہ دوبارہ ویسا ہی غافل اور سرکش بن جاتا ہے جیسا وہ پہلے تھا۔ ایسے لوگوں کے اظہار بندگی کو خدا تسلیم نہیں کرتا۔ کیونکہ اظہار بندگی وہ مطلوب ہے جو آزادانہ حالات میں کی جائے، مجبورانہ حالات میں ظاہر کی ہوئی بندگی کی خدا کے نزدیک کوئی قیمت نہیں۔

آدمی ایک توجیہ پسند مخلوق ہے۔ وہ ہر عمل کا ایک جواز تلاش کرتا ہے۔ اگر آدمی سرکشی کو اپنے لئے پسند کرلے تو اس کا ذہن بھی اسی طرف مڑ جائے گا۔ وہ عملاً سرکشی کرے گا اور اس کا ذہن اس کی سرکشی کو درست ثابت کرنے کے لئے اس کو خوبصورت الفاظ فراہم کرتا رہے گا۔ اسی کا نام تزئین اعمال ہے۔ آدمی اپنی غلطیوں کو خوش نما الفاظ میں بیان کر کے اپنے کو مطمئن کر لیتا ہے کہ وہ حق پر ہے۔ مگر یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص آگ کا انگارہ اپنے ہاتھ میں لے لے اور سمجھے کہ وہ اس کو نہیں جلائے گا کیونکہ اس کا نام اس نے سرخ پھول رکھ دیا ہے۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا ۙ وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ۚ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

اور ہم نے تم سے پہلے قوموں کو ہلاک کیا جب کہ انھوں نے ظلم کیا۔ اور ان کے پیغمبران کے پاس کھلی دلیلوں کے ساتھ آئے اور وہ ایمان لانے والے نہ بنے۔ ہم ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں مجرم لوگوں کو۔ پھر ہم نے ان کے بعد تم کو ملک میں جانشین بنایا تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسا عمل کرتے ہو۔ ۱۳-۱۴

"پیغمبر اپنی قوموں کے پاس بیّنات کے ساتھ آئے مگر انھوں نے نہ مانا" بینہ جمع بینات کے معنی دلیل کے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کا داعی ہمیشہ بیّنات کی بنیاد پر اٹھتا ہے۔ لوگوں کو اسے دلائل کی سطح پر پہچاننا پڑتا ہے۔ جو لوگ ظاہری عظمتوں اور عوامی استقبالیوں میں خدا کے داعی کو پانا چاہیں وہ کبھی اس کو نہیں پائیں گے، کیونکہ خدا کا داعی وہاں موجود ہی نہیں ہوتا۔ نبی معجزہ دکھاتا ہے۔ مگر معجزہ آخری مرحلہ میں اتمام حجت کے لئے آتا ہے، دعوتی مرحلہ میں سارا کام دلائل کی بنیاد پر ہوتا ہے۔

کسی شخص یا گروہ کا ظالم ہونا یہ ہے کہ وہ دلیل کے روپ میں ظاہر ہونے والی دعوت خداوندی کو نہ پہچانے اور اپنے خود ساختہ معیار پر نہ پانے کی وجہ سے اس کا انکار کر دے۔ ایسے لوگ اپنی اس روش کی وجہ سے خدائی قانون کی زد میں آجاتے ہیں۔

ماضی کی جن قوموں پر انکار نبوت کے جرم میں خدا کا عذاب نازل ہوا وہ سرے سے نبوت کی منکر نہ تھیں۔ یہ تمام قومیں کسی نہ کسی سابق پیغمبر کو مانتی تھیں۔ البتہ انھوں نے وقت کے پیغمبر کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ پچھلے پیغمبر کا معاملہ یہ تھا کہ اس کی پشت پر تاریخ کی تصدیقات قائم ہوگئی تھیں اور قومی عصبیتیں اس کے ساتھ وابستہ ہو چکی تھیں۔ جب کہ معاصر پیغمبر ابھی اس قسم کی اضافی خصوصیات سے خالی تھا۔ انھوں نے اس گزرے ہوئے پیغمبر کا اقرار کیا جو نسلوں کی روایات کے نتیجہ میں ان کا قومی پیغمبر بن چکا تھا، جس کے ساتھ اپنے کو منسوب کرنا تاریخی عظمت کے مینارے اپنے کو منسوب کرنے کے ہم معنی تھا۔ انھوں نے اپنے قومی پیغمبر کو پیغمبر مانا مگر اس پیغمبر کا انکار کر دیا جس کو صرف دلیل اور برہان کے ذریعہ جانا جاسکتا تھا۔

یہ جرم خدا کی نظر میں اتنا شدید تھا کہ وہ لوگ نبی کے منکر قرار دے کر ہلاک کر دئے گئے۔

"پھر ہم نے ان کے بعد تم کو ملک میں خلیفہ بنایا" خلیفہ کے اصل معنی ہیں بعد کو آنے والا۔ یہ لفظ جانشین، خاص طور پر، اقتدار میں جانشین کے لئے بولا جاتا ہے۔ یہ جانشینی انسان کی ہوتی ہے نہ کہ خدا کی۔ کوئی انسان اقتدار میں خدا کا جانشین نہیں ہو سکتا۔ انسان ہمیشہ کسی مخلوق کا جانشین ہوتا ہے۔ قرآن میں جہاں بھی خلافت کا لفظ آیا ہے وہ مخلوق کی جانشینی کے لئے ہے نہ کہ خدا کی جانشینی کے لئے۔

کسی کو خلیفہ (جانشین) بنانا اعزاز کے لئے نہیں بلکہ صرف امتحان کے لئے ہوتا ہے۔ جانشین بنانے کا مطلب ایک کے بعد دوسرے کو کام کا موقع دینا ہے، ایک قوم کے بعد دوسری قوم کو امتحان کے میدان میں کھڑا کرنا ہے۔ جیسے ہندستان میں دیسی راجاؤں کی جگہ مغلوں کو اختیار دیا گیا۔ پھر ان کو ہٹا کر انگریز ان کے جانشین بنائے گئے۔ اس کے بعد انھیں ملک سے نکال کر اکثریتی فرقہ کے لئے جگہ خالی کی گئی۔ ان میں سے ہر بعد کو آنے والا اپنے پہلے کا خلیفہ تھا۔

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ ۙ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ ۚ قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي ۖ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ۖ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿١٥﴾ قُلْ لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا تَلَوْتُهُ عَلَيْكُمْ وَلَا أَدْرَاكُمْ بِهِ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِنْ قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿١٦﴾ فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ ۚ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُونَ ﴿١٧﴾

اور جب ان کو ہماری کھلی ہوئی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو جن لوگوں کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں ہے وہ کہتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی اور قرآن لاؤ یا اس کو بدل دو۔ کہو کہ میرا یہ کام نہیں کہ میں اپنے جی سے اس کو بدل دوں۔ میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس آتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ کہو کہ اگر اللہ چاہتا تو میں اس کو تمہیں نہ سناتا اور نہ اللہ اس سے تمہیں باخبر کرتا۔ میں اس سے پہلے تمہارے درمیان ایک عمر بسر کر چکا ہوں، پھر کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے، اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ بہتان باندھے یا اس کی نشانیوں کو جھٹلائے۔ یقیناً مجرموں کو فلاح حاصل نہیں ہوتی۔ ۱۷-۱۵

مکہ کے قریش خدا اور رسول کو مانتے تھے۔ وہ اپنے کو ملت ابراہیمی کا پیرو کہتے تھے۔ حتیٰ کہ اسلام کی بہت سی دینی اصطلاحیں مثلاً صلاۃ، صوم، زکوٰۃ، حج وغیرہ وہی ہیں جو پہلے سے ان کے یہاں رائج تھیں۔ اس کے باوجود کیوں انھوں نے کہا کہ دوسرا قرآن لاؤ یا اس قرآن میں کچھ ترمیم کرو تب ہم اس کو مانیں گے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ قرآن میں خدا کے خالص دین کا اعلان تھا۔ جب کہ قریش خدا کے دین کے نام پر ایک ملاوٹی دین کو اختیار کیے ہوئے تھے۔

قرآن کی توحید سے ان کے مشرکانہ عقیدۂ خدا پر زد پڑتی تھی۔ قرآن کے تصور عبادت کی روشنی میں ان کی عبادتیں محض کھیل تماشا معلوم ہوتی تھیں۔ وہ پیغمبر کو اپنے قومی فخر کا نشان بنائے ہوئے تھے اور قرآن ان سے ایک ایسے پیغمبر کو ماننے کا مطالبہ کر رہا تھا جو ان کی عملی زندگی میں رہنما کا درجہ حاصل کرلے۔ انھوں نے کعبہ کی خدمت کو اپنی دینداری کا سب سے بڑا ثبوت سمجھ رکھا تھا جب کہ قرآن نے بتایا کہ دین داری یہ ہے کہ آدمی خدا سے ڈرے اور جو کچھ کرے آخرت کو سامنے رکھ کر کرے۔

آدمی چند الفاظ بول کر حق کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے دل میں "کھٹکا" نہیں ہوتا۔ اگر آدمی کے دل میں یہ کھٹکا لگا ہوا ہو کہ وہ اپنے قول وفعل کے لئے خدا کے یہاں جواب دہ ہے تو وہ فوراً سنجیدہ ہو جائے گا۔ اور جو شخص سنجیدہ ہو وہ معاملہ کو حقیقت پسندی کی نظر سے دیکھے گا، وہ سرسری طور پر اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هَٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللَّهِ ۚ قُلْ أَتُنَبِّئُونَ اللَّهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ ۚ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿١٨﴾ وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا ۚ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيمَا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿١٩﴾

اور وہ اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو ان کو نہ نقصان پہنچا سکیں اور نہ نفع پہنچا سکیں۔ اور وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے یہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ کہو، کیا تم اللہ کو ایسی چیز کی خبر دیتے ہو جو اس کو آسمانوں اور زمین میں معلوم نہیں۔ وہ پاک اور برتر ہے اس سے جس کو وہ شریک کرتے ہیں۔ اور لوگ ایک ہی امت تھے۔ پھر انھوں نے اختلاف کیا۔ اور اگر تمھارے رب کی طرف سے ایک بات پہلے سے نہ ٹھہر چکی ہوتی تو ان کے درمیان اس امر کا فیصلہ کر دیا جاتا جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔ ۱۹ — ۱۸

ہماری دنیا میں جو واقعات ہو رہے ہیں وہ بظاہر مادی اسباب کے تحت ہو رہے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ تمام واقعات کے پیچھے خدا کا تصرف کام کر رہا ہے۔ اس دنیا میں کسی کو کوئی ذاتی اختیار حاصل ہی نہیں۔ توحید یہ ہے کہ آدمی ظاہری چیزوں سے گزر کر غیب میں چھپے ہوئے خدا کو پالے۔ اس کے مقابلہ میں شرک یہ ہے کہ آدمی ظاہری چیزوں میں اٹک کر رہ جائے۔ وہ چیزوں ہی کو چیزوں کے خالق کا مقام دے دے۔

اس دنیا میں خدا کے سوا کسی کے پاس نفع دینے یا نقصان پہنچانے کی طاقت نہیں۔ جو آدمی اس حقیقت کو پالیتا ہے اس کی تمام توجہ خدا کی طرف لگ جاتی ہے۔ وہ خدا ہی کی پرستش کرتا ہے۔ وہ اسی سے ڈرتا ہے اور اسی سے امیدیں قائم کرتا ہے۔ وہ اپنا سب کچھ ایک خدا کو بنا لیتا ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ چیزوں میں اٹکے ہوئے ہوں وہ اپنے اپنے ذوق کے لحاظ سے کسی غیر خدا کو اپنا خدا بنا لیتے ہیں اور ان غیر خداؤں سے وہی امیدیں اور اندیشے وابستہ کر لیتے ہیں جو درحقیقت خدائے واحد کے ساتھ وابستہ کرنا چاہئے۔ اسی کی ایک صورت شفاعت کا عقیدہ ہے۔ لوگ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ انسانوں یا غیر انسانوں میں کچھ ایسی برتر ہستیاں ہیں جو خدا کی نظر میں

مقدس ہیں۔ خدا ان کی سنتا ہے اور ان کی سفارش پر دنیوی رزق یا اخروی نجات کے فیصلے کرتا ہے۔ مگر اس قسم کا عقیدہ باطل ہے۔ وہ خدا کی خدائی کا کمتر اندازہ ہے۔

خدا اس قسم کے ہر شرک سے پاک ہے۔ خدا اپنی صفات کا جو تعارف اپنی عظیم کائنات میں کرا رہا ہے اس کے لحاظ سے اس قسم کے تمام عقائد بالکل بے جوڑ ہیں۔ ایسے کسی عقیدہ کا مطلب یہ ہے کہ خدا وہ نہیں ہے جو بظاہر اپنی تخلیقی صفات کے آئینہ میں نظر آرہا ہے یا پھر خدا کی صفتوں میں تضاد ہے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی چیز ممکن نہیں۔

خدا نے انسانیت کا آغاز دین فطرت سے کیا تھا۔ اس وقت تمام انسانوں کا ایک ہی دین تھا۔ اس کے بعد لوگوں نے فرق کرکے دین کے مختلف روپ بنالئے۔ اس کی وجہ اس آزادی کا غلط استعمال ہے جو لوگوں کو امتحان کی غرض سے دی گئی ہے۔ اگر خدا ظاہر ہو جائے تو اس کی طاقتوں کو دیکھ کر لوگوں کی سرکشی ختم ہو جائے اور اچانک اختلاف کی جگہ اتحاد پیدا ہو جائے۔ کیونکہ شدت خوف رایوں کے تعدد کو ختم کر دیتا ہے۔ مگر خدا قیامت سے پہلے اس صورت حال میں مداخلت نہیں کرے گا۔ موجودہ دنیا کو خدا نے امتحان کے لئے بنایا ہے اور امتحان کی فضا باقی رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ حقیقت چھپی رہے اور لوگوں کو موقع ہو کہ وہ اپنی عقل کو صحیح رخ پر بھی استعمال کر سکیں اور غلط رخ پر بھی۔

وَيَقُولُونَ لَوْلَآ أُنزِلَ عَلَيْهِ ءَايَةٌ مِّن رَّبِّهِۦ ۖ فَقُلْ إِنَّمَا ٱلْغَيْبُ لِلَّهِ فَٱنتَظِرُوٓا۟ إِنِّى مَعَكُم مِّنَ ٱلْمُنتَظِرِينَ ﴿٢٠﴾ وَإِذَآ أَذَقْنَا ٱلنَّاسَ رَحْمَةً مِّنۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ إِذَا لَهُم مَّكْرٌ فِىٓ ءَايَاتِنَا ۚ قُلِ ٱللَّهُ أَسْرَعُ مَكْرًا ۚ إِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُونَ مَا تَمْكُرُونَ ﴿٢١﴾

اور وہ کہتے ہیں کہ نبی پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی، کہو کہ غیب کی خبر تو اللہ ہی کو ہے۔ تم لوگ انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔ اور جب کوئی تکلیف پڑنے کے بعد ہم لوگوں کو اپنی رحمت کا مزا چکھاتے ہیں تو وہ فوراً ہماری نشانیوں کے معاملہ میں حیلے بنانے لگتے ہیں۔ کہو کہ خدا اپنے حیلوں میں ان سے بھی زیادہ تیز ہے۔ یقیناً ہمارے فرشتے تمہاری حیلہ بازیوں کو لکھ رہے ہیں۔ ۲۱ — ۲۰

مکہ کے لوگ جب مسلسل انکار کی روش پر قائم رہے تو خدا نے ان پر قحط بھیجا جو سات سال مسلسل رہا اور بالآخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کے بعد ختم ہوا۔ یہ ایک نشانی تھی جس سے انھیں یہ سبق لینا چاہئے تھا کہ رسول کا انکار کرنے کے بعد وہ خدائی پکڑ کی زد میں آجائیں گے۔ مگر ان کا حال یہ ہوا کہ جب تک قحط رہا الحاح وزاری کرتے رہے اور جب قحط رخصت ہوا تو کہنے لگے کہ یہ تو زمانہ کی گردشیں ہیں جو ہر ایک کے ساتھ پیش آتی ہیں۔ اس کا

رسول کو ماننے یا نہ ماننے سے کوئی تعلق نہیں۔

پیغمبر سے لوگ نشانی مانگتے ہیں۔ مگر اصل سوال نشانی کے ظہور کا نہیں بلکہ اس سے سبق لینے کا ہے۔ کیونکہ نشانی صرف دیکھنے کے لئے ہوتی ہے وہ مجبور کرنے کے لئے نہیں ہوتی۔ نشانی ظاہر ہونے کے بعد بھی یہ آدمی کے اپنے اختیار میں ہوتا ہے کہ وہ اس کو مانے یا کوئی جھوٹی توجیہ نکال کر اسے رد کر دے۔

تاہم جب خدا کی آخری نشانی ظاہر ہوتی ہے تو اس کے مقابلہ میں انسان کو کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ یہ آخری نشانی اتمام حجت کے بعد خدا کی عدالت بن کر آتی ہے اور وہ مختلف پیغمبروں کے لئے مختلف صورتوں میں آتی ہے۔ پیغمبر آخرالزماں کے لئے مختلف مصلحتوں کی بنا پر یہ نشانی اس صورت میں ظاہر ہوئی کہ منکرین کو مغلوب کرکے مومنین کو ان کے اوپر غالب کر دیا گیا۔ شاہ عبدالقادر صاحب اس سلسلہ میں موضح القرآن میں لکھتے ہیں "یعنی اگر کہیں کہ ہم کیسے جانیں کہ تمھاری بات سچ ہے۔ فرمایا کہ آگے حق تعالیٰ اس دین کو روشن کرے گا اور مخالف ذلیل اور برباد ہو جائیں گے۔ سو ویسا ہی ہوا۔ سچ کی نشانی ایک بار کافی ہے۔ اور ہر بار مخالف ذلیل ہوں تو فیصلہ ہو جائے۔ حالانکہ فیصلہ کا دن دنیا میں نہیں"۔

آدمی جب سرکشی کرتا ہے اور اس کی وجہ سے اس کا کچھ بگڑتا ہوا نظر نہیں آتا تو وہ اور بھی زیادہ ڈھیٹ ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ خدا کی پکڑ سے باہر ہے۔ حالانکہ یہ عین خدا کی تدبیر ہوتی ہے۔ خدا سرکش آدمی کو ڈھیل دیتا ہے تاکہ وہ بے فکر ہو کر خوب سرکشی کرے۔ اور اس سرکشی کے دوران خدا کے کارندے پردہ میں رہ کر خاموشی کے ساتھ اس کے تمام اقوال و افعال کو لکھتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب اس کا وقت پورا ہو جاتا ہے تو اچانک موت کا فرشتہ ظاہر ہو کر اس کو پکڑ لیتا ہے تاکہ اس کو اس کے اعمال کا حساب دینے کے لئے خدا کے سامنے حاضر کر دے۔

هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُکُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا کُنْتُمْ فِی الْفُلْکِ ۚ وَجَرَیْنَ بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِیْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ کُلِّ مَکَانٍ وَّظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اُحِیْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۚ لَئِنْ اَنْجَیْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَکُوْنَنَّ مِنَ الشّٰکِرِیْنَ ﴿۲۲﴾ فَلَمَّاۤ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ یَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْیُکُمْ عَلٰۤی اَنْفُسِکُمْ ۙ مَّتَاعَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۫ ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُکُمْ فَنُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۳﴾

وہ اللہ ہی ہے جو تم کو خشکی اور تری میں چلاتا ہے۔ چنانچہ جب تم کشتی میں ہوتے ہو اور کشتیاں لوگوں کو لے کر موافق

ہوا سے چل رہی ہوتی ہیں اور لوگ اس سے خوش ہوتے ہیں کہ یکایک تند ہوا آتی ہے اور ان پر ہر جانب سے موجیں اٹھنے لگتی ہیں اور وہ گمان کر لیتے ہیں کہ ہم گھر گئے۔ اس وقت وہ اپنے دین کو اللہ ہی کے لئے خالص کر کے اس کو پکارنے لگتے ہیں کہ اگر تو نے ہمیں اس سے نجات دے دی تو یقیناً ہم شکر گزار بندے بنیں گے۔ پھر جب وہ ان کو نجات دے دیتا ہے تو فوراً ہی زمین میں ناحق کی سرکشی کرنے لگتے ہیں۔ اے لوگو تمہاری سرکشی تمہارے اپنے ہی خلاف ہے، دنیا کی زندگی کا نفع اٹھا لو، پھر تم کو ہماری طرف لوٹ کر آنا ہے، پھر ہم بتا دیں گے جو کچھ تم کر رہے تھے۔

۲۲ — ۲۳

انسان ایک بے حد حساس وجود ہے۔ وہ تکلیف کو برداشت نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ انسان پر جب تکلیف کا کوئی لمحہ آتا ہے تو وہ فوراً سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ اس وقت اس کے ذہن سے تمام مصنوعی پردے ہٹ جاتے ہیں۔ فکر کے لمحات میں آدمی اس حقیقت کا اعتراف کر لیتا ہے جس کا اعتراف کرنے کے لئے وہ بے فکری کے لمحات میں تیار نہ ہوتا تھا۔

اس کی ایک مثال سمندر کا سفر ہے۔ سمندر میں سکون ہو اور کشتی منزل کی طرف رواں ہو تو اس کے مسافروں کے لئے یہ بڑا خوش گوار لمحہ ہوتا ہے۔ اس وقت ان کے اندر ایک جھوٹا اعتماد پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھ لیتے ہیں کہ ان کا معاملہ درست ہے، اب اس کو کوئی بگاڑنے والا نہیں۔

اس کے بعد سمندری ہوائیں اٹھتی ہیں۔ پہاڑ جیسی موجیں مسافروں کو چاروں طرف سے گھیر لیتی ہیں۔ ان کے درمیان بڑے سے بڑا جہاز بھی معمولی تنکے کی طرح ہچکولے کھانے لگتا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب ہلاکت کے سوا دوسرا کوئی انجام نہیں۔ اس وقت خدا کے منکر خدا کا اقرار کر لیتے ہیں۔ دیوتاؤں کو پوجنے والے خدائے واحد کو پکارنا شروع کرتے ہیں۔ اپنی قوت اور اپنی تدبیر پر بھروسہ کرنے والے ہر دوسری چیز کو چھوڑ کر صرف خدا کو یاد کرنے لگتے ہیں۔ یہ ایک تجرباتی ثبوت ہے کہ توحید ایک فطری عقیدہ ہے۔ توحید کے سوا دوسرے تمام عقیدے بالکل بے بنیاد ہیں۔

یہ تجربہ بتاتا ہے کہ خدا کو نہ ماننے کے لئے آدمی خواہ کتنا ہی فلسفہ پیش کرے، حقیقۃً اس قسم کی تمام باتیں بے فکری کی نظریہ سازی ہیں۔ انسان اگر جانے کہ دنیا کے مواقع محض وقتی طور پر اس کو امتحان کے لئے دئے گئے ہیں تو وہ فوراً سنجیدہ ہو جائے۔ اس کے ذہن سے تمام مصنوعی دیواریں گر جائیں اور ایک خدا کو ماننے کے سوا اس کے لئے کوئی چارہ نہ رہے۔

وہ وقت آنے والا ہے جب انسان خدا کے جلال کو دیکھ کر کانپ اٹھے اور تمام خدائی باتوں کا اقرار کرنے پر مجبور ہو جائے۔ مگر عقل مند وہ ہے جو موجودہ زندگی کے تجربات میں آنے والی زندگی کی حقیقتوں کو دیکھ لے اور آج ہی اس بات کو مان لے جس کو وہ کل ماننے پر مجبور ہوگا۔ مگر کل کا ماننا اس کے کچھ کام نہ آئے گا۔

پارہ ۱۱

إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ أَنزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ مِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ وَالْأَنْعَامُ حَتّٰى إِذَآ أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ أَهْلُهَآ أَنَّهُمْ قٰدِرُونَ عَلَيْهَآ أَتٰهَآ أَمْرُنَا لَيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيدًا كَأَن لَّمْ تَغْنَ بِالْأَمْسِ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْأٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴿۲۴﴾

دنیا کی زندگی کی مثال ایسی ہے جیسے پانی کہ ہم نے اس کو آسمان سے برسایا تو زمین کا سبزہ خوب نکلا جس کو آدمی کھاتے ہیں اور جس کو جانور کھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب زمین پوری رونق پر آگئی اور سنور اٹھی اور زمین والوں نے گمان کرلیا کہ اب یہ ہمارے قابو میں ہے تو اچانک اس پر ہمارا حکم رات کو یا دن کو آگیا، پھر ہم نے اس کو کاٹ کر ڈھیر کر دیا گویا کل یہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ اس طرح ہم نشانیاں کھول کر بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور کرتے ہیں۔ ۲۴

دنیا کی زندگی امتحان کے لئے ہے۔ اس لئے انسان کو یہاں مکمل آزادی اور ہر قسم کے کھلے مواقع دئے گئے ہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان آزاد ہے کہ جو چاہے کرے اور جس قسم کا مستقبل چاہے اپنے لئے بنائے۔ مگر انھیں حالات کے درمیان ایسے واقعات بھی رکھ دئے گئے ہیں جو سوچنے والوں کے لئے نصیحت کا کام کرتے ہیں، جو اس حقیقت کی نشان دہی کر رہے ہیں کہ یہ سب کچھ محض وقتی ہے اور بہت جلد اس سے چھن جانے والا ہے۔

انھیں میں سے ایک زمین کی سرسبزی کا واقعہ ہے۔ جب بارش ہوتی ہے تو زمین ہر قسم کی نباتات سے لہلہا اٹھتی ہے۔ آدمی ان کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ معاملہ پوری طرح اس کے قابو میں ہے اور بہت جلد وہ تیار فصل کا مالک بننے والا ہے۔ عین اس وقت اچانک کوئی آفت آجاتی ہے۔ مثلاً بگولا آگیا، اولے پڑ گئے، ٹڈی دل پہنچ گیا اور ایک لمحہ میں ساری فصل کا خاتمہ کر دیا۔

یہی حال انسانی زندگی کا ہے۔ آدمی ایک عمدہ جسم لے کر پیدا ہوتا ہے۔ دنیا کے اسباب اس کا ساتھ دیتے ہیں اور وہ اپنے لئے ایک کامیاب اور شان دار زندگی بنا لیتا ہے۔ اب اس کے اندر ایک اعتماد پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا معاملہ اس کے اپنے اختیار میں ہے۔ اس کے بعد کسی دن یا کسی رات میں اچانک اس کی موت آجاتی ہے۔ اپنے آپ کو با اختیار سمجھنے والا یکایک اپنے کو اس حال میں پاتا ہے کہ مجبوری اور بے اختیاری کے سوا اس کے پاس اور کوئی سرمایہ نہیں ——— آدمی اگر اس حقیقت کو سامنے رکھے تو وہ دنیا میں کبھی سرکش نہ بنے، وہ کبھی کسی کے ساتھ ظلم اور بے انصافی کا طریقہ اختیار نہ کرے۔

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۵﴾ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ؕ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍۭ بِمِثْلِهَا ۙ وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷﴾

اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے اور وہ جس کو چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے۔ جن لوگوں نے بھلائی کی ان کے لئے بھلائی ہے اور اس پر مزید بھی۔ اور ان کے چہروں پر نہ سیاہی چھائے گی اور نہ ذلت۔ یہی جنت والے لوگ ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور جنھوں نے برائیاں کمائیں تو برائی کا بدلہ اس کے برابر ہے۔ اور ان پر رسوائی چھائی ہوئی ہوگی۔ کوئی ان کو اللہ سے بچانے والا نہ ہوگا۔ گویا کہ ان کے چہرے اندھیری رات کے ٹکڑوں سے ڈھانک دئے گئے ہیں۔ یہی لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۲۵ — ۲۷

دنیا کے ظاہری حالات سے آدمی دھوکا کھا جاتا ہے۔ وہ وقتی چیز کو مستقل چیز سمجھ لیتا ہے۔ اس کا خیال یہ ہو جاتا ہے کہ خوشیوں اور راحتوں کی زندگی جو وہ چاہتا ہے وہ اس کو اسی موجودہ دنیا میں حاصل ہو سکتی ہے۔ مگر انسانی آرزوؤں کی دنیا دراصل آخرت میں بننے والی ہے اور اس کو وہی شخص پائے گا جو خدا کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

دنیا میں آدمی بالفرض سب کچھ حاصل کر لے تب بھی وہ اس پر قادر نہیں کہ اپنی زندگی کو دکھ اور غم سے پاک کر سکے۔ یہاں ہر خوشی کے ساتھ کوئی اندیشہ لگا ہوا ہے۔ یہاں کی ہر کامیابی بہت جلد کسی دکھ کی نذر ہو جاتی ہے۔ دکھ اور رنج سے خالی زندگی ایک ایسی انوکھی زندگی ہے جو صرف جنت کے ماحول میں آدمی کو حاصل ہوگی۔ جو لوگ اس راز کو پالیں وہی وہ لوگ ہیں جو جنت کا راستہ اختیار کریں گے اور بالآخر خدا کی ابدی جنتوں میں پہنچیں گے۔

راحت اور خوشی کی زندگی جو انسان کو بے حد مرغوب ہے وہ خدا کے وفادار بندوں کو کامل طور پر جنت میں ملے گی۔ مگر راحت اور خوشی کا ایک اور درجہ ہے جو معروف راحتوں اور خوشیوں سے بہت بلند ہے۔ یہ مالک کائنات کا دیدار ہے جو اہل جنت کو خصوصی طور پر حاصل ہوگا۔ جو خدا راحتوں اور لذتوں کا خالق ہے وہ یقینی طور پر تمام راحتوں اور لذتوں کا سب سے بڑا خزانہ ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ جب جنت والے جنت میں اور دوزخ والے دوزخ میں داخل ہو چکے ہوں گے تو ایک پکارنے والا پکارے گا۔ اے جنت والو، تمہارے لئے خدا کا ایک وعدہ باقی ہے جس کو اب وہ پورا کرنا چاہتا ہے۔ جنت والے یہ سن کر کہیں گے کہ وہ کیا ہے۔ کیا ہمارے پلڑے بھاری

نہیں کر دیے گئے۔ کیا ہمارے چہروں کو روشن نہیں کر دیا گیا۔ کیا خدا نے ہمیں جنت میں نہیں داخل کر دیا اور ہم کو آگ سے نہیں بچا لیا۔ اس کے بعد ان کے اوپر سے حجاب اٹھا لیا جائے گا اور وہ اپنے رب کو دیکھنے لگیں گے۔ پس خدا کی قسم کوئی نعمت جو خدا نے انھیں دی ہے وہ ان کے لئے خدا کو دیکھنے سے زیادہ محبوب نہ ہوگی اور نہ اس سے زیادہ ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک دینے والی ہوگی (تفسیر ابن کثیر)

آدمی کے لئے اس سے زیادہ سخت حالت اور کوئی نہیں کہ وہ ایک ایسی بے بسی سے دوچار ہو جو ابدی ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایک ایسی ناکامی میں پڑا ہوا پائے جو دوبارہ کامیابی میں تبدیل نہیں ہوسکتی۔ جو لوگ آخرت میں جہنم کے باشندے قرار دئے جائیں گے وہ اسی حالت سے دوچار ہوں گے۔ ان کے چہرے شدید مایوسی کی وجہ سے ایسے کالے ہو جائیں گے گویا کہ وہ تہ بتہ اندھیروں میں ڈوب گئے ہیں۔ آدمی کو اگرچہ اس کی برائی کا بدلہ اتنا ہی دیا جائے گا جتنا اس نے برائی کی ہے۔ مگر ابدی محرومی کا احساس اس کے لئے اتنا سخت ہوگا کہ اس کا چہرہ تک اس کی وجہ سے سیاہ پڑ جائے گا۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا مَكَانَكُمْ أَنْتُمْ وَشُرَكَاؤُكُمْ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَاؤُهُمْ مَا كُنْتُمْ إِيَّانَا تَعْبُدُونَ ۝ فَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ إِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغَافِلِينَ ۝ هُنَالِكَ تَبْلُو كُلُّ نَفْسٍ مَا أَسْلَفَتْ وَرُدُّوا إِلَى اللَّهِ مَوْلَاهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ۝

اور جس دن ہم ان سب کو جمع کریں گے، پھر ہم شرک کرنے والوں سے کہیں گے کہ ٹھہرو تم بھی اور تمھارے بنائے ہوئے شریک بھی۔ پھر ہم ان کے درمیان تفریق کر دیں گے اور ان کے شریک کہیں گے کہ تم ہماری عبادت تو نہیں کرتے تھے۔ اللہ ہمارے درمیان گواہی کے لئے کافی ہے۔ ہم تمھاری عبادت سے بالکل بے خبر تھے۔ اس وقت ہر شخص اپنے اس عمل سے دوچار ہوگا جو اس نے کیا تھا اور لوگ اللہ اپنے مالک حقیقی کی طرف لوٹائے جائیں گے اور جو جھوٹ انھوں نے گھڑے تھے وہ سب ان سے جاتے رہیں گے۔ ۳۰ — ۲۸

شرک کا پورا کاروبار جھوٹی امیدوں پر قائم ہوتا ہے، وہ واقعات جو خدا کے کئے سے ہو رہے ہیں ان کو آدمی جھوٹے معبودوں کی طرف منسوب کر دیتا ہے اور اس طرح خود ساختہ تصور کے تحت ان کو اپنی عقیدت و پرستش کا مرکز بنا لیتا ہے، اپنے ان معبودوں پر اس کا اعتماد اتنا بڑھتا ہے کہ وہ سمجھ لیتا ہے کہ آخرت میں بھی وہ ضرور خدا کے مقابلہ میں اس کے مددگار بن جائیں گے۔ اور اس کو خدا کی پکڑ سے بچا لیں گے۔

یہ سراسر جھوٹی امیدیں ہیں۔ مگر دنیا کی زندگی میں ان کا جھوٹ ہونا ظاہر نہیں ہوتا کیونکہ یہاں امتحان کی

وجہ سے ہر چیز پر غیب کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ یہاں آدمی کو موقع ہے کہ وہ واقعات کو اپنے فرضی معبودوں کی طرف منسوب کرے اور اس طرح ان کی معبودیت پر مطمئن ہوجائے۔ مگر آخرت میں ساری حقیقتیں کھل جائیں گی۔ وہاں معلوم ہوگا کہ اس کائنات میں ایک خدا کے سوا کسی کو کوئی زور حاصل نہ تھا۔

موجودہ دنیا میں آدمی اس خوش فہمی میں جی رہا ہے کہ وہ اپنے بڑوں یا اپنے معبودوں کی مدد سے آخرت کے مرحلے میں کامیاب ہوجائے گا۔ مگر آخرت میں اچانک اس پر کھلے گا کہ اس کا اعتماد سراسر جھوٹا تھا۔ یہاں کسی کو صرف وہی ملے گا جو اس نے خود کیا تھا۔ فرضی سہارے وہاں اس طرح غائب ہوجائیں گے جیسے کہ ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۞ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۞ كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۞

کہو کہ کون تم کو آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے۔ یا کون ہے جو کان پر اور آنکھوں پر اختیار رکھتا ہے۔ اور کون بے جان میں سے جاندار کو اور جاندار میں سے بے جان کو نکالتا ہے۔ اور کون معاملات کا انتظام کر رہا ہے۔ وہ کہیں گے کہ اللہ۔ کہو کہ پھر کیا تم ڈرتے نہیں۔ پس وہی اللہ تمھارا پروردگار حقیقی ہے۔ توفیق کے بعد بھٹکنے کے سوا اور کیا ہے، تم کدھر پھیرے جاتے ہو۔ اسی طرح تیرے رب کی بات سرکشی کرنے والوں کے حق میں پوری ہوچکی ہے کہ وہ ایمان نہ لائیں گے۔ ۳۱ — ۳۳

انسان کو رزق کی ضرورت ہے۔ یہ رزق انسان کو کیسے ملتا ہے۔ کائنات کے مجموعی عمل سے۔ ساری کائنات حد درجہ ہم آہنگی کے ساتھ ایک خاص رخ پر عمل کرتی ہے۔ تب یہ ممکن ہوتا ہے کہ انسان کے لئے وہ رزق فراہم ہو جس کے بغیر اس کا وجود اس سرزمین پر ممکن نہیں۔ خدائی کے مفروضہ شرکاء یا دیوی دیوتا خود مشرکین کے عقیدہ کے مطابق، انسان کے لئے رزق فراہم نہیں کرسکتے۔ کیوں کہ ہر مفروضہ شریک کسی جزء کا معبود ہے، اور جزء کا معبود کبھی ایسے واقعہ کو ظہور میں نہیں لاسکتا جو کل اجزاء کی موافقت سے ظہور میں آتا ہو۔

اسی طرح مثلاً انسان کے اندر کان اور آنکھ جیسی حیرت انگیز صلاحیتیں ہیں۔ وہ بھی کسی دیوتا کی دی ہوئی

نہیں ہوسکتیں۔ دیوی دیوتا یا تو خود ان صلاحیتوں سے محروم ہیں یا اگر کسی مفروضہ معبود کے اندر یہ صلاحیتیں ہوں تو وہ ان کا خالق نہیں۔ حتی کہ خود اس سے یہ صلاحیتیں ویسے ہی چھن جاتی ہیں جیسے عام انسانوں سے چھن جاتی ہیں۔ اسی طرح بے جان چیزوں میں جان ڈالنا اور جان دار کو بے جان کر دینا بھی مفروضہ معبودوں کے لئے ممکن نہیں۔ نہ اس کا کوئی ثبوت ہے اور نہ کوئی پوجنے والا ان کے بارے میں اس قسم کا عقیدہ رکھتا ہے۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ یہ چیزیں ان معبودوں سے انسان کو ملیں۔

کیسی عجیب بات ہے کہ انسان ایک بڑے خدا کو مانتا ہے۔ اس کے باوجود وہ خدا کی طرف ایسی باتیں منسوب کرتا ہے جو اس کی تمام اعلیٰ صفات کی نفی کر دیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو خدا کا ڈر نہیں۔ جھوٹے خیالات کے ذریعہ اس نے اپنے آپ کو یہ تسلی دے لی ہے کہ خدا اس سے بازپرس کرنے والا نہیں۔ اور اگر بازپرس کی نوبت آئی تو اس کی مدد پر ایسی ہستیاں ہیں جو خدا کے یہاں سفارش کرکے اس کو بچا لیں ——— ڈر آدمی کو سنجیدہ بناتا ہے۔ جب کسی کے دل سے ڈر نکل جائے تو اس کو غیر منصفانہ رویہ اختیار کرنے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ ایسا آدمی سرکش ہو جاتا ہے۔ اور سرکش آدمی کبھی سچائی کا اعتراف نہیں کرتا۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۞ قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ؕ اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ ۟ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۞ وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ؕ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ۞

کہو، کیا تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ہے جو پہلی بار پیدا کرتا ہو پھر وہ دوبارہ بھی پیدا کرے۔ کہو، اللہ ہی پہلی بار بھی پیدا کرتا ہے پھر وہی دوبارہ بھی پیدا کرے گا۔ پھر تم کہاں بھٹکے جاتے ہو۔ کہو، کیا تمہارے شرکا میں کوئی ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہو، کہہ دو کہ اللہ ہی حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ پھر جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے وہ پیروی کئے جانے کا مستحق ہے یا وہ جس کو خود ہی راستہ نہ ملتا ہو بلکہ اسے راستہ بتایا جائے۔ تم کو کیا ہو گیا ہے، تم کیسا فیصلہ کرتے ہو۔ ان میں سے اکثر صرف گمان کی پیروی کر رہے ہیں۔ اور گمان حق بات میں کچھ بھی کام نہیں دیتا۔ اللہ کو خوب معلوم ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔ ۳۴-۳۶

اللہ کے سوا جن کو خدائی کا مقام دیا جاتا ہے، خواہ وہ انسان ہوں یا غیر انسان، کوئی بھی یہ طاقت نہیں رکھتا کہ وہ کسی غیر موجود کو موجود کر دے۔ یہ صرف اللہ ہے جس کے لئے تخلیق کا عمل ثابت ہے۔ اور جب

تخلیق کا عمل ایک بار اللہ کے لئے ثابت ہے تو اسی سے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ اس کا اعادہ کر سکتا ہے اور کرے گا۔ پھر جب وجود اول اور وجود ثانی دونوں کا اختیار صرف ایک اللہ کو ہے تو دوسرے شریکوں کی طرف توجہ لگانا بالکل عبث ہے۔ ان سے آدمی نہ اپنی پہلی زندگی میں کچھ پانے والا ہے اور نہ دوسری زندگی میں۔

یہی معاملہ رہنمائی کا ہے۔ "اللہ رہنمائی کرتا ہے" یہ چیز پیغمبروں کی ہدایت سے ثابت ہے۔ پیغمبروں نے جس ہدایت کو خدائی ہدایت کہہ کر انسان کے سامنے پیش کیا وہ مسلّم طور پر ایک ہدایت ہے۔ اس کے برعکس شریکوں کا حال یہ ہے کہ وہ یا تو سرے سے اس قابل نہیں کہ وہ انسان کو حق اور ناحق کے بارے میں کوئی علم دیں (مثلاً بت) یا وہ اپنی کمیوں اور محدودیتوں کی وجہ سے خود رہنمائی کے محتاج ہیں، کجا کہ وہ دوسروں کو کوئی واقعی رہنمائی فراہم کریں (مثلاً انسانی معبود) جب صورت حال یہ ہے تو انسان کو صرف ایک خدا کی طرف رجوع کرنا چاہئے نہ کہ فرضی شریکوں کی طرف۔

شرک کا کاروبار کسی واقعی علم پر قائم نہیں ہے بلکہ وہ مفروضات اور قیاسات پر قائم ہے۔ کچھ ہستیوں کے بارے میں بے بنیاد طور پر یہ رائے قائم کر لی گئی ہے کہ وہ خدائی صفات کے حامل ہیں۔ حالاں کہ اتنی بڑی رائے کسی حقیقی علم کی بنیاد پر قائم کی جا سکتی ہے نہ کہ محض اٹکل اور قیاس کی بنیاد پر۔

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۷﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾ بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ۭ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۹﴾

اور یہ قرآن ایسا نہیں کہ اللہ کے سوا کوئی اس کو بنا لے۔ بلکہ یہ تصدیق ہے ان پیشین گوئیوں کی جو اس کے پہلے سے موجود ہیں۔ اور کتاب کی تفصیل ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ خداوند عالم کی طرف سے ہے۔ کیا لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اس کو گھڑ لیا ہے۔ کہو کہ تم اس کی مانند کوئی سورۃ لے آؤ۔ اور اللہ کے سوا تم جس کو بلا سکو بلا لو، اگر تم سچے ہو۔ بلکہ یہ لوگ اس چیز کو جھٹلا رہے ہیں جو ان کے علم کے احاطے میں نہیں آئی۔ اور جس کی حقیقت ابھی ان پر نہیں کھلی۔ اسی طرح ان لوگوں نے بھی جھٹلایا جو ان سے پہلے گزرے ہیں، پس دیکھو کہ ظالموں کا انجام کیا ہوا۔ ۳۹ - ۳۷

یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ قرآن ایک غیر انسانی کلام ہے۔ اگر وہ کسی انسان کا کلام ہوتا تو یقیناً دوسرے انسانوں کے لئے بھی یہ ممکن ہونا چاہئے تھا کہ وہ اپنی کوشش سے ویسا ہی ایک کلام بنالیں۔

قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا دوسرا ثبوت یہ ہے کہ وہ ان پیشین گوئیوں کی تصدیق ہے جو اس کے بارے میں پہلے سے آسمانی صحیفوں میں موجود ہیں۔ آسمانی تعلیمات کی حامل قومیں پہلے سے ایک آخری ہدایت نامہ کی منتظر تھیں۔ قرآن اسی انتظار کا جواب بن کر آیا ہے، پھر اس میں شک کرنے کی کیا ضرورت۔ مزید یہ کہ وہ "کتاب" کی تفصیل ہے۔ یعنی وہ الٰہی تعلیمات جو تمام آسمانی کتابوں کا خلاصہ ہیں انھیں کو وہ صحیح اور بے آمیز روپ میں پیش کرتا ہے۔ یہ ایک واضح قرینہ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن اسی خدا کی طرف سے آیا ہے جس کی طرف سے پچھلی آسمانی کتابیں آئی تھیں۔

جب کوئی شخص کہتا ہے کہ قرآن ایک انسانی تصنیف ہے تو وہ اپنے دعوے کو ایک ایسے میدان میں لاتا ہے جہاں اس کو جانچنا آسان ہو۔ کیونکہ وہ اپنی یا دوسروں کی انسانی صلاحیتوں کو کام میں لاکر قرآن جیسی ایک کتاب یا اس کے جیسی ایک سورۃ تیار کرسکتا ہے۔ اور اس طرح عملی طور پر اس دعوے کو رد کرسکتا ہے کہ قرآن خدائی ذہن سے نکلی ہوئی کتاب ہے۔ مگر قرآنی چیلنج کے باوجود کسی کا ایسا نہ کرسکنا آخری طور پر ثابت کر رہا ہے کہ قرآن کو انسانی کتاب کہنے والوں کا دعویٰ درست نہیں۔

قرآن کی صداقت کے یہ دلائل ایسے نہیں ہیں کہ آدمی ان کو سمجھ نہ سکے۔ اصل یہ ہے کہ قرآن کو جھٹلانے کے نتائج سے وہ بے خوف ہیں۔ ان کو یہ ڈر نہیں کہ قرآن کا انکار کرکے وہ کسی عذاب کی پکڑ میں آجائیں گے۔ ان کی مخالفانہ روش کی وجہ وہ غیر سنجیدگی ہے جو ان کی بے خوفی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے نہ کہ کسی قسم کا عقلی اور استدلالی اطمینان۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ ۚ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ۝ وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ۭ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ۭ اَفَاَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَـيْـــًٔـا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَھُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝

اور ان میں سے وہ بھی ہیں جو قرآن پر ایمان لے آئیں گے اور وہ بھی ہیں جو اس پر ایمان نہیں لائیں گے۔ اور تیرا رب مفسدوں کو خوب جانتا ہے۔ اور اگر وہ تم کو جھٹلاتے ہیں تو کہہ دو کہ میرا عمل میرے لئے ہے اور تمہارا عمل تمہارے لئے۔ تم اس سے بری ہو جو میں کرتا ہوں اور میں اس سے بری ہوں جو تم کر رہے ہو۔

اور ان میں بعض ایسے بھی ہیں جو تمھاری طرف کان لگاتے ہیں تو کیا تم بہروں کو سناؤ گے جب کہ وہ سمجھ سے کام نہ لے رہے ہوں۔ اور ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو تمھاری طرف دیکھتے ہیں تو کیا تم اندھوں کو راستہ دکھاؤ گے اگرچہ وہ دیکھ نہ رہے ہوں۔ اللہ لوگوں پر کچھ بھی ظلم نہیں کرتا مگر لوگ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں ۴۲-۴۴

ایمان نہ لانے والے خدا کی نظر میں مفسد ہیں۔ کیونکہ اپنی فطرت کو بگاڑ کر ہی کسی کے لئے یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ حق کو قبول کرنے سے باز رہے۔ ایسا آدمی اپنے ضمیر کی آواز کو دباتا ہے، وہ اپنے سوچنے کی صلاحیت کو استعمال نہیں کرتا، وہ کھلے کھلے دلائل کو جھوٹے الفاظ بول کر نظرانداز کر دیتا ہے، وہ سن کر نہیں سنتا اور سمجھنے کے باوجود سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا، وہ حق کے مقابلہ میں اپنے تعصبات اور اپنے مفادات کو ترجیح دیتا ہے۔

بحث ومناظرہ کرنے والے لوگ آخر وقت تک اپنی بحث جاری رکھتے ہیں۔ "میرا معاملہ میرے ساتھ ہے اور تمھارا معاملہ تمھارے ساتھ"، اس قسم کا جملہ کہنا ان کو اپنی شکست نظر آتا ہے، مگر داعی فتح وشکست کی نفسیات سے بلند ہو کر کام کرتا ہے، اس لئے جب وہ دیکھتا ہے کہ مخاطب ضد اور ہٹ دھرمی پر اتر آیا ہے اور مزید بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تو وہ یہ کہہ کر الگ ہو جاتا ہے کہ اصل فیصلہ اللہ کے یہاں ہونا ہے۔ خدا کی میزان میں جو شخص جیسا نکلے گا ویسا ہی اس کا انجام ہوگا۔

حق کو نہ ماننے والوں میں ایک طبقہ وہ ہے جو شروع سے اپنا منکر ہونا ظاہر کر دیتا ہے۔ مگر زیادہ ہوشیار قسم کے لوگ یہ کرتے ہیں کہ بظاہر وہ باتوں کو اس طرح سنتے ہیں گویا کہ وہ سچ مچ سمجھنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ان کے دل میں یہ ہوتا ہے کہ اس کو سمجھنا نہیں ہے۔ وہ داعی کی صداقت کی نشانیوں کو اس طرح دیکھتے ہیں جیسے وہ کھلے دل سے اس کا مشاہدہ کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ان کا ذہن پہلے سے یہ طے کئے ہوئے ہوتا ہے کہ اس کو دیکھنا اور ماننا نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کی ظاہری سادگی سے داعی اس خوش گمانی میں پڑ جاتا ہے کہ وہ قبولیت حق کے قریب ہیں۔ مگر خدا کی نظر میں وہ ایسے لوگ ہیں جو کان رکھتے ہوئے بہرے اور آنکھ رکھتے ہوئے اندھے بن جائیں۔ ایسے لوگوں کو کبھی خدا کی طرف سے قبول حق کی توفیق نہیں ملتی۔

خدا نے انسان کو بہترین صلاحیتیں دی ہیں۔ اگر وہ ان صلاحیتوں کو استعمال کرے تو وہ کبھی گمراہ نہ ہو۔ مگر انسان اپنے کو آزاد پا کر غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے۔ وہ بے جا سرکشی کرنے لگتا ہے۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ اس نے خدا کی اسکیم کو نہیں سمجھا، جو چیز اس کو آزمائش کے طور پر دی گئی تھی اس کو اس نے اپنا حق سمجھ لیا۔

پارہ ۱۱

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَأَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ ۭ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَاۗءِ اللّٰهِ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝ وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُھُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُھُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰي مَا يَفْعَلُوْنَ ۝ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَاۗءَ رَسُوْلُھُمْ قُضِيَ بَيْنَھُمْ بِالْقِسْطِ وَھُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝

اور جس دن اللہ ان کو جمع کرے گا، گویا کہ وہ بس دن کی ایک گھڑی دنیا میں تھے۔ وہ ایک دوسرے کو پہچانیں گے۔ بے شک سخت گھاٹے میں رہے وہ لوگ جنھوں نے اللہ سے ملنے کو جھٹلایا اور وہ راہ راست پر نہ آئے۔ ہم تم کو اس کا کوئی حصہ دکھا دیں جس کا ہم ان سے وعدہ کر رہے ہیں یا تمھیں وفات دے دیں، بہر حال ان کو ہماری ہی طرف لوٹنا ہے، پھر اللہ گواہ ہے اس پر جو کچھ وہ کر رہے ہیں۔ اور ہر امت کے لئے ایک رسول ہے۔ پھر جب ان کا رسول آجاتا ہے تو ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور ان پر کوئی ظلم نہیں ہوتا۔ ۴۷ - ۴۵

آج آخرت انسان کے سامنے نہیں ہے۔ آج ایک دیکھنے والے کو اسے تصور کی نگاہ سے دیکھنا پڑتا ہے۔ اس لئے جو شخص آخرت کے معاملہ میں سنجیدہ نہ ہو اس کو آخرت بہت دور کی چیز معلوم ہوگی۔ مگر جب آخرت سب سے بڑی حقیقت کی حیثیت سے انسان کے اوپر ٹوٹ پڑے گی اور وہ اس کو اس کی تمام سنگینیوں کے ساتھ اپنی آنکھ سے دیکھنے لگے گا، اس وقت وہ اپنی موجودہ سرکشی کو بھول جائے گا، اس وقت اس کو دنیا کے وہ لمحات بہت حقیر معلوم ہوں گے جن کی وجہ سے وہ غفلت میں پڑ گیا تھا اور آخرت کے بارے میں سوچنے پر تیار نہ ہوتا تھا۔

آخرت کسی اجنبی دنیا میں واقع نہیں ہوگی بلکہ ہماری جانی پہچانی دنیا میں واقع ہوگی۔ وہاں آدمی اپنے آپ کو اسی ماحول میں پائے گا جس ماحول میں اس نے اس سے پہلے حق کا انکار کیا تھا، وہ اپنے آپ کو انھیں لوگوں کے درمیان دیکھے گا جن کے بل پر وہ سرکشی کرتا تھا مگر اس دن وہ لوگ اس کے کچھ کام نہ آئیں گے۔ اس وقت ہر بات اس کے ذہن میں اس طرح تازہ ہوگی گویا اس پر کوئی مدت گزری ہی نہیں۔

داعی اور مدعو کا معاملہ آسمان کے نیچے پیش آنے والے تمام معاملات میں سب سے زیادہ نازک معاملہ ہے۔ داعی اگر فی الواقع حق کو لے کر اٹھا ہے تو وہ اس دنیا میں خدا کا نمائندہ ہے۔ اس کا اقرار خدا کا اقرار ہے اور اس کا انکار خدا کا انکار۔ ایسا ایک واقعہ انجام سے خالی نہیں ہو سکتا۔ داعی حق کے ظہور کے بعد لازماً ایسا ہوتا ہے کہ اس کی زبان سے جاری ہونے والے ربانی کلام کے سامنے تمام لوگ بے دلیل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہ باطل

کے اوپر حق کی پہلی فتح ہے۔ دوسری فتح آخرت میں ہوگی جب کہ اس کے مخالفین خدا کے اذن سے اس کے مقابلہ میں بے زور ہو کر رہ جائیں گے۔ پہلا واقعہ لازمی طور پر اسی دنیا میں پیش آتا ہے اور دوسرا واقعہ بھی جزئی طور پر موجودہ دنیا میں ظاہر ہوتا ہے اگر خدا اس کو موجودہ دنیا میں ظاہر کرنا چاہے۔

یہ معاملہ ہر گروہ کے ساتھ پیش آنا لازمی ہے جب کہ وہ براہ راست خدا کے سامنے کھڑا ہونے سے پہلے موجودہ دنیا میں بالواسطہ طور پر نمائندۂ خدا کے سامنے کھڑا کیا جائے۔ اس طرح خدا دیکھتا ہے کہ کون ہے جو اس وقت اپنے آپ کو خدا کے حوالے کر دیتا ہے جب کہ خدا ابھی غیب میں ہے اور کون ہے جو ایسا نہیں کرتا۔ پہلی قسم کے لوگوں کے لئے جنت ہے اور دوسری قسم کے لوگوں کے لئے دوزخ۔

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٤٨﴾ قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَلَا نَفْعًا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۗ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۚ إِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۖ وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ﴿٤٩﴾ قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَتَاكُمْ عَذَابُهُ بَيَاتًا أَوْ نَهَارًا مَاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُونَ ﴿٥٠﴾ أَثُمَّ إِذَا مَا وَقَعَ آمَنْتُمْ بِهِ ۚ آلْآنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهِ تَسْتَعْجِلُونَ ﴿٥١﴾ ثُمَّ قِيلَ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُونَ ﴿٥٢﴾

اور وہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب پورا ہوگا اگر تم سچے ہو۔ کہو میں اپنے واسطے بھی برے اور بھلے کا مالک نہیں، مگر جو اللہ چاہے۔ ہر امت کے لئے ایک وقت ہے۔ جب ان کا وقت آجاتا ہے تو پھر نہ وہ ایک گھڑی پیچھے ہوتے اور نہ آگے۔ کہو کہ بتاؤ، اگر اللہ کا عذاب تم پر رات کو آپڑے یا دن کو آجائے تو مجرم لوگ اس سے پہلے کیا کر لیں گے۔ پھر کیا جب عذاب واقع ہو چکے گا تب اس پر یقین کرو گے۔ اب قائل ہوئے اور تم اسی کا تقاضا کرتے تھے، پھر ظالموں سے کہا جائے گا کہ اب ہمیشہ کا عذاب چکھو۔ یہ اسی کا بدلہ مل رہا ہے جو کچھ تم کماتے تھے۔

۴۸ - ۵۲

انسان موجودہ دنیا میں اپنے کو آزاد پاتا ہے۔ وہ بظاہر دیکھتا ہے کہ وہ جو چاہے کرے، کوئی اس کو پکڑنے والا نہیں، کوئی اس کو سزا دینے والا نہیں۔ یہ صورت حال اس کو بھلاوے میں ڈال دیتی ہے۔ حتی کہ خدا کا داعی جب اس کو اس کے عمل کے انجام سے ڈراتا ہے تو وہ خدا کے داعی کا مذاق اڑانے لگتا ہے۔ وہ کہتا ہے ——— ہماری سرکشی پر تم جس عذاب کی دھمکی دے رہے ہو وہ کب پوری ہوگی۔

اس قسم کی باتوں کا سبب نادانی کے سوا اور کچھ نہیں۔ کیونکہ یہ پکڑ خود داعیٔ حق کی طرف سے نہیں آنے والی ہے بلکہ خدا کی طرف سے آنے والی ہے۔ اور خدا ہر آن اپنی دنیا میں بتا رہا ہے کہ اس کا طریقہ جلدی کا طریقہ نہیں۔

کشتی میں سوراخ ہو اور کوئی ملاح اس کی پروانہ کرتے ہوئے اپنی کشتی کو دریا میں ڈال دے تو خدا کا لازمی قانون ہے کہ ایسی کشتی پانی میں ڈوب جائے۔ مگر ایسی کشتی فوراً پانی میں نہیں ڈوبتی بلکہ خدا کی سنت کے مطابق اپنے مقرر وقت پر ڈوبتی ہے۔ اس قسم کی مثالیں دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں جو انسان کو خدائی سنت کا تعارف کرا رہی ہیں مگر ان کو دیکھنے کے باوجود وہ کہتا ہے کہ اگر ان اعمال پر خدا کا عذاب ہے تو وہ عذاب جلد کیوں نہیں آجاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان خدا کی پکڑ کے بارے میں سنجیدہ نہیں۔

زلزلہ اور طوفان خدائی واقعات ہیں۔ یہ واقعات بتاتے ہیں کہ جب معاملہ خدا اور انسان کے درمیان ہو تو فیصلہ کا اختیار تمام تر صرف فریق اول کو ہوتا ہے۔ مگر انسان اس پہلو پر غور نہیں کرتا۔ وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ خدا کا قانون فوراً حرکت میں نہیں آرہا ہے اور چونکہ وہ فوراً حرکت میں نہیں آتا اس لیے وہ غفلت میں پڑا رہتا ہے۔ مگر جب خدا کا فیصلہ آئے گا تو اس وقت انسان اپنے کو بے بس پاکر سب کچھ مان لے گا۔ حالانکہ اس وقت کا ماننا کچھ کام نہ آئے گا۔ کیونکہ وہ عمل کا انجام پانے کا وقت ہوگا نہ کہ عمل کرنے کا۔

وَيَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ؔ قُلْ اِيْ وَرَبِّيْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ڃ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۵۳﴾ وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ۭ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۵۴﴾ اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾ هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۶﴾

اور وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ بات سچ ہے۔ کہو کہ ہاں میرے رب کی قسم یہ سچ ہے اور تم اس کو تھکا نہ سکو گے۔ اور اگر ہر ظالم کے پاس وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے تو وہ اس کو فدیہ میں دے دینا چاہے گا اور جب وہ عذاب کو دیکھیں گے تو اپنے دل میں پچھتائیں گے۔ اور ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ کر دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔ یاد رکھو جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اللہ کا ہے، یاد رکھو اللہ کا وعدہ سچا ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔ وہی زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ ۵۳ ـ ۵۶

عرب کے لوگوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ اگر تم نے اپنی اصلاح نہ کی تو تم کو آخرت کا

عذاب پکڑلے گا۔ اس کے جواب میں وہ آپ کی بات کا مذاق اڑانے لگے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ لوگ آخرت کے منکر تھے۔ وہ دراصل پیغمبر اسلام کی تنبیہ کو بے وزن سمجھ رہے تھے نہ کہ نفس آخرت کو۔ پیغمبر اسلام کی عظمت اس وقت تک مسلّم نہ ہوئی تھی۔ اس وقت آپ کے مخاطبین آپ کو ایک معمولی انسان کے روپ میں دیکھتے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ایسے معمولی انسان کی بات نہ ماننے سے ان کے اوپر خدا کا عذاب کیسے آجائے گا۔ انھیں آپ کے نمائندۂ خدا ہونے پر شک تھا نہ کہ خود خدا اور آخرت پر۔

یہ تقابل حقیقۃً اقرار آخرت اور انکار آخرت کے درمیان نہ تھا، بلکہ بڑی شخصیت کے دین اور چھوٹی شخصیت کے دین کے درمیان تھا۔ وہ ماضی کے مشہور بزرگوں کے ساتھ اپنے کو منسوب کرتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو مسلّمہ شخصیتوں کے دین پر سمجھتے تھے۔ اس کے مقابلہ میں جب وہ سامنے کے پیغمبر کو دیکھتے تو وہ ان کو ایک معمولی انسان کے روپ میں نظر آتا۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ تاریخ کی جن بڑی بڑی شخصیتوں کے ساتھ وہ اپنے کو وابستہ کئے ہوئے ہیں، ان سے وابستگی ان کے لئے باعث نجات نہ ہو۔ بلکہ نجات کے لئے یہ ضروری ہو کہ وہ اپنے آپ کو اس شخص کے ساتھ وابستہ کریں جس کو بظاہر کوئی تقدس اور عظمت حاصل نہیں۔ یہی وہ نفسیات تھی جس کی وجہ سے ان کو یہ جرأت ہوئی کہ وہ آپ کا مذاق اڑائیں۔

آدمی ایک حساس مخلوق ہے۔ وہ تکلیف کو برداشت نہیں کرسکتا۔ دنیا میں جب تک اس کو عذاب کا سامنا نہیں ہے وہ حق کا مذاق اڑاتا ہے۔ وہ اس کو بے نیازی کے ساتھ ٹھکرا دیتا ہے۔ مگر جب آخرت کا عذاب سامنے ہوگا تو اس پر اتنی گھبراہٹ طاری ہوگی کہ سب کچھ اس کو حقیر معلوم ہونے لگے گا۔ ساری دنیا کی دولت اور تمام دنیا کی نعمت بھی اگر اس کے پاس ہو تو عذاب کے مقابلہ میں وہ اتنی بے قیمت نظر آئے گی کہ وہ چاہے گا کہ سب کچھ دے کر صرف اتنا ہو جائے کہ وہ اس تکلیف سے نجات پا جائے۔

مگر آخرت کا مسئلہ کوئی سودے بازی کا مسئلہ نہیں۔ وہ تو اپنے کئے کا انجام بھگتنے کا مسئلہ ہے۔ زندگی اور موت کے بارے میں خدا کا جو منصوبہ ہے اس کا یہ لازمی جزء ہے۔ خدائی انصاف کا تقاضا ہے کہ وہ ہو۔ اور خدائی قدرت اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ بہر حال ہو کر رہے گا۔

اس کے پیش آنے میں جو کچھ دیر ہے وہ صرف اس مقررہ وقت کے آنے کی ہے جب کہ موجودہ امتحان کی مدت ختم ہو اور سارے انسان خدا کے یہاں اپنے آخری انجام کا فیصلہ سننے کے لئے حاضر کر دئے جائیں۔

يَاأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿۵۷﴾ قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذَٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوا هُوَ خَيْرٌ مِمَّا يَجْمَعُونَ ﴿۵۸﴾ قُلْ أَرَأَيْتُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ لَكُمْ مِنْ رِزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِنْهُ حَرَامًا وَحَلَالًا قُلْ آللَّهُ أَذِنَ لَكُمْ أَمْ عَلَى اللَّهِ تَفْتَرُونَ ﴿۵۹﴾ وَمَا ظَنُّ الَّذِينَ

يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿٦٠﴾ ع ۲ / ۱۱

اے لوگو، تمھارے پاس تمھارے رب کی جانب سے نصیحت آگئی اور اس کے لئے شفا جو سینوں میں ہوتی ہے اور اہل ایمان کے لئے ہدایت اور رحمت۔ کہو کہ یہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے ہے۔ اب چاہئے کہ لوگ خوش ہوں، یہ اس سے بہتر ہے جس کو وہ جمع کر رہے ہیں۔ کہو، یہ بتاؤ کہ اللہ نے تمھارے لئے جو رزق اتارا تھا، پھر تم نے اس میں سے کچھ کو حرام ٹھہرایا اور کچھ کو حلال۔ کہو، کیا اللہ نے تم کو اس کا حکم دیا ہے یا تم اللہ پر جھوٹ لگا رہے ہو۔ اور قیامت کے دن کے بارے میں ان لوگوں کا کیا خیال ہے جو اللہ پر جھوٹ لگا رہے ہیں۔ بیشک اللہ لوگوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے، مگر اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔ ۵۷ — ۶۰

انسان ایک نفسیاتی مخلوق ہے۔ نفسیات کے بننے سے وہ بنتا ہے اور نفسیات کے بگڑنے سے وہ بگڑ جاتا ہے۔ خدا کی کتاب کی صورت میں جو ہدایت اتری ہے وہ انسان کے لئے سراسر رحمت ہے۔ اس میں انسان کے لئے بہترین نصیحت موجود ہے۔ مگر اس نصیحت کو پانے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی نے اپنی راست فکری نہ کھوئی ہو۔ جو شخص اپنی راست فکری کی صلاحیت کو بگاڑ لے، اس کے لئے خدا کا نصیحت نامہ بے اثر رہے گا۔

موجودہ دنیا کی چیزیں اور اس کی رونقیں آدمی کے سامنے "نقد" ہوتی ہیں۔ آدمی ہر آن ان کی لذت اور خوبی کا تجربہ کرتا ہے، اس کے مقابلہ میں آخرت کی نعمتیں صرف "وعدہ" کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آدمی صرف ان کے بارے میں سنتا ہے، وہ ان کا تجربہ نہیں کرتا۔ اس بنا پر اکثر لوگ دنیا کی نقد چیزوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ مگر جو شخص گہرائی کے ساتھ سوچے گا وہ اس بات پر خوش ہوگا کہ خدا نے اپنی ہدایت اتار کر اس کے لئے ابدی نعمتوں کے حصول کا دروازہ کھول دیا ہے۔

اللہ نے جو کچھ انسان کو دیا ہے، خواہ وہ زرعی پیداوار کی صورت میں ہو یا دوسری صورت میں، سب کا سب رزق ہے۔ آدمی اگر ان چیزوں کو خدا کا دیا ہوا سمجھے اور خدا کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق ان میں تصرف کرے تو اس کے اندر خدا کے شکر کا جذبہ ابھرے گا۔ مگر شیطان ہمیشہ اس کوشش میں رہتا ہے کہ وہ اس نسبت کو بدل دے، تاکہ اس "رزق" کے استعمال کے وقت آدمی کو خدا کی یاد نہ آئے بلکہ دوسری دوسری چیزوں کی یاد آئے — قدیم زمانہ میں شیطان نے پیداوار میں مفروضہ دیوی دیوتاؤں کے مراسم مقرر کئے تاکہ آدمی ان کو لیتے ہوئے خدا کو یاد نہ کرے بلکہ دیوی دیوتاؤں کو یاد کرے۔ موجودہ زمانہ میں یہی مقصد شیطان مادی توجیہات کے ذریعہ حاصل کر رہا ہے۔ وہ خدا کی طرف سے ملنے والی چیز کو مادی عوامل کے تحت ملنے والی چیز بنا کر لوگوں کو دکھا رہا ہے تاکہ لوگ جب ان نعمتوں کو پائیں تو وہ اس کو خدا کا رزق نہ سمجھیں بلکہ صرف مادہ کا کرشمہ سمجھیں۔

وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَمَا تَتْلُوا مِنْهُ مِنْ قُرْآنٍ وَلَا تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُودًا إِذْ تُفِيضُونَ فِيهِ ۚ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَبِّكَ مِنْ مِثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَلَا أَصْغَرَ مِنْ ذَٰلِكَ وَلَا أَكْبَرَ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ ﴿٦١﴾ أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٢﴾ الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ﴿٦٣﴾ لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۚ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿٦٤﴾ وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ إِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا ۚ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٦٥﴾

اور تم جس حال میں بھی ہو اور قرآن میں سے جو حصہ بھی سنا رہے ہو اور تم لوگ جو کام بھی کرتے ہو، ہم تمھارے اوپر گواہ رہتے ہیں جس وقت تم اس میں مشغول ہوتے ہو۔ اور تیرے رب سے ذرہ برابر بھی کوئی چیز غائب نہیں، نہ زمین میں اور نہ آسمان میں اور نہ اس سے چھوٹی اور نہ بڑی، مگر وہ ایک واضح کتاب میں ہے۔ سن لو، اللہ کے دوستوں کے لئے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور ڈرتے رہے، ان کے لئے خوش خبری ہے دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں، اللہ کی باتوں میں کوئی تبدیلی نہیں، یہی بڑی کامیابی ہے۔ اور تم کو ان کی بات غم میں نہ ڈالے۔ زور سب اللہ ہی کے لئے ہے، وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ ۶۵—۶۱

دعوت اس دنیا کے تمام کاموں میں مشکل ترین کام ہے۔ داعی اپنے پورے وجود کو دعوتی عمل میں شامل کرتا ہے، اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ کسی پیغام کا داعی بن سکے۔ اس سے بھی زیادہ سخت مرحلہ وہ ہے جو مخاطبین کی طرف سے پیش آتا ہے۔

داعی جب خدا کے دین کو بے آمیز صورت میں پیش کرتا ہے اور اس کو کھلے دلائل کی زبان میں مبرہن کر دیتا ہے تو وہ تمام لوگ بپھر اٹھتے ہیں جو خود ساختہ دین کو خدا کا دین بتا کر دیندار بنے ہوئے ہوں یا دینی پیشوائی کا مقام حاصل کئے ہوئے ہوں۔ وہ داعی کو زیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بے بنیاد پروپیگنڈا، سازشیں، حتیٰ کہ جارحانہ کارروائیاں، ہر چیز کو وہ اپنے لئے جائز کر لیتے ہیں۔ موجودہ دنیا میں ملی ہوئی آزادی انھیں موقع دیتی ہے اور وہ داعی کے خلاف جو کچھ کرنا چاہتے ہیں کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ صورت حال یہاں تک پہنچتی ہے کہ دلیل کی طاقت تمام تر ایک طرف ہو جاتی ہے اور مادیات کی طاقت تمام تر دوسری طرف۔

یہ صورت حال بلاشبہ بے حد سخت ہے۔ اس کے بعد ایک طرف یہ ہوتا ہے کہ مخالفین حق کے حوصلے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ وہ اپنے کو کامیاب سمجھنے لگتے ہیں۔ دوسری طرف داعی پر بھی یہ خیال گزرتا ہے کہ کیا خدا اس معاملہ میں غیر جانب دار ہے۔ کیا وہ مجھے حق و باطل کے اس معرکہ میں ڈال کر خود علیحدہ ہو گیا ہے۔

مگر ایسا نہیں ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ خدا حق کا ساتھ نہ دے۔ مخالفین کا بے دلیل ہو جانا اور دلیل کی قوت کا تمام تر داعی کی طرف ہونا یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا داعی کے ساتھ ہے نہ کہ دوسرے گروہ کے ساتھ۔ کیونکہ دلیل موجودہ دنیا میں خدا کی نمائندہ ہے۔ جس کے ساتھ دلیل ہے اس کے ساتھ گویا خدا ہے۔ مخالفین حق کو جارحیت کا موقع صرف اس آزادی کی وجہ سے مل رہا ہے جو امتحان کی خاطر انھیں دی گئی ہے۔ امتحانی دنیا کے ختم ہوتے ہی یہ صورت حال بدل جائے گی۔ اس وقت عزت و برتری اس کے لئے ہوگی جو دلیل کی بنیاد پر کھڑا ہوا تھا۔ جو لوگ دلیل سے خالی تھے وہ وہاں کی دنیا میں رسوا اور ناکام ہو کر رہ جائیں گے۔ اللہ کے سچے داعیوں کا گروہ خدا کے دوستوں کا گروہ ہے۔ اللہ ان کو آخرت میں ایک ایسی اعلیٰ زندگی کی خوش خبری دیتا ہے جہاں نہ انھیں پچھلی زندگی کے لئے کوئی پچھتاوا ہوگا اور نہ اگلی زندگی کے لئے کوئی اندیشہ۔

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ ۭ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَاۗءَ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝۶۶ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ۝۶۷

سنو، جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں سب اللہ ہی کے ہیں۔ اور جو لوگ اللہ کے سوا شریکوں کو پکارتے ہیں وہ کس چیز کی پیروی کر رہے ہیں، وہ صرف گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور وہ محض اٹکل دوڑا رہے ہیں۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لئے رات بنائی تاکہ تم سکون حاصل کرو۔ اور دن کو روشن بنایا۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو سنتے ہیں۔ ۶۷ - ۶۶

زمین و آسمان کے پیچھے کون ہے جو اس کو سنبھالے ہوئے ہے اور اس کو چلا رہا ہے۔ یہ سوال ہر زمانہ میں انسان کی تلاش کا مرکزی نکتہ رہا ہے۔ مگر اس سوال کا صحیح جواب پانا اسی وقت ممکن ہے جب کہ آدمی ماورار طبیعیات دنیا تک دیکھ سکے اور ماورار طبیعیات تک دیکھنے والی آنکھ کسی کو حاصل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر وہ جواب جو وہ بطور خود قائم کرتا ہے وہ محض قیاس و گمان کی بنیاد پر ہوتا ہے نہ کہ

حقیقی علم کی بنیاد پر۔

اس دنیا میں حقیقی علم کی بنیاد پر بولنے والے صرف وہ لوگ ہیں جن کو پیغمبر کہا جاتا ہے ۔ یہ وہ مخصوص لوگ ہیں جن کا ربط عالم بالا سے براہ راست قائم ہوتا ہے ۔ خدا خود انھیں اپنی طرف سے حقیقت کی خبر دیتا ہے ۔ اس لئے اس دنیا میں پیغمبر کا علم ہی واحد علم ہے جس پر یقینی طور پر بھروسہ کیا جا سکے۔

پیغمبروں کے دعوے کی صداقت کو جانچنے کے لئے اگرچہ ہمارے پاس کوئی براہ راست ذریعہ نہیں ہے ۔ تاہم ایک بالواسطہ ذریعہ یقینی طور پر موجود ہے ۔ اور وہ کائنات کی آیات (نشانیاں) ہیں ۔ یہ نشانیاں پیغمبروں کے بیان کردہ معنوی حقائق کی عملی تصدیق کر رہی ہیں۔

مثال کے طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری زمین پر رات کے بعد دن آتا ہے اور دن کے بعد رات آتی ہے ۔ یہ گردش ایک انتہائی محکم نظام کی وجہ سے وجود میں آتی ہے جو ریاضیاتی صحت کی حد تک منظم ہے۔ مزید یہ کہ یہ گردش حیرت ناک حد تک ہماری زندگی کے موافق ہے ۔ اس کے پیچھے واضح طور پر ایک بامقصد منصوبہ کام کرتا ہوا نظر آتا ہے ۔ یہ صورت حال یقینی طور پر ایک ایسے قادر مطلق اور رحمان ورحیم کے وجود کا ثبوت ہے جس کی خبر پیغمبر دیتے ہیں ۔

جو لوگ اپنے خیال کے مطابق "شریکوں" کی پیروی کر رہے ہیں ، وہ شرکار خواہ قدیم الہیاتی شرکار ہوں یا جدید مادی شرکار ، وہ کسی واقعی حقیقت کی پیروی نہیں کر رہے ہیں ۔ بلکہ صرف اپنے قیاس وگمان کی پیروی کر رہے ہیں ۔ پیغمبروں کے ذریعہ ظاہر ہونے والی حقیقت کی تصدیق ساری کائنات کر رہی ہے مگر "مشرکین" جس چیز کے مدعی ہیں اس کی تصدیق کرنے والا کوئی نہیں ۔

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِيُّ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۭ بِهٰذَا ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾ قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾ؕ مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ﴿۷۰﴾

کہتے ہیں کہ اللہ نے بیٹا بنایا ہے ۔ وہ پاک ہے ، بے نیاز ہے ۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے ۔ تمھارے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں ۔ کیا تم اللہ پر ایسی بات گھڑتے ہو جس کا تم علم نہیں رکھتے ۔ کہو، جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ فلاح نہیں پائیں گے ۔ ان کے لئے بس دنیا میں تھوڑا فائدہ اٹھا لینا ہے ۔ پھر ہماری ہی طرف ان کا لوٹنا ہے ۔ پھر ان کو ہم اس انکار کے بدلے سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے ۔ ۶۸ ۔ ۷۰

خدا کے لئے بیٹے بیٹیاں ماننا خدا کو انسان کے اوپر قیاس کرنا ہے۔ انسان کمیوں اور محدودیتوں کا شکار ہے، اس لئے اس کو اولاد کی ضرورت ہے تاکہ ان کے ذریعہ وہ اپنی کمیوں اور محدودیتوں کی تلافی کرے مگر خدا کے معاملہ میں یہ قیاس بالکل بے بنیاد ہے۔

مخلوقات کا نظام خود ہی اس قسم کے خالق کی تردید ہے۔ مخلوقات کا عالمی نظام جس خدا کی شہادت دے رہا ہے وہ یقینی طور پر ایک ایسا خدا ہے جو اپنی ذات میں آخری حد تک کامل ہے۔ وہ ہر قسم کے عیبوں اور کمیوں سے پاک ہے۔ خدا اگر اپنی ذات میں کامل نہ ہوتا، اگر وہ عیبوں اور کمیوں والا خدا ہوتا تو کبھی وہ موجودہ کائنات جیسی کائنات کو نہیں بنا سکتا تھا اور نہ اس کو اس طرح چلا سکتا تھا جس طرح وہ انتہائی معیاری صورت میں چل رہی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر جس خدائے واحد کا تصور پیش کر رہا ہے اس کا وجود تو زمین و آسمان کی تمام نشانیوں سے ثابت ہے۔ مگر مشرکین نے خدا کا جو تصور بنا رکھا ہے، اس کا کوئی ثبوت موجودہ کائنات میں موجود نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ بے ثبوت خدا کو ماننا خود ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ ایسے لوگ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ جو خدا سرے سے موجود نہ ہو وہ کیسے کسی کی مدد پر آئے گا اور کیسے کسی کو بامراد کرے گا۔ جو خدا حقیقی طور پر موجود ہے، مشرکین اس کو مانتے نہیں، اور جس خدا کو مانتے ہیں اس کا کہیں وجود نہیں۔ ایسی حالت میں مشرکین موجودہ کائنات میں کیونکر کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ان کے لئے جو واحد انجام مقدر ہے وہ صرف یہ کہ بالآخر وہ بے بس اور بے سہارا ہو کر رہ جائیں اور ہمیشہ کے لئے ذلت و ناکامی میں پڑے رہیں۔

موجودہ دنیا میں انکار یا شرک کا رویہ اختیار کرنے سے کسی کا کچھ بگڑتا نہیں۔ اس سے آدمی غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے۔ مگر یہ صورت حال صرف امتحان کی مہلت کی بنا پر ہے۔ موجودہ دنیا میں انسان کو امتحان کی وجہ سے عمل کی آزادی دی گئی ہے۔ جیسے ہی امتحان کی مدت ختم ہوگی موجودہ صورت حال بھی ختم ہو جائے گی۔ اس وقت آدمی دیکھے گا کہ اس کے پاس ان چیزوں میں سے کوئی چیز نہیں ہے جس کا وہ اپنے آپ کو مالک سمجھ کر سرکش بنا ہوا تھا۔

حدیث میں آیا ہے کہ اللہ نے عقل سے کہا: "اے عقل، اس کائنات میں میں نے تجھ سے افضل، تجھ سے حسین اور تجھ سے بہتر مخلوق پیدا نہیں کی۔" انسان کو ایسی عظیم نعمت دینے کا یہ تقاضا ہے کہ اس کی ذمہ داری بھی عظیم ہو۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کے نزدیک سچائی کا انکار سب سے بڑا جرم ہے۔ سچائی کو جب دلیل سے ثابت کر دیا جائے تو آدمی کے اوپر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اس کو مانے۔ عقلی طور پر ثابت شدہ ہو جانے کے بعد اگر وہ سچائی کا انکار کرتا ہے تو وہ ناقابل معافی جرم کا ارتکاب کر رہا ہے۔ خدا نے جب انسان کو ایسی عقل دی جس سے وہ حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا جان سکے تو اس کے بعد کیا چیز ہوگی جو خدا کے یہاں اس کے لئے عذر بن سکے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ نُوحٍ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ إِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَقَامِي وَتَذْكِيرِي بِآيَاتِ اللَّهِ فَعَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْتُ فَأَجْمِعُوا أَمْرَكُمْ وَشُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ أَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوا إِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُونِ ﴿٧١﴾ فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ ۖ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿٧٢﴾ فَكَذَّبُوهُ فَنَجَّيْنَاهُ وَمَنْ مَعَهُ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنَاهُمْ خَلَائِفَ وَأَغْرَقْنَا الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ۖ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِينَ ﴿٧٣﴾

اور ان کو نوح کا حال سناؤ۔ جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم، اگر میرا کھڑا ہونا اور اللہ کی آیتوں سے نصیحت کرنا تم پر گراں ہو گیا ہے تو میں نے اللہ پر بھروسہ کیا۔ تم اپنا متفقہ فیصلہ کر لو اور اپنے شریکوں کو بھی ساتھ لے لو، تم کو اپنے فیصلہ میں کوئی شبہ باقی نہ رہے۔ پھر تم لوگ میرے ساتھ جو کچھ کرنا چاہتے ہو کر گزرو اور مجھ کو مہلت نہ دو۔ اگر تم اعراض کرو گے تو میں نے تم سے کوئی مزدوری نہیں مانگی ہے۔ میری مزدوری تو اللہ کے ذمہ ہے۔ اور مجھ کو حکم دیا گیا ہے کہ میں فرماں برداروں میں سے ہوں۔ پھر انھوں نے اس کو جھٹلا دیا تو ہم نے نوح کو اور جو لوگ اس کے ساتھ کشتی میں تھے نجات دی اور ان کو جانشین بنایا۔ اور ان لوگوں کو غرق کر دیا جنھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تھا۔ دیکھو کہ کیا انجام ہوا ان کا جن کو ڈرایا گیا تھا۔ ۷۱ ـ ۷۳

حضرت نوح قدیم ترین زمانہ کے رسول ہیں۔ وہ جب تک خاموش تھے، قوم ان کی عزت کرتی رہی۔ مگر جب آپ حق کے داعی بن کر کھڑے ہوئے اور لوگوں کو بتانے لگے کہ ایسا کرو اور ویسا نہ کرو تو وہ قوم کی نظر میں ایک ناپسندیدہ شخص بن گئے۔ یہاں تک کہ قوم نے اعلان کر دیا کہ تم اپنی تبلیغ ونصیحت سے باز آؤ ورنہ ہم تم کو اپنی زمین میں نہیں رہنے دیں گے۔

حضرت نوح نے کہا کہ تم لوگ میرے معاملہ کو ایک انسان کا معاملہ سمجھتے ہو، اس لئے ایسا کہہ رہے ہو۔ مگر یہ معاملہ خدا کا معاملہ ہے۔ مجھ سے لڑنے کے لئے تم کو خدا سے لڑنا پڑے گا۔ تم کو اگر یقین نہ ہو تو تم اس طرح تجربہ کر سکتے ہو کہ اپنے ساتھیوں اور شریکوں کو ملا کر میرے خلاف کوئی متفقہ منصوبہ بناؤ اور اپنی تمام طاقت کے ساتھ اس کی تعمیل کر گزرو۔ تم دیکھو گے کہ میرے مقابلہ میں تمھارا ہر منصوبہ ناکام ہے۔ موجودہ دنیا میں داعی حق کی صداقت کو جانچنے کا معیار یہ ہے کہ وہ ہر حال میں اپنا کام پورا کر کے رہتا ہے۔ کوئی بھی اس کو زیر کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔

جو شخص خدا کی طرف سے حق کی دعوت لے کر اٹھے وہ ہمیشہ نشانی (دلیل) کے زور پر اٹھتا ہے۔ دلیل چونکہ ایک ذہنی چیز ہے اس لئے ظاہر پسند انسان اس کی عظمت کو سمجھ نہیں پاتا۔ وہ ذہنی طور پر لاجواب ہونے کے باوجود اس کے

آگے جھکنے سے انکار کر دیتا ہے۔

حق کے داعی کو جن آداب دعوت کا لازمی طور پر لحاظ کرنا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ داعی اپنے مدعو سے کسی بھی قسم کا معاشی اور مادی مطالبہ نہ کرے۔ خواہ اس یک طرفہ دست برداری کی وجہ سے اس کو کتنا ہی نقصان اٹھانا پڑے۔ ایسا کرنا اس لئے ضروری ہے کہ دونوں کے درمیان آخر وقت تک داعی اور مدعو کا تعلق باقی رہے، وہ کسی بھی حال میں قومی حریف اور مادی رقیب کا تعلق نہ بننے پائے۔

حضرت نوح نے جب اتمام حجت کی حد تک حق کا پیغام پہنچا دیا، پھر بھی ان کی قوم سرکشی پر قائم رہی تو سرکشوں کو سیلاب میں غرق کر کے زمین ان سے خالی کرالی گئی اور مومنین نوح کو موقع دیا گیا کہ وہ زمین کے وارث بن کر اس پر آباد ہوں۔ اسی کو قرآن کی اصطلاح میں "خلافت" کہا جاتا ہے۔ سیلاب سے پہلے قوم نوح زمین کی خلیفہ بنی ہوئی تھی، سیلاب کے بعد مومنین نوح زمین کے خلیفہ قرار پائے۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۷۴﴾

پھر ہم نے نوح کے بعد کتنے رسول بھیجے۔ وہ ان کے پاس کھلی کھلی دلیلیں لے کر آئے، مگر وہ اس پر ایمان لانے والے نہ بنے جس کو پہلے جھٹلا چکے تھے۔ اسی طرح ہم حد سے نکل جانے والوں کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں۔ ۷۴

اس آیت میں "حد سے گزر جانے والا" ان لوگوں کو کہا گیا ہے جن کا حال یہ ہوتا ہے کہ ایک بار اگر وہ حق کا انکار کر دیں تو اس کے بعد وہ اس کو اپنی ساکھ کا مسئلہ بنا لیتے ہیں اور پھر اس کو مسلسل نظر انداز کرتے رہتے ہیں تاکہ لوگوں کی نظر میں ان کا علم دین اور ان کا برسرحق ہونا مشتبہ نہ ہونے پائے۔

جو لوگ اس قسم کا رویہ اختیار کریں ان کو دنیا میں یہ سزا ملتی ہے کہ ان کے دلوں پر مہر لگا دی جاتی ہے۔ یعنی خدا کے قانون کے تحت ان کی نفسیات دھیرے دھیرے ایسی بن جاتی ہیں کہ بالآخر حق کے معاملہ میں ان کا شدت احساس باقی نہیں رہتا۔ ابتداءً ان کے اندر جو تھوڑی سی حساسیت زندہ تھی وہ بھی بالآخر مُردہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ وہ اس قابل نہیں رہتے کہ حق اور ناحق کے معاملہ میں تڑپیں اور ناحق کو چھوڑ کر حق کو قبول کر لیں۔ حضرت نوح اور ان کے بعد آنے والے بیشتر رسولوں کی تاریخ اس کی تصدیق کرتی ہے۔

اللہ کی طرف سے جب بھی کوئی داعیٔ حق آتا ہے تو وہ اس حال میں آتا ہے کہ اس کے گرد کسی قسم کی ظاہری عظمت نہیں ہوتی۔ اس کے پاس جو واحد چیز ہوتی ہے وہ صرف دلیل ہے۔ جو لوگ دلیل کی زبان میں حق کو مانیں وہی داعیٔ حق کو مانتے ہیں۔ جن لوگوں کا حال یہ ہو کہ دلیل کی زبان انھیں متاثر نہ کر سکے وہ داعیٔ حق کو پہچاننے سے بھی محروم رہتے ہیں اور اس کا ساتھ دینے سے بھی۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ىِٕهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۷۵﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۶﴾ قَالَ مُوْسٰٓى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ﴿۷۷﴾ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِى الْاَرْضِ ؕ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۸﴾

پھر ہم نے ان کے بعد موسیٰ اور ہارون کو فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس اپنی نشانیاں دے کر بھیجا، مگر انھوں نے گھمنڈ کیا اور وہ مجرم لوگ تھے۔ پھر جب ان کے پاس ہماری طرف سے سچی بات پہنچی تو انھوں نے کہا، یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔ موسیٰ نے کہا کہ کیا تم حق کو جادو کہتے ہو جب کہ وہ تمھارے پاس آچکا ہے۔ کیا یہ جادو ہے، حالاں کہ جادو والے کبھی فلاح نہیں پاتے۔ انھوں نے کہا کہ کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ ہم کو اس راستے سے پھیر دو جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے، اور اس ملک میں تم دونوں کی بڑائی قائم ہو جائے، اور ہم کبھی تم دونوں کی بات ماننے والے نہیں ہیں۔ ۷۸ — ۷۵

فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں نے اپنی مجرمانہ ذہنیت کی بنا پر موسیٰ اور ہارون کی بات نہیں مانی۔ وہ چیزوں کو دلیل کے معیار سے دیکھنے کے بجائے جاہ واقتدار کے معیار سے دیکھتے تھے۔ اس خود ساختہ معیار کے نام پر انھوں نے اپنے کو اونچا اور موسیٰ و ہارون کو نیچا سمجھ لیا۔ ان کی یہ نفسیات ان کے لیے اس حق کو قبول کرنے میں رکاوٹ بن گئی جو ان کے نزدیک ایک چھوٹا آدمی ان کے سامنے پیش کر رہا تھا۔

حضرت موسیٰ کی استدلال کی زبان جب فرعون کی سمجھ میں نہیں آئی تو آپ نے عصا اور ید بیضا کے معجزات دکھائے۔ ان معجزات کا توڑ فرعون کے پاس نہ تھا۔ چنانچہ اس نے کہا کہ یہ جادو ہے۔ اس طرح فرعون نے حضرت موسیٰ کے مقابلہ میں اپنی شکست کو ایک جھوٹی توجیہہ میں چھپانے کی کوشش کی۔ اس نے لوگوں کو یہ تاثر دیا کہ موسیٰ کا معاملہ حق کا معاملہ نہیں ہے بلکہ جادو کا معاملہ ہے، یہ صحیح ہے کہ جادو اور معجزہ میں کچھ ظاہری مشابہت ہوتی ہے۔ مگر بہت جلد معلوم ہو جاتا ہے کہ جادو محض شعبدہ اور کرشمہ تھا۔ اس کے مقابلہ میں معجزہ کو مستقل کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ جادو بالآخر جادو ثابت ہوتا ہے اور معجزہ بالآخر معجزہ۔

اس موقع پر فرعون نے لوگوں کو حضرت موسیٰ کی دعوت سے پھیرنے کے لیے دو اور باتیں کہیں۔ ایک یہ کہ موسیٰ ہم کو ہمارے آبائی دین سے برگشتہ کرنا چاہتے ہیں۔ فرعون کو چاہیے تھا کہ وہ حضرت موسیٰ کے پیغام کو حق اور ناحق کی

اصطلاح میں سمجھنے کی کوشش کرے۔ مگر اس نے اس کو آبائی اور غیر آبائی معیار سے جانچا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حق اور ناحق کے معیار سے دیکھنے میں اپنے آپ کو غلط ماننا پڑتا۔ جب کہ آبائی اور غیر آبائی کی تقسیم میں اپنی روش پر بدستور موجود رہنے کا جواز مل رہا تھا۔

فرعون نے دوسری بات یہ کہی کہ "موسیٰ اور ہارون اس ملک میں اپنی کبریائی قائم کرنا چاہتے ہیں"۔ یہ بھی عوام کو بھڑکانے کے لیے محض ایک سیاسی شوشہ تھا، کیونکہ حضرت موسیٰ نے تو اول مرحلہ میں فرعون کے سامنے یہ بات رکھ دی تھی کہ ان کا مقصد یہ ہے کہ وہ فرعون کو خدا کا پیغام پہنچائیں اور اس کے بعد بنی اسرائیل کے ساتھ مصر سے نکل کر صحرائے سینا میں چلے جائیں۔ ایسی حالت میں یہ الزام سراسر خلاف واقعہ تھا کہ وہ مصر کی حکومت پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُونِي بِكُلِّ سَاحِرٍ عَلِيمٍ ﴿٧٩﴾ فَلَمَّا جَاءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُم مُّوسَىٰ أَلْقُوا مَا أَنتُم مُّلْقُونَ ﴿٨٠﴾ فَلَمَّا أَلْقَوْا قَالَ مُوسَىٰ مَا جِئْتُم بِهِ السِّحْرُ ۖ إِنَّ اللَّهَ سَيُبْطِلُهُ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِينَ ﴿٨١﴾ وَيُحِقُّ اللَّهُ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ ﴿٨٢﴾

ع ۱۲

اور فرعون نے کہا کہ تمام ماہر جادوگروں کو میرے پاس لے آؤ۔ جب جادوگر آئے تو موسیٰ نے ان سے کہا کہ جو کچھ تمھیں ڈالنا ہے ڈالو۔ پھر جب جادوگروں نے ڈالا تو موسیٰ نے کہا کہ جو کچھ تم لائے ہو وہ جادو ہے۔ بے شک اللہ اس کو باطل کر دے گا، اللہ یقیناً مفسدوں کے کام کو سدھرنے نہیں دیتا۔ اور اللہ اپنے حکم سے حق کو حق کر دکھاتا ہے خواہ مجرموں کو وہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ ۸۲ — ۷۹

فرعون کا ماہر جادوگروں کو بلانا اس لئے نہ تھا کہ وہ سمجھتا تھا کہ جادوگروں کے ذریعہ وہ حضرت موسیٰ کو زیر کر لے گا۔ یہ کسی عقلی فیصلہ سے زیادہ فرعون کی اس بڑھی ہوئی خواہش کا نتیجہ تھا کہ وہ حضرت موسیٰ کو نہ مانے۔ خدا کے پیغمبر کو جادوگروں کے ذریعہ غلط ثابت کرنے کا منصوبہ ایک ایسا منصوبہ تھا جس کا ناکام ہونا پہلے سے معلوم تھا۔ مگر آدمی جب کسی حقیقت کو نہ ماننا چاہے تو اس کی یہ خواہش اس کو یہاں تک لے جاتی ہے کہ وہ احمقانہ تدبیروں سے اس کا مقابلہ کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔ وہ سیلاب کے مقابلہ میں تنکوں کا بند باندھتا ہے حالاں کہ وہ خود جان رہا ہوتا ہے کہ سیلاب کے مقابلہ میں تنکوں کی کوئی حقیقت نہیں۔

چنانچہ وہی ہوا جو ہونا تھا۔ جادوگروں نے میدان میں رسیاں اور لکڑیاں پھینکیں جو دیکھنے والوں کو رینگتے ہوئے سانپ کی صورت میں دکھائی دیں۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ نے اپنا عصا ڈالا تو وہ بہت بڑا سانپ بن کر

میدان میں دوڑنے لگا۔ حضرت موسیٰ کا یہ "سانپ" محض سانپ نہ تھا، وہ دراصل خدا کی ایک طاقت تھی جو اس لئے ظاہر ہوئی تھی کہ حق کو حق اور باطل کو باطل ثابت کردے۔ چنانچہ اس کے سامنے آتے ہی جادوگروں کی رسّی، رسّی رہ گئی اور ان کی لکڑی لکڑی۔

یہ خود اپنے منتخب کئے ہوئے میدان میں فرعون کی شکست تھی۔ مگر اب بھی فرعون نے شکست نہ مانی۔ اب اس نے حضرت موسیٰ کی تردید کے لئے کچھ اور الفاظ تلاش کرلئے جس طرح اس کو پہلے مرحلہ میں آپ کی تردید کے لئے کچھ الفاظ مل گئے تھے۔

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓی اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰی خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ۚ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِی الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَقَالَ مُوْسٰی يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ﴿۸۴﴾ فَقَالُوْا عَلَی اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۶﴾

پھر موسیٰ کو اس کی قوم میں سے چند نوجوانوں کے سوا کسی نے نہ مانا، فرعون کے ڈر سے اور خود اپنی قوم کے بڑے لوگوں کے ڈر سے کہ کہیں وہ ان کو کسی فتنہ میں نہ ڈال دے۔ بے شک فرعون زمین میں غلبہ رکھتا تھا اور وہ ان لوگوں میں سے تھا جو حد سے گزر جاتے ہیں۔ اور موسیٰ نے کہا اے میری قوم، اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اسی پر بھروسہ کرو، اگر تم واقعی فرماں بردار ہو۔ انھوں نے کہا، ہم نے اللہ پر بھروسہ کیا، اے ہمارے رب، ہمیں ظالم لوگوں کے لئے فتنہ نہ بنا۔ اور اپنی رحمت سے ہم کو کافر لوگوں سے نجات دے۔ ۸۶-۸۳

نئے فکر کو قبول کرنا ہمیشہ اس قیمت پر ہوتا ہے کہ آدمی اپنے معاشرہ میں نئے نئے مسائل سے دوچار ہوجائے۔ یہی وجہ ہے کہ زیادہ عمر کے لوگ اکثر کسی نئے فکر کو قبول کرنے میں محتاط ہوتے ہیں۔ مختلف وجوہ سے زیادہ عمر کے لوگوں پر مصلحت کا غلبہ ہوجاتا ہے۔ وہ نئے فکر کی صحت کو ماننے کے باوجود آگے بڑھ کر اس کا ساتھ نہیں دے پاتے۔

مگر نوجوان طبقہ عام طور پر اس قسم کی مصلحتوں سے خالی ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمیشہ تاریخ میں ایسا ہوا ہے کہ کسی نئی اور انقلابی دعوت کو قبول کرنے میں وہی لوگ زیادہ آگے بڑھے جو ابھی زیادہ عمر کو نہیں پہنچے تھے۔ یہی صورت حال حضرت موسیٰ کے ساتھ پیش آئی۔

حضرت موسیٰ کا ساتھ دینے والے نوجوانوں کو ایک طرف فرعون کا خطرہ تھا۔ دوسری طرف خود اپنی قوم کے بڑوں کی طرف سے ان کو حوصلہ افزائی نہیں ملی۔ یہ بڑے اگرچہ حضرت موسیٰ کی نبوت کو مانتے تھے۔ مگر اپنی مصلحت اندیشی کی بنا پر وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے بیٹے بیٹیاں پُرجوش طور پر حضرت موسیٰ کا ساتھ دیں اور اس کے نتیجہ میں وہ فرعون کے ظلم کا شکار بنیں۔

مگر اس قسم کی صورت حال کا تقاضا یہ نہیں ہوتا کہ آدمی مخالفین حق کے ڈر سے خاموش ہو کر بیٹھ جائے۔ اس کو چاہئے کہ وہ انسانی مخالفتوں کے مقابلہ میں خدائی نصرتوں پر نظر رکھے، وہ خدا کے بھروسہ پر اس حق کا ساتھ دینے کے لئے اٹھ کھڑا ہو جس کا ساتھ دینے کے لئے ذاتی طور پر وہ اپنے آپ کو عاجز پا رہا تھا۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۷﴾

اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کی طرف وحی کی کہ اپنی قوم کے لئے مصر میں کچھ گھر مقرر کر لو اور اپنے ان گھروں کو قبلہ بناؤ اور نماز قائم کرو۔ اور اہل ایمان کو خوش خبری دے دو۔ ۸۷

قبلہ کے معنی عربی زبان میں مرجع یا مرکز توجہ کے ہیں۔ یہاں گھروں کو قبلہ بنانے سے مراد یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی بستیوں میں کچھ گھروں یا ان گھروں کے بعض مناسب حصوں کو اس مقصد کے لئے مخصوص کر دیا جائے کہ وہ حضرت موسیٰ کی دینی جد و جہد کے لئے بطور مرکز کے کام دیں۔ یہاں تنظیمی اجتماعات ہوں، باہمی مشورے ہوں۔ دعوتی عمل کی خاموش منصوبہ بندی کی جائے۔

حضرت موسیٰ کی توحید و آخرت کی باتیں مصر کے بادشاہ فرعون کو سخت ناگوار تھیں۔ اس نے ان کے اوپر نہایت سخت قسم کی پابندیاں عائد کر دیں۔ یہاں تک کہ کھلے طور پر دینی سرگرمیاں جاری رکھنا ان کے لئے سخت دشوار ہو گیا۔ اس وقت حکم ہوا کہ فرعون سے ٹکرانے کے بجائے یہ کرو کہ اپنے کام کو قریبی دائرہ میں سمیٹ لو۔ اپنی بستیوں میں چھوٹے چھوٹے دعوتی اور تنظیمی مراکز بنا کر محدود دائرہ میں خاموشی کے ساتھ اپنا کام جاری رکھو۔

ان حالات میں ان کو جو دوسرا حکم دیا گیا وہ نماز کی اقامت تھا۔ یعنی اللہ سے تعلق جوڑنے اور اس سے مدد مانگنے کے لئے نمازوں کا اہتمام، انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی۔ نماز دراصل خدا سے قریب ہو کر خدا سے مدد مانگنے کی ایک صورت ہے۔ نماز میں مشغول ہو کر بندہ اپنے آپ کو عجز اور تواضع کے مقام پر لاتا ہے اور عجز اور تواضع ہی وہ مقام ہے جہاں بندہ اور خدا کی ملاقات ہوتی ہے۔ بندہ کے لئے اپنے رب سے ملنے کا دوسرا کوئی مقام نہیں۔

یہ جو پروگرام بتایا گیا اسی کی تکمیل میں ان کے لئے فلاح اور نجات کا راز چھپا ہوا تھا۔ یہ حکم گویا اس بات کی خوش خبری تھی کہ خدا ان کو اس حالت سے نکالنے والا ہے جس میں ان کے دشمنوں نے ان کو مبتلا کر دیا ہے۔

وَقَالَ مُوسٰی رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۸۸﴾ قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۹﴾

اور موسیٰ نے کہا، اے ہمارے رب، تو نے فرعون کو اور اس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں رونق اور مال دیا ہے۔ اے ہمارے رب، اس لئے کہ وہ تیری راہ سے لوگوں کو بھٹکائیں۔ اے ہمارے رب، ان کے مال کو غارت کر دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے کہ وہ ایمان نہ لائیں یہاں تک کہ دردناک عذاب کو دیکھ لیں۔ فرمایا، تم دونوں کی دعا قبول کی گئی۔ اب تم دونوں جمے رہو اور ان لوگوں کی راہ کی پیروی نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔ ۸۹ — ۸۸

جو لوگ آخرت کی فکر کرتے ہیں وہ عام طور پر دنیوی ساز و سامان جمع کرنے میں ان لوگوں سے پیچھے رہ جاتے ہیں جو آخرت سے بے فکر ہو کر دنیا حاصل کرنے میں لگے ہوتے ہوں۔ دینی کمی آخرت کی طرف دھیان لگانے کی قیمت ہے، اور دنیوی زیادتی آخرت سے غافل ہونے کی قیمت۔

مزید یہ کہ جس کے پاس دنیا کی رونق اور سامان زیادہ جمع ہو جائیں وہ بڑائی کے احساس میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے لوگ اپنے اندر یہ صلاحیت کھو دیتے ہیں کہ کسی دوسرے کی زبان پر جاری ہونے والے حق کو پہچانیں اور اس کے آگے جھک جائیں۔ اپنے وسائل کو اگر وہ خدا کا عطیہ سمجھتے تو اس کو حق کی تائید میں استعمال کرتے، مگر وہ اس کو اپنا ذاتی کمال سمجھتے ہیں اس لئے وہ اس کو صرف اس مقصد کے لئے استعمال کرتے ہیں کہ حق کو دبائیں اور اس طرح ماحول کے اندر اپنی برتری قائم رکھیں۔

"تاکہ وہ تیری راہ سے بھٹکائیں" کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اللہ کے دئے ہوئے مال و اسباب کو صرف اس لئے استعمال کیا کہ اس کے ذریعہ سے خدا کے بندوں کو خدا سے دور کریں۔ انہوں نے اس کو حق کی خدمت میں لگانے کے بجائے باطل کی خدمت میں لگایا۔ یہاں شدت بیان کی خاطر کلام کا اسلوب بدل گیا ہے۔

حضرت موسیٰ نے فرعون اور اس کے ساتھیوں کے سامنے سچے دین کی دعوت پیش کی اور اپنی اعلیٰ صلاحیتوں اور خدا کی نصرتوں کے ذریعہ اس کو اتمام حجت کی حد تک واضح کر دیا۔ اس کے باوجود فرعون اور اس کے ساتھیوں نے آنجناب کے پیغام کو نہیں مانا۔ اس وقت حضرت موسیٰ نے دعا کی کہ خدایا

ان کے اوپر وہ سزا نازل فرما جو تیرے قانون کے تحت ایسے سرکشوں کے لئے مقدر ہے۔ ایسے موقع پر پیغمبر کی بددعا خود خدا کے فیصلہ کا اعلان ہوتا ہے جو نمائندہ خدا کی زبان سے جاری کیا جاتا ہے۔

حضرت موسیٰ کی دعا قبول ہو گئی۔ تاہم جیسا کہ بعض روایات میں آتا ہے، حضرت موسیٰ کی دعا اور فرعون کی تباہی کے درمیان ۴۰ سال کا فاصلہ ہے۔ (تفسیر النسفی)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے بعد بھی لمبی مدت تک یہ صورت حال باقی رہی کہ حضرت موسیٰ اور آپ کے ساتھی اپنے آپ کو بے بس پاتے تھے، اور دوسری طرف فرعون اور اس کے ساتھیوں کی شان و شوکت بدستور ملک میں قائم تھی۔ ایسی حالت میں آدمی اگر خدا کی اس سنت سے بے خبر ہو کہ وہ سرکشوں کو مہلت دیتا ہے تو وہ جلد بازی میں اصل کام چھوڑ دے گا اور مایوسی اور بد دلی کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔

وَجَاوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّعَدْوًا ۭ حَتّٰٓي اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۹۰﴾ اٰۗلْئٰنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۹۱﴾ فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ﴿۹۲﴾ ع ۹ / ۱۴

اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر پار کرا دیا تو فرعون اور اس کے لشکر نے ان کا پیچھا کیا۔ سرکشی اور زیادتی کی غرض سے۔ یہاں تک کہ جب فرعون ڈوبنے لگا تو اس نے کہا کہ میں ایمان لایا کہ کوئی معبود نہیں مگر وہ جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے۔ اور میں اس کے فرمانبرداروں میں ہوں۔ کیا اب، اور اس سے پہلے تو نافرمانی کرتا رہا اور تو فساد برپا کرنے والوں میں سے تھا۔ پس آج ہم تیرے بدن کو بچائیں گے تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لئے نشانی بنے اور بیشک بہت سے لوگ ہماری نشانیوں سے غافل رہتے ہیں۔ ۹۰-۹۲

مصر میں حضرت موسیٰ کا مشن دو طرفہ تھا۔ ایک، فرعون کو توحید اور آخرت کی طرف بلانا۔ دوسرے، بنی اسرائیل کو مصر سے باہر صحرائی ماحول میں لے جانا اور وہاں ان کی تربیت کرنا۔ جب فرعون پر دعوت حق کی تکمیل ہو چکی تو اللہ کے حکم سے وہ بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے روانہ ہوئے۔ صحرائے سینا پہنچنے کے لئے انہیں دریا کو پار کرنا تھا۔ جب بنی اسرائیل حضرت موسیٰ کی رہنمائی میں دریا کے کنارے پہنچے تو اللہ کے حکم سے حضرت موسیٰ نے پانی پر اپنا عصا مارا۔ پانی بیچ سے پھٹ کر دائیں بائیں کھڑا ہو گیا،

اور درمیان میں خشک راستہ نکل آیا۔ حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل اس راستہ سے بآسانی پار ہوگئے۔

فرعون اپنے لشکر کے ساتھ بنی اسرائیل کا پیچھا کرتے ہوئے آگے بڑھا۔ وہ دریا کے کنارے پہنچا تو دیکھا کہ موسیٰ اور بنی اسرائیل پانی کے درمیان ایک خشک راستہ سے گذر رہے ہیں۔ دریا کے وسیع پاٹ نے پھٹ کر حضرت موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کو راستہ دے دیا تھا۔ یہ واقعہ دراصل خدا کی ایک نشانی تھا۔ فرعون کو اس سے یہ سبق لینا چاہئے تھا کہ موسیٰ حق پر ہیں اور خدا ان کے ساتھ ہے۔ مگر اس نے دریا کے پھٹنے کو خدائی واقعہ سمجھنے کے بجائے عام واقعہ سمجھا۔ اپنے اور موسیٰ کے درمیان فرعون کو صرف دریا نظر آیا، حالانکہ وہاں خود خدا کھڑا ہوا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس واقعہ میں فرعون کے لئے اطاعت اور انابت کا پیغام تھا وہ اس کے لئے صرف سرکشی میں اضافہ کا سبب بن گیا۔ اس نے "دریا" کو دیکھا مگر "خدا" کو نہیں دیکھا۔ اس نے سمجھا کہ جس طرح موسیٰ اور ان کے ساتھیوں نے دریا کو پار کیا ہے اسی طرح وہ بھی دریا کو پار کر سکتا ہے۔

اپنے اس ذہن کے ساتھ فرعون اور اس کا لشکر دریا میں داخل ہوگئے۔ دریا کا پانی جو دو ٹکڑے ہوا تھا وہ موسیٰ اور ان ساتھیوں کے لئے ہوا تھا، وہ فرعون اور اس کے ساتھیوں کے لئے نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ فرعون اور اس کا لشکر جب بیچ دریا میں پہنچے تو خدا کے حکم سے دونوں طرف کا پانی مل گیا اور فرعون اپنے لشکر سمیت اس میں غرق ہوگیا۔ غرق ہوتے ہوئے فرعون نے ایمان کا اقرار کیا مگر وہ بے سود تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اختیاری ایمان معتبر ہے نہ کہ وہ ایمان جب کہ آدمی ایمان لانے پر مجبور ہوگیا ہو۔

خدا سے نافرمانی اور سرکشی کا انجام ہلاکت ہے، اس کا نمونہ دور رسالت میں بار بار انسان کے سامنے آتا تھا۔ تاہم اس قسم کے کچھ نمونے خدا نے مستقل طور پر محفوظ کر دیئے ہیں تاکہ وہ بعد کے زمانہ میں بھی انسان کو سبق دیتے رہیں جبکہ نبیوں کی آمد کا سلسلہ ختم ہوگیا ہو۔ انہیں میں سے ایک تاریخی نمونہ فرعون موسیٰ (رعمسیس ثانی) کا ہے جس کی ممی کی ہوئی لاش ماہرین اثریات کو قدیم مصری شہر تھیبس (Thebes) میں ملی تھی اور اب وہ قاہرہ کے میوزیم میں نمائش کے لئے رکھی ہوئی ہے۔

وَلَقَدْ بَوَّأْنَا بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ مُبَوَّأَ صِدْقٍ وَرَزَقْنَٰهُم مِّنَ ٱلطَّيِّبَٰتِ فَمَا ٱخْتَلَفُوا۟ حَتَّىٰ جَآءَهُمُ ٱلْعِلْمُ ۚ إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِي بَيْنَهُمْ يَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ فِيمَا كَانُوا۟ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۝

اور ہم نے بنی اسرائیل کو اچھا ٹھکانا دیا اور ان کو ستھری چیزیں کھانے کے لئے دیں۔ پھر انہوں نے اختلاف نہیں کیا مگر اس وقت جب کہ علم ان کے پاس آچکا تھا۔ یقیناً تیرا رب قیامت کے دن ان کے درمیان اس چیز کا فیصلہ کردے گا جس میں وہ اختلاف کرتے رہے۔ ۹۳

بنی اسرائیل قدیم زمانہ میں خدا کے دین کے حامل تھے۔ ان کے ساتھ خدا نے یہ احسان کیا کہ ان کے دشمن (فرعون) سے ان کو نجات دی۔ اس کے بعد وہ ان کو سینا کی کھلی فضا میں لے گیا۔ وہاں ان کے لئے خصوصی انتظام کے تحت پانی اور رزق مہیا کیا۔ صحرائی تربیت کے ذریعہ ان کے اندر ایک نئی طاقتور نسل تیار کی۔ اس نسل نے حضرت موسیٰ کی وفات کے بعد ایک عظیم ملک فتح کیا اور شام اور اردن اور فلسطین جیسے سرسبز علاقہ میں بنی اسرائیل کی سلطنت قائم کی۔ جو کئی سو سال تک باقی رہی۔

اس احسان کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ بنی اسرائیل خدا کے فرماں بردار اور شکر گزار رہتے اور خدا کے دین کی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد بناتے۔ مگر واضح رہنمائی کے ہوتے ہوئے وہ راہ سے بے راہ ہوگئے۔

ان کا راہ سے بے راہ ہونا کیا تھا۔ یہ آپس کا اختلاف تھا۔ ان کے پاس خدا کا اتارا ہوا علم موجود تھا جو واحد سچائی تھا۔ مگر انہوں نے اس علم کی تشریح و تاویل میں اختلاف کیا اور ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے۔ (تفسیر النسفی) کوئی امت جب تک خدا کے اتارے ہوئے دین (العلم) پر رہتی ہے، اس میں اتفاق و اتحاد رہتا ہے۔ مگر بعد کو ان کے درمیان اس العلم کی تشریح میں اختلافات شروع ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ ایک اختلافی رائے لیکر بیٹھ جاتے ہیں اور کچھ لوگ دوسری اختلافی رائے لیکر۔ ہر ایک اپنے اپنے مسلک کو برحق ثابت کرنے کے لئے بحث مباحثہ اور تقریر اور مناظرہ کا طوفان کھڑا کرتا ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ اصل العلم کتابوں میں بند پڑا رہتا ہے اور سارا زور ان کی تاویلات و تشریحات میں صرف ہونے لگتا ہے۔ اس طرح بنیادی دینی تعلیمات (العلم) میں متحد الرائے ہونے کے باوجود لوگ ذیلی تعلیمات میں مشغول ہو کر مختلف الرائے ہو جاتے ہیں۔

"اللہ قیامت کے دن فیصلہ کردے گا" بظاہر متعدی ہے مگر حقیقۃً وہ لازم کا صیغہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت میں جب خدا ظاہر ہوگا تو ہر آدمی اپنے اختلاف کو بھول کر اسی بات کو مان لے گا جو واحد سچائی ہے۔ اگر وہ خدا سے ڈرتے تو آج ہی سب کے سب ایک رائے پر پہنچ جاتے۔ مگر خدا سے بے خوف ہو کر وہ الگ الگ راہوں میں بٹ گئے ہیں۔ بے خوفی سے رایوں کا تعدد پیدا ہوتا ہے اور خوف سے رایوں کا اتحاد۔

فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ فَسْـَٔلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿٩٤﴾ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٩٥﴾

پس اگر تم کو اس چیز کے بارے میں شک ہے جو ہم نے تمہاری طرف اتاری ہے تو ان لوگوں سے پوچھ لو جو تم سے پہلے سے کتاب پڑھ رہے ہیں۔ بیشک یہ تم پر حق آیا ہے تمہارے رب کی طرف سے، پس تم شک کرنے والوں میں سے نہ بنو۔ اور تم ان لوگوں میں شامل نہ ہو جنہوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا ہے، ورنہ تم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگے۔ ۹۵-۹۴

پیغمبر بے آمیز حق کو لیکر اٹھتا ہے، اور بے آمیز حق کی دعوت کو قبول کرنا انسان کے لئے ہمیشہ سخت دشوار کام رہا ہے۔ لوگ عام طور پر ملاوٹی حق کی بنیاد پر کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ اپنی دنیا پرستانہ زندگی پر حق کا لیبل لگا لیتے ہیں۔ ایسی حالت میں بے آمیز حق کی دعوت کو ماننا اپنی ذات کی نفی کی قیمت پر ہوتا ہے۔ داعیٔ حق کو ماننے کے لئے اس کے مقابلہ میں اپنے آپ کو چھوٹا کرنا پڑتا ہے، اور اپنے آپ کو چھوٹا کرنا بلاشبہ انسان کے لئے مشکل ترین کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ حق کی دعوت اٹھے اور لوگ جوق در جوق اس کی طرف دوڑنا شروع کردیں۔ حق کا استقبال اس دنیا میں ہمیشہ اعراض اور مخالفت کی صورت میں کیا گیا ہے۔

داعی جب اپنے ماحول میں حق کی یہ بے وقعتی دیکھتا ہے تو کبھی کبھی اس پر یہ شبہ گزرتا ہے کہ میں غلطی پر تو نہیں ہوں۔ اس آیت میں داعی کو اسی نفسیات سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔

اس شبہ کے غلط ہونے کا ایک نہایت واضح ثبوت یہ ہے کہ پچھلے پیغمبروں اور داعیوں کو بھی ہمیشہ اسی طرح کی صورت حال سے سابقہ پیش آیا۔ جو لوگ سابق انبیاء کی تاریخ سے واقف ہیں ان کو بخوبی معلوم ہے کہ اس دنیا میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ایک پیغمبر اٹھے اور فوراً اس کو عوامی مقبولیت حاصل ہوجائے۔ پھر یہی بات اگر بعد کے زمانہ کے داعیوں کے ساتھ پیش آئے تو اس پر حیران و پریشان ہونے کی کیا ضرورت۔

آدمی کی عقل اگر کسی چیز کی سچائی پر گواہی دے اور وہ صرف لوگوں کی بے توجہی یا مخالفت کی وجہ سے اس چیز کو چھوڑ دے تو یہ گویا اللہ کی نشانیوں کو جھٹلانا ہے۔ اللہ نشانیوں (دلائل) کے روپ میں انسان کے سامنے ظاہر ہوتا ہے۔ اس لئے جس چیز کی صداقت پر دلیل قائم ہوجائے

اس کو ماننا آدمی کے اوپر خدا کا حق ہو جاتا ہے۔ پھر جو شخص خدا کا حق ادا نہ کرے اس کے حصہ میں نقصان اور ہلاکت کے سوا کیا آئے گا۔

إِنَّ الَّذِينَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٩٦﴾ وَلَوْ جَاءَتْهُمْ كُلُّ آيَةٍ حَتَّىٰ يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ﴿٩٧﴾ فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ آمَنَتْ فَنَفَعَهَا إِيمَانُهَا إِلَّا قَوْمَ يُونُسَ لَمَّا آمَنُوا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنَاهُمْ إِلَىٰ حِينٍ ﴿٩٨﴾

بے شک جن لوگوں پر تیرے رب کی بات پوری ہو چکی ہے وہ ایمان نہیں لائیں گے، خواہ ان کے پاس ساری نشانیاں آجائیں جب تک کہ وہ دردناک عذاب کو سامنے آتا نہ دیکھ لیں۔ پس کیوں نہ ہوا کہ کوئی بستی ایمان لاتی کہ اس کا ایمان اس کو نفع دیتا، یونس کی قوم کے سوا۔ جب وہ ایمان لائے تو ہم نے ان سے دنیا کی زندگی میں رسوائی کا عذاب ٹال دیا اور ان کو ایک مدت تک بہرہ مند ہونے کا موقع دیا۔ ۹۶ — ۹۸

انسان کے سامنے جب ایک حق بات آتی ہے تو اس کی عقل گواہی دیتی ہے کہ یہ صحیح ہے۔ مگر کسی حق کو لینے کے لئے آدمی کو کچھ دینا پڑتا ہے اور اسی دینے کے لئے آدمی تیار نہیں ہوتا۔ اس کی خاطر آدمی کو دوسرے کے مقابلہ میں اپنے کو چھوٹا کرنا پڑتا ہے۔ اپنے مفاد کو خطرہ میں ڈالنا ہوتا ہے۔ اپنی رائے اور اپنے وقار کو کھونا پڑتا ہے۔ یہ اندیشے آدمی کے لئے قبول حق میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ جس چیز کا جواب اس کو قبولیت اور اعتراف سے دینا چاہئے تھا اس کا جواب وہ انکار اور مخالفت سے دینے لگتا ہے۔

آدمی کی نفسیات کچھ اس طرح بنی ہیں کہ وہ ایک بار جس رخ پر چل پڑے اسی رخ پر اس کا پورا ذہن چلنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک بار حق سے انحراف کرنے کے بعد بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ آدمی دوبارہ حق کی طرف لوٹے۔ کیونکہ ہر آنے والے دن وہ اپنے فکر میں پختہ تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس قابل ہی نہیں رہتا کہ حق کی طرف واپس جائے۔

اس طرح کے لوگ اپنے موقف کو بتانے کے لئے ایسے الفاظ بولتے ہیں جس سے ظاہر ہو کہ ان کا کیس نظریاتی کیس ہے۔ مگر حقیقۃً وہ صرف ضد اور تعصب اور ہٹ دھرمی کا کیس ہوتا ہے جو اپنی دنیوی

مصلحتوں کی خاطر اختیار کیا جاتا ہے۔ تاہم عذاب خداوندی کے ظہور کے وقت آدمی کا یہ بھرم کھل جائیگا۔ خوف کی حالت اس کو اس چیز کے آگے جھکنے پر مجبور کر دے گی جس کے آگے وہ بے خوفی کی حالت میں جھکنے پر تیار نہ ہوتا تھا۔

پچھلے زمانہ میں جتنے رسول آئے سب کے ساتھ یہ قصہ پیش آیا کہ ان کی مخاطب قوم آخر وقت تک ایمان نہیں لائی۔ البتہ جب وہ عذاب کی پکڑ میں آگئے تو انہوں نے کہا کہ ہم ایمان قبول کرتے ہیں۔ جب تک خدا انہیں دلیل کی زبان میں پکار رہا تھا۔ انہوں نے نہیں مانا اور جب خدا نے انہیں اپنی طاقتوں کی زد میں لے لیا تو کہنے لگے کہ اب ہم مانتے ہیں۔ مگر ایسا ماننا خدا کے یہاں معتبر نہیں۔ خدا کو وہ ماننا مطلوب ہے جب کہ آدمی دلیل کے زور پر جھک جائے نہ کہ وہ طاقت کے زور پر جھکے۔

حضرت یونس علیہ السلام عراق کے ایک قدیم شہر نینوای میں بھیجے گئے۔ انہوں نے وہاں تبلیغ کی مگر وہ لوگ ایمان نہ لائے۔ آخر حضرت یونس نے پیغمبروں کی سنت کے مطابق ہجرت کی۔ وہ یہ کہہ کر نینوی سے چلے گئے کہ اب تمہارے اوپر خدا کا عذاب آئے گا۔ حضرت یونس کے جانے کے بعد عذاب کی ابتدائی علامتیں ظاہر ہوئیں۔ مگر اس وقت انہوں نے وہ نہ کیا جو قوم ھود نے کیا تھا کہ انہوں نے عذاب کا بادل آتے دیکھ کر کہا کہ یہ ہمارے لئے بارش برسانے آرہا ہے۔ قوم یونس کے اندر فوراً چونک پیدا ہوگئی۔ سارے لوگ اپنے مویشیوں اور عورتوں اور بچوں کو لے کر میدان میں جمع ہوگئے اور خدا کے آگے عاجزی کرنے لگے۔ اس کے بعد عذاب ان سے اٹھا لیا گیا۔ جس طرح ظہور عذاب سے پہلے کا ایمان قابل اعتبار ہے اسی طرح وقوع عذاب کے قریب کا ایمان بھی قابل اعتبار ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ اتنا کامل ہو جتنا کامل قوم یونس کا ایمان تھا۔

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا ۚ أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ۝ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تُؤْمِنَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ۝

اور اگر تیرا رب چاہتا تو زمین پر جتنے لوگ ہیں سب کے سب ایمان لے آتے۔ پھر کیا تم لوگوں کو مجبور کروگے کہ وہ مومن ہو جائیں۔ اور کسی شخص کے لئے ممکن نہیں کہ وہ اللہ کی اجازت کے بغیر ایمان لا سکے۔ اور اللہ ان لوگوں پر گندگی ڈال دیتا ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ ۹۹ — ۱۰۰

"تیرا رب چاہتا تو سارے لوگ مومن بن جاتے" کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے لئے یہ ممکن تھا کہ انسانی دنیا کا نظام بھی اسی طرح بنائے جس طرح بقیہ دنیا کا نظام ہے۔ جہاں ہر چیز مکمل طور پر خدا کے حکم کی پابند بنی ہوئی ہے۔ مگر انسان کے سلسلہ میں خدا کی یہ اسکیم ہی نہیں۔ انسان کے سلسلہ میں خدا کی اسکیم یہ ہے کہ آزادانہ ماحول میں رکھ کر انسان کو موقع دیا جائے کہ وہ خود اپنے ذاتی فیصلہ سے خدا کا فرماں بردار بنے۔ وہ اپنے اختیار سے وہ کام کرے جو بقیہ دنیا بے اختیاری کے ساتھ کر رہی ہے، جنت کی ابدی نعمتیں اسی اختیارانہ اطاعت کی قیمت ہیں۔

"کوئی شخص خدا کے اذن کے بغیر ایمان نہیں لا سکتا" کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں کسی کو ایمان کی نعمت ملے گی تو اس طریقہ کی پیروی کر کے ملے گی جو خدا نے اس کے لئے مقرر کر دیا ہے۔ موجودہ دنیا میں ایمان کو پانے کا راستہ یہ ہے کہ آدمی ایمان کی دعوت کو اپنی عقل کے استعمال سے سمجھے۔ جس شخص کی عقل کے اوپر اس کی دنیوی مصلحتیں غالب آجائیں اس کی عقل گویا گندگی کی کیچڑ میں لت پت ہو گئی ہے۔ ایسے شخص کے لئے اس دنیا میں ایمان کی نعمت پانے کا کوئی سوال نہیں۔

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا تُغْنِی الْاٰیٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ فَهَلْ یَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَیَّامِ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ قُلْ فَانْتَظِرُوْۤا اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ ﴿۱۰۲﴾ ثُمَّ نُنَجِّیْ رُسُلَنَا وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَیْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۰۳﴾

ع ۱۰ ۱۱ ۱۵

کہو کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اسے دیکھو اور نشانیاں اور ڈراوے ان لوگوں کو فائدہ نہیں پہنچاتے جو ایمان نہیں لاتے۔ وہ تو بس اس طرح کے دن کا انتظار کر رہے ہیں جس طرح کے دن ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو پیش آئے کہو، انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں پھر ہم بچا لیتے ہیں اپنے رسولوں کو اور ان کو جو ایمان لائے۔ اسی طرح ہمارا ذمہ ہے کہ ہم ایمان والوں کو بچالیں گے۔ ۱۰۳ — ۱۰۱

ہمارے چاروں طرف جو کائنات ہے اس میں بے شمار نشانیاں موجود ہیں جو خدا کے وجود کو ثابت کرتی ہیں۔ اور اسی کے ساتھ یہ بھی بتاتی ہیں کہ اس کائنات کے بارہ میں خدا کا منصوبہ کیا ہے۔ مزید یہ کہ دنیا میں ڈراوے (آندھی اور بھونچال) جیسے واقعات بھی پیش

آتے رہتے ہیں جو انسان کو خدا اور آخرت کے معاملہ میں سنجیدہ بنائیں۔ مگر یہ سب کچھ عالم امتحان میں ہوتا ہے۔ یعنی ایسی دنیا میں جہاں آدمی کو اختیار ہے کہ مانے یا نہ مانے۔ چنانچہ آدمی یہ کرتا ہے کہ جب نشانیاں اور ڈراوے سامنے آتے ہیں تو وہ ان کی کوئی نہ کوئی خود ساختہ توجیہہ کرکے بات کو دوسرے رخ کی طرف پھیر دیتا ہے اور نصیحت سے محروم رہ جاتا ہے۔

جب آدمی دلیل کی زبان میں بات کو نہ مانے تو گویا وہ صرف اس دن کا انتظار کر رہا ہے جب کہ امتحان کا پردہ ہٹا دیا جائے اور خدا اپنا آخری فیصلہ سنانے کے لئے سامنے آجائے۔ مگر وہ دن جب آئے گا تو وہ آج کے دن سے بالکل مختلف ہوگا۔ آج تو ماننے والے اور نہ ماننے والے دونوں بظاہر یکساں حالت میں نظر آتے ہیں۔ مگر جب فیصلہ کا دن آئے گا تو اس کے بعد وہی لوگ امن میں رہیں گے جو حق پرست ثابت ہوئے تھے۔ بقیہ تمام لوگ اس طرح عذاب کی لپیٹ میں آجائیں گے کہ اس کے بعد ان کے لئے کوئی راہ نہ ہوگی جس سے بھاگ کر وہ نجات حاصل کریں۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَاۤ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ
تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ۖۚ وَاُمِرْتُ اَنْ
اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا تَكُوْنَنَّ
مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ
فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ
يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ۗ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۗ وَهُوَ الْغَفُوْرُ
الرَّحِيْمُ

کہو، اے لوگو اگر تم میرے دین کے متعلق شک میں ہو تو میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی عبادت تم کرتے ہو اللہ کے سوا۔ بلکہ میں اس اللہ کی عبادت کرتا ہوں جو تم کو وفات دیتا ہے اور مجھ کو حکم ملا ہے کہ میں ایمان والوں میں سے بنوں۔ اور یہ کہ اپنا رخ یکسو ہو کر دین کی طرف کر دوں۔ اور مشرکوں میں سے نہ بنوں۔ اور اللہ کے علاوہ ان کو نہ پکارو جو تم کو نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان۔ پھر اگر تم ایسا کروگے تو یقیناً تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔ اور اگر اللہ تم کو کسی تکلیف میں پکڑ لے تو

اس کے سوا کوئی نہیں جو اس کو دور کر سکے۔ اور اگر وہ تم کو کوئی بھلائی پہنچانا چاہے تو اس کے فضل کو کوئی روکنے والا نہیں۔ وہ اپنا فضل اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور وہ بخشنے والا مہربان ہے۔ ۱۰۷-۱۰۴

داعی اولاً دلیل کی زبان میں اپنی بات کہتا ہے۔ مگر جب لوگ دلیل سننے کے باوجود شک وشبہ میں پڑے رہتے ہیں تو اس کے پاس آخری چیز یہ رہ جاتی ہے کہ عزم کی زبان میں اپنے پیغام کی صداقت کا اظہار کر دے۔

توحید کے داعی کا شرک کے پرستاروں سے یہ کہنا کہ "میں اس کی عبادت نہیں کرتا جس کی عبادت تم لوگ کرتے ہو" محض ایک دعویٰ نہیں بلکہ وہ اپنی ذات میں ایک دلیل بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ — میں بھی تمہارے جیسا ایک انسان ہوں۔ میرے پاس بھی وہی عقل ہے جو تمہارے پاس ہے۔ پھر جس بات کی صداقت میری سمجھ میں آرہی ہے اس کی صداقت تمہاری سمجھ میں آخر کیوں نہیں آتی۔

سچائی اگر ایک انسان کی سطح پر قابل فہم ہو جائے تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کے لئے بھی قابل فہم تھی۔ اس کے باوجود اگر دوسرے لوگ انکار کریں تو یقیناً اس کی وجہ خود ان کا اپنا کوئی نقص ہوگا نہ کہ دعوت حق کا نقص۔ جس چیز کو ایک آنکھ والا دیکھ رہا ہو اور دوسرا آنکھ والا شخص اسے نہ دیکھے تو وہ صرف اس بات کا ثبوت ہے کہ آنکھ والا حقیقۃً آنکھ والا نہیں۔ کیونکہ اس دنیا میں یہ ممکن نہیں کہ جس چیز کو ایک آنکھ والا دیکھ لے اس کو دوسرا شخص آنکھ رکھتے ہوئے نہ دیکھ سکے۔

موت اس بات کا اعلان ہے کہ آدمی اس دنیا میں کامل طور پر بے اختیار ہے۔ موت ان تمام چیزوں کو باطل ثابت کر دیتی ہے جن کے سہارے آدمی انکار اور سرکشی کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ موت ایک طرف آدمی کو اپنے عجز اور دوسری طرف خدا کی قدرت کا تعارف کراتی ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ اس دنیا میں کوئی نہیں جس کو نفع دینے یا نقصان پہنچانے کا اختیار حاصل ہو۔ اس طرح موت آدمی کو ہر دوسری چیز سے کاٹ کر خدا کی طرف لے جاتی ہے۔ وہ مکمل طور پر انسان کو خدا کا پرستار بناتی ہے۔ اگر آدمی کے اندر سبق لینے کا ذہن ہو تو صرف موت کا واقعہ اس کی اصلاح کے لئے کافی ہو جائے۔

ہر انسان پر ایک وقت آتا ہے جب کہ وہ بے بسی کے ساتھ اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دیتا ہے۔ اسی طرح کسی انسان کے بس میں نہیں کہ وہ فائدہ اور نقصان کے معاملہ میں وہی ہونے دے جو وہ چاہتا ہے۔ وہ مطلوب فائدہ کو ہر حال میں پالے اور غیر مطلوب نقصان سے ہر حال میں محفوظ رہے۔

یہ صورت حال بتاتی ہے کہ انسان ایک بے اختیار مخلوق ہے۔ وہ ایک ایسی دنیا میں ہے جہاں کوئی اور بھی ہے جو اس کے اوپر حکمرانی کر رہا ہے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ۝ وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ۝

کہو، اے لوگو تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس حق آگیا ہے۔ جو ہدایت قبول کریگا وہ اپنے ہی لئے کرے گا اور جو بھٹکے گا تو اس کا وبال اسی پر آئے گا۔ اور میں تمہارے اوپر ذمہ دار نہیں ہوں۔ اور تم اس کی پیروی کرو جو تم پر وحی کی جاتی ہے اور صبر کرو یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ ۱۰۹ — ۱۰۸

دعوت کا کام اصلاً اعلان حق کا کام ہے۔ کسی گروہ کے اوپر اس وقت پیغام رسانی کا حق ادا ہو جاتا ہے جب کہ داعی امر حق کو دلیل کے ذریعہ پوری طرح واضح کر دے اور اسی کے ساتھ اس بات کا ثبوت دیدے کہ وہ اس معاملہ میں پوری طرح سنجیدہ ہے۔

داعی اگر وقت کے معیار کے مطابق امر حق کو مدلل کر دے۔ وہ نفع نقصان سے بے نیاز ہو کر حق کی مکمل گواہی دیدے۔ وہ ہر تکلیف اور ناخوش گواری کو برداشت کرتا ہوا اپنے دعوتی کام کو جاری رکھے تو اس کے بعد مخاطب کے اوپر وہ اتمام حجت ہو جاتا ہے جس کے بعد خدا کے یہاں کسی کے لئے کوئی عذر باقی نہ رہے۔

داعی کا کام اصلاً اتباع وحی ہے۔ یعنی اپنی ذات کی حد تک عملاً مرضی رب پر قائم رہتے ہوئے دوسروں کو مرضی رب کی طرف پکارتے رہنا۔ اس کام کو ہر حال میں حکمت اور صبر اور خیر خواہی کے ساتھ مسلسل جاری رکھنا ہے۔ اس کے بعد جتنے بقیہ مراحل ہیں وہ سب براہ راست طور پر خدا سے متعلق ہیں۔ داعی کی طرف سے کوئی دوسرا عملی اقدام صرف اس وقت درست ہے جب کہ خود خدا کی طرف سے اس کا فیصلہ کیا جا چکا ہو اور اس کے آثار ظاہر ہو جائیں۔

خدا کا فیصلہ ہمیشہ حالات کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔ جب خدا کے علم میں داعی کا دعوتی کام مطلوب حد کو پہنچ چکا ہوتا ہے تو خدا حالات میں ایسی تبدیلیاں پیدا کرتا ہے جن کو استعمال کر کے داعی اپنے عمل کے اگلے مرحلہ میں داخل ہو جائے۔

سُوْرَةُ هُوْدٍ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ مِائَةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ثَلٰثٌ وَعِشْرُوْنَ اٰيَةً وَعَشْرُ رُكُوْعَاتٍ

الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ﴿۱﴾ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ ﴿۲﴾ وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ؕ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ﴿۳﴾ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴﴾

آیاتہا ۱۲۳ — سورۃ ھود مکیہ — ۱۱ — رکوعاتہا ۱۰

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

ال ر۔ یہ کتاب ہے جس کی آیتیں پہلے محکم کی گئیں پھر ایک دانا اور خبیر ہستی کی طرف سے ان کی تفصیل کی گئی کہ تم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو۔ میں تم کو اس کی طرف سے ڈرانے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں۔ اور یہ کہ تم اپنے رب سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آؤ، وہ تم کو ایک مدت تک برتوائے گا اچھا برتوانا، اور ہر زیادہ کے مستحق کو اپنی طرف سے زیادہ عطا کرے گا۔ اور اگر تم پھر جاؤ تو میں تمہارے حق میں ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ تم سب کو اللہ کی طرف پلٹنا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۱—۴

قرآن کی دعوت یہ ہے کہ آدمی ایک اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرے۔ وہ ایک خدا کو اپنا سب کچھ بنائے۔ وہ اسی سے ڈرے اور اسی سے امید رکھے۔ اس کے ذہن و دماغ پر اسی کا غلبہ ہو۔ اپنی زندگی کے معاملات میں وہ سب سے زیادہ اس کی مرضی کا لحاظ کرے۔ وہ اپنے آپ کو عابد کے مقام پر رکھ کر خدا کو معبود کا مقام دینے پر راضی ہو جائے۔

پیغمبرانہ دعوت دراصل اسی چیز سے انسان کو باخبر کرنے کی دعوت ہے۔ قرآن میں اس کو انتہائی محکم زبان اور واضح اسلوب میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اب انسان سے جو چیز مطلوب ہے وہ یہ کہ وہ اس کے مقابلہ میں صحیح ردعمل پیش کرے۔ حسد، گھمنڈ، مصلحت بینی اور گروہ پرستی جیسی چیزوں کے زیر اثر آکر وہ اس کو نظر انداز نہ کر دے۔ بلکہ سیدھی طرح اس کو مان کر خدا کی طرف پلٹ آئے۔ وہ اپنی ماضی کی غلطیوں کے لئے خدا سے معافی مانگے اور مستقبل کے لئے خدا سے مدد

کی درخواست کرے۔

آدمی کے سامنے کھانا پیش کیا جائے اور وہ کھانے کو قبول کرلے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنی جسمانی پرورش کا انتظام کیا۔ اس کے برعکس اگر وہ کھانا قبول نہ کرے تو گویا اس نے اپنے آپ کو جسمانی پرورش سے محروم رکھا۔ ایسا ہی معاملہ دعوت حق کا ہے۔ جب آدمی حق کو قبول کرتا ہے تو درحقیقت وہ اس رزق ربانی کو قبول کرتا ہے جو اس کے اندر داخل ہو کر اس کی روح اور اس کے جسم کی صالح پرورش کا سبب بنے اور بالآخر اس کو روحانی ترقی کی اس منزل کی طرف لے جائے جو اس کو جنت کے باغوں کا مستحق بناتی ہے۔

جو شخص دعوت حق کو قبول نہ کرے اس نے گویا اپنی روح کو ربانی پرورش کے مواقع سے محروم کردیا۔ حق کو ماننے والا اگر تواضع میں جی رہا تھا تو یہ دوسرا شخص گھمنڈ کی نفسیات میں جئے گا۔ حق کو ماننے والے کے لمحات اگر خدا کی یاد میں بسر ہو رہے تھے تو اس کے لمحات غیر خدا کی یاد میں بسر ہوں گے۔ حق کو ماننے والا اگر مواقع حیات میں اطاعت خداوندی کا رویہ اختیار کیے ہوئے تھا تو یہ اس کی جگہ سرکشی کا رویہ اختیار کرے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پہلا شخص اس دنیا سے اس حال میں جائے گا کہ اس کی روح صحت مند اور ترقی یافتہ روح ہوگی اور جنت کی فضاؤں میں بسائے جانے کی مستحق ٹھہرے گی۔ اور دوسرے شخص کی روح بیمار اور پچھڑی ہوئی روح ہوگی اور صرف اس قابل ہوگی کہ اس کو جہنم کے کوڑا خانہ میں پھینک دیا جائے۔

أَلَا إِنَّهُمْ يَثْنُونَ صُدُورَهُمْ لِيَسْتَخْفُوا مِنْهُ ۚ أَلَا حِينَ يَسْتَغْشُونَ ثِيَابَهُمْ ۙ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ۚ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝ وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۚ كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُبِينٍ ۝

دیکھو، یہ لوگ اپنے سینوں کو لپیٹتے ہیں تاکہ اس سے چھپ جائیں۔ خبردار، جب وہ کپڑوں سے اپنے آپ کو ڈھانپتے ہیں، اللہ جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں۔ وہ دلوں کی بات تک جاننے والا ہے۔ اور زمین پر کوئی چلنے والا ایسا نہیں جس کی روزی اللہ کے ذمہ نہ ہو۔ اور وہ جانتا ہے جہاں کوئی ٹھہرتا ہے اور جہاں وہ سونپا جاتا ہے۔ سب کچھ ایک کھلی کتاب میں موجود ہے۔ ۶-۵

قریش کے بعض سرداروں نے ایسا کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے توحید کی دعوت پیش کی تو وہ بے پروائی کے ساتھ اٹھے۔ اپنی چادر اپنے اوپر ڈالی اور روانہ ہوگئے۔

یہ دراصل کسی بات کو نظر انداز کرنے کی ایک صورت ہے۔ کوئی آدمی جب داعی کو حقیر سمجھے اور اس کے مقابلہ میں اپنے کو برتر خیال کرے تو اس وقت وہ اسی قسم کا رویہ اختیار کرتا ہے۔ مگر آدمی بھول جاتا ہے کہ جس نفسیات کے تحت وہ ایسا کر رہا ہے وہ اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہے۔ یہ صرف ایک انسان (داعی) کو نظر انداز کرنا نہیں ہے بلکہ خود خدا کو نظر انداز کرنا ہے جو ہر کھلے اور چھپے کو جاننے والا ہے۔

پھر آدمی کا حال اس وقت کیا ہوگا جب وہ خدا کا سامنا کرے گا۔ وہ دیکھے گا کہ جس خدا کو اس نے نظر انداز کیا تھا وہی وہ ہستی تھا جس سے اس کو وہ سب کچھ ملا تھا جو اس کے پاس تھا۔ حتیٰ کہ وہ اسباب بھی جن کے بل پر اس نے خدا کی بات کو نظر انداز کر دیا تھا۔ آدمی خدا کی دنیا میں ہے اور بالآخر وہ خدا کی طرف جانے والا ہے۔ مگر وہ اس طرح رہتا ہے جیسے کہ نہ آج خدا سے اس کا کوئی تعلق ہے اور نہ آئندہ اس کا خدا سے کوئی واسطہ پڑنے والا ہے۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۗ وَلَئِنْ قُلْتَ إِنَّكُمْ مَّبْعُوثُونَ مِنْ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُولَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوٓا إِنْ هٰذَآ إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ۝ وَلَئِنْ أَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ إِلَىٰٓ أُمَّةٍ مَّعْدُودَةٍ لَّيَقُولُنَّ مَا يَحْبِسُهُ ۗ أَلَا يَوْمَ يَأْتِيهِمْ لَيْسَ مَصْرُوفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ۝ ع

اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ اور اس کا عرش پانی پر تھا، تاکہ تم کو آزمائے کہ کون تم میں اچھا کام کرتا ہے۔ اور اگر تم کہو کہ مرنے کے بعد تم لوگ اٹھائے جاؤ گے تو منکرین کہتے ہیں یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔ اور اگر ہم کچھ مدت تک ان کی سزا کو روک دیں تو کہتے ہیں کہ کیا چیز اس کو روکے ہوئے ہے۔ آگاہ، جس دن وہ ان پر آپڑے گا تو وہ ان سے پھیرا نہ جا سکے گا اور ان کو گھیرے گی وہ چیز جس کا وہ مذاق اڑا رہے تھے۔ ۷ — ۸

موجودہ دنیا کو خدا نے چھ دنوں، یعنی چھ ادوار (Periods) میں پیدا کیا ہے۔ زمین پر

ایک ایسا دور گزرا ہے جب کہ اس کی سطح پانی سے ڈھکی ہوئی تھی۔ خدا کی سلطنت کے اس حصہ میں اس وقت صرف پانی نظر آتا تھا۔ اس کے بعد خدا کے حکم سے خشکی کے علاقے ابھر آئے اور پانی سمندروں کی گہرائی میں جمع ہو گیا۔ اس طرح یہ ممکن ہوا کہ زمین پر موجودہ انواع حیات ظہور میں آئیں۔

خدا اگرچہ قادر ہے کہ واقعات کو اچانک ظاہر کر دے۔ مگر یہ دنیا انسان کے لئے بطور امتحان گاہ بنائی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے موجودہ دنیا کو منصوبہ کے تحت بنایا اور اپنی تخلیقات پر اسباب کا پردہ قائم رکھا۔

دنیا کی پیدائش اور اس پر انسان کی آبادکاری سے خدا کا مقصود اچھا عمل کرنے والے کا انتخاب ہے۔ "اچھا عمل" دراصل حقیقت پسندانہ عمل کا دوسرا نام ہے۔ یعنی کسی دباؤ کے بغیر وہ کرنا جو از روئے حقیقت آدمی کو کرنا چاہئے۔ حقیقت پسند شخص وہ ہے جو اسباب کے ظاہری پردہ سے گزر کر خدا کی چھپی ہوئی کارفرمائی کو دیکھ لے۔ بظاہر اختیار رکھتے ہوئے اپنے آپ کو بے اختیار کر لے۔ سرکشی کی زندگی گزارنے کا موقع رکھتے ہوئے خدا کا تابعدار بن جائے۔

موجودہ دنیا میں ایسے ہی حقیقت پسند انسانوں کا چناؤ ہو رہا ہے۔ جب چناؤ کی یہ مدت ختم ہوگی تو موجودہ نظام کو ختم کرکے دوسرا معیاری نظام بنایا جائے گا جہاں تمام اچھی چیزیں صرف اچھا عمل کرنے والوں کے لئے ہوں گی اور تمام بری چیزیں صرف برا عمل کرنے والوں کے لئے۔

اللہ تعالیٰ اپنے قانون مہلت کی وجہ سے منکروں اور سرکشوں کو فوراً نہیں پکڑتا۔ ان کو انتہائی حد تک موقع دیتا ہے کہ وہ یا تو متنبہ ہو کر اپنی اصلاح کر لیں یا آخری طور پر اپنے آپ کو مجرم ثابت کر دیں۔ یہ قانون مہلت بعض سرکشوں کے لئے غلط فہمی کا سبب بن جاتا ہے۔ وہ اپنی حیثیت کو بھول کر بڑی بڑی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ مگر جب وہ خدا کی پکڑ میں آجائیں گے اس وقت انہیں معلوم ہوگا کہ وہ خدا کے مقابلہ میں کس قدر بے بس تھے۔

وَلَئِنْ أَذَقْنَا الْإِنسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنَاهَا مِنْهُ إِنَّهُ لَيَئُوسٌ كَفُورٌ ۝ وَلَئِنْ أَذَقْنَاهُ نَعْمَاءَ بَعْدَ ضَرَّاءَ مَسَّتْهُ لَيَقُولَنَّ ذَهَبَ السَّيِّئَاتُ عَنِّي إِنَّهُ لَفَرِحٌ فَخُورٌ ۝ إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ ۝

اور اگر ہم انسان کو اپنی کسی رحمت سے نوازتے ہیں پھر اس سے اس کو محروم کر دیتے ہیں تو وہ مایوس اور ناشکرا بن جاتا ہے۔ اور اگر کسی تکلیف کے بعد جو اس کو پہنچی تھی، اس کو ہم نعمت سے نوازتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ ساری مصیبتیں مجھ سے دور ہو گئیں، وہ اترانے والا اور اکڑنے والا بن جاتا ہے۔ مگر جو لوگ

صبر کرنے والے اور نیک عمل کرنے والے ہیں ان کے لئے بخشش ہے اور بڑا اجر۔ ۱۱–۹

موجودہ دنیا میں آدمی کو کبھی راحت دی جاتی ہے اور کبھی مصیبت۔ مگر یہاں نہ راحت انعام کے طور پر ہے اور نہ مصیبت سزا کے طور پر۔ دونوں ہی کا مقصد جانچ ہے۔ یہ دنیا دارالامتحان ہے۔ یہاں انسان کے ساتھ جو کچھ پیش آتا ہے وہ صرف اس لئے ہوتا ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ مختلف حالات میں آدمی نے کس قسم کا ردعمل پیش کیا۔

وہ آدمی ناکام ہے جس کا حال یہ ہو کہ جب اس کو خدا کی طرف سے کوئی راحت پہنچے تو وہ فخر کی نفسیات میں مبتلا ہو جائے۔ اور جو افراد اس کو اپنے سے کم دکھائی دیں ان کے مقابلہ میں وہ اکڑنے لگے۔ اسی طرح وہ شخص بھی ناکام ہے کہ جب اس سے کوئی چیز چھنے اور وہ مصیبت کا شکار ہو تو وہ ناشکری کرنے لگے۔ کسی محرومی کے بعد بھی آدمی کے پاس خدا کی دی ہوئی بہت سی چیزیں موجود ہوتی ہیں۔ مگر آدمی ان کو بھول جاتا ہے اور کھوئی ہوئی چیز کے غم میں ایسا پست ہمت ہوتا ہے گویا اس کا سب کچھ لٹ گیا ہے۔

اس کے برعکس ایمان میں پورا اترنے والے وہ ہیں جو صابر اور صالح العمل ہوں۔ یعنی ہر جھٹکے کے باوجود اپنے آپ کو اعتدال پر باقی رکھیں اور وہی کریں جو خدا کا بندہ ہونے کی حیثیت سے انہیں کرنا چاہئے۔

صبر یہ ہے کہ آدمی کی نفسیات حالات کے زیر اثر نہ بنے بلکہ اصول اور نظریہ کے تحت بنے۔ حالات خواہ کچھ ہوں وہ ان سے بلند ہو کر خالص حق کی روشنی میں اپنی رائے بنائے۔ وہ حالات سے غیر متاثر رہ کر اپنے عقیدہ اور شعور کی سطح پر زندہ رہنے کی طاقت رکھتا ہو۔ اسی قسم کی زندگی نیک عملی کی زندگی ہے۔ جو لوگ اس نیک عملی کا ثبوت دیں وہی وہ لوگ ہیں جو اگلی زندگی میں خدا کی رحمتوں کے حصہ دار ہوں گے اور خدا کی ابدی جنتوں میں جگہ پائیں گے۔

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوحَىٰٓ إِلَيْكَ وَضَآئِقٌۢ بِهِۦ صَدْرُكَ أَن يَقُولُوا۟ لَوْلَآ أُنزِلَ عَلَيْهِ كَنزٌ أَوْ جَآءَ مَعَهُۥ مَلَكٌ ۚ إِنَّمَآ أَنتَ نَذِيرٌ ۚ وَٱللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ وَكِيلٌ ﴿١٢﴾ أَمْ يَقُولُونَ ٱفْتَرَىٰهُ ۖ قُلْ فَأْتُوا۟ بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِۦ مُفْتَرَيَٰتٍ وَٱدْعُوا۟ مَنِ ٱسْتَطَعْتُم مِّن دُونِ ٱللَّهِ إِن كُنتُمْ صَٰدِقِينَ ﴿١٣﴾ فَإِلَّمْ يَسْتَجِيبُوا۟ لَكُمْ فَٱعْلَمُوٓا۟

أَنَّمَا أُنزِلَ بِعِلْمِ اللَّهِ وَأَن لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ فَهَلْ أَنتُم مُّسْلِمُونَ ﴿١٤﴾

کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اس چیز کا کچھ حصہ چھوڑ دو جو تمہاری طرف وحی کی گئی ہے۔ اور تم اس بات پر دل تنگ ہو کہ وہ کہتے ہیں کہ اس پر کوئی خزانہ کیوں نہیں اتارا گیا یا اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا۔ تم تو صرف ڈرانے والے ہو اور اللہ ہر چیز کا ذمہ دار ہے۔ کیا وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اس کتاب کو گھڑ لیا ہے۔ کہو، تم بھی ایسی ہی دس سورتیں بنا کر لے آؤ اور اللہ کے سوا جس کو بلا سکو بلا لو، اگر تم سچے ہو۔ پس اگر وہ تمہارا کہا پورا نہ کر سکیں تو جان لو کہ یہ اللہ کے علم سے اترا ہے اور یہ کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، پھر کیا تم حکم مانتے ہو۔ ۱۲—۱۴

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب شرک کی تردید کی اور لوگوں کو توحید کی طرف بلایا تو آپ کے مخاطبین بگڑ گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کی باتوں سے ان کے ان بڑوں پر زد پڑتی تھی جن کے دین کو انہوں نے اختیار کر رکھا تھا اور جن سے انتساب پر وہ فخر کرتے تھے۔ صورت حال یہ تھی کہ قدیم عربوں کے یہ اکابر تاریخی طور پر ان کی نظر میں باعظمت بنے ہوئے تھے، جب کہ پیغمبر اسلام کے ساتھ ابھی تاریخ کی عظمتیں شامل نہیں ہوئی تھیں۔ اس وقت آپ لوگوں کو ایک بے حیثیت انسان کے روپ میں نظر آتے تھے۔ عرب کے لوگ یہ دیکھ کر سخت برہم ہوتے تھے کہ ایک معمولی آدمی ایسی باتیں کہہ رہا ہے جس سے ان کے اکابر و اعاظم بے اعتبار ثابت ہو رہے ہیں۔

ایسی حالت میں داعی کے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ وہ، کم از کم وقتی طور پر، تنقیدی انداز سے پرہیز کرے اور صرف مثبت طور پر اپنا پیغام پیش کرے۔ "شاید تم وحی کے بعض حصہ کی تبلیغ چھوڑ دو گے" سے مراد وحی خداوندی کا یہی تنقیدی حصہ ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کو وضاحت مطلوب ہے اور تنقید کے بغیر وضاحت ممکن نہیں۔ پھر اگر حق کو پوری طرح کھولنے کے نتیجہ میں لوگ داعی کو استہزاء اور مخالفت کا موضوع بنائیں تو اس سے گھبرانے کی کیا ضرورت۔ مدعو کی طرف سے یہ مخالفانہ ردعمل تو دراصل وہ قیمت ہے جو کسی آدمی کو بے آمیز حق کا داعی بننے کے لئے اس دنیا میں ادا کرنی پڑتی ہے۔

خدا کے داعی کے برحق ہونے کا سب سے زیادہ یقینی ثبوت اس کا ناقابل تقلید کلام ہے۔ جو لوگ پیغمبر کو حقیر سمجھ رہے تھے اور یہ یقین کرنے کے لئے تیار نہ تھے کہ اس بظاہر معمولی آدمی کو وہ سچائی ملی ہے جو ان کے اکابر کو بھی نہیں ملی تھی، ان سے کہا گیا کہ پیغمبر کی صداقت کو اس معیار پر نہ جانچو کہ مادی اعتبار سے وہ کیسا ہے۔ بلکہ اس حیثیت سے دیکھو کہ وہ جس کلام کے ذریعہ اپنی

دعوت پیش کر رہا ہے وہ کلام اتنا عظیم ہے کہ تم اور تمہارے تمام اکابر مل کر بھی ویسا کلام نہیں بنا سکتے۔ یہ ناقابل تقلید امتیاز اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ پیغمبر خدا کی طرف سے بول رہا ہے۔ پیغمبر کے برسرِ حق ہونے کی اس واضح نشانی کے بعد آخر لوگوں کو خدا کا حکم بردار بننے میں کس چیز کا انتظار ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ﴿۱۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾

جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زینت چاہتے ہیں، ہم ان کے اعمال کا بدلہ دنیا ہی میں دیدیتے ہیں۔ اور اس میں ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جاتی۔ یہی لوگ ہیں جن کے لئے آخرت میں آگ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ انہوں نے دنیا میں جو کچھ بنایا تھا وہ برباد ہوا اور خراب گیا جو انہوں نے کمایا تھا۔ ۱۶—۱۵

دین کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ملاوٹی دین، دوسرا بے آمیز دین۔ ملاوٹی دین دراصل دنیا کے اوپر دین کا لیبل لگانے کا دوسرا نام ہے۔ وہ دنیا اور دین کے درمیان مصالحت کرنے سے وجود میں آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانہ میں ایسا ہوتا ہے کہ ملاوٹی دین کی بنیاد پر بڑے بڑے ادارے قائم ہوتے ہیں۔ مفاد پرست لوگ اس کے ذریعہ دین کے نام پر دنیا حاصل کر لیتے ہیں۔

بے آمیز دین کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ بے آمیز دین کی دعوت جب کسی ماحول میں اٹھتی ہے تو وہ صرف ایک نظری سچائی ہوتی ہے۔ معاشی مفادات اور قیادتی مصالح اس کے ساتھ جمع نہیں ہوتے۔ ایسی حالت میں جو لوگ ملاوٹی دین کے نام پر عزت اور مقام حاصل کئے ہوئے ہوں ان کے سامنے جب بے آمیز دین کی دعوت آتی ہے تو وہ سخت متوحش ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس کو اختیار کرنے کی صورت میں انہیں نظر آتا ہے کہ تمام دنیوی چیزیں ان سے چھن جائیں گی۔

اس اعتبار سے کسی ماحول میں بے آمیز دین کی دعوت کا اٹھنا وہاں ایک نازک امتحان کا برپا ہونا ہے۔ ایسے وقت میں جو لوگ دنیا کی عزت اور دنیا کے مفادات کو قابل ترجیح سمجھیں اور بے آمیز دین کا ساتھ نہ دیں ان کی ساری دوڑ دھوپ دنیا کے خانہ میں چلی جاتی ہے۔ کیونکہ انہوں نے

اس دین کا ساتھ دیا جس میں ان کے دنیوی مفادات محفوظ تھے۔ اور اس دین کا ساتھ نہ دیا جس میں انھیں اپنے دنیوی مفادات چھنتے ہوئے نظر آتے تھے۔ وہ بظاہر خواہ دینی سرگرمیوں میں مشغول ہوں، اصل مقصود کے اعتبار سے وہ دنیا کے حصول میں مشغول ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی کوششوں کا آخرت میں کوئی نتیجہ ملنا ممکن نہیں۔

انہوں نے اگرچہ اپنی سرگرمیوں کو دین کے نام سے موسوم کر رکھا تھا وہ اپنے قومی میلوں کے اوپر جشن دینی کا بورڈ لگاتے تھے۔ وہ اپنی قومی لڑائیوں کو مقدس جنگ کا نام دیتے تھے۔ وہ اپنی قیادتی نمائش کو دینی کانفرنس کہتے تھے، وہ اپنے سیاسی ہنگاموں کو مذہب کی اصطلاحات میں بیان کرتے تھے، وہ اپنے دنیوی جذبات کے تحت دھوم مچاتے تھے اور اس کو خدا اور رسول کے ساتھ جوڑتے تھے۔ مگر یہ ساری تعمیرات دنیا کی زمین میں تھیں، وہ آخرت کی زمین میں نہ تھیں، اس لئے قیامت کا زلزلہ انہیں بالکل برباد کر دے گا۔ اگلی دنیا میں ان کا کوئی انجام ان کے حصہ میں نہ آئے گا۔

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ۚ فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۤ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۷﴾

بھلا ایک شخص جو اپنے رب کی طرف سے ایک دلیل پر ہے، اس کے بعد اللہ کی طرف سے اس کے لئے ایک گواہ بھی آگیا، اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب رہنما اور رحمت کی حیثیت سے موجود تھی، ایسے ہی لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں اور جماعتوں میں سے جو کوئی اس کا انکار کرے تو اس کے وعدہ کی جگہ آگ ہے۔ پس تم اس کے بارہ میں کسی شک میں نہ پڑو۔ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے مگر اکثر لوگ نہیں مانتے۔ ۱۷

پیغمبر اسلام نے عرب میں توحید کی دعوت پیش کی تو کچھ لوگوں نے اس کو مانا اور زیادہ لوگ اس کے منکر ہو گئے۔ یہی ہر زمانہ میں دعوت حق کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔

خدا نے ہر آدمی کو فطرت صحیح پر پیدا کیا ہے۔ گرد و پیش کی دنیا میں ہر طرف ایسی نشانیاں

پھیلی ہوئی ہیں جو اپنے خالق کا اعلان کرتی ہیں اور اسی کے ساتھ اس کے تخلیقی منصوبہ کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ پھر انسانیت کے بالکل ابتدائی زمانہ سے خدا کے رسول آتے رہے اور خدا کی باتیں لوگوں کو بتاتے رہے۔ انہیں میں سے ایک پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ جن کی لائی ہوئی کتاب اب تک کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ اب جو شخص سنجیدہ ہو اور چیزوں سے سبق لینا جانتا ہو تو وہ حقیقت سے اتنا مانوس ہوگا کہ داعی جب اس کے سامنے حقیقت کا اعلان کرے گا تو فوراً وہ اس کو پہچان لے گا۔ اس کا دل اور اس کا دماغ حق کے حق ہونے پر گواہی دیں گے۔ وہ آگے بڑھ کر اس کو اس طرح اختیار کرلے گا جیسے وہ اس کے اپنے دل کی آواز ہو۔

مگر اکثر لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ چیزوں کو بہت زیادہ سنجیدگی کے ساتھ نہیں دیکھتے۔ وہ سطحی تماشوں اور وقتی دلچسپیوں میں پڑ کر اپنا مزاج بگاڑ لیتے ہیں۔ غیر متعلق چیزوں کی مصروفیت انہیں اس کا موقع نہیں دیتی کہ وہ داعی اور اس کی دعوت پر ٹھہر کر سوچیں۔ چنانچہ ان کے سامنے جب حق کی دعوت آتی ہے تو وہ اس کو پہچان نہیں پاتے۔ وہ اپنے بگڑے ہوئے مزاج کی بنا پر اس کے منکر بلکہ مخالف بن جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے خدا کی اور خدا کے تخلیقی منصوبہ کی ناقدری کی۔ ان کے لئے آخرت میں جہنم کی آگ کے سوا اور کچھ نہیں۔

انسانی فطرت، زمین و آسمان کے واقعات اور پچھلی آسمانی کتابیں قرآن کے حق ہونے کی گواہی دے رہی ہیں۔ اس کے بعد اگر لوگوں کی اکثریت اس کا انکار کرتی ہے تو اس کی وجہ منکرین کے اندر تلاش کی جائے گی نہ یہ کہ خود قرآن کے کتاب حق ہونے پر شک کیا جائے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ۚ أُولَٰئِكَ يُعْرَضُونَ عَلَىٰ رَبِّهِمْ وَيَقُولُ الْأَشْهَادُ هَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ كَذَبُوا عَلَىٰ رَبِّهِمْ ۚ أَلَا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ ﴿١٨﴾ الَّذِينَ يَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ ﴿١٩﴾ أُولَٰئِكَ لَمْ يَكُونُوا مُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ۘ يُضَاعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ۚ مَا كَانُوا يَسْتَطِيعُونَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوا يُبْصِرُونَ ﴿٢٠﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٢١﴾ لَا جَرَمَ أَنَّهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمُ الْأَخْسَرُونَ ﴿٢٢﴾

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ گھڑے۔ ایسے لوگ اپنے رب کے سامنے پیش ہوں گے اور گواہی دینے والے کہیں گے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ گھڑا تھا۔ سنو، اللہ کی لعنت ہے ظالموں کے اوپر۔ ان لوگوں کے اوپر جو اللہ کے راستہ سے لوگوں کو روکتے ہیں اور اس میں کجی ڈھونڈتے ہیں۔ یہی لوگ آخرت کے منکر ہیں۔ وہ لوگ زمین میں اللہ کو بے بس کرنے والے نہیں اور نہ اللہ کے سوا ان کا کوئی مددگار ہے، ان پر دوہرا عذاب ہوگا۔ وہ نہ سن سکتے تھے اور نہ دیکھتے تھے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا۔ اور وہ سب کچھ ان سے کھویا گیا جو انہوں نے گھڑ رکھا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ یہی لوگ آخرت میں سب سے زیادہ گھاٹے میں رہیں گے۔ ۲۲ — ۱۸

"خدا پر جھوٹ گھڑنے" سے مراد خدا کی ذات پر جھوٹ گھڑنا نہیں ہے۔ اس سے مراد خدا کی بات پر جھوٹ گھڑنا ہے۔ خدا اپنا پیغام سنانے کے لئے خود سامنے نہیں آتا بلکہ ایک انسان کی زبان سے اس کا اعلان کراتا ہے۔ یہ انسان اس وقت بظاہر ایک معمولی انسان ہوتا ہے، مگر اس کے کلام میں خدا کی واضح جھلکیاں ہوتی ہیں۔ اگر لوگ اس کو اس کے کلام کے اعتبار سے دیکھیں تو وہ اس کی عظمتوں میں خدا کو پالیں۔ مگر لوگوں کی سطحیت اور ظاہر پرستی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی نگاہیں سنانے والے کی معمولی حیثیت میں اٹک کر رہ جاتی ہیں۔ پیغام بر کا معمولی ہونا انھیں نظر آتا ہے مگر پیغام کا غیر معمولی ہونا انہیں دکھائی نہیں دیتا۔ چنانچہ وہ اس کو ایک عام انسان کا معاملہ سمجھ کر اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اس کی بات میں جھوٹے اعتراضات نکالتے ہیں۔ اور اس کو اس طرح نظر انداز کر دیتے ہیں جیسے کہ اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔

اس ظالمانہ رویہ کی اصل وجہ بے خوفی کی نفسیات ہے۔ لوگوں کو آخرت پر یقین نہیں۔ ان کے دلوں میں خدائے قہار وجبار کا خوف نہیں۔ اس لئے وہ اس پیغام کے بارہ میں سنجیدہ نہیں ہو پاتے۔ اور جس معاملہ میں آدمی سنجیدہ نہ ہو وہ اس کے متعلق صحیح رد عمل پیش کرنے میں ہمیشہ ناکام رہے گا۔

مگر لوگوں کی یہ غیر سنجیدگی اس وقت رخصت ہو جائے گی جب وہ قیامت میں مالک کائنات کے سامنے کھڑے ہوں گے۔ اس وقت ان کی موجودہ آزادی ان سے چھن چکی ہوگی۔ جن اسباب و وسائل کے بھروسہ پر وہ سرکش بنے ہوئے تھے وہ خدا کا ٹیپ ریکارڈر بن کر ان کے خلاف گواہی دینے لگیں گے۔ اس وقت عیاناً یہ کھل جائے گا کہ خدا کے داعی کو جو انہوں نے جھٹلایا تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ اس کو سمجھنے سے عاجز تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس کے بارہ میں سنجیدہ نہ تھے۔ قیامت کی ہولناکی اچانک انہیں سنجیدہ بنا دے گی۔ اس وقت اپنی بے بسی کے ماحول میں وہ اس بات کو پوری طرح سمجھ

لیں گے جس کو دنیا میں اپنی آزادی کے ماحول میں سمجھ نہیں پاتے تھے۔

اللہ نے انسان کو ایسی اعلیٰ صلاحیتیں دی ہیں کہ اگر وہ ان کو استعمال کرے تو وہ ہر بات کو اس کی گہرائی تک سمجھ سکتا ہے۔ اور اپنے دنیوی معاملات میں واقعۃً وہ ایسا ہی ثابت ہوتا ہے۔ مگر آخرت کے معاملہ میں آدمی کا حال یہ ہے کہ وہ کان رکھتے ہوئے بہرا بن جاتا ہے اور آنکھ رکھتے ہوئے اندھے پن کا ثبوت دیتا ہے۔

آدمی کی کامیابی اس کی سنجیدگی (Sincerity) کی قیمت ہے۔ جو لوگ دنیا کے معاملہ میں سنجیدہ ہوں وہ دنیا میں کامیاب رہتے ہیں۔ اسی طرح جو لوگ آخرت کے معاملہ میں سنجیدہ ہوں وہ آخرت میں کامیاب رہیں گے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَخْبَتُوا إِلَىٰ رَبِّهِمْ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢٣﴾ مَثَلُ الْفَرِيقَيْنِ كَالْأَعْمَىٰ وَالْأَصَمِّ وَالْبَصِيرِ وَالسَّمِيعِ ۚ هَلْ يَسْتَوِيَانِ مَثَلًا ۚ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿٢٤﴾

جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے اور اپنے رب کے سامنے عاجزی کی وہی لوگ جنت والے ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ان دونوں فریقوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اندھا اور بہرا ہو اور دوسرا دیکھنے اور سننے والا۔ کیا یہ دونوں یکساں ہو جائیں گے۔ کیا تم غور نہیں کرتے۔ ۲۳—۲۴

اخبات کے معنی ہیں عاجزی کرنا۔ عربی میں کہتے ہیں ھو خبیت القلب (وہ شکستہ دل ہے) یہی ایمان کا خلاصہ ہے۔ ایمان نہ کوئی وراثت ہے اور نہ کسی لفظی مجموعہ کی لسانی ادائگی۔ ایمان ایک دریافت ہے۔ آدمی جب اپنے سمع و بصر (بالفاظ دیگر شعور) کو استعمال کرکے خدا کو پاتا ہے اور اس کے مقابلہ میں اپنی حیثیت کا ادراک کرتا ہے تو اس وقت اس کے اوپر جو کیفیت طاری ہوتی ہے اسی کا نام عجز (اخبات) ہے۔ عجز خدا کے مقابلہ میں اپنی حیثیت واقعی کی پہچان کا لازمی نتیجہ ہے۔

ایمان، اخبات اور عمل صالح تینوں ایک ہی حقیقت کے مختلف پہلو ہیں۔ ایمان خدا کے وجود اور اس کی صفات کمال کی شعوری دریافت ہے۔ اخبات اس قلبی حالت کا نام ہے جو خدا کی دریافت کے نتیجہ میں لازماً آدمی کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ عمل صالح اسی شعور اور اسی کیفیت سے پیدا ہونے والی خارجی صورت ہے۔ آدمی جب خدا کے ذہن سے سوچتا ہے۔ جب اس کا دل خدائی کیفیات سے بھر جاتا ہے تو اس وقت اس کے عین فطری نتیجے کے طور پر اس کی ظاہری زندگی خدائی عمل میں

ڈھل جاتی ہے۔ اسی کا نام عمل صالح ہے۔ جو شخص ایمان، اخبات اور عمل صالح کا پیکر بن جائے وہی خدا کا مطلوب انسان ہے۔ اور وہی وہ انسان ہے جس کو جنت کے ابدی باغوں میں بسایا جائیگا۔

دنیا میں اعلیٰ ترین امتحانی حالات پیدا کر کے یہ دیکھا جا رہا ہے کہ کون اپنے آپ کو کیا ثابت کرتا ہے۔ ایک گروہ وہ ہے جس نے اپنے سمع و بصر (شعور) کو صحیح طور پر استعمال کر کے حقیقت واقعہ کو جانا اور اپنے آپ کو اس کے مطابق ڈھال لیا۔ یہ دیکھنے اور سننے والے لوگ ہیں۔ دوسرا گروہ وہ ہے جس نے اپنے سمع و بصر کو صحیح طور پر استعمال نہیں کیا۔ اس کو نہ حقیقت واقعہ کی معرفت حاصل ہوئی اور نہ وہ اپنے آپ کو اس کے مطابق ڈھال سکا۔ یہ اندھے اور بہرے لوگ ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں بالکل مختلف قسم کے انسان ہیں۔ اور دو مختلف انسانوں کا انجام ایک جیسا نہیں ہو سکتا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ اِنِّىْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲۵﴾ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۶﴾ فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۢ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿۲۷﴾

اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا کہ میں تم کو کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ یہ کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ میں تم پر ایک دردناک عذاب کے دن کا اندیشہ رکھتا ہوں۔ اس کی قوم کے سردار وں نے کہا، جنہوں نے انکار کیا تھا کہ ہم تو تم کو بس اپنے جیسا ایک آدمی دیکھتے ہیں۔ اور ہم نہیں دیکھتے کہ کوئی تمہارا تابع ہوا ہو سوائے ان کے جو ہم میں پست لوگ ہیں، بے سمجھے بوجھے۔ اور ہم نہیں دیکھتے کہ تم کو ہمارے اوپر کچھ بڑائی حاصل ہو، بلکہ ہم تو تم کو جھوٹا خیال کرتے ہیں۔ ۲۷ — ۲۵

خدا کے جتنے پیغمبر آئے، اسی لئے آئے کہ وہ انسان کو خدا کے تخلیقی منصوبہ سے آگاہ کریں۔ یہ منصوبہ کہ انسان موجودہ دنیا میں بغرض امتحان رکھا گیا ہے۔ یہاں اگرچہ بظاہر مختلف چیزوں کی عبادت کے مواقع ہیں۔ مگر اصل مطلوب صرف یہ ہے کہ انسان خدا کا عابد بنے۔ جو لوگ خدا کے عابد نہ بنیں وہ امتحان میں ناکام ہو گئے۔ ایسے لوگوں کے لئے مرنے کے بعد کی زندگی میں سخت عذاب ہے۔ حضرت نوح نے اپنی قوم کے لوگوں سے یہی بات کہی۔ وہ اس کے لئے نذیر مبین بن گئے۔ مگر

آپ کی قوم نے آپ کی بات نہیں مانی۔

اس کی وجہ لوگوں کی ظاہر پرستی تھی۔ انسان کی گمراہی کی نظریاتی طور پر بہت سی قسمیں ہیں۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے ہر دور کے انسانوں کی گمراہی صرف ایک رہی ہے۔ اور وہ ہے ظاہر پرستی یا دنیا پسندی۔ دنیا پرست لوگ، عین اپنے مزاج کے مطابق، دنیوی چیزوں کو حق اور ناحق کا معیار سمجھتے ہیں۔ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ فرض کر لیتے ہیں کہ جس کے پاس ظاہری رونقیں ہوں وہ حق پر ہے اور جو دنیا کی رونقوں سے محروم ہو وہ ناحق پر۔

خدا کا داعی جب اٹھتا ہے تو اپنے ہم عصروں کو وہ صرف انسانوں میں سے ایک انسان نظر آتا ہے۔ دنیوی اعتبار سے اس کے گرد و پیش بڑائی کا کوئی خصوصی نشان نہیں ہوتا۔ دوسری طرف یہ ہوتا ہے کہ وہ جس دین کا علم بردار ہوتا ہے اس کے ساتھ چونکہ ابھی تک دنیوی فائدے وابستہ نہیں ہوتے، اس لئے اس کی طرف بڑھنے والے زیادہ وہ تہی دست لوگ ہوتے ہیں جنہیں ایک "نئے دین" کو اختیار کرنے کے نتیجہ میں کچھ کھونا نہ پڑے۔ یہ صورت حال خاص طور پر، وقت کے بڑوں کے لئے، فتنہ بن جاتی ہے۔ وہ سمجھ لیتے ہیں کہ جب دنیا ان کے ساتھ نہیں ہے تو حق بھی ان کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ حتیٰ کہ قوم میں ایسے لوگ بھی نکلتے ہیں جو ان کو جھوٹا اور دھوکا باز کہنے سے بھی دریغ نہ کریں۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَيٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ﴿۲۹﴾ وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَلَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَاۤ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَاۤ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ وَّلَاۤ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْۤ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ ۚ اِنِّيْۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۱﴾

نوح نے کہا اے میری قوم، بتاؤ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک روشن دلیل پر ہوں اور اس نے مجھ پر اپنے پاس سے رحمت بھیجی ہے، مگر وہ تم کو نظر نہ آئی تو کیا ہم اس کو تم پر چپکا سکتے ہیں جب کہ تم

اس سے بیزار ہو۔ اور اے میری قوم، میں اس پر تم سے کچھ مال نہیں مانگتا۔ میرا اجر تو بس اللہ کے ذمہ ہے اور میں ہرگز ان کو اپنے سے دور کرنے والا نہیں جو ایمان لائے ہیں۔ ان لوگوں کو اپنے رب سے ملنا ہے۔ مگر میں دیکھتا ہوں تم لوگ جہالت میں مبتلا ہو۔ اور اے میری قوم، اگر میں ان لوگوں کو دھتکار دوں تو خدا کے مقابلہ میں کون میری مدد کرے گا۔ کیا تم غور نہیں کرتے۔ اور میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔ اور نہ میں غیب کی خبر رکھتا ہوں۔ اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ اور میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ جو لوگ تمہاری نگاہوں میں حقیر ہیں ان کو اللہ کوئی بھلائی نہیں دے گا۔ اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ ان کے دلوں میں ہے۔ اگر میں ایسا کہوں تو میں ہی ظالم ہوں گا۔ ۲۸ — ۳۱

یہاں "بینہ" سے مراد دلیل ہے اور رحمت سے مراد نبوت ہے (تفسیر النسفی) اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبر جب کسی قوم کو دعوت دیتا ہے تو وہ دو چیزوں کے اوپر کھڑا ہوتا ہے۔ دلیل اور نبوت۔ پیغمبر کے بعد کوئی داعی بھی اسی وقت داعی ہے جب کہ وہ انہیں دو چیزوں پر کھڑا ہو۔ اس فرق کے ساتھ کہ دلیل کے بعد دوسری چیز جو اس کے پاس ہوگی وہ بالواسطہ طور پر پیغمبر سے ملی ہوئی ہوگی۔ جب کہ پیغمبر کے پاس وہ براہ راست خدا کی طرف سے آئی ہے۔

قوم جس وقت خدا کے داعی کو یہ سمجھ کر نظر انداز کر دیتی ہے کہ اس کے یہاں ظاہری اعتبار سے کوئی قابل لحاظ چیز نہیں، عین اسی وقت اس کے پاس ایک بہت بڑی قابل لحاظ چیز موجود ہوتی ہے۔ اور وہ دلیل اور ہدایت ہے۔ دلیل اور ہدایت کی بڑائی کامل طور پر خدا کے داعی کے پاس موجود ہوتی ہے۔ مگر یہ بہرحال معنوی بڑائی ہے۔ اور جن لوگوں کی نگاہیں ظواہر میں اٹکی ہوئی ہوں ان کو معنوی بڑائی کیوں کر دکھائی دے گی۔

دعوت الی اللہ کا کام خالص اخروی کام ہے۔ اس کی صحیح کارکردگی کے لئے ضروری ہے کہ داعی اور مدعو کے درمیان زر اور زمین کے جھگڑے نہ ہوں۔ یہ ذمہ داری خود داعی کو لینی پڑتی ہے کہ اس کے اور مدعو کے درمیان معتدل فضا ہو۔ اور اس کی خاطر وہ ہر قسم کے مادی اور معاشی جھگڑے یک طرفہ طور پر ختم کر دے۔ جس داعی کا یہ حال ہو کہ وہ ایک طرف دعوت دے اور دوسری طرف مدعو سے دنیوی چیزوں کے لئے احتجاج اور مطالبہ بھی کر رہا ہو، وہ داعی نہیں، مسخرہ ہے۔ اس کی کوئی قیمت نہ مدعو کی نظر میں ہو سکتی ہے اور نہ خدا کی نظر میں۔

مدعو کا امتحان یہ ہے کہ وہ بظاہر ایک بے عظمت انسان کے اندر حق کی عظمت کو دیکھ لے۔ اسی طرح داعی کا امتحان یہ ہے کہ وہ کسی بے دین کا اس لئے استقبال نہ کرنے لگے کہ وہ مال وجاہ کا مالک ہے۔ اور کسی دین دار کو اس لئے ناقابل لحاظ نہ سمجھ لے کہ اس کے پاس دنیوی شان وشوکت

کی چیزیں موجود نہیں۔ داعی اگر ایسا کرے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ زبان سے آخرت کی اہمیت کا وعظ کہہ رہا ہے اور عمل سے دنیا کی اہمیت کا ثبوت دے رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اپنی تردید آپ ہے۔ اور جو شخص اپنی تردید آپ کرے اس کی بات کی دوسروں کی نظر میں کیا قیمت ہو سکتی ہے۔

قَالُوْا یٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ اِنَّمَا یَاْتِیْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ ﴿۳۳﴾ وَلَا یَنْفَعُكُمْ نُصْحِیْۤ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ یُرِیْدُ اَنْ یُّغْوِیَكُمْ ؕ هُوَ رَبُّكُمْ ۫ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۳۴﴾ؕ

انہوں نے کہا کہ اے نوح تم نے ہم سے جھگڑا کیا اور بہت جھگڑا کر لیا۔ اب وہ چیز لے آؤ جس کا تم ہم سے وعدہ کرتے رہے ہو، اگر تم سچے ہو۔ نوح نے کہا اس کو تو تمہارے اوپر اللہ ہی لائے گا اگر وہ چاہے گا اور تم اس کے قابو سے باہر نہ جا سکو گے۔ اور میری نصیحت تم کو فائدہ نہیں دے گی اگر میں تم کو نصیحت کرنا چاہوں جب کہ اللہ یہ چاہتا ہو کہ وہ تم کو گمراہ کرے۔ وہی تمہارا رب ہے اور اسی کی طرف تم کو لوٹ کر جانا ہے۔ ۳۲ — ۳۴

حضرت نوح نے اپنی قوم سے جدال (جھگڑا اور مناظرہ) نہیں کیا تھا۔ وہ سنجیدہ انداز میں اپنا ناصح پیغام ان کے سامنے پیش کر رہے تھے۔ مگر آپ کی سنجیدہ دعوت آپ کی قوم کو الٹی صورت میں نظر آرہی تھی۔ اس کی وجہ انسان کی یہ کمزوری ہے کہ جب اس کی اپنی ذات زد میں آرہی ہو تو وہ سنجیدگی کھو دیتا ہے۔ ایسی بات کو وہ دلیل اور ثبوت کے اعتبار سے نہیں دیکھتا۔ وہ بغیر سوچے سمجھے اس کو رد کر دیتا ہے۔ داعی حق کی ٹھوس دلیل بھی اس کو بحث وجدال معلوم ہونے لگتی ہے۔

"بہت جدال کر چکے" کا جملہ در اصل یہ بتانے کے لئے نہیں ہے کہ نوح نے کیا کہا تھا۔ بلکہ وہ اس کو بتاتا ہے کہ سننے والوں نے آپ کی بات کو کیا درجہ دیا تھا۔

اسی طرح مخالفین نوح کا عذاب کو طلب کرنا حقیقۃً عذاب کو طلب کرنا نہیں تھا۔ بلکہ حضرت نوح کا مذاق اڑانا تھا کہ دیکھو یہ شخص ایسی بات کہہ رہا ہے جو کبھی ہونے والی نہیں۔ وہ اپنی پوزیشن کو اتنا مستحکم سمجھتے تھے جس میں ان کے خیال کے مطابق کہیں سے عذاب آنے کی گنجائش نہ تھی۔ اسی ذہن کے تحت انہوں نے کہا کہ ہمارے انکار کی سزا میں جس عذاب کی تم خبر دیتے رہے

ہو وہ عذاب لاؤ۔ اور چونکہ ان کے نزدیک ایسا عذاب کبھی آنے والا نہ تھا اس لیے معناً اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم حق پر ہیں اور تم ناحق پر۔

حضرت نوح نے جواب دیا کہ تم معاملہ کو میری نسبت سے دیکھ رہے ہو اور چونکہ میں کمزور ہوں اس لئے تمہاری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ عذاب کبھی تمہارے اوپر آسکتا ہے۔ اگر معاملہ کو خدا کی نسبت سے دیکھتے تو تم یہ نہ کہتے۔ کیونکہ پھر تمہیں نظر آجاتا کہ اس دنیا میں ظالموں کے لئے عذاب کا آنا اتنا ہی یقینی ہے جتنا سورج کا نکلنا اور زلزلہ کا پھٹنا۔

داعیٔ حق کی بات کو ماننے کا تمام تر انحصار اس پر ہے کہ سننے والا اس کو کہنے والے کے اعتبار سے نہ دیکھے بلکہ جو کہا گیا ہے اس کے اعتبار سے دیکھے۔ چونکہ حضرت نوح کی قوم آپ کی بات کو بس ایک عام انسان کی بات سمجھ رہی تھی، اس لئے آپ نے فرمایا کہ اس ذہن کے تحت تم میری بات کی قدر وقیمت کبھی نہیں پا سکتے۔ اب تو تمہارے لئے اسی دن کا انتظار کرنا ہے جب کہ خدا براہ راست تمہارے سامنے آجائے۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ إِنِ افْتَرَيْتُهُ فَعَلَيَّ إِجْرَامِي وَأَنَا بَرِيءٌ مِّمَّا تُجْرِمُونَ ﴿٣٥﴾

کیا وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اس کو گھڑ لیا ہے۔ کہو کہ اگر میں نے اس کو گھڑا ہے تو میرا جرم میرے اوپر ہے اور جو جرم تم کر رہے ہو اس سے میں بری ہوں۔ ۳۵

جو لوگ کہتے تھے کہ پیغمبر نے یہ کلام خود گھڑ لیا ہے، یہ خدا کی طرف سے نہیں ہے، وہ وحی والہام کے منکر نہ تھے۔ حتیٰ کہ وہ ماضی کے رسولوں کو مانتے تھے۔ پھر انہوں نے ایسا کیوں کہا۔ یہ دراصل وحی کا انکار نہیں تھا۔ بلکہ صاحب وحی کا انکار تھا۔ جو شخص خدا کی طرف سے بول رہا تھا وہ دیکھنے میں ان کو ایک معمولی انسان دکھائی دیتا تھا۔ ان کا ظاہر پرست مزاج سمجھ نہیں پاتا تھا کہ ایسا ایک آدمی وہ شخص کیسے ہوسکتا ہے جس کو خدا نے اپنے پیغام کی پیغام بری کے لئے چنا ہو۔

"میرا جرم میرے اوپر، تمہارا جرم تمہارے اوپر" یہ دراصل کلمۂ رخصت ہے۔ جب مخاطب دلیل سے بات کو نہیں مانتا۔ ہر قسم کی وضاحت کے باوجود وہ انکار پر تلا ہوا ہے تو داعی محسوس کرتا ہے کہ اس کے لئے اب آخری چارہ کار صرف یہ ہے کہ وہ یہ کہہ کر خاموش ہوجائے کہ میں اور تم دونوں حاکم اصلی کے سامنے پیش ہونے والے ہیں۔ وہاں ہر ایک کا حال کھل

جائے گا۔ اور ہر آدمی اپنی حقیقت کے اعتبار سے جیسا تھا اس کے مطابق اسے بدلہ دیا جائے گا۔
جب دلیل کی حد ختم ہو جائے تو داعی کے لئے اس کے سوا کوئی صورت باقی نہیں رہتی کہ وہ یقین کی زبان میں کلام کرکے علیٰحدگی اختیار کرلے۔

وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ ۫ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ۭ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ﴿۳۸﴾ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۳۹﴾

اور نوح کی طرف وحی کی گئی کہ اب تمہاری قوم میں سے کوئی ایمان نہیں لائے گا سوا اس کے جو ایمان لا چکا۔ پس تم ان کاموں پر غمگین نہ ہو جو وہ کر رہے ہیں۔ اور ہمارے روبرو اور ہمارے حکم سے تم کشتی بناؤ اور ظالموں کے حق میں مجھ سے بات نہ کرو، بیشک یہ لوگ غرق ہوں گے۔ اور نوح کشتی بنانے لگا۔ اور جب اس کی قوم کا کوئی سردار اس پر گذرتا تو وہ اس کی ہنسی اڑاتا، انہوں نے کہا اگر تم ہم پر ہنستے ہو تو ہم بھی تم پر ہنس رہے ہیں۔ تم جلد جان لوگے کہ وہ کون ہیں جن پر وہ عذاب آتا ہے جو اس کو رسوا کردے اور اس پر وہ عذاب اترتا ہے جو دائمی ہے۔ ۳۶ — ۳۹

انسان سے جو ایمان مطلوب ہے وہ ایمان وہ ہے جب کہ آدمی شعوری طور پر اپنے آزادانہ فیصلہ سے ایمان قبول کرے۔ پیغمبر کے طویل دعوتی عمل کے باوجود جو لوگ ایمان نہ لائیں وہ ایسا کرکے یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ آزادانہ فیصلہ کے تحت خدا کے مومن بننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے دوسرا مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی آزادی چھین لی جائے اور ان کو لے جا کر براہ راست خدائے ذوالجلال کے سامنے کھڑا کر دیا جائے تاکہ جس چیز کا انہوں نے مومنانہ اقرار نہیں کیا تھا، اس کا وہ مجرمانہ اقرار کریں اور اپنی سرکشی کی سزا بھگتیں۔

حضرت نوح کی سیکڑوں سال کی تبلیغ کے بعد ان کی قوم کے لئے یہ وقت آگیا تھا۔ اس

کے بعد حضرت نوح سے کہہ دیا گیا کہ اب تبلیغ کے کام سے فارغ ہو کر کشتی تیار کرو تاکہ جب سرکشوں کو غرق کرنے کے لئے خدا کا سیلاب آئے تو اس وقت تم اور تمہارے ساتھی اہل ایمان اس میں پناہ لے سکیں۔

حضرت نوح نے ایک بہت بڑی تین منزلہ کشتی تیار کی۔ اس کو بنانے میں کئی سال لگ گئے۔ جس زمانہ میں حضرت نوح اپنے چند ساتھیوں کو لیکر کشتی بنا رہے تھے تو قوم کے سرکش لوگ آتے جاتے ہوئے اسے دیکھتے۔ چونکہ وہ لوگ عذاب کی بات کو محض فرضی سمجھ رہے تھے اس لئے جب انہوں نے دیکھا کہ آنے والے مفروضہ عذاب سے بچنے کے لئے کشتی بھی تیار کی جارہی ہے تو وہ حضرت نوح کا اور بھی زیادہ مذاق اڑانے لگے۔

ایک آدمی سرکشی اور ناانصافی کے ذریعہ دولت سمیٹ رہا ہو تو ظاہر پرست آدمی اس کے گرد دنیا کا ساز و سامان دیکھ کر اس کو کامیاب سمجھ لے گا۔ مگر جو شخص جانتا ہو کہ دنیا کا نظام اخلاقی قوانین پر چل رہا ہے، وہ مذکورہ شخص کی وقتی کامیابی میں مستقبل کی عظیم تباہی کا منظر دیکھ رہا ہوگا —— قوم نوح کے ظاہر پرست لوگ اگرچہ حضرت نوح کا مذاق اڑا رہے تھے، مگر حقیقتِ واقعہ کی نظر میں خود ان کا مذاق اڑ رہا تھا۔

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ۭ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿۴۰﴾ وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۴۱﴾ وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۣ وَنَادٰي نُوْحُۨ ابْنَهٗ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۲﴾ قَالَ سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَاۗءِ ۭ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ﴿۴۳﴾ وَقِيْلَ يٰٓاَرْضُ ابْلَعِيْ مَاۗءَكِ وَيٰسَمَاۗءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ الْمَاۗءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَي الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾

کر حفص بفتح المیم و امالۃ الرا ۱۲

یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آپہنچا اور طوفان ابل پڑا ہم نے نوح سے کہا کہ ہر قسم کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا کشتی میں رکھ لو اور اپنے گھر والوں کو بھی، سوا ان اشخاص کے جن کی بابت پہلے کہا جاچکا ہے اور سب ایمان والوں کو بھی۔ اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو نوح کے ساتھ ایمان لائے تھے۔ اور نوح نے کہا کہ کشتی میں سوار ہو جاؤ، اللہ کے نام سے اس کا چلنا ہے اور اس کا ٹھہرنا بھی۔ بیشک میرا رب بخشنے والا مہربان ہے۔ اور کشتی پہاڑ جیسی موجوں کے درمیان ان کو لیکر چلنے لگی۔ اور نوح نے اپنے بیٹے کو پکارا جو اس سے الگ تھا۔ اے میرے بیٹے، ہمارے ساتھ سوار ہو جا اور کافروں کے ساتھ مت رہ۔ اس نے کہا میں کسی پہاڑ کی پناہ لے لوں گا جو مجھ کو پانی سے بچا لے گا۔ نوح نے کہا کہ آج کوئی اللہ کے حکم سے بچانے والا نہیں مگر وہ جس پر اللہ رحم کرے۔ اور دونوں کے درمیان موج حائل ہوگئی اور وہ ڈوبنے والوں میں شامل ہو گیا۔ اور کہا گیا کہ اے زمین، اپنا پانی نگل لے اور اے آسمان تھم جا۔ اور پانی سکھا دیا گیا۔ اور معاملہ کا فیصلہ ہو گیا اور کشتی جودی پہاڑ پر ٹھہر گئی اور کہہ دیا گیا کہ دور ہو ظالموں کی قوم۔ ۴۴ ۔ ۴۰

جب کشتی بن کر تیار ہو گئی تو خدا کے حکم سے طوفانی ہوائیں چلنے لگیں۔ زمین سے پانی کے دہانے پھوٹ پڑے۔ اوپر سے مسلسل بارش ہونے لگی۔ یہاں تک کہ ہر طرف پانی ہی پانی ہو گیا۔ تمام لوگ اس میں ڈوب گئے۔ صرف وہ چند انسان اور کچھ مویشی بچے جو حضرت نوح کی کشتی میں سوار تھے۔ حتی کہ حضرت نوح کا بیٹا بھی غرق ہو گیا ـــــ خدا کی نظر میں کسی کی قیمت اس کے عمل کے اعتبار سے ہے نہ کہ رشتہ کے اعتبار سے، خواہ وہ رشتہ پیغمبر کا کیوں نہ ہو۔

جب تمام ڈوبنے والے ڈوب چکے تو خدا نے حکم دیا کہ طوفان تھم جائے، اور طوفان تھم گیا۔ پانی سمندروں اور دریاؤں میں چلا گیا اور زمین دوبارہ رہنے کے قابل ہو گئی۔

طوفان نوح کے موقع پر دیکھنے والوں نے یہ منظر دیکھا کہ اونچے پہاڑ پر چڑھنے والے ڈوب گئے اور ہولناک موجوں کے باوجود کشتی میں بیٹھنے والے سلامت رہے۔ اس کی وجہ خود پہاڑ میں یا کشتی میں نہ تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ حکم خداوندی کا معاملہ تھا۔ حکم خداوندی اگر پہاڑ کے ساتھ ہوتا تو پہاڑ اپنے چڑھنے والوں کو بچاتا اور کشتی کا سہارا لینے والے ہلاک ہو جاتے۔ مگر اس موقع پر حکم خداوندی کشتی کے ساتھ تھا۔ اس لئے کشتی والے محفوظ رہے اور دوسری چیزوں کی پناہ لینے والے غرق ہو گئے۔

دنیا میں اسباب کا نظام محض ایک پردہ ہے۔ ورنہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے براہ راست خدا کے حکم سے ہو رہا ہے۔ انسان کا امتحان یہ ہے کہ وہ ظاہری پردہ سے گزر کر اصل حقیقت کو دیکھ

لے۔ وہ اسباب کے اندر خدائی طاقتوں کو کام کرتا ہوا پا لے۔

وَ نَادٰی نُوۡحٌ رَّبَّہٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابۡنِیۡ مِنۡ اَہۡلِیۡ وَ اِنَّ وَعۡدَکَ الۡحَقُّ وَ اَنۡتَ اَحۡکَمُ الۡحٰکِمِیۡنَ ﴿۴۵﴾ قَالَ یٰنُوۡحُ اِنَّہٗ لَیۡسَ مِنۡ اَہۡلِکَ ۚ اِنَّہٗ عَمَلٌ غَیۡرُ صَالِحٍ ٭۫ۖ فَلَا تَسۡـَٔلۡنِ مَا لَیۡسَ لَکَ بِہٖ عِلۡمٌ ؕ اِنِّیۡۤ اَعِظُکَ اَنۡ تَکُوۡنَ مِنَ الۡجٰہِلِیۡنَ ﴿۴۶﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّیۡۤ اَعُوۡذُ بِکَ اَنۡ اَسۡـَٔلَکَ مَا لَیۡسَ لِیۡ بِہٖ عِلۡمٌ ؕ وَ اِلَّا تَغۡفِرۡ لِیۡ وَ تَرۡحَمۡنِیۡۤ اَکُنۡ مِّنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ﴿۴۷﴾

اور نوح نے اپنے رب کو پکارا اور کہا کہ اے میرے رب، میرا بیٹا میرے گھر والوں میں ہے، اور بیشک تیرا وعدہ سچا ہے۔ اور تو سب سے بڑا حاکم ہے۔ خدا نے کہا اے نوح، وہ تیرے گھر والوں میں نہیں۔ اس کے کام خراب ہیں۔ پس مجھ سے اس چیز کے لیے سوال نہ کرو جس کا تمہیں علم نہیں۔ میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ تم جاہلوں میں سے نہ بنو۔ نوح نے کہا کہ اے میرے رب، میں تیری پناہ چاہتا ہوں کہ تجھ سے وہ چیز مانگوں جس کا مجھے علم نہیں۔ اور اگر تو مجھے معاف نہ کرے اور مجھ پر رحم نہ فرمائے تو میں برباد ہو جاؤں گا۔ ۴۵ — ۴۷

طوفان نوح میں جو لوگ غرق ہوئے ان میں خود حضرت نوح کا بیٹا کنعان بھی تھا۔ حضرت نوح نے اس کو اپنی کشتی میں بٹھانا چاہا۔ مگر اس کے لئے ڈوبنا مقدر تھا اس لئے وہ نہیں بیٹھا۔ پھر انہوں نے اس کے بچاؤ کے لئے خدا سے دعا کی تو جواب ملا کہ یہ نادانی کا سوال ہے، ایسے سوالات نہ کرو۔

اصل یہ ہے کہ خدا کا فیصلہ اس بنیاد پر نہیں ہوتا کہ جو لوگ بزرگوں کی اولاد ہیں۔ یا جو کسی حضرت کا دامن تھامے ہوئے ہیں ان سب کو نجات یافتہ قرار دے کر جنتوں میں داخل کر دیا جائے۔ خدا کے یہاں نجات کا فیصلہ خالص عمل کی بنیاد پر ہوتا ہے نہ کہ نسبی یا گروہی تعلق کی بنیادوں پر۔

دنیا میں اگر نسبی رشتہ کا اعتبار ہے تو آخرت میں اخلاقی رشتہ کا اعتبار۔ طوفان نوح اسی لئے آیا تھا کہ انسانوں کے درمیان دوسری تمام تقسیمات کو توڑ کر اخلاقی تقسیم قائم کر دے۔ جو عمل صالح والے لوگ ہیں ان کو خدائی کشتی میں بٹھا کر بچا لیا جائے اور غیر عمل صالح والے تمام لوگوں کو طوفان کی بے رحم موجوں کے حوالے کر دیا جائے۔ یہی واقعہ دوبارہ قیامت میں زیادہ بڑے پیمانہ پر اور زیادہ کامل طور پر ہوگا۔

قِيلَ يٰنُوحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ۭ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ڕ فَاصْبِرْ ڕ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝

کہا گیا کہ اے نوح، اترو، ہماری طرف سے سلامتی کے ساتھ اور برکتوں کے ساتھ، تم پر اور ان گروہوں پر جو تمہارے ساتھ ہیں۔ اور (ان سے ظہور میں آنے والے) گروہ کہ ہم ان کو فائدہ دیں گے، پھر ان کو ہماری طرف سے ایک دردناک عذاب پکڑ لے گا۔ یہ غیب کی خبریں ہیں جن کو ہم تمہاری طرف وحی کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے نہ تم ان کو جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم۔ پس صبر کرو بے شک آخری انجام ڈرنے والوں کے لیے ہے۔ ۴۸ — ۴۹

جب تمام برے لوگ غرق ہو چکے تو طوفان تھم گیا۔ پانی دھیرے دھیرے زمین میں اور سمندروں میں چلا گیا۔ حضرت نوح کی کشتی جودی پہاڑ پر ٹھہر گئی تھی، آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس سے نکل کر زمین پر اترے۔ زمین دوبارہ خدا کے حکم سے سرسبز اور آباد ہوگئی۔

حضرت نوح جن لوگوں کے درمیان آئے وہ حضرت آدم کی نبوت کو ماننے والے لوگ تھے۔ آپ کے بعد آپ کی امت ابتداءً راہ راست پر رہی۔ اس کے بعد اس کی اگلی نسلوں میں بگاڑ آیا تو دوبارہ انبیاء بھیجے گئے۔ یہ بعد کو آنے والے انبیاء ان قوموں میں آئے جو حضرت نوح کی نبوت کو مانتی تھیں۔ اس کے باوجود جب انہوں نے وقت کے نبی کو مان کر اپنی اصلاح نہ کی تو وہ ہلاک کر دی گئیں۔ گویا صرف کسی نبی کو ماننا یا اس کی طرف اپنے کو منسوب کرنا نجات یافتہ ہونے کے لیے کافی نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایمان مطلوب ہے جو زندہ ایمان ہو اور جس کے اندر یہ طاقت ہو کہ وہ آدمی کی زندگی کو نیک عملی کی زندگی میں تبدیل کر دے۔

حضرت نوح کی تاریخ یہ سبق دیتی ہے کہ باطل پرستوں کا زور خواہ کتنا ہی زیادہ ہو اور ان کی زندگی خواہ کتنی ہی طویل ہو جائے۔ بالآخر ان کے لیے جو چیز مقدر ہے وہ ہلاکت ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں اہل ایمان خواہ کتنے ہی کم ہوں اور خواہ وہ بظاہر کتنے ہی بے زور ہوں۔ مگر جب خدا کا فیصلہ ظاہر ہوتا ہے تو یہی لوگ ہیں جو خدا کی رحمتوں میں حصہ دار بنائے جاتے ہیں، ابتداءً موجودہ دنیا میں اور آخری طور پر آخرت میں۔

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۭ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اِنْ اَنْتُمْ

إِلَّا مُفْتَرُونَ ﴿٥٠﴾ يَٰقَوْمِ لَآ أَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ۖ إِنْ أَجْرِىَ إِلَّا عَلَى ٱلَّذِى فَطَرَنِىٓ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٥١﴾ وَيَٰقَوْمِ ٱسْتَغْفِرُوا۟ رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوٓا۟ إِلَيْهِ يُرْسِلِ ٱلسَّمَآءَ عَلَيْكُم مِّدْرَارًا وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلَىٰ قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا۟ مُجْرِمِينَ ﴿٥٢﴾

اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ھود کو بھیجا۔ اس نے کہا کہ اے میری قوم، اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ تم نے محض جھوٹ گھڑ رکھے ہیں۔ اے میری قوم، میں اس پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ میرا اجر تو اس پر ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ کیا تم نہیں سمجھتے۔ اور اے میری قوم، اپنے رب سے معافی چاہو، پھر اس کی طرف پلٹو۔ وہ تمہارے اوپر خوب بارشیں برسائے گا۔ اور تمہاری قوت پر مزید قوت کا اضافہ کرے گا۔ اور تم مجرم ہو کر روگردانی نہ کرو۔ ۵۰—۵۲

قوم عاد کی ھدایت کے لئے حضرت ھود کو اٹھایا گیا جو انہیں کے بھائی تھے۔ یہ پیغمبروں کے باب میں ہمیشہ سے اللہ تعالیٰ کی سنت رہی ہے۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ قوم کا فرد ہونے کی وجہ سے وہ بخوبی طور پر قوم کی نفسیات، اس کے حالات اور اس کی زبان کو جانتے ہیں اور زیادہ موثر طور پر اس کے اندر دعوت حق کا کام کر سکتے ہیں۔

حضرت ھود نے اپنی قوم کو ایک اللہ کی عبادت کا پیغام دیا۔ اسی کے ساتھ انہوں نے یہ بھی کہا کہ تمہارا جو دین ہے وہ محض ایک جھوٹ ہے جو تم نے گھڑ لیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبر کا طریقہ معروف معنوں میں صرف "مثبت طور پر" اپنی بات کہنے کا طریقہ نہیں ہے۔ بلکہ اسی کے ساتھ وہ کھلی کھلی تنقید بھی کرتا ہے۔ کیونکہ جب تک تنقید و تجزیہ کے ذریعہ ناحق کا ناحق ہونا واضح نہ کیا جائے اس وقت تک حق کا حق ہونا لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔

ہر پیغمبر کے زمانہ میں ایسا ہوا کہ اس کے مخالفین اس کی پیغمبری کو ماننے کے لئے یہ چاہتے تھے کہ وہ کوئی بڑا عہدیدار ہو، اس کو دولت کے خزانے حاصل ہوں، وہ عالی شان عمارتوں میں رہتا ہو۔ مگر حق کے داعی کو جانچنے کا یہ معیار صحیح نہیں۔ داعی کی صداقت جانچنے کا اصل معیار یہ ہے کہ وہ اپنے مشن میں پوری طرح سنجیدہ ہو، اس کی بات آخری حد تک مدلل ہو۔ وہ ہر قسم کی دنیوی غرض سے بالاتر ہو۔ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ عین حقیقت واقعہ ہو۔ اس کا پیغام کائناتی نظام سے کامل مطابقت رکھتا ہو۔ اس کو اختیار کرنا کامیابی کی شاہراہ پر چلنا ہو۔

تمہاری قوت پر مزید قوت کا اضافہ کرے گا۔ اس فقرہ کا مطلب مادی

قوت میں اضافہ نہیں ہے۔ کیونکہ قوم عاد اپنے زمانہ میں نہایت طاقتور تھی۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر نے جب ان کو عذاب سے ڈرایا تو انہوں نے کہا کہ ہم سے زیادہ طاقتور کون ہے (من اشد منا قوۃ، حم السجدہ ۱۵) اس لئے مادی قوت میں اضافہ کی بات، دعوتی اعتبار سے ان کے لئے زیادہ پرکشش نہیں ہو سکتی تھی۔

اس آیت میں قوت پر اضافہ کا مطلب ہے مادی قوت پر ایمانی قوت کا اضافہ۔ پیغمبر کا مطلب یہ تھا کہ اگر تم ایمانی زندگی اختیار کر لو تو اس سے تم کو اخلاقی اور روحانی قوت حاصل ہوگی۔ موجودہ مادی زور کے ساتھ اخلاقی اور روحانی زور ملنے سے تمہاری طاقت گھٹے گی نہیں۔ بلکہ وہ مزید بہت زیادہ بڑھ جائے گی۔

قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۳﴾ اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ؕ قَالَ اِنِّيْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا اَنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۵۵﴾ اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ ؕ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۶﴾

انہوں نے کہا کہ اے ھود، تم ہمارے پاس کوئی کھلی نشانی لے کر نہیں آئے ہو، اور ہم تمہارے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ اور ہم ہرگز تم کو ماننے والے نہیں ہیں۔ ہم تو یہی کہیں گے کہ تمہارے اوپر ہمارے معبودوں میں سے کسی کی مار پڑ گئی ہے۔ ھود نے کہا، میں اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ میں بری ہوں ان سے جن کو تم شریک کرتے ہو اس کے سوا۔ پس تم سب مل کر میرے خلاف تدبیر کرو، پھر مجھ کو مہلت نہ دو۔ میں نے اللہ پر بھروسہ کیا جو میرا رب ہے اور تمہارا رب بھی۔ کوئی جاندار ایسا نہیں جس کی چوٹی اس کے ہاتھ میں نہ ہو۔ بے شک میرا رب سیدھی راہ پر ہے۔ ۵۶ — ۵۳

قوم نے حضرت ہود سے کہا کہ تمہارے پاس اپنے برسر حق ہونے کی کوئی دلیل نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ فی الواقع بھی حضرت ہود کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی۔ آنجناب کے پاس یقیناً دلیل تھی، مگر وہ مخاطبین کو دلیل دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آدمی عام طور پر کسی

بات کو خالص دلیل کی بنیادوں پر جانچ نہیں پاتا۔ بلکہ اس اعتبار سے دیکھتا ہے کہ جو شخص اس کو پیش کر رہا ہے وہ کیسا ہے۔ چونکہ پیش کرنے والا اپنے زمانہ میں لوگوں کو ایک ناقابل لحاظ انسان دکھائی دیتا تھا اس لئے اس کی بات بھی لوگوں کو ناقابل لحاظ نظر آتی تھی۔

جب ایک شخص وقت کے جمے ہوئے مذہب کو چھوڑ کر خالص بے آمیز دین کی دعوت لیکر اٹھتا ہے تو ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ ماحول میں وہ اجنبی بلکہ حقیر بن کر رہ جاتا ہے۔ لوگ اس کو اس نظر سے دیکھتے ہیں جیسے وہ کوئی ایسا شخص ہو جس کو خلل دماغی کا عارضہ لاحق ہو گیا ہو۔ حضرت ہود کے معاملہ میں یہی صورت حال تھی جس کی وجہ سے ان کی قوم کے لوگوں کو یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ ——— "ہمارا تو خیال ہے کہ تمہارے اوپر ہمارے بزرگوں کی مار پڑ گئی ہے" مگر داعیٔ حق کی صداقت کا ثبوت، نظری دلائل کے بعد، ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے مخالفین ہر قسم کی کوششوں کے باوجود اس کو زیر نہیں کر پاتے۔

خدا کے پیغمبر جن قوموں میں آئے وہ سب خدا کو ماننے والی تھیں۔ گویا داعی بھی خدا پرست ہونے کا مدعی تھا اور مدعو بھی خدا پرست ہونے کا مدعی۔ ایسی حالت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا دونوں میں سے کس گروہ کے ساتھ ہے۔ اس سوال کا آسان جواب یہ ہے کہ خدا صراط مستقیم (سیدھی شاہراہ) پر ہے۔ اس لئے جو دین کے سیدھے خط پر چل رہا ہے وہ براہ راست خدا تک پہنچے گا اور جو ٹیڑھے راستوں پر چل رہا ہے اس کا راستہ ادھر ادھر بھٹک کر رہ جائے گا۔ وہ خدا تک پہنچنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

حضرت ہود نے جب کہا کہ "میرا رب صراط مستقیم پر ہے" تو دوسرے لفظوں میں گویا وہ یہ کہہ رہے تھے کہ میں جس چیز کی طرف بلا رہا ہوں وہ صراط مستقیم (دین کی شاہراہ) ہے۔ اور تم لوگ جن چیزوں کو دین سمجھ کر اختیار کئے ہوئے ہو وہ دین کی شاہراہ کے اطراف میں پگڈنڈیاں نکال کر ان کے اوپر دوڑنا ہے۔ اس قسم کی دوڑ آدمی کو خدا تک نہیں پہنچاتی، وہ اس کو ادھر ادھر بھٹکا کر چھوڑ دیتی ہے۔

ان آیات کی روشنی میں غور کیا جائے تو حضرت ہود کی بتائی ہوئی صراط مستقیم یہ نکلتی ہے ——— توحید، عبادت الٰہی، استغفار، توبہ، نعمتوں پر خدا کا شکر، توکل علی اللہ، خدا کو اپنا پروردگار ماننا، صرف خدا کو تمام طاقتوں کا مالک سمجھنا، خدا کو اپنے اوپر نگران بنا لینا۔ کبر کی روش کے بجائے اطاعت کی روش اختیار کرنا۔

یہ سب دین کی بنیادی تعلیمات ہیں۔ ان تعلیمات پر چلنا اور ان کو اپنی توجہ کا مرکز بنانا گویا دین کی شاہراہ پر چلنا ہے۔ اس پر چلنے والا سیدھے خدا تک پہنچتا ہے۔ اس کے سوا جن چیزوں کو آدمی اہمیت دے اور ان کی دھوم مچائے وہ گویا اصل شاہراہ کے دائیں بائیں پگڈنڈیاں نکال

کر ان کے اوپر دوڑ رہا ہے۔ ایسی دوڑ آدمی کو صرف خدا سے دور کرنے والی ہے، وہ اس کو خدا کے قریب نہیں پہنچا سکتی۔

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ مَا أُرْسِلْتُ بِهِ إِلَيْكُمْ ۚ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّونَهُ شَيْئًا ۚ إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَفِيظٌ ﴿٥٧﴾ وَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُودًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِنَّا وَنَجَّيْنَاهُمْ مِنْ عَذَابٍ غَلِيظٍ ﴿٥٨﴾ وَتِلْكَ عَادٌ ۖ جَحَدُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهُ وَاتَّبَعُوا أَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ ﴿٥٩﴾ وَأُتْبِعُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ أَلَا إِنَّ عَادًا كَفَرُوا رَبَّهُمْ ۗ أَلَا بُعْدًا لِعَادٍ قَوْمِ هُودٍ ﴿٦٠﴾

ع ۵ ۱۱

اگر تم اعراض کرتے ہو تو میں نے تم کو وہ پیغام پہنچا دیا جس کو دے کر مجھے تمہاری طرف بھیجا گیا تھا۔ اور میرا رب تمہاری جگہ تمہارے سوا کسی اور گروہ کو جانشین (خلیفہ) بنائے گا۔ تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے۔ بے شک میرا رب ہر چیز پر نگہبان ہے۔ اور جب ہمارا حکم آپہنچا، ہم نے اپنی رحمت سے بچا دیا ہود کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے۔ اور ہم نے ان کو ایک سخت عذاب سے بچا دیا۔ اور یہ عاد تھے کہ انہوں نے اپنے رب کی نشانیوں کا انکار کیا۔ اور اس کے رسولوں کو نہ مانا اور ہر سرکش اور مخالف کی بات کی اتباع کی۔ اور ان کے پیچھے لعنت لگا دی گئی اس دنیا میں اور قیامت کے دن۔ سن لو، عاد نے اپنے رب کا انکار کیا۔ سن لو، دوری ہے عاد کے لیے جو ہود کی قوم تھی۔ ۵۷ — ۶۰

جو لوگ خدا کی بات کو نظر انداز کر دیں، خدا بھی انہیں نظر انداز کر دیتا ہے۔ یہ واقعہ جو موجودہ دنیا میں جزئی طور پر پیش آتا ہے یہی قیامت میں کلی اور آخری طور پر پیش آئے گا۔ اس وقت تمام سرکش لوگ خدا کی رحمتوں سے دور کر دئے جائیں گے۔ اور خدا کی رحمت صرف ان لوگوں کا حصہ ہوگی جو دنیا کی زندگی میں خدا کے تابع اور وفادار بن کر رہے تھے۔

اس دنیا میں خدا نے "استخلاف" کا اصول رائج کیا ہے۔ یعنی ایک قوم کو ہٹانے کے بعد دوسری قوم کو اس کی جگہ زمین پر متمکن کرنا۔ دنیا میں یہ تمکن امتحان کی غرض سے وقتی طور پر ہوتا ہے۔

آخرت میں خدا کی معیاری دنیا میں یہ تمکن انعام کے طور پر مستقل طور پر سچے اہل ایمان کو حاصل ہوگا۔

موجودہ امتحانی دنیا کا نظام کچھ اس طرح بنا ہے کہ یہاں آدمی ہمیشہ خیر اور شر کے درمیان ہوتا ہے۔ اس کو آزادی ہوتی ہے کہ دونوں میں سے جس راہ کو چاہے اختیار کرے۔ مزید یہ کہ اکثر حالات میں اس دنیا میں شر کا غلبہ ہوتا ہے۔ خیر کی جانب صرف نشانیوں (نظری دلائل) کا زور ہوتا ہے۔ دوسری طرف شر کی جانب مادی طاقت موجود ہوتی ہے، وہ بھی اتنی بڑی مقدار میں کہ اس کے علم بردار سرکشی اور گھمنڈ میں مبتلا ہو کر ماحول کے اندر ایسی دباؤ کی فضا پیدا کرتے ہیں کہ عام آدمی حق کی طرف بڑھنے کی جرأت ہی نہ کرے۔

وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ هُوَ أَنشَأَكُم مِّنَ الْأَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيهَا فَاسْتَغْفِرُوهُ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ ۚ إِنَّ رَبِّي قَرِيبٌ مُّجِيبٌ ﴿٦١﴾ قَالُوا يَا صَالِحُ قَدْ كُنتَ فِينَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هَٰذَا ۖ أَتَنْهَانَا أَن نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا وَإِنَّنَا لَفِي شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ مُرِيبٍ ﴿٦٢﴾ قَالَ يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِن كُنتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي وَآتَانِي مِنْهُ رَحْمَةً فَمَن يَنصُرُنِي مِنَ اللَّهِ إِنْ عَصَيْتُهُ ۖ فَمَا تَزِيدُونَنِي غَيْرَ تَخْسِيرٍ ﴿٦٣﴾

اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو بھیجا۔ اس نے کہا، اے میری قوم، اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ اسی نے تم کو زمین سے بنایا، اور اس میں تم کو آباد کیا۔ پس معافی چاہو، پھر اس کی طرف رجوع کرو۔ بے شک میرا رب قریب ہے، قبول کرنے والا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اے صالح اس سے پہلے ہم کو تم سے امید تھی۔ کیا تم ہم کو ان کی عبادت سے روکتے ہو جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے تھے۔ اور جس چیز کی طرف تم ہم کو بلاتے ہو اس کے بارے میں ہم کو سخت شبہ ہے اور ہم بڑے خلجان میں ہیں۔ اس نے کہا کہ اے میری قوم بتاؤ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل پر ہوں اور اس نے مجھ کو اپنے پاس سے رحمت دی ہے تو مجھ کو خدا سے کون بچائے گا اگر میں اس کی نافرمانی کروں۔ پس تم کچھ نہیں بڑھاؤ گے میرا سوائے نقصان کے۔ ۶۱-۶۳

حضرت صالح نے اپنی قوم کو ایک خدا کی عبادت کی طرف بلایا۔ یہی ہر زمانہ میں تمام پیغمبروں کا مقصد تھا۔ مگر حضرت صالح کی قوم آپ کے پیغام کو قبول نہ کر سکی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ اس کو براہ راست خدا سے جوڑنے کی بات کرتے تھے، جب کہ قوم کا حال یہ تھا کہ وہ خدا کے نام پر صرف اپنے اعاظم و اکابر سے جڑی ہوئی تھی۔

ایسے لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مخصوص مزاج کی وجہ سے کسی چیز کی اہمیت اور معنویت صرف اس وقت سمجھ پاتے ہیں جب کہ ان کے قومی بزرگوں کے قول وعمل میں اس کی تصدیق مل جائے۔ اب چونکہ حضرت صالح کے پاس صرف دلیل کا زور تھا، ان کی قوم ان کی بات کی اہمیت کو محسوس نہ کر سکی۔ حضرت صالح جس دین کی طرف بلا رہے تھے اس کی اہمیت خدا کی وحی اور زمین و آسمان کی نشانیوں میں غور کرنے سے واضح ہوتی تھی۔ جب کہ ان کی قوم صرف اس دین کی اہمیت سے باخبر تھی جو اکابر قوم کے ملفوظات اور معمولات سے ثابت ہوتا ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی قوم آپ کے دلائل کے مقابلہ میں لاجواب ہو کر بھی بس ایک قسم کے شبہہ کی حالت میں پڑی رہی۔

حضرت صالح، دوسرے تمام پیغمبروں کی طرح، شخصیت اور ذہانت میں اپنی قوم کے ممتاز فرد تھے۔ لوگ امید رکھتے تھے کہ بڑے ہو کر وہ قوم کے ایک کار آمد فرد ثابت ہوں گے۔ مگر وہ بڑی عمر کو پہنچے تو انھوں نے قوم کے مروجہ مذہب پر تنقید شروع کر دی۔ یہ دیکھ کر قوم کے لوگوں کو ان کے بارہ میں سخت مایوسی ہوئی۔ انھوں نے کہا، ہم تو یہ سمجھے ہوئے تھے کہ تم ہمارے قائم شدہ مذہبی نظام کے ایک ستون بنو گے۔ اس کے برعکس ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ تم ہمارے مذہبی نظام کو بے بنیاد ثابت کرنے پر اپنا سارا زور لگائے ہوئے ہو— یہی معاملہ ہر دور میں خدا کے سچے داعیوں کو اپنی قوم کی طرف سے پیش آیا ہے۔

وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ﴿۶۴﴾ فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ﴿۶۵﴾ فَلَمَّا جَاۗءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِىِٕذٍ ۭ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴿۶۶﴾ وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۶۷﴾ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۭ

أَلَآ إِنَّ ثَمُودَا۟ كَفَرُوا۟ رَبَّهُمْ ۗ أَلَا بُعْدًا لِّثَمُودَ ﴿٦٨﴾

اور اے میری قوم، یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لئے ایک نشانی ہے۔ پس اس کو چھوڑ دو کہ وہ اللہ کی زمین میں کھائے۔ اور اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچاؤ ورنہ بہت جلد تم کو عذاب پکڑ لے گا۔ پھر انہوں نے اس کے پاؤں کاٹ ڈالے۔ تب صالح نے کہا کہ تین دن اور اپنے گھروں میں فائدہ اٹھالو۔ یہ ایک وعدہ ہے جو جھوٹا نہ ہوگا۔ پھر جب ہمارا حکم آگیا تو ہم نے اپنی رحمت سے صالح کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے بچالیا اور اس دن کی رسوائی سے (محفوظ رکھا)۔ بیشک تیرا رب ہی قوی اور زبردست ہے۔ اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا ان کو ایک ہولناک آواز نے پکڑ لیا پھر صبح کو وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔ جیسے کہ وہ کبھی ان میں بسے ہی نہیں۔ سنو، ثمود نے اپنے رب سے کفر کیا۔ سنو، پھٹکار ہے ثمود کے لئے۔ ۶۴ — ۶۸

حضرت صالح اپنی قوم سے کہتے تھے کہ میں خدا کا رسول ہوں۔ اگر تم نے میری بات نہ مانی تو تم خدا کی پکڑ میں آجاؤ گے۔ ان کی قوم اگرچہ خدا اور رسالت کی منکر نہ تھی مگر اس نے حضرت صالح کی بات کو ایک مذاق سمجھا۔ کیونکہ حضرت صالح کے پاس اپنی پیغمبری کو ثابت کرنے کے لئے صرف نظری دلیل تھی اور یہ انسان کی کمزوری ہے کہ وہ صرف نظری دلیل کی بنیاد پر بہت کم اس کے لئے تیار ہوتا ہے کہ ایک مانوس چیز کو چھوڑے اور دوسری غیر مانوس چیز کو اختیار کرلے۔

حضرت صالح کی قوم جب نظری نشانیوں کے آگے جھکنے پر تیار نہ ہوئی تو آخری مرحلہ میں اس کے مطالبہ کے مطابق اس کے لئے حسی نشانی بھی ظاہر کر دی گئی۔ یہ ایک اونٹنی تھی جو لوگوں کے سامنے ٹھوس چٹان کے اندر سے نکل آئی۔ ایسی نشانی کے بارہ میں خدا کا قانون ہے کہ جب وہ ظاہر کی جاتی ہے تو اس کے بعد لوگوں کے لئے امتحان کی مزید مہلت باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ حضرت صالح نے اعلان کر دیا کہ اب تم لوگ یا تو توبہ کرکے میری بات مان لو، ورنہ تم سب لوگ ہلاک کر دئے جاؤ گے۔ مگر جو لوگ نظری دلائل کی قوت کو محسوس نہ کرسکیں وہ حسی دلائل کو دیکھ کر بھی اس سے عبرت پکڑنے میں ناکام رہتے ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد بھی حضرت صالح کی قوم اپنی سرکشی سے باز نہ آئی۔ حتیٰ کہ اس نے خود اونٹنی کو مار ڈالا۔ اس کے بعد ان لوگوں کے لئے مزید مہلت کا سوال نہ تھا۔ چنانچہ وہ مٹا دی گئی۔

قوم صالح (ثمود) کا علاقہ شمال مغربی عرب (الحجر) تھا۔ حضرت صالح کو حکم ہوا کہ تم یہاں سے باہر چلے جاؤ۔ چنانچہ وہ اپنے مخلص ساتھیوں کو لے کر شام کی طرف چلے گئے۔ اس کے بعد ایک سخت زلزلہ آیا اور ساری قوم اس کی لپیٹ میں آکر بری طرح ہلاک ہوگئی۔

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ﴿٦٩﴾ فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ؕ ﴿٧٠﴾ وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ﴿٧١﴾ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰۤى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِىْ شَيْخًا ؕ اِنَّ هٰذَا لَشَىْءٌ عَجِيْبٌ ﴿٧٢﴾ قَالُوْۤا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ؕ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ﴿٧٣﴾

اور ابراہیم کے پاس ہمارے فرشتے خوش خبری لے کر آئے۔ کہا تم پر سلامتی ہو۔ ابراہیم نے کہا تم پر بھی سلامتی ہو۔ پھر دیر نہ گزری کہ ابراہیم ایک بُھنا ہوا بچھڑا لے آیا۔ پھر جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے کی طرف نہیں بڑھ رہے ہیں تو وہ کھٹک گیا اور دل میں ان سے ڈرا۔ انہوں نے کہا کہ ڈرو نہیں، ہم لوط کی قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ اور ابراہیم کی بیوی کھڑی تھی، وہ ہنس پڑی۔ پس ہم نے اس کو اسحاق کی خوش خبری دی اور اسحاق کے آگے یعقوب کی۔ اس نے کہا، اے خرابی، کیا میں بچہ جنوں گی، حالانکہ میں بڑھیا ہوں اور یہ میرا خاوند بھی بوڑھا ہے۔ یہ تو ایک عجیب بات ہے۔ فرشتوں نے کہا، کیا تم اللہ کے حکم پر تعجب کرتی ہو۔ ابراہیم کے گھر والو، تم پر اللہ کی رحمتیں اور برکتیں ہیں۔ بے شک اللہ نہایت قابل تعریف اور بڑی شان والا ہے۔ ۶۹ — ۷۳

حضرت ابراہیم کی عمر تقریباً سو سال ہو چکی تھی کہ ایک روز چند انتہائی خوبصورت نوجوان ان کے گھر میں داخل ہوئے۔ حضرت ابراہیم نے ان کو مہمان سمجھ کر فوراً ان کے کھانے کا انتظام کیا۔ مگر وہ انسان نہیں تھے بلکہ خدا کے فرشتے تھے۔ وہ بیک وقت دو مقصد کے لئے آئے تھے۔ ایک، حضرت ابراہیم کو اولاد کی بشارت دینا۔ دوسرے، حضرت لوط کی قوم کو ہلاک کرنا جو انکار اور سرکشی کی آخری حد پر پہنچ چکی تھی۔

حضرت ابراہیم اور ان کی اہلیہ کو اسحاق (بیٹے) اور یعقوب (پوتے) کی بشارت دینا عام معنوں میں محض اولاد کی بشارت نہ تھی۔ یہ صالح اور داعی انسانوں کا ایک گھرانا وجود میں لانا تھا۔ تاریخ کا تجربہ ہے کہ اکثر کوئی "گھرانا" ہوتا ہے جو دین حق کی خدمت کے لئے کھڑا ہوتا ہے۔ نبیوں کی تاریخ اور نبیوں کے بعد ان کے سچے پیرووں کے واقعات یہی بتاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ

ایک شخص جس پر سچائی کا انکشاف ہوتا ہے وہ اپنے زمانہ کے لوگوں کی نظر میں ایک معمولی انسان ہوتا ہے۔ اس بنا پر عام لوگوں کے لئے اس کے مقام کو پہچاننا اور اس کا ساتھ دینا بہت مشکل ہوتا ہے۔ مگر اس کے اپنے گھر والے کے لئے ذاتی رشتہ ایک مزید وجہ بن جاتا ہے۔ جس چیز کو باہر والے ظاہر بینی کی بنا پر دیکھ نہیں پاتے، گھر والے ذاتی تعلق کی بنا پر اس کو محسوس کر لیتے ہیں۔ اور اس کے مشن میں اس کے ساتھی بن جاتے ہیں۔

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ إِبْرَاهِيمَ الرَّوْعُ وَجَاءَتْهُ الْبُشْرَىٰ يُجَادِلُنَا فِي قَوْمِ لُوطٍ ﴿٧٤﴾ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّاهٌ مُنِيبٌ ﴿٧٥﴾ يَا إِبْرَاهِيمُ أَعْرِضْ عَنْ هَٰذَا ۖ إِنَّهُ قَدْ جَاءَ أَمْرُ رَبِّكَ ۖ وَإِنَّهُمْ آتِيهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُودٍ ﴿٧٦﴾

پھر جب ابراہیم کا خوف دور ہوا اور اس کو خوش خبری ملی تو وہ ہم سے قوم لوط کے بارہ میں جھگڑنے لگا۔ بیشک ابراہیم بڑا حلیم اور نرم دل تھا اور رجوع کرنے والا تھا۔ اے ابراہیم اس کو چھوڑو۔ تمہارے رب کا حکم آچکا ہے اور ان پر ایک ایسا عذاب آنے والا ہے جو لوٹایا نہیں جاتا۔ ۷۴ — ۷۶

حضرت ابراہیم کی یہ گفتگو ان فرشتوں سے ہوئی جو قوم لوط کو ہلاک کرنے کے لئے آئے تھے۔ چونکہ یہ فرشتے خدا کی طرف سے اور اس کے حکم کی تعمیل میں آئے تھے، اس لئے خدا نے اس کو اپنی طرف منسوب فرمایا۔ پیغمبر اور فرشتوں کے درمیان اس گفتگو کا ایک جزء سورۂ عنکبوت (آیت ۳۲) میں مذکور ہے۔ اور اس کا تفصیلی ذکر موجودہ بائبل (پیدائش باب ۱۸) میں آیا ہے۔

حضرت ابراہیم کی دعا قوم لوط کے حق میں منظور نہیں ہوئی۔ اسی طرح اس سے پہلے حضرت نوح کی دعا اپنے بیٹے کے لئے منظور نہیں ہوئی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغفرت کی دعا معروف معنوں میں کوئی سفارش نہیں ہے جو کہ ایک شخص دوسرے شخص کے لئے کرے۔ اور وہ دعا کرنے والے کی بزرگی کی بنا پر اس کے حق میں مان لی جائے۔

دعا خود اپنے آپ کو خدا کے سامنے پیش کرنا ہے۔ اگر حضرت نوح کے بیٹے یا حضرت لوط کی قوم کے لوگوں کے اندر خود دعا کا جذبہ ابھر آتا اور وہ اپنی نجات کے لئے خدا کو پکارتے تو یقیناً خدا انہیں معاف کر دیتا اور اپنی رحمت ان کی طرف بھیج دیتا۔ عذاب کا لوٹا دیا جانا ممکن ہے، جیسا کہ حضرت یونس کی قوم کی مثال سے ثابت ہوتا ہے۔ مگر وہ جب بھی لوٹے گا خود زیر سزا

افراد کی دعاؤں سے لوٹے گا نہ کہ کسی غیر شخص کی دعاؤں سے، خواہ یہ غیر شخص پیغمبر ہی کیوں نہ ہو۔
ایک شخص کو دوسرے شخص کے لئے بھی دعا کرنی چاہئے۔ اور ہر زمانہ میں پیغمبروں نے اور صالح لوگوں نے دوسروں کے لئے دعائیں کی ہیں۔ مگر یہ دعا حقیقۃً خود دعا کرنے والے کے حلیم اور اوّاہ اور منیب ہونے کا اظہار ہوتا ہے۔ اللہ کا ایک بندہ جو اللہ سے ڈرتا ہو وہ اللہ کے عذاب کو دیکھ کر کانپ اٹھتا ہے اور اپنے لئے اور دوسروں کے لئے دعائیں کرنے لگتا ہے۔ تاہم کسی کی دعا دوسرے کے حق میں اسی وقت مفید ہو گی جب کہ وہ خود بھی اللہ سے ڈر کر اللہ کو پکار رہا ہو۔

وَلَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِيءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَقَالَ هَٰذَا يَوْمٌ عَصِيبٌ ﴿٧٧﴾ وَجَاءَهُ قَوْمُهُ يُهْرَعُونَ إِلَيْهِ وَمِن قَبْلُ كَانُوا يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ ۚ قَالَ يَا قَوْمِ هَٰؤُلَاءِ بَنَاتِي هُنَّ أَطْهَرُ لَكُمْ ۖ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَلَا تُخْزُونِ فِي ضَيْفِي ۖ أَلَيْسَ مِنكُمْ رَجُلٌ رَّشِيدٌ ﴿٧٨﴾ قَالُوا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِي بَنَاتِكَ مِنْ حَقٍّ وَإِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيدُ ﴿٧٩﴾

اور جب ہمارے فرشتے لوط کے پاس پہنچے تو وہ گھبرایا اور ان کے آنے سے دل تنگ ہوا۔ اس نے کہا آج کا دن بڑا سخت ہے۔ اور اس کی قوم کے لوگ دوڑتے ہوئے اس کے پاس آئے۔ اور وہ پہلے سے برے کام کر رہے تھے لوط نے کہا اے میری قوم، یہ میری بیٹیاں ہیں، وہ تمہارے لئے زیادہ پاکیزہ ہیں۔ پس تم اللہ سے ڈرو اور مجھ کو میرے مہمانوں کے سامنے رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی بھلا آدمی نہیں ہے۔ انہوں نے کہا، تم جانتے ہو کہ ہم کو تمہاری بیٹیوں سے کچھ غرض نہیں، اور تم جانتے ہو کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ ۷۷ - ۷۹

حضرت لوط کے پاس جو فرشتے آئے وہ عذاب کے فرشتے تھے۔ مگر وہ نہایت خوبصورت نوجوانوں کی صورت میں بستی کے اندر داخل ہوئے۔ یہ دراصل ان کو آخری طور پر مجرم ثابت کرنے کے لئے تھا۔ آدمی جب مسلسل ایک برائی کرتا ہے تو اس کے بارہ میں وہ بالکل بے حس ہو جاتا ہے۔ یہی حال قوم لوط کا تھا۔ وہ اب کھلم کھلا بدکاری کرنے لگے تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے دیکھا کہ خوبصورت لڑکے حضرت لوط کے گھر آئے ہوئے ہیں تو وہ شہوت کے جذبات لئے ہوئے آپ کے گھر کی طرف دوڑ پڑے۔ انہوں نے انتہائی بے حیائی کے ساتھ مطالبہ شروع کیا کہ ان لڑکوں کو ہمارے حوالے

کردیا جائے۔

حضرت لوط نے شریر لوگوں کو اس طرح آتے ہوئے دیکھا تو آپ پر سخت شرم اور غیرت طاری ہوئی۔ آپ نے کہا "یہ قوم کی بیٹیاں ہیں، ان میں سے جس سے چاہو نکاح کرلو اور اپنی فطری خواہش پوری کرو۔" کسی قوم میں جو بڑے بوڑھے ہوتے ہیں وہ قوم کی تمام لڑکیوں کو بیٹی کہہ کر پکارتے ہیں۔ اسی معنی میں حضرت لوط نے قوم کی بیٹیوں کو "میری بیٹیاں" فرمایا۔

مگر ان لوگوں نے حضرت لوط کی جائز پیش کش کو ٹھکرا دیا اور ناجائز کی طرف بدستور دوڑتے رہے۔ اس سے آخری طور پر ثابت ہوگیا کہ یہ مجرم لوگ ہیں اور یقیناً اس قابل ہیں کہ انہیں ہلاک کردیا جائے۔ چنانچہ اس کے بعد وہ سب کے سب ہلاک کردئے گئے۔

"کیا تم میں ایک بھی رجل رشید نہیں" یہ اس بندۂ خدا کا آخری کلمہ ہوتا ہے جس کے پاس شریر لوگوں کے روکنے کے لئے مادی قوت نہ ہو اور معقولیت کی تمام باتیں ان کو روکنے کے لئے ناکافی ثابت ہوئی ہوں۔ اس وقت اس طرح کا جملہ بول کر وہ قوم کی غیرت کو پکارتا ہے اور اس کے ضمیر کو بیدار کرنا چاہتا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر ایسا ہو کہ لوگ بدستور بے حس بنے رہیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ ان کے اندر انسانیت اور شرافت کا کوئی درجہ باقی نہیں رہا۔

قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ ﴿۸۰﴾ قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ ؕ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَآ اَصَابَهُمْ ؕ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ؕ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ﴿۸۱﴾ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ۙ مَّنْضُوْدٍ ﴿۸۲﴾ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ؕ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۳﴾

لوط نے کہا، کاش میرے پاس تم سے مقابلہ کی قوت ہوتی یا میں جا بیٹھتا کسی مستحکم پناہ میں۔ فرشتوں نے کہا کہ اے لوط، ہم تیرے رب کے بھیجے ہوئے ہیں۔ وہ ہرگز تم تک نہ پہنچ سکیں گے۔ پس تم اپنے لوگوں کو لے کر کچھ رات رہے نکل جاؤ۔ اور تم میں سے کوئی مڑ کر نہ دیکھے۔ مگر تمہاری عورت کہ اس پر وہی کچھ گزرنے والا ہے جو ان لوگوں پر گزرے گا۔ ان کے لئے صبح کا وقت مقرر ہے، کیا صبح قریب نہیں۔ پھر جب ہمارا حکم آیا تو ہم نے اس بستی کو تلپٹ کردیا اور اس پر پتھر برسائے کنکر کے، تہ بہ تہ، تمہارے رب کے پاس سے نشان لگائے ہوئے۔ اور وہ بستی ان ظالموں سے

حضرت لوط ابتداءً آنے والے نوجوانوں کو انسان سمجھ رہے تھے۔ جب حضرت لوط کی پریشانی بڑھی اور وہ اپنے کو خطرہ میں محسوس کرنے لگے تو انہوں نے بتایا کہ ہم فرشتے ہیں۔ اور خدا کی طرف سے بھیجے گئے ہیں۔ یعنی یہ معاملہ انسانی معاملہ نہیں بلکہ خدائی معاملہ ہے۔ وہ نہ ہمارا کچھ بگاڑ سکیں گے اور نہ تمہارا۔ چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ جب قوم لوط کے لوگ آگے بڑھنے سے نہ رکے تو ایک فرشتہ نے اپنا بازو دکھایا۔ اس کے بعد وہ سب کے سب اندھے ہو گئے۔ اور یہ کہتے ہوئے لوٹ گئے کہ ——— بھاگو، لوط کے مہمان تو بڑے جادوگر معلوم ہوتے ہیں۔

جب خدا کسی قوم کو اس کی سرکشی کی بنا پر ہلاک کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو یہ اس پورے علاقے کیلئے ایک عام حکم ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر اس علاقہ میں بسنے والے تمام جاندار خدائی عذاب کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ البتہ خدا کے خصوصی انتظامات کے تحت وہ لوگ اس سے بچالئے جاتے ہیں جنہوں نے ان سرکش لوگوں کے اوپر حق کا اعلان کیا ہو۔ اعلان حق خدا کی پکڑ سے بچنے کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ موجودہ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

حضرت لوط کی بیوی کے بارہ میں روایات میں آتا ہے کہ وہ دل سے حضرت لوط کے ساتھ نہ تھی۔ مگر آخر وقت میں جب حضرت لوط یہ کہہ کر بستی سے نکلے کہ صبح تک یہاں عذاب آجائے گا تو وہ بھی آپ کے قافلہ کے ساتھ ہو گئی۔ تاہم ابھی یہ لوگ راستہ میں تھے کہ پیچھے زلزلہ اور طوفان کا شور سنائی دیا۔ حضرت لوط اور ان کے مخلص ساتھیوں نے پیچھے توجہ نہ دی۔ مگر حضرت لوط کی بیوی پیچھے مڑ کر دیکھنے لگی اور جب اس کو دھواں اور شور دکھائی دیا تو اس کی زبان سے نکلا واقوماہ (ہائے میری قوم) اس وقت عذاب کا ایک پتھر آکر اس کو لگا اور وہیں اس کا خاتمہ ہو گیا۔

اس میں یہ سبق ہے کہ ایک شخص اگر واقعۃً خدا اور رسول کا وفادار نہیں ہے تو کسی اور محرک کے تحت قافلۂ حق کے ساتھ لگ جانے سے وہ نجات نہیں پاجائے گا۔ اس کی کمزوری کہیں نہ کہیں ظاہر ہو گی اور وہیں وہ بیٹھ کر رہ جائے گا۔

وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۚ قَالَ يَٰقَوْمِ ٱعْبُدُوا۟ ٱللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُۥ ۖ وَلَا تَنقُصُوا۟ ٱلْمِكْيَالَ وَٱلْمِيزَانَ ۚ إِنِّىٓ أَرَىٰكُم بِخَيْرٍ وَإِنِّىٓ أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيطٍ ﴿٨٤﴾ وَيَٰقَوْمِ أَوْفُوا۟ ٱلْمِكْيَالَ وَٱلْمِيزَانَ بِٱلْقِسْطِ ۖ وَلَا تَبْخَسُوا۟ ٱلنَّاسَ أَشْيَآءَهُمْ

وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿۸۵﴾ بَقِيَّتُ اللَّهِ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۚ وَمَا أَنَا عَلَيْكُم بِحَفِيظٍ ﴿۸۶﴾

اور مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اس نے کہا کہ اے میری قوم، اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ اور ناپ اور تول میں کمی نہ کرو۔ میں تم کو اچھے حال میں دیکھ رہا ہوں، اور میں تم پر ایک گھیر لینے والے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ اور اے میری قوم، ناپ اور تول کو پورا کرو انصاف کے ساتھ۔ اور لوگوں کو ان کی چیزیں گھٹا کر نہ دو۔ اور زمین پر فساد نہ مچاؤ۔ جو اللہ کا دیا بچ رہے وہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم مومن ہو۔ اور میں تمہارے اوپر نگہبان نہیں ہوں۔ ۸۴-۸۶

مدین کا علاقہ حجاز اور شام کے درمیان تھا۔ ان کے پیغمبر حضرت شعیب کا اپنی قوم سے یہ کہنا کہ "اگر تم ایمان والے ہو" ظاہر کرتا ہے کہ ان کی قوم مومن ہونے کی مدعی تھی۔ بالفاظ دیگر، وہ اپنے زمانہ کی مسلمان قوم تھی۔ وہ حضرت شعیب سے پہلے آنے والے نبی کی امت تھی اور اب لمبا عرصہ گزرنے کے بعد ان کی بعد کی نسلوں میں بگاڑ آگیا تھا۔

حضرت شعیب نے ان سے کہا کہ اگر تم مومن ہونے کے دعویدار ہو تو تمہارا دعویٰ خدا کے یہاں اسی وقت مانا جائے گا جب کہ تم اپنے دعوے کے تقاضے پورے کرو۔ تقاضا پورا کئے بغیر دعوے کی کوئی قیمت نہیں۔

تمہارے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ تم صرف ایک اللہ کی عبادت کرو۔ لین دین میں انصاف برتو۔ دوسروں کے لئے وہی پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو۔ تم میں سے ہر شخص کو چاہئے کہ وہ لوگوں کے حقوق ٹھیک ٹھیک ادا کرے۔ اور اس میں کسی طرح کی کمی نہ کرے۔ زمین میں اس طرح رہو جس طرح خدا چاہتا ہے کہ اس کے بندے رہیں۔ جائز طریقہ سے حاصل کئے ہوئے رزق پر قناعت کرو نہ کہ نافرمانی کرکے زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ اگر تم ایسا کرو جبھی تم خدا کے یہاں مومن ٹھہرو گے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ خدا کا عذاب تم کو پکڑ لے۔

حضرت شعیب نے ایک طرف یہ کہا کہ لوگوں کو کم نہ دو۔ دوسری طرف یہ فرمایا کہ "آج میں تم کو اچھے حال میں دیکھ رہا ہوں" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم شعیب میں کچھ غریب تھے اور کچھ امیر۔ کچھ زیادہ پانے والے تھے اور کچھ وہ تھے جن کو گھٹا کر مل رہا تھا۔ اگر سارے لوگ کم پانے والے ہوتے تو ان میں "اچھے حال والا" کون باقی رہتا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں جن مخاطبین کا ذکر ہے۔ وہ قوم کے بااثر اور صاحب حیثیت افراد تھے۔ انبیاء اگرچہ ہر ایک کی ہدایت کے لئے آتے ہیں مگر ان کا خطاب خاص طور پر وقت کے ممتاز طبقہ سے ہوتا ہے۔

کیونکہ عوام انہیں لوگوں کے تابع ہوتے ہیں۔ وہ زیادہ تر اپنے بڑوں کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ خواص تک دعوت پہنچنا بالواسطہ طور پر عوام تک بھی دعوت کا پہنچنا ہے۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ۭ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ﴿۸۷﴾

انہوں نے کہا کہ اے شعیب، کیا تمہاری نماز تم کو یہ سکھاتی ہے کہ ہم ان چیزوں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے تھے۔ یا اپنے مال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرنا چھوڑ دیں۔ بس تم ہی تو ایک دانش مند اور نیک چلن آدمی ہو۔ ۸۷

بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ نماز بول کر دین مراد لیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا تمہارا دین تم کو ایسا حکم دے رہا ہے۔ انہوں نے نماز کا لفظ اس لئے استعمال کیا کہ نماز دین کی سب سے زیادہ واضح علامت ہے۔ (قد یراد بالصلاۃ الدین۔ والمعنی دینك یأمرك بذلك واطلق علیه الصلاۃ لانها اظهر شعائر الدین، صفوۃ التفاسیر)

حضرت شعیب کی قوم دیندار ہونے کی مدعی تھی۔ وہ عبادت بھی کرتی تھی۔ مگر انہوں نے اپنے دین اور عبادت کے ساتھ شرک اور بد معاملگی کو بھی جمع کر رکھا تھا۔ حضرت شعیب نے ان کو سچی خدا پرستی اور لوگوں کے ساتھ حسن معاملہ کی دعوت دی اور کہا کہ دین کے ساتھ اگر شرک ہے اور عبادت کے ساتھ اگر بد معاملگی بھی جاری ہے تو ایسے دین اور ایسی عبادت کی خدا کے یہاں کوئی قیمت نہیں۔

اس قسم کی باتوں سے قوم کا دینی بھرم کھلتا تھا۔ اس سے ان کے اس زعم پر زد پڑتی تھی کہ سب کچھ کرتے ہوئے بھی وہ دیندار ہیں اور عبادت گزاری کا تمغہ بھی ہر حال میں انہیں ملا ہوا ہے۔ چنانچہ وہ بگڑ گئے۔ انہوں نے کہا کہ کیا تم ہی ایک خدا کے عبادت گزار ہو۔ کیا ہمارے وہ تمام بزرگ جاہل تھے یا ہیں جن کے طریقہ کو ہم نے اختیار کر رکھا ہے۔ کیا تمہارے سوا کوئی یہ جاننے والا نہیں کہ عبادت کیا ہے اور اس کے تقاضے کیا ہیں۔ شاید تم سمجھتے ہو کہ صرف تم ہی دنیا بھر میں ایک سمجھ دار اور صالح پیدا ہوئے ہو۔

قوم شعیب کو وہ لوگ زیادہ بڑے معلوم ہوتے تھے جو لمبی روایات کے نتیجہ میں بڑے بن چکے تھے۔ یا جو اونچی گدیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اسی لئے ان کو حضرت شعیب کے بارہ میں ایسا کہنے کی جرأت ہوئی۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ۭ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۭ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ﴿۸۸﴾ وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ۭ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۹﴾ وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ۭ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ﴿۹۰﴾

شعیب نے کہا کہ اے میری قوم، بتاؤ، اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل پر ہوں اور اس نے اپنی جانب سے مجھ کو اچھا رزق بھی دیا۔ اور میں نہیں چاہتا کہ میں خود وہی کام کروں جس سے میں تم کو روک رہا ہوں۔ میں تو صرف اصلاح چاہتا ہوں، جہاں تک ہو سکے۔ اور مجھے توفیق تو اللہ ہی سے ملے گی۔ اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے۔ اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔ اور اے میری قوم، ایسا نہ ہو کہ میری ضد کرکے تم پر وہ آفت آپڑے جو قوم نوح یا قوم ہود یا قوم صالح پر آئی تھی، اور لوط کی قوم تو تم سے دور بھی نہیں۔ اور اپنے رب سے معافی مانگو پھر اس کی طرف پلٹ آؤ۔ بے شک میرا رب مہربان اور محبت والا ہے۔ ۸۸-۹۰

ماننے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک ہے تقلیدی طور پر ماننا۔ دوسرا صحیح سمجھ کر ماننا۔ پہلی صورت میں آدمی کسی بات کو اس لئے مانتا ہے کہ لوگ اس کو مانتے ہیں۔ دوسری صورت میں وہ اس کو اس لئے مانتا ہے کہ اس نے خود دلیل کی بنیاد پر پایا ہے کہ وہ بات صحیح ہے۔ اول الذکر اگر رسمی اقرار ہے تو ثانی الذکر شعوری دریافت۔

حق کو دلیل (یا شعور) کی سطح پر پانا ہی مومن کا اصل سرمایہ ہے۔ اسی سے وہ زندہ یقین حاصل ہوتا ہے جب کہ آدمی ہر چیز سے بے پرواہو کر لوگوں کے درمیان کھڑا ہو اور حق کی نمائندگی کر سکے۔ حق کی شعوری یافت ہر دوسری چیز کا بدل ہے۔ جس کو یہ نعمت حاصل ہو جائے اس کو پھر کسی اور چیز کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

عام آدمی "روٹی" پر جیتا ہے۔ مومن وہ انسان ہے جو دلیل حق پر جیتا ہے۔ اس طرح کا رزق (شعوری یافت) ملنے کے بعد آدمی کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے خلاف رویہ اختیار کرے۔

قول وعمل کا تضاد رسمی ایمان کا نتیجہ ہے اور قول وعمل کی یکسانیت شعوری ایمان کا نتیجہ۔

"شقاق" کی تشریح میں حضرت حسن بصری کا قول ہے کہ میری دشمنی تم کو ایمان کا راستہ چھوڑ دینے پر نہ ابھارے کہ اس کے بعد تم کو وہ سزا ملے جو کافروں کو ملی (لا یجرمنکم معاداتی علی ترک الایمان فیصیبکم ما أصاب الکفار، القرطبی)

داعی چونکہ اپنے زمانہ کے لوگوں کو ایک عام انسان کی مانند نظر آتا ہے۔ اس لئے اس کی ناقدانہ باتوں سے وہ لوگ بگڑ اٹھتے ہیں جن کو ماحول میں اونچی حیثیت حاصل ہو۔ ایک معمولی آدمی کی یہ جرأت ان کے لئے ناقابل برداشت ہوجاتی ہے کہ وہ ان پر اور ان کے بڑوں پر تنقید کرے۔ اس وجہ سے ان کے اندر داعی کے خلاف ضد اور نفرت پیدا ہوجاتی ہے۔

کسی آدمی کے اندر اس قسم کی نفسیات کا پیدا ہونا اس کا نہایت کڑے امتحان میں مبتلا کیا جانا ہے۔ کیونکہ ایسا آدمی ایک شخص کو حقیر سمجھنے کی وجہ سے اس کی طرف سے آنے والی خدائی بات کو بھی حقیر سمجھ لیتا ہے۔ وہ ایک انسان کو نظر انداز کرنے کے نام پر خود خدا کو نظر انداز کردیتا ہے۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۡ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ﴿٩١﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَاۗءَكُمْ ظِهْرِيًّا ۭ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿٩٢﴾ وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰي مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ ۭ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ۭ وَارْتَقِبُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ ﴿٩٣﴾

انھوں نے کہا کہ اے شعیب، جو تم کہتے ہو اس کا بہت سا حصہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ اور ہم تو دیکھتے ہیں کہ تو ہم میں کمزور ہے۔ اور اگر تیری برادری نہ ہوتی تو ہم تم کو سنگسار کر دیتے۔ اور تم ہم پر کچھ بھاری نہیں۔ شعیب نے کہا کہ اے میری قوم، کیا میری برادری تم پر اللہ سے زیادہ بھاری ہے۔ اور اللہ کو تم نے پس پشت ڈال دیا۔ بے شک میرے رب کے قابو میں ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ اور اے میری قوم، تم اپنے طریقہ پر کام کئے جاؤ اور میں اپنے طریقہ پر کرتا رہوں گا۔ جلد ہی تم کو معلوم ہوجائے گا کہ کس کے اوپر رسوا کرنے والا عذاب آتا ہے اور کون جھوٹا ہے۔ اور انتظار کرو، میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔ ۹۳ - ۹۱

حضرت شعیب کو حدیث میں خطیب الانبیاء کہا گیا ہے۔ آنجناب اپنی قوم کو اس کی اپنی قابل فہم زبان میں نہایت موثر انداز میں سمجھاتے تھے۔ پھر آپ کی بات اس کی سمجھ میں کیوں نہیں آئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قوم کا ذہنی

سانچہ بگڑا ہوا تھا۔ اس کے سوچنے کا انداز اور تھا اور حضرت شعیب کے سوچنے کا انداز اور۔ اس بنا پر آنجناب کی بات اس کی سمجھ میں نہ آسکی۔

قوم انسانوں کی تعظیم میں گم تھی۔ آپ اس کو ایک اللہ کی تعظیم کی طرف بلاتے تھے۔ وہ خوش عقیدگی کو نجات کا ذریعہ سمجھے ہوئے تھی، آپ کا کہنا تھا کہ صرف عمل کے ذریعہ نجات ہو سکتی ہے۔ قوم کا خیال تھا کہ وہ اپنے کو مومن سمجھتی ہے اس لئے وہ مومن ہے۔ آپ نے کہا کہ مومن وہ ہے جو خدا کی میزان میں مومن قرار پائے۔ قوم کے نزدیک نماز کی حیثیت بس ایک غیر مؤثر قسم کے رسمی ضمیمہ کی تھی، آپ نے اعلان کیا کہ نماز آدمی کی زندگی اور اس کے آمد و خرچ کی محاسب ہے۔ قوم سمجھتی تھی کہ ایمان بس ایک بے روح اقرار ہے، آپ نے بتایا کہ ایمان وہ ہے جو ایک زندہ شعور کے طور پر حاصل ہوا ہو۔

اس طرح حضرت شعیب اور ان کی قوم کے درمیان ایک قسم کا فصل (Gap) پیدا ہو گیا تھا۔ یہی ذہنی فصل قوم کے لئے آپ کی سیدھی اور سچی بات کو سمجھنے میں رکاوٹ بنا رہا۔

"اگر تمھارا قبیلہ نہ ہوتا تو ہم تم کو سنگسار کر دیتے" یہ جملہ بتاتا ہے کہ حضرت شعیب کی قوم کس قدر بے حس اور ظاہر پرست ہو چکی تھی۔ قصہ یہ تھا کہ حضرت شعیب نے جب قوم کے دینی بھرم کو بے نقاب کیا تو قوم کے لوگ ان کے دشمن بن گئے۔ اس وقت حضرت شعیب کے ساتھ نہ عوام کی بھیڑ تھی جو لوگوں کو روکے اور نہ آپ دولت اور حیثیت کے مالک تھے جس کو دیکھ کر لوگ مرعوب ہوں۔ آپ کے پاس صرف صداقت اور معقولیت کا زور تھا اور ایسے لوگوں کے نزدیک صرف صداقت اور معقولیت کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

ایسی حالت میں وہ یقیناً آپ پر قاتلانہ حملہ کر دیتے۔ تاہم جس چیز نے انھیں اس قسم کے اقدام سے روکا وہ قبیلہ کے انتقام کا اندیشہ تھا۔ قبائلی دور میں قبیلہ کے کسی فرد کو مارنے کا مطلب یہ تھا کہ قبائلی دستور کے مطابق پورا قبیلہ اس سے خون کا بدلہ لینے کے لئے اٹھ کھڑا ہو جائے۔ یہ اندیشہ قوم شعیب کے لئے آپ کے خلاف کسی انتہائی اقدام میں مانع بن گیا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے موجودہ زمانہ میں شریر افراد کی شرارت سے اکثر اوقات لوگ اس لئے محفوظ رہتے ہیں کہ ان کو اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر انھوں نے کوئی جارحیت کی تو ان کو پولیس اور عدالت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

وَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِنَّا وَأَخَذَتِ الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دِيَارِهِمْ جَاثِمِينَ ﴿۹۴﴾ كَأَنْ لَمْ يَغْنَوْا فِيهَا ۗ أَلَا بُعْدًا لِمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُودُ ﴿۹۵﴾

ع ۸ ۱۲

اور جب ہمارا حکم آیا ہم نے شعیب کو اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے اپنی رحمت سے بچا لیا۔ اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا ان کو کڑک نے پکڑ لیا۔ پس وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔ گویا کہ کبھی ان میں بسے ہی نہ

تھے۔ سنو، پھٹکار ہے مدین کو جیسے پھٹکار ہوئی تھی ثمود کو۔ ۹۵-۹۴

حضرت شعیب کی قوم کے لوگ سمجھتے تھے کہ وہ مدین کے مالک ہیں جو چیز انھیں امتحان کی مصلحت کے تحت دی گئی تھی اس کو انھوں نے اپنا مستقل حق سمجھ لیا۔ اس احساس کے تحت انھوں نے آپ کے خلاف جارحانہ تدبیریں کیں۔ انھوں نے آپ کو یہ دھمکی بھی دی کہ ہم تم کو اور تمھارے ساتھیوں کو اپنی سرزمین سے نکال دیں گے (الاعراف ۸۸) مگر وہی زمین جس کو وہ اپنی زمین سمجھتے تھے اور جس کے وہ مالک بنے ہوئے تھے۔ وہاں خدا کے حکم سے ہولناک گڑگڑاہٹ کے ساتھ زلزلہ آیا۔ جس کے نتیجہ میں یہ پورا علاقہ تباہ ہوگیا۔ وہ خود اپنی دنیا میں اس طرح مٹ کر رہ گئے جیسے کبھی ان کا وجود ہی نہ تھا۔

البتہ قوم کے وہ افراد جنھوں نے حضرت شعیب کی بات مانی تھی اور آپ کے ساتھ ہوگئے تھے ان کو خصوصی نصرت سے بچا لیا گیا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ىِٕهٖ فَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَ مَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ۝ يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ؕ وَ بِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ۝ وَ اُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ۝

اور ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں اور واضح سند کے ساتھ بھیجا، فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف۔ پھر وہ فرعون کے حکم پر چلے حالانکہ فرعون کا حکم راستی پر نہ تھا۔ قیامت کے دن وہ اپنی قوم کے آگے ہوگا اور ان کو آگ پر پہنچائے گا۔ اور کیسا برا گھاٹ ہے جس پر وہ پہنچیں گے۔ اور اس دنیا میں ان کے پیچھے لعنت لگا دی گئی اور قیامت کے دن بھی۔ کیسا برا انعام ہے جو ان کو ملا۔ ۹۹-۹۶

حضرت موسیٰ نے حق کی دعوت آخری ممکن حد تک پیش کر دی۔ انھوں نے فرعون اور اس کے ساتھیوں کو نہ صرف نظری طور پر بے دلیل کر دیا۔ بلکہ عصا کے معجزے کی صورت میں اپنی صداقت کا کھلا ہوا ظاہری ثبوت بھی انھیں دکھا دیا پھر بھی فرعون کی قوم فرعون ہی کے ساتھ رہی، وہ حضرت موسیٰ کا ساتھ دینے پر تیار نہ ہوئی۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کے نزدیک ساری اہمیت اقتدار اور دنیوی ساز و سامان کی تھی اور یہ چیزیں وہ حضرت موسیٰ کے اندر نہ دیکھتے تھے۔ وہ آپ کی باتوں پر حیران ضرور ہوتے تھے۔ مگر جب وہ حضرت موسیٰ کا مقابلہ فرعون سے کرتے تو ان کو ایک طرف بے سر و سامانی دکھائی دیتی اور دوسری طرف ہر قسم کا مادی جاہ و جلال۔

یہ تقابل ان کے لئے فیصلہ کن بن گیا۔ اور وہ دلائل اور معجزات دیکھنے کے باوجود اس کے لئے تیار نہ ہوئے کہ فرعون کو چھوڑ دیں اور اس سے الگ ہو کر حضرت موسیٰ کے ساتھ ہو جائیں۔

جو لوگ دنیا میں کسی کا ساتھ صرف اس لئے دیں گے کہ اس کے پاس مادی بڑائی کی چیزیں تھیں، وہ آخرت میں بھی اس کے ساتھ کر دئے جائیں گے۔ مگر دنیا کے برعکس یہ بہت برا ساتھ ہوگا۔ کیونکہ اس دن اس آدمی سے اس کا تمام سامان چھن چکا ہوگا۔ اب اس کا وجود صرف ذلت اور بربادی کا نشان ہوگا۔ وہ اپنے ساتھیوں کو بھی اسی آگ میں پہنچا دے گا جو خود اس کے لئے اس کی گمراہ قیادت کے نتیجہ میں خدا کی طرف سے مقدر کی جا چکی ہے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ ﴿۱۰۰﴾ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۭ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ﴿۱۰۱﴾

یہ بستیوں کے کچھ حالات ہیں جو ہم تم کو سنا رہے ہیں۔ ان میں سے بعض اب تک قائم ہیں اور بعض مٹ گئیں۔ اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا۔ بلکہ انھوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا۔ پھر جب تیرے رب کا حکم آ گیا تو ان کے معبود ان کے کچھ کام نہ آئے جن کو وہ اللہ کے سوا پکارتے تھے۔ اور انھوں نے ان کے حق میں بربادی کے سوا اور کچھ نہیں بڑھایا۔ ۱۰۰-۱۰۱

قدیم تاریخوں میں بادشاہوں اور فوجی جنرلوں کے حالات درج ہیں مگر نبیوں اور ان کی اقوام کے حالات کسی تاریخ میں درج نہیں۔ دوسری طرف قرآن کو دیکھئے تو اس میں سب سے زیادہ اہتمام کے ساتھ نبیوں اور ان کی قوموں کے حالات ملتے ہیں۔ بقیہ باتیں اس نے اس طرح نظر انداز کر دی ہیں جیسے اس کی نظر میں ان کی کوئی اہمیت نہیں۔ انسان نے جو تاریخ لکھی اس میں اس نے وہی بات چھوڑ دی جو خالق کے نزدیک سب سے زیادہ قابل تذکرہ تھی۔

دور نبوت کی ان ہلاک شدہ بستیوں میں سے بعض بستیاں ایسی ہیں جو ابھی تک آباد ہیں۔ جیسے مصر جو فرعون کا مقام تھا۔ دوسری طرف قوم ہود اور قوم لوط جیسی اقوام ہیں جن کی بستیاں ان کے باشندوں سمیت ناپید ہو گئیں۔ البتہ کہیں کہیں ان کے کچھ نشانات کھنڈر کی صورت میں کھڑے ہیں یا زمین کی کھدائی سے برآمد کئے گئے ہیں۔

ان بستیوں کا ہلاک کیا جانا بظاہر ایک ظالمانہ واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر جب یہ دیکھئے کہ کیوں ایسا ہوا

تو وہ عین مطابق حقیقت بن جاتا ہے۔ کیونکہ یہ ان کی اپنی بدعملی کے نتائج تھے۔ جو کچھ ہوا وہ ان کی بدکرداری کے بعد ہوا نہ کہ ان کی بدکرداری سے پہلے۔

جب بھی آدمی سرکشی اور ظلم کرتا ہے تو وہ کسی برتے پر کرتا ہے۔ وہ کچھ چیزوں یا ہستیوں کو اپنا سہارا سمجھ لیتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ یہ مشکل وقتوں میں اس کے مددگار ثابت ہوں گے۔ مگر یہ سہارے اسی وقت تک سہارے ہیں جب تک خدا ڈھیل دے رہا ہو۔ جب خدا کے قانون کے مطابق ڈھیل کی مدت ختم ہو جائے اور خدا اپنا آخری فیصلہ ظاہر کر دے اس وقت آدمی کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب محض جھوٹے مفروضے تھے جن کو اس نے اپنی نادانی کی وجہ سے سہارا سمجھ لیا تھا۔

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِىَ ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗۤ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ﴿۱۰۲﴾ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ؕ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ﴿۱۰۳﴾ وَمَا نُؤَخِّرُهٗۤ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ؕ ﴿۱۰۴﴾ يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِىٌّ وَّسَعِيْدٌ ﴿۱۰۵﴾

اور تیرے رب کی پکڑ ایسی ہی ہے جب کہ وہ بستیوں کو ان کے ظلم پر پکڑتا ہے۔ بے شک اس کی پکڑ بڑی دردناک اور سخت ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لئے نشانی ہے جو آخرت کے عذاب سے ڈریں۔ وہ ایک ایسا دن ہے جس میں سب لوگ جمع ہوں گے۔ اور وہ حاضری کا دن ہوگا۔ اور ہم اس کو ایک مدت کے لئے ٹال رہے ہیں جو مقرر ہے۔ جب وہ دن آئے گا تو کوئی جان اس کی اجازت کے بغیر کلام نہ کر سکے گی۔ پس ان میں کچھ بدبخت ہوں گے اور کچھ نیک بخت۔ ۱۰۵-۱۰۲

موجودہ دنیا میں انسان کو رہنے اور بسنے کا موقع صرف امتحان کی بنا پر حاصل ہے۔ پیغمبروں کے ذریعہ اتمام حجت کے بعد بھی جو لوگ منکر بنے رہیں وہ خدا کی زمین میں مزید ٹھہرنے کا حق کھو دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبروں کے منکرین کو خدا نے ہلاک کر دیا (عنکبوت ۴۰) یہ ہلاکت زیادہ تر اس طرح ہوئی کہ عام زمینی آفتوں میں شدت پیدا کر دی گئی مثلاً آندھی، سیلاب، یا زلزلہ، جو عام حالات میں ایک حد کے اندر رہتے ہیں، ان کو غیر محدود طور پر شدید کر دیا گیا۔

ماضی میں اس طرح قوموں کی تباہی کے واقعات کو جغرافی تاریخ کے علماء موسمی تغیرات (Climatic Pulsations) کا نام دیتے ہیں۔ گویا جو کچھ ہوا وہ محض جغرافی اتھل پتھل کے نتیجہ میں ہوا۔ اگرچہ وہ اس واقعہ کی کوئی توجیہ نہیں کر پاتے کہ اس قسم کے شدید موسمی تغیرات صرف ماضی میں کیوں پیش آئے۔ وہ اب (ختم نبوت

کے بعد) کیوں نہیں پیش آتے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ واقعات سادہ معنوں میں صرف جغرافی واقعات نہ تھے بلکہ یہ حکم خداوندی کا ظہور تھا۔ ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ موجودہ دنیا کا نظام عدل پر قائم ہے۔ یہاں خود قانون قدرت کے تحت لازماً ایسا ہونے والا ہے کہ ظالم اپنے ظلم کی سزا پائے اور عادل کو اپنے عدل کا انعام ملے۔ ان واقعات کو موسمی تغیرات کہنا ان کو جغرافیہ کے خانہ میں ڈال دینا ہے۔ اس کے برعکس اگر ان کو خدائی تغیرات مانا جائے تو وہ آدمی کے لئے خوف خدا اور فکر آخرت کا زبردست سبق بن جائیں گے۔

پیغمبروں کے زمانہ میں جو واقعات پیش آئے وہ گویا بڑی قیامت سے پہلے اس کی ایک چھوٹی نشانی تھے۔ ان میں ایسا ہوا کہ منکرین کو ایک مدت تک ڈھیل دی گئی۔ اس کے بعد خدا کا فیصلہ ظاہر ہوا تو سب کے سب ہلاک کر دئے گئے۔ صرف وہ لوگ بچ سکے جو حق کا ساتھ دینے کی وجہ سے خدا کے نزدیک نیک بخت قرار پا چکے تھے۔ ان کے علاوہ جو لوگ خدا کی میزان میں سرکش اور بدبخت تھے وہ لازمی طور پر عذاب کی زد میں آئے۔ حتیٰ کہ پیغمبروں کی سفارش بھی ان کو بچا نہ سکی، جیسا کہ حضرت نوح اور حضرت ابراہیم کی مثال سے ثابت ہوتا ہے۔

فَأَمَّا الَّذِينَ شَقُوا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَشَهِيقٌ ۝ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ۚ إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِمَا يُرِيدُ ۝ وَأَمَّا الَّذِينَ سُعِدُوا فَفِي الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ۖ عَطَاءً غَيْرَ مَجْذُوذٍ ۝ فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِمَّا يَعْبُدُ هَٰؤُلَاءِ ۚ مَا يَعْبُدُونَ إِلَّا كَمَا يَعْبُدُ آبَاؤُهُمْ مِنْ قَبْلُ ۚ وَإِنَّا لَمُوَفُّوهُمْ نَصِيبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوصٍ ۝

ع ۹

پس جو لوگ بدبخت ہیں وہ آگ میں ہوں گے۔ ان کو وہاں چیخنا ہے اور دھاڑنا۔ وہ اس میں رہیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں، مگر جو تیرا رب چاہے۔ بے شک تیرا رب کر ڈالتا ہے جو چاہتا ہے۔ اور جو لوگ نیک بخت ہیں تو وہ جنت میں ہوں گے، وہ اس میں رہیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں، مگر جو تیرا رب چاہے بخشش ہے بے انتہا۔ پس تو ان چیزوں سے شک میں نہ رہ جن کی یہ لوگ عبادت کر رہے ہیں۔ یہ تو بس اسی طرح عبادت کر رہے ہیں جس طرح ان سے پہلے ان کے باپ دادا عبادت کر رہے تھے۔ اور ہم ان کا حصہ انھیں پورا پورا دیں گے بغیر کسی کمی کے۔ ۱۰۹-۱۰۶

قرآن میں سب سے زیادہ اہمیت اور سب سے زیادہ تکرار کے ساتھ جس چیز کا ذکر ہے وہ یہ ہے کہ انسان اپنی موجودہ حالت پر چھوڑ نہیں دیے جائیں گے۔ بلکہ موت کے بعد وہ خدا کی عدالت میں حاضر کیے جائیں گے۔ وہاں ہر ایک اپنی کارکردگی کے مطابق جنت یا دوزخ میں ڈالا جائے گا۔

اس اہمیت اور تکرار کی وجہ لوگوں کا "شک" ہے۔ لوگ دیکھتے ہیں کہ زمین پر بے شمار انسان ایسے ہیں جو خدا کی ہدایت کو نہیں مانتے۔ بے شمار انسان ایسے ہیں جو خدا کی ہدایت سے آزاد ہو کر عمل کرتے ہیں۔ بیشتر انسان خدا پسند زندگی کے بجائے خود پسند زندگی گزار رہے ہیں۔ پھر بھی ان کا کچھ نہیں بگڑتا پھر بھی سارے لوگ کامیاب ہیں۔ بظاہر یہاں کہیں دکھائی نہیں دیتا کہ خدا کے وفاداروں کو کوئی خصوصی انعام مل رہا ہو۔ یا خدا کے نافرمانوں کو کوئی خاص سزا بھگتنی پڑتی ہو۔

اس بنا پر لوگوں کو شک ہونے لگتا ہے۔ ان کو یقین نہیں آتا کہ انسانوں کا جو انجام مسلسل وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اس کے سوا بھی کوئی انجام ان کے لئے مقدر ہے۔ یہاں قرآن بتاتا ہے کہ لوگوں کا مسلسل غیر حق پر چلنا اس لئے نہیں ہے کہ انھوں نے مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کیا اور پھر اس کو معقول پا کر اسے اختیار کر لیا۔ اس کا سبب دراصل رواج کی پیروی ہے نہ کہ دلیل اور معقولیت کی پیروی۔

اس کے باوجود لوگوں کے عمل کا انجام ان کے سامنے نہیں آتا تو اس کا سبب مہلت امتحان ہے۔ زمین پر موت سے پہلے کی زندگی جانچ کی زندگی ہے۔ اس لئے موت تک انسان کو یہاں ڈھیل دی جا رہی ہے کہ وہ جو چاہے بولے اور جو چاہے کرے۔ موت اس مقررہ مدت کا خاتمہ ہے۔ موت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو مقام امتحان سے اٹھا کر مقام عدالت میں پہنچا دیا جائے۔ وہاں ہر ایک کو وہی ملے گا جس کا وہ فی الواقع مستحق تھا اور ہر ایک سے وہ چھن جائے گا جس کو اس نے استحقاق کے بغیر اپنے گرد جمع کر رکھا تھا۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ۗ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۚ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۱۰﴾ وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ۗ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۱۱﴾

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی۔ پھر اس میں پھوٹ پڑ گئی۔ اور اگر تیرے رب کی طرف سے پہلے ہی ایک بات نہ آ چکی ہوتی تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا۔ اور ان کو اس میں شبہ ہے کہ وہ مطمئن نہیں ہونے دیتا اور یقیناً تیرا رب ہر ایک کو اس کے اعمال کا پورا بدلہ دے گا۔ وہ باخبر ہے اس سے جو وہ کر رہے ہیں۔ ۱۱۰-۱۱۱

"موسیٰ کی کتاب میں اختلاف" کا مطلب یہ ہے کہ اس کے مخاطبین اس کے بیانات کے بارہ میں کئی رائے ہو گئے۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے جھٹلایا اور کچھ لوگوں نے تسلیم کیا (فاختلف فی ذالك الکتاب۔ فکذّب به بعضهم وصدّق به بعضهم، الطبری)

جب بھی کوئی بات کہی جائے تو آدمی اس کے بارہ میں ہمیشہ دو چیزوں کے درمیان ہوتا ہے۔ ایک، صحیح تعبیر۔ دوسرے، غلط تعبیر۔ اگر سننے والے فی الواقع سنجیدہ ہوں تو وہ ہمیشہ ایک ہی صحیح تعبیر تک پہنچیں گے ان کی سنجیدگی ان کے لئے اتحاد رائے کی ضامن بن جائے گی۔ اس کے برعکس اگر وہ بات کے بارہ میں سنجیدہ نہ ہوں تو وہ اس کو کوئی اہمیت نہ دیں گے اور اپنے اپنے خیال کے مطابق اس کی مختلف تعبیریں کریں گے۔ کوئی ایک بات کہے گا، کوئی دوسری بات۔ اس طرح ان کی غیر سنجیدگی انھیں اختلاف رائے تک پہنچا دے گی۔

یہ صورت تمام پیغمبروں کے ساتھ پیش آئی۔ اس کے باوجود خدا اس کو گوارا کرتا رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا نے موجودہ دنیا کو عمل کی جگہ بنایا ہے اور اگلی آنے والی دنیا کو بدلہ پانے کی جگہ۔ خدا کی یہی سنت ہے جس کی بنا پر لوگوں کو مکمل آزادی ملی ہوئی ہے۔ موجودہ صورت حال اسی مہلت امتحان کی بنا پر ہے نہ کہ خدا کے عجز یا لوگوں کے کسی استحقاق کی بنا پر۔

فَاسْتَقِمْ كَمَآ أُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۚ إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿١١٢﴾ وَلَا تَرْكَنُوٓا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ ﴿١١٣﴾ وَأَقِمِ الصَّلَوٰةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ۚ إِنَّ الْحَسَنَٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّـَٔاتِ ۚ ذَٰلِكَ ذِكْرَىٰ لِلذَّٰكِرِينَ ﴿١١٤﴾ وَاصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿١١٥﴾

پس تم جمے رہو جیسا کہ تم کو حکم ہوا ہے اور وہ بھی جنھوں نے تمہارے ساتھ توبہ کی ہے اور حد سے نہ بڑھو بیشک وہ دیکھ رہا ہے جو تم کرتے ہو۔ اور ان کی طرف نہ جھکو جنھوں نے ظلم کیا، ورنہ تم کو آگ پکڑ لے گی اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی مددگار نہیں، پھر تم کہیں مدد نہ پاؤ گے اور نماز قائم کرو دن کے دونوں حصوں میں اور رات کے کچھ حصہ میں۔ بے شک نیکیاں دور کرتی ہیں برائیوں کو۔ یہ یاددہانی ہے یاددہانی حاصل کرنے والوں کے لئے اور صبر کرو اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ ۱۵ – ۱۱۲

دعوت حق کا ابتدائی استقبال نظر انداز کرنے کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس کے بعد مخالفت شروع ہوتی ہے، یہاں تک کہ مخالفت اپنے آخری نقطہ پر پہنچ جاتی ہے۔ یہ داعیوں کے لئے بڑا نازک وقت ہوتا

ہے۔ اس وقت ان کے درمیان دو قسم کے ذہن ابھرتے ہیں۔ کچھ لوگ جھنجھلا کر یہ چاہنے لگتے ہیں کہ مخالفین سے ٹکرا جائیں اور ان لوگوں سے قوت کے ذریعے نپٹیں جن کے لئے نظری دلائل بے اثر ثابت ہوئے ہیں۔ دوسرا ذہن وہ ہے جو یہ سوچتا ہے کہ مخاطبین کے لئے قابل قبول بنانے کی خاطر اپنی دعوت میں کچھ ترمیم کر لی جائے۔ دعوت کے ان اجزا کا ذکر نہ کیا جائے جن کو سن کر مخاطبین بگڑ جاتے ہیں۔

پہلا رویہ اگر حد سے تجاوز کرنا ہے تو دوسرا رویہ باطل سے مصالحت کرنا۔ اور یہ دونوں ہی اللہ کی نظر میں یکساں طور پر غلط ہیں۔ خاص طور پر دوسری چیز (قابل قبول بنانے کی خاطر تبدیلی) تو جرم کا درجہ رکھتی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ جو چیز مطلوب ہے وہ حق کا اعلان ہے۔ اور مصالحت کی صورت میں حق کا واضح اعلان نہیں ہو سکتا۔

دعوت کی راہ میں جب بھی کوئی مشکل پیش آئے تو داعی کو چاہئے کہ خدا کی طرف زیادہ سے زیادہ رجوع کرے کیونکہ سب کچھ کرنے والا وہی ہے۔ خدا کی مدد ہی تمام مشکلات کے حل کا واحد یقینی ذریعہ ہے۔

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

پس کیوں نہ ایسا ہوا کہ تم سے پہلے کی قوموں میں ایسے اہل خیر ہوتے جو لوگوں کو زمین میں فساد کرنے سے روکتے۔ ایسے تھوڑے لوگ نکلے جن کو ہم نے ان میں سے بچا لیا۔ اور ظالم لوگ تو اسی عیش میں پڑے رہے جو انھیں ملا تھا اور وہ مجرم تھے۔ اور تیرا رب ایسا نہیں کہ وہ بستیوں کو ناحق تباہ کر دے حالانکہ اس کے باشندے اصلاح کرنے والے ہوں۔ ۱۷-۱۱۶

یہاں پچھلوں سے مراد پچھلی امتیں بالفاظ دیگر پچھلی مسلم قومیں ہیں۔ قوم کا بگاڑ ہمیشہ اس طرح ہوتا ہے کہ دنیوی سامان جو خدا کی طرف سے انھیں اس لئے دیا گیا تھا کہ اس سے ان کے اندر شکر کا جذبہ ابھرے، وہ ان کے لئے سرمستی اور دنیا پرستی پیدا کرنے کا ذریعہ بن گیا۔

ایسی حالت میں مسلم قوم کی اصلاح کے لئے جو کام کرنا ہے اس کا عنوان شریعت کی اصطلاح میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ یہ حکم ایک مسلمان کی اس ذمہ داری کو بتاتا ہے جو اپنے قریبی ماحول کی اصلاح کے سلسلے میں اس پر عائد ہوتی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ مسلم معاشرہ میں ہمیشہ ایسے افراد موجود رہنے چاہئیں جو مسلمانوں کو خدا اور آخرت کی یاد دلائیں۔ وہ ان کے اخلاق کی نگرانی کریں۔ وہ معاملات میں

ان کو راہ راست پر قائم رکھنے کی کوشش کریں۔

کسی قوم میں ایسے اہل خیر کا نہ نکلنا ہمیشہ دو سبب سے ہوتا ہے۔ یا تو پوری قوم کی قوم بگڑ چکی ہو اور اس میں کوئی صالح انسان باقی نہ رہا ہو۔ یا صالح افراد موجود تو ہوں مگر عمومی بگاڑ کی وجہ سے وہ زبان کھولنے کی ہمت نہ کرتے ہوں۔ انھیں اندیشہ ہو کہ اگر انھوں نے سچی بات کہی تو قوم کے درمیان وہ بے عزت ہو کر رہ جائیں گے۔

مذکورہ دونوں صورتوں میں قوم خدا کی نظر میں اپنا اعتبار کھو دیتی ہے اور اس کی مستحق ہو جاتی ہے کہ ایک یا دوسری صورت میں وہ عذاب خداوندی کی زد میں آجائے۔

وَلَوْ شَاۗءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ۭ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ۭ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

اور اگر تیرا رب چاہتا تو لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا مگر وہ ہمیشہ اختلاف میں رہیں گے۔ سوا ان کے جن پر تیرا رب رحم فرمائے۔ اور اس نے اسی لئے ان کو پیدا کیا ہے۔ اور تیرے رب کی بات پوری ہوئی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سے اکٹھے بھر دوں گا۔ ۱۱۸ ۔ ۱۱۹

ہماری دنیا میں انسان کے سوا دوسری بے شمار مخلوقات بھی ہیں۔ یہ سب ہمیشہ فطرت کے ایک ہی مقرر راستہ پر چلتی ہیں۔ اسی طرح انسان کو بھی خدا ایک ہی صراط مستقیم کا پابند بنا سکتا تھا۔ مگر انسان کے بارہ میں خدا کی یہ اسکیم ہی نہیں۔ انسان کے سلسلہ میں خدا کا منصوبہ یہ تھا کہ ایک ایسی مخلوق پیدا کی جائے جو خود اپنے آزادانہ اختیار کے تحت ایک چیز کو لے اور دوسری چیز کو چھوڑ دے۔ انسان کی دنیا میں اختلاف (کسی کا ایک راستہ پر چلنا اور کسی کا دوسرے راستہ پر) دراصل اسی خاص خدائی منصوبہ کی بنا پر ہے۔

یہ منصوبہ یقیناً ایک پر خطر منصوبہ تھا کیونکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ بہت سے لوگ آزادی کا غلط استعمال کر کے اپنے آپ کو جہنم کا مستحق بنالیں گے۔ مگر اسی پر خطر منصوبہ کے ذریعے وہ اعلیٰ روحیں بھی چنی جا سکتی تھیں جو خدا کی رحمت خاص کی مستحق قرار پائیں۔ خدا نے اپنی رحمتیں ساری کائنات کو بطور عطیہ دے رکھی ہیں۔ اب خدا نے یہ منصوبہ اس لئے بنایا تاکہ اپنی رحمت وہ اپنی ایک مخلوق کو یہ کہہ کر دے کہ یہ تمہارا حق ہے۔

خدا کی رحمت اس شخص کو ملتی ہے جس کا شعور اتنا بیدار ہو گیا ہو کہ وہ امتحانی اختیار کے اندر اپنی حقیقی بے اختیاری کو جان لے۔ وہ انسانی قدرت کے پردہ میں خدا کی قدرت کو دیکھ لے۔ یہ شعور ایسے

آدمی سے سرکشی کی طاقت چھین لیتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کا یہ حال ہوجاتا ہے کہ جب خدا اپنی رحمت کو اس کا حق کہہ کر پیش کرے تو اس کا شعور حقیقت پکار اٹھے ـــــــ خدایا یہ بھی تیری رحمتوں ہی کا ایک کرشمہ ہے۔ ورنہ میرا عمل تو کسی قیمت کا مستحق نہیں۔

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِ فُؤَادَكَ ۚ وَجَاءَكَ فِي هَٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَذِكْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۲۰﴾ وَقُلْ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنَّا عَامِلُونَ ﴿۱۲۱﴾ وَانْتَظِرُوا إِنَّا مُنْتَظِرُونَ ﴿۱۲۲﴾ وَلِلَّهِ غَيْبُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَإِلَيْهِ يُرْجَعُ الْأَمْرُ كُلُّهُ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ۚ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۱۲۳﴾

ع ۱۰

اور ہم رسولوں کے احوال سے سب چیز تمھیں سنا رہے ہیں۔ جس سے تمھارے دل کو مضبوط کریں اور اس میں تمھارے پاس حق آیا ہے اور مومنوں کے لئے نصیحت اور یاددہانی۔ اور جو لوگ ایمان نہیں لائے ان سے کہو کہ تم اپنے طریقہ پر کرتے رہو اور ہم اپنے طریقہ پر کر رہے ہیں۔ اور انتظار کرو، ہم بھی منتظر ہیں۔ اور آسمانوں اور زمین کی چھپی بات اللہ کے پاس ہے اور وہی تمام امور کا مرجع ہے۔ پس تم اس کی عبادت کرو اور اسی پر بھروسہ رکھو اور تمھارا رب اس سے بے خبر نہیں جو تم کر رہے ہو۔ ۱۲۰ - ۱۲۳

قرآن میں رسولوں کے احوال اس لئے سنائے گئے ہیں کہ بعد کے داعیوں کو اس سے سبق حاصل ہو۔ رسولوں کے احوال میں داعی دیکھتا ہے کہ ان کی مخاطب قوموں نے ان سے جھگڑے کئے۔ سیدھی بات کو غلط رخ دے کر انھیں مطعون کیا۔ ان کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائیں۔ ان کو اس طرح رد کر دیا جیسے ان کی کوئی قیمت ہی نہیں۔

مگر بالآخر اللہ نے ان کی مدد کی۔ ان کی بات سب سے برتر ثابت ہوئی۔ مخالفین کی تمام کارروائیاں ناکام ہو کر رہ گئیں۔ دونوں گروہوں کا یہ مختلف انجام اپنی ابتدائی صورت میں موجودہ دنیا ہی میں پیش آیا اور آخرت میں وہ اپنی کامل ترین صورت میں پیش آئے گا۔

ان مثالوں سے داعی کو یہ تاریخی اعتماد حاصل ہوتا ہے کہ اس کو دعوت حق کی راہ میں جو مشکلیں پیش آرہی ہیں ان میں اس کے لئے نہ مایوسی کا سوال ہے اور نہ گھبراہٹ کا۔ دعوت حق کی راہ میں یہ چیزیں ہمیشہ پیش آتی ہیں۔ اور اس کو بھی بالآخر اسی طرح کامیابی حاصل ہوگی جس طرح اس سے پہلے خدا کے سچے داعیوں کو حاصل ہوئی۔

پارہ ۱۲

سُوْرَةُ يُوْسُفَ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ مِائَةٌ وَّاِحْدٰى عَشْرَةَ اٰيَةً وَّاثْنَا عَشَرَ رُكُوْعًا بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

الف، ل، ر۔ یہ واضح کتاب کی آیتیں ہیں۔ ہم نے اس کو عربی قرآن بنا کر اتارا ہے تاکہ تم سمجھو۔ ہم تم کو بہترین سرگزشت سناتے ہیں اس قرآن کی بدولت جو ہم نے تمھاری طرف وحی کیا۔ اس سے پہلے بے شک تو بے خبروں میں تھا۔ ۳-۱

قرآن اگرچہ ساری دنیا کی ہدایت کے لیے آیا ہے۔ تاہم اس کے مخاطب اوّل عرب تھے۔ اس لئے وہ عربی زبان میں اترا۔ اب اس پر ایمان لانے والوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کی تعلیمات کو ہر زبان میں منتقل کریں۔ اور اس کو دنیا کی تمام قوموں تک پہنچائیں۔

قرآن کی تعلیمات قرآن میں مختلف انداز اور اسلوب سے بیان کی گئی ہیں۔ کہیں وہ کائناتی استدلال کی زبان میں ہیں، کہیں انذار اور تبشیر کی زبان میں اور کہیں تاریخ کی زبان میں۔ سورہ یوسف میں یہ پیغام حضرت یوسف کے قصہ کی شکل میں سامنے لایا گیا ہے۔ اس سورہ میں اہل ایمان کو ایک پیغمبر کی سرگزشت کی صورت میں بتایا گیا ہے کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ حق کے لئے اٹھنے والوں کی مدد کرتا ہے۔ اور مخالفین کی تمام سازشوں کے باوجود بالآخر ان کو کامیاب کرتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ اہل ایمان کے اندر تقویٰ اور صبر کی صفت موجود ہو۔ یعنی وہ اللہ سے ڈرنے والے ہوں اور ہر حال میں حق کے راستے پر جمے رہیں۔

اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ۝ قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝

جب یوسف نے اپنے باپ سے کہا کہ ابا جان میں نے خواب میں گیارہ ستارے اور سورج اور چاند دیکھے ہیں۔ میں نے ان کو دیکھا کہ وہ مجھ کو سجدہ کر رہے ہیں۔ اس کے باپ نے کہا کہ اے میرے بیٹے، تم اپنا یہ خواب اپنے بھائیوں کو نہ سنانا کہ وہ تمہارے خلاف کوئی سازش کرنے لگیں۔ بے شک شیطان آدمی کا کھلا ہوا دشمن ہے۔ اور اسی طرح تیرا رب تجھ کو منتخب کرے گا اور تم کو باتوں کی حقیقت تک پہنچنا سکھائے گا اور تم پر اور آل یعقوب پر اپنی نعمت پوری کرے گا جس طرح وہ اس سے پہلے تمہارے اجداد ابراہیم اور اسحاق پر اپنی نعمت پوری کر چکا ہے۔ یقیناً تیرا رب علیم اور حکیم ہے۔ ۶-۴

حدیث میں ہے کہ خواب کی تین قسمیں ہیں۔ اپنے دل کی بات، شیطان کا ڈراوا اور خدا کی بشارت۔ عام آدمی کا خواب تینوں میں سے کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ مگر پیغمبر کا خواب ہمیشہ خدا کی بشارت ہوتا ہے، کبھی راست انداز میں اور کبھی تمثیلی انداز میں۔

حضرت یوسف کا زمانہ انیسویں صدی قبل مسیح کا زمانہ ہے۔ آپ کے والد حضرت یعقوب فلسطین میں رہتے تھے۔ حضرت یوسف اور ان کے بھائی بن یامین ایک ماں سے تھے اور بقیہ دس بھائی دوسری ماؤں سے۔ اس خواب میں سورج اور چاند سے مراد آپ کے والدین ہیں اور گیارہ ستاروں سے مراد گیارہ بھائی۔ اس میں یہ بشارت تھی کہ حضرت یوسف کو پیغمبری ملے گی اور اسی کے ساتھ یہ خواب آپ کے اس عروج و اقتدار کی تمثیل تھا جو بعد کو مصر پہنچ کر آپ کو ملا اور جس کے بعد سارے اہل خاندان مجبور ہوئے کہ وہ آپ کی عظمت کو تسلیم کر لیں۔

حضرت یوسف کے دس سوتیلے بھائی آپ کی شخصیت اور مقبولیت کو دیکھ کر آپ سے حسد رکھتے تھے۔ اس لئے آپ کے والد (حضرت یعقوب) نے خواب سن کر فوراً کہا کہ اپنے بھائیوں سے اس کا ذکر نہ کرنا ورنہ وہ تمہارے اور زیادہ دشمن ہو جائیں گے۔

کسی کی بڑائی دیکھ کر اس کے خلاف جلن پیدا ہونا خالص شیطانی فعل ہے۔ جس شخص کے اندر یہ صفت پائی جائے اس کو اپنے بارہ میں توبہ کرنی چاہئے۔ کیونکہ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ خدا کے فیصلہ پر راضی نہیں۔ وہ شیطان کی ہدایت پر چل رہا ہے نہ کہ خدا کی ہدایت پر۔

یہاں اتمام نعمت کا لفظ حضرت یوسف کے لئے بھی بولا گیا ہے جن کو حکومت حاصل ہوئی اور حضرت ابراہیم کے لئے بھی جن کو کوئی حکومت نہیں ملی۔ پھر دونوں کے درمیان وہ مشترک چیز کیا تھی جس کو اتمام نعمت کہا گیا۔ وہ نبوت تھی۔ یعنی خدا کی اس خصوصی ہدایت کی توفیق جو کسی کو آخرت میں اعلیٰ مراتب تک پہنچانے والی ہے۔ خدا کی ہدایت انسان کے اوپر خدا کی نعمتوں کی تکمیل ہے۔ یہ نعمت پیغمبروں کو براہ راست طور پر ملتی ہے اور عام صالحین کو بالواسطہ طور پر۔

لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَإِخْوَتِهٖٓ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ ۝۷ اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ ۭ اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنِ ۝۸ اقْتُلُوْا يُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا يَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ ۝۹ قَالَ قَاۗئِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ وَاَلْقُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ۝۱۰

حقیقت یہ ہے کہ یوسف اور اس کے بھائیوں میں پوچھنے والوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں۔ جب اس کے بھائیوں نے آپس میں کہا کہ یوسف اور اس کا بھائی ہمارے باپ کو ہم سے زیادہ محبوب ہیں۔ حالانکہ ہم ایک پورا جتھا ہیں۔ یقیناً ہمارا باپ ایک کھلی ہوئی غلطی میں مبتلا ہے۔ یوسف کو قتل کر دو یا اس کو کسی جگہ پھینک دو تاکہ تمہارے باپ کی توجہ صرف تمہاری طرف ہو جائے۔ اور اس کے بعد تم بالکل ٹھیک ہو جانا۔ ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ یوسف کو قتل نہ کرو۔ اگر تم کچھ کرنے ہی والے ہو تو اس کو کسی اندھے کنوئیں میں ڈال دو۔ کوئی راہ چلتا قافلہ اس کو نکال لے جائے گا۔ ۱۰ - ۷

مکہ کے آخری دنوں میں جب کہ ابوطالب اور حضرت خدیجہ کا انتقال ہو چکا تھا مکہ کے لوگوں نے آپ کی مخالفت تیز تر کر دی۔ اس زمانہ میں مکہ کے بعض لوگوں نے آپ سے حضرت یوسف کا حال پوچھا جن کا نام انھوں نے اسفار کے دوران بعض یہودیوں سے سنا تھا۔ یہ سوال اگرچہ انھوں نے تمسخر کی غرض سے کیا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اس کو خود پوچھنے والوں کی طرف لوٹا دیا۔ اس قصہ کے ذریعہ بالواسطہ طور پر انھیں بتایا گیا کہ تم لوگ وہ ہو جن کے حصہ میں یوسف کے بھائیوں کا کردار آیا ہے۔ جب کہ پیغمبر کا انجام خدا کی رحمت سے وہ ہونے والا ہے جو یوسف کا مصر میں ہوا۔

حضرت یعقوب دیکھ رہے تھے کہ ان کی اولاد میں سب سے زیادہ لائق اور صالح حضرت یوسف ہیں۔ ان کے اندر انھیں مستقبل کے نبی کی شخصیت دکھائی دیتی تھی۔ اس بنا پر ان کو حضرت یوسف سے بہت زیادہ لگاؤ تھا۔ مگر آپ کے دس صاحبزادے معاملہ کو دنیوی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ باپ کی نظر میں سب سے زیادہ اہم چیز ان کا جتھا ہونا چاہئے۔ کیونکہ وہی اس قابل ہے کہ خاندان کی مدد اور حمایت کر سکے۔ ان کا یہ یک طرفہ نقطہ نظر یہاں تک پہنچا کہ انھوں نے سوچا کہ یوسف کو میدان سے ہٹا دیں تو باپ کی ساری توجہ ان کی طرف ہو جائے گی۔

وہ لوگ جب حضرت یوسف کے خلاف منصوبہ بنانے بیٹھے تو ان کے ایک بھائی (یہوذا) نے یہ تجویز

پیش کی کہ یوسف کو قتل کرنے کے بجائے کسی اندھے کنوئیں میں ڈال دیا جائے ۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص انتظام تھا ۔ اللہ کا یہ طریقہ ہے کہ کوئی گروہ جب ناحق کسی بندے کے درپے ہو جاتا ہے تو خود اس گروہ میں سے ایک ایسا شخص نکلتا ہے جو اپنے لوگوں کو کسی ایسی معتدل تدبیر پر راضی کرلے جس کے اندر سے اس بندۂ خدا کے لئے نیا امکان کھل جائے ۔

قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ وَاِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ ﴿۱۱﴾ اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَيَلْعَبْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۱۲﴾ قَالَ اِنِّيْ لَيَحْزُنُنِيْٓ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَاَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَاَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳﴾ قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّآ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۱۴﴾

انھوں نے اپنے باپ سے کہا ، اے ہمارے باپ ، کیا بات ہے کہ آپ یوسف کے معاملہ میں ہم پر بھروسہ نہیں کرتے ۔ حالانکہ ہم تو اس کے خیر خواہ ہیں ۔ کل اس کو ہمارے ساتھ بھیج دیجئے ، کھائے اور کھیلے ، اور ہم اس کے نگہبان ہیں ۔ باپ نے کہا میں اس سے غمگین ہوتا ہوں کہ تم اس کو لے جاؤ اور مجھ کو اندیشہ ہے کہ اس کو کوئی بھیڑیا کھا جائے جب کہ تم اس سے غافل ہو ۔ انھوں نے کہا کہ اگر اس کو بھیڑیا کھا گیا جب کہ ہم ایک پوری جماعت ہیں ، تو ہم بڑے خسارے والے ثابت ہوں گے ۔ ۱۴-۱۱

حضرت یعقوب نے اپنے بیٹوں کو جو جواب دیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حالات کے مطالعہ سے انھوں نے اندازہ کر لیا تھا کہ یہ صحرا میں کھیلنے کودنے کا معاملہ نہیں ہے ۔ بلکہ یوسف کے خلاف ان کے بھائیوں کی سازش کا معاملہ ہے ۔ مگر اللہ سے ڈرنے والا انسان اللہ پر بھروسہ کرنے والا انسان ہوتا ہے ۔ حضرت یعقوب نے اگر چہ اپنی فراست سے یہ محسوس کر لیا تھا کہ کیا ہونے جارہا ہے ۔ تاہم وہ خدا کی قدرت کو ہر دوسری چیز سے اوپر سمجھتے تھے ۔ ان کو خدا کی بالادستی پر کامل یقین تھا ۔ چنانچہ واضح خطرات کے باوجود انھوں نے یوسف کو خدا کے بھروسہ پر ان کے بھائیوں کے حوالہ کر دیا ۔

یہ خدا سے ڈرنے والے انسان کی تصویر تھی ۔ دوسری طرف حضرت یوسف کے بھائیوں میں ان لوگوں کی تصویر نظر آتی ہے جن کے دل خدا کے خوف سے خالی ہوں ۔ یہ لوگ ایک بندۂ خدا کو ناحق برباد کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے ۔ وہ یہ بھول گئے تھے کہ وہ ایک ایسی دنیا میں ہیں جہاں خدا کے سوا کسی اور کو کوئی اختیار حاصل نہیں ۔ وہ لفظوں کے اعتبار سے اپنے کو خیر خواہ ثابت کر رہے تھے ۔ حالانکہ خدا کے نزدیک خیر خواہ وہ ہے جو عمل کے اعتبار سے اپنے کو خیر خواہ ثابت کرے ۔

فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهِ وَأَجْمَعُوا أَنْ يَجْعَلُوهُ فِي غَيَابَتِ الْجُبِّ ۚ وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِأَمْرِهِمْ هَٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿۱۵﴾ وَجَاءُوا أَبَاهُمْ عِشَاءً يَبْكُونَ ﴿۱۶﴾ قَالُوا يَا أَبَانَا إِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَأَكَلَهُ الذِّئْبُ ۖ وَمَا أَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَنَا وَلَوْ كُنَّا صَادِقِينَ ﴿۱۷﴾ وَجَاءُوا عَلَىٰ قَمِيصِهِ بِدَمٍ كَذِبٍ ۚ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا ۖ فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۖ وَاللَّهُ الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ ﴿۱۸﴾

پھر جب وہ اس کو لے گئے اور یہ طے کر لیا کہ اس کو ایک اندھے کنویں میں ڈال دیں اور ہم نے یوسف کو وحی کی کہ تو ان کو ان کا یہ کام جتائے گا اور وہ تجھ کو نہ جانیں گے اور وہ شام کو اپنے باپ کے پاس روتے ہوئے آئے۔ انھوں نے کہا کہ اے ہمارے باپ ہم دوڑ کا مقابلہ کرنے لگے اور یوسف کو ہم نے اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا۔ پھر اس کو بھیڑیا کھا گیا۔ اور آپ ہماری بات کا یقین نہ کریں گے چاہے ہم سچے ہوں۔ اور وہ یوسف کی قمیص پر جھوٹا خون لگا کر لے آئے۔ باپ نے کہا نہیں، بلکہ تمھارے نفس نے تمھارے لئے ایک بات بنا دی ہے۔ اب صبر ہی بہتر ہے۔ اور جو بات تم ظاہر کر رہے ہو اس پر اللہ ہی سے مدد مانگتا ہوں ۱۸-۱۵

حضرت یوسف کا اصل قصہ یقینی طور پر اس سے زیادہ مفصل ہے جتنا کہ قرآن میں بیان ہوا ہے۔ مگر قرآن کا اصل مقصد نصیحت ہے نہ کہ واقعہ نگاری۔ اس لئے وہ صرف ان پہلوؤں کو لیتا ہے جو نصیحت اور تذکیر کے لئے مفید ہوں۔ اور بقیہ تمام اجزاء کو حذف کر دیتا ہے تاکہ تاریخ نگار اس کو مرتب کریں۔

روایات کے مطابق حضرت یوسف تین دن تک اندھے کنوئیں میں رہے۔ انھیں تین دنوں میں غالباً خواب کے ذریعہ آپ کو آپ کا مستقبل دکھایا گیا۔ اس میں آپ نے دیکھا کہ آپ کنویں سے نکلتے ہیں اور پھر عظمت و شان کے ایک اونچے مقام پر پہنچتے ہیں۔ حتی کہ آپ کے اور آپ کے بھائیوں کے درمیان حیثیت کے اعتبار سے اتنا فرق ہو جاتا ہے کہ وہ آپ کو دیکھتے ہیں تو پہچان نہیں پاتے۔

حضرت یوسف کے بھائیوں نے جو کچھ کیا وہ انتہائی اشتعال انگیز حرکت تھی۔ مگر ایک طرف حضرت یوسف کا حال یہ تھا کہ انھوں نے اپنے معاملہ کو خدا کے حوالے کر دیا اور سنسان مقام پر اندھے کنویں کے اندر خاموش بیٹھے ہوئے خدا کی مدد کا انتظار کرتے رہے۔ دوسری طرف آپ کے والد حضرت یعقوب نے صبر جمیل کی روش اختیار کی۔ بعض تفسیروں میں آیا ہے کہ انھوں نے اپنے بیٹوں سے کہا: اگر یوسف کو بھیڑیا کھا جاتا تو وہ اس کی قمیص کو بھی ضرور پھاڑ ڈالتا (لو اکلہ السبع لخرق القمیص) یعنی وہ بھیڑیا بھی کیسا شریف بھیڑیا تھا جو یوسف کو تو اٹھا لے گیا اور خون آلود قمیص کو نہایت صحیح و سالم حالت میں اتار کر تمھارے حوالے کر گیا۔

وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَأَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ فَأَدْلٰى دَلْوَهٗ ۚ قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ۚ وَأَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً ۚ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۢ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ ۚ وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ ﴿۲۰﴾

اور ایک قافلہ آیا تو انھوں نے اپنا پانی بھرنے والا بھیجا۔ اس نے اپنا ڈول لٹکایا۔ اس نے کہا، خوشخبری ہو یہ تو ایک لڑکا ہے۔ اور اس کو تجارت کا مال سمجھ کر محفوظ کر لیا۔ اور اللہ خوب جانتا تھا جو وہ کر رہے تھے۔ اور انھوں نے اس کو تھوڑی سی قیمت چند درہم کے عوض بیچ دیا۔ اور وہ اس سے بے رغبت تھے۔ ۱۹-۲۰

حضرت یوسف کے بھائی جب آپ کو اندھے کنویں میں ڈال کر چلے گئے تو تین دن بعد ایک تجارتی قافلہ ادھر سے گذرا جو مدین سے مصر جا رہا تھا۔ قافلہ کے ایک آدمی نے پانی کی خاطر کنویں میں ڈول ڈالا تو حضرت یوسف (جو اس وقت تقریباً ۱۶ سال کے تھے) ڈول پکڑ کر باہر آ گئے۔

یہ بردہ فروشی کا زمانہ تھا۔ اس لئے قافلہ والے خوش ہوئے کہ وہ مصر لے جا کر لڑکے کو فروخت کر سکیں گے۔ چنانچہ جب وہ مصر پہنچے تو اپنے دیگر سامانوں کے ساتھ حضرت یوسف کو بھی بازار میں رکھا۔ وہاں ایک آدمی نے ہونہار لڑکا دیکھ کر آپ کو بیس درہم میں خرید لیا۔

حضرت یوسف کے بھائی آپ کو بے وطن کر کے کنویں میں ڈال چکے تھے۔ قافلہ والوں نے غلام کی حیثیت سے فروخت کر دیا۔ اس کے بعد مصر کے ایک اعلیٰ سرکاری افسر کی بیوی (زلیخا) نے آپ کو قید خانہ میں قید کرا دیا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان تمام مراحل کو آپ کے لئے عزت و سربلندی تک پہنچنے کا زینہ بنا دیا —— کس قدر فرق ہے علم انسانی میں اور علم خداوندی میں۔

وَقَالَ الَّذِى اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖٓ اَكْرِمِىْ مَثْوٰىهُ عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ۚ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِى الْاَرْضِ ۡ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ۚ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۲﴾

اور اہل مصر میں سے جس شخص نے اس کو خریدا اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ اس کو اچھی طرح رکھو۔ امید ہے کہ وہ ہمارے لئے مفید ہو یا ہم اس کو بیٹا بنا لیں۔ اور اس طرح ہم نے یوسف کو اس ملک میں جگہ دی۔ اور تاکہ ہم اس کو باتوں کی تاویل سکھائیں۔ اور اللہ اپنے کام پر غالب رہتا ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اور

جب وہ اپنی پختگی کو پہنچا ہم نے اس کو حکم اور علم عطا کیا۔ اور نیکی کرنے والوں کو ہم ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں۔ ۲۲-۲۱

کہا جاتا ہے کہ مصری حکومت کے ایک افسر (فوطیفار) نے حضرت یوسف کو خریدا۔ معمولی کپڑے میں چھپی ہوئی آپ کی شاندار شخصیت کو اس نے پہچان لیا۔ اس نے سمجھ لیا کہ یہ کوئی غلام نہیں ہے بلکہ شریف خاندان کا لڑکا ہے۔ کسی وجہ سے وہ قافلہ کے ہاتھ لگ گیا اور اس نے اس کو یہاں لا کر بیچ دیا۔ چنانچہ اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ اس کو غلام کی طرح نہ رکھنا۔ یہ ایک لائق نوجوان معلوم ہوتا ہے اور اس قابل ہے کہ ہمارے گھر اور جائداد کا انتظام سنبھال لے۔ مزید یہ کہ فوطیفار بے اولاد تھا اور کسی کو اپنا متبنّیٰ بنانا چاہتا تھا۔ اس نے یہ ارادہ بھی کر لیا کہ اگر واقعی یہ نوجوان اس کی امیدوں کے مطابق نکلا تو وہ اس کو اپنا بیٹا بنا لے گا۔

حضرت یوسف جب تقریباً چالیس سال کے ہوئے تو خدا نے ان کو ایک طرف نبوت عطا کی اور دوسری طرف اقتدار۔ ان کو یہ انعام ان کے حسن عمل کی وجہ سے ملا۔ خدا کے انعام کا دروازہ ہمیشہ محسنین کے لئے کھلا ہوا ہے۔ فرق یہ ہے کہ دور نبوت میں کسی کو اس کے حسن عمل کے نتیجہ میں نبی بھی بنایا جا سکتا تھا۔ مگر بعد کے زمانہ میں اس کو صرف وہ انعامات ملیں گے جو نبوت کے علاوہ ہیں۔

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ۭ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا ۚ لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۭ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْۗءَ وَالْفَحْشَاۗءَ ۭ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۲۴﴾

اور یوسف جس عورت کے گھر میں تھا وہ اس کو پھسلانے لگی اور ایک روز دروازے بند کر دئے اور بولی کہ آجا۔ یوسف نے کہا خدا کی پناہ۔ وہ میرا آقا ہے، اس نے مجھ کو اچھی طرح رکھا ہے۔ بے شک ظالم لوگ کبھی فلاح نہیں پاتے۔ اور عورت نے اس کا ارادہ کر لیا اور وہ بھی اس کا ارادہ کرتا اگر وہ اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لیتا۔ ایسا ہوا تاکہ ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو دور کر دیں۔ بے شک وہ ہمارے چنے ہوئے بندوں میں سے تھا۔ ۲۴-۲۳

عزیز مصر کی بیوی زلیخا حضرت یوسف پر فریفتہ ہو گئی۔ وہ برابر آپ کو پھسلاتی رہی۔ یہاں تک کہ ایک روز موقع پا کر اس نے کمرہ کا دروازہ بند کر لیا۔

ایک غیر شادی شدہ نوجوان کے لئے یہ بڑا نازک موقع تھا۔ مگر حضرت یوسف نے اپنی فطرت ربانی کو محفوظ رکھا تھا اور یہ فطرت اس وقت حضرت یوسف کے کام آ گئی۔ حق اور ناحق بھلائی اور برائی کو پہچاننے کی یہ طاقت

ہر آدمی کے اندر پیدائشی طور پر موجود ہوتی ہے۔ وہ ہر موقع پر انسان کو متنبہ کرتی ہے۔ جو شخص اس کو نظر انداز کردے اس نے گویا خدا کی آواز کو نظر انداز کر دیا۔ ایسا آدمی خدا کی مدد سے محروم ہو کر دھیرے دھیرے اپنی فطرت کو کمزور کر لیتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص خدائی پکار کے ظاہر ہوتے ہی اس کے آگے جھک جائے، خدا کی مدد اس کی استعداد بڑھاتی رہتی ہے۔ وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ آئندہ زیادہ قوت کے ساتھ برائی کے مقابلہ میں ٹھہر سکے۔

حضرت یوسف کو جس چیز نے برائی سے روکا وہ حقیقۃً اللہ کا ڈر تھا۔ مگر زلیخا کے لئے خدا کا حوالہ دینا اس وقت بے اثر رہتا۔ یہ موقع اعلان حق کا نہیں تھا بلکہ ایک نازک صورت حال سے اپنے آپ کو بچانے کا تھا اسی نزاکت کی بنا پر آپ نے زلیخا کو اس کے شوہر کا حوالہ دیا۔ آپ نے فرمایا کہ وہ میرا آقا ہے۔ اس نے مجھے نہایت عزت کے ساتھ اپنے گھر میں رکھا ہے۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ میں اپنے محسن کے ناموس پر حملہ کروں۔

وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيصَهُ مِنْ دُبُرٍ وَأَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ۚ قَالَتْ مَا جَزَاءُ مَنْ أَرَادَ بِأَهْلِكَ سُوءًا إِلَّا أَنْ يُسْجَنَ أَوْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٢٥﴾ قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِي عَنْ نَفْسِي ۚ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ أَهْلِهَا إِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكَاذِبِينَ ﴿٢٦﴾ وَإِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿٢٧﴾ فَلَمَّا رَأَىٰ قَمِيصَهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ إِنَّهُ مِنْ كَيْدِكُنَّ ۖ إِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيمٌ ﴿٢٨﴾ يُوسُفُ أَعْرِضْ عَنْ هَٰذَا ۚ وَاسْتَغْفِرِي لِذَنْبِكِ ۖ إِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخَاطِئِينَ ﴿٢٩﴾

ع ۱۴

اور دونوں دروازے کی طرف بھاگے۔ اور عورت نے یوسف کا کرتا پیچھے سے پھاڑ دیا۔ اور دونوں نے اس کے شوہر کو دروازے پر پایا۔ عورت بولی کہ جو تیری گھر والی کے ساتھ برائی کا ارادہ کرے اس کی سزا اس کے سوا کیا ہے کہ اسے قید کیا جائے یا اسے سخت عذاب دیا جائے۔ یوسف بولا کہ اسی نے مجھے پھسلانے کوشش کی۔ اور عورت کے کنبہ والوں میں سے ایک شخص نے گواہی دی کہ اگر اس کا کرتا آگے سے پھٹا ہوا ہو تو عورت سچی ہے اور وہ جھوٹا ہے۔ اور اگر اس کا کرتا پیچھے سے پھٹا ہوا ہو تو عورت جھوٹی ہے اور وہ سچا ہے۔ پھر جب عزیز نے دیکھا کہ اس کا کرتا پیچھے سے پھٹا ہوا ہے تو اس نے کہا کہ بے شک یہ تم عورتوں کی چال ہے۔ اور تمھاری چالیں بہت بڑی ہوتی ہیں۔ یوسف اس سے درگزر کرو۔ اور اے عورت تو اپنی غلطی کی معافی مانگ۔ بے شک تو ہی خطا کار تھی۔ ۲۵-۲۹

حضرت یوسف اپنے آپ کو بچانے کے لئے دروازے کی طرف بھاگے۔ زلیخا بھی ان کے پیچھے دوڑی اور پیچھے سے آپ کا کرتا پکڑ لیا۔ کھینچ تان میں پیچھے کا دامن پھٹ گیا۔ تاہم حضرت یوسف دروازہ کھول کر باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ دروازہ کے باہر اتفاق سے زلیخا کا شوہر موجود تھا۔ اس کو دیکھتے ہی زلیخا نے ساری ذمہ داری حضرت یوسف پر ڈال دی۔ ایک لمحہ پہلے وہ جس شخص سے اظہار محبت کر رہی تھی، ایک لمحہ بعد اس پر جھوٹا الزام لگانے لگی۔

حضرت یوسف نے بتایا کہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اب سوال یہ تھا کہ فیصلہ کیسے کیا جائے کہ غلطی کس کی ہے۔ کوئی تیسرا شخص موقع پر موجود نہیں تھا جو عینی گواہی دے۔ اس وقت گھر کے ایک مرد دانا نے لوگوں کو رہنمائی دی۔ اغلب ہے کہ یہ شخص پہلے سے حالات سے باخبر تھا۔ نیز اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ یوسف کا کرتا آگے کے بجائے پیچھے کی طرف سے پھٹا ہوا ہے۔ مگر اس نے اپنی بات کو ایسے انداز میں کہا گویا کہ وہ لوگوں سے کہہ رہا ہے کہ جب عینی شہادت موجود نہیں ہے تو قرینہ کی شہادت (Circumstantial evidence) دیکھ کر فیصلہ کر لو۔ اور قرینہ کی شہادت یہ تھی کہ حضرت یوسف کا کرتا پیچھے کی جانب سے پھٹا ہوا تھا۔ یہ واضح طور پر اس کا ثبوت تھا کہ اس معاملہ میں اقدام زلیخا کی طرف سے ہوا ہے نہ کہ یوسف کی طرف سے۔

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ تُرَاوِدُ فَتَاهَا عَنْ نَفْسِهِ ۖ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ۖ إِنَّا لَنَرَاهَا فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ﴿٣٠﴾ فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ أَرْسَلَتْ إِلَيْهِنَّ وَأَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَأً وَآتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِنْهُنَّ سِكِّينًا وَقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۖ فَلَمَّا رَأَيْنَهُ أَكْبَرْنَهُ وَقَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا هَٰذَا بَشَرًا إِنْ هَٰذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ ﴿٣١﴾ قَالَتْ فَذَٰلِكُنَّ الَّذِي لُمْتُنَّنِي فِيهِ ۖ وَلَقَدْ رَاوَدْتُهُ عَنْ نَفْسِهِ فَاسْتَعْصَمَ ۖ وَلَئِنْ لَمْ يَفْعَلْ مَا آمُرُهُ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُونًا مِنَ الصَّاغِرِينَ ﴿٣٢﴾ قَالَ رَبِّ السِّجْنُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ ۖ وَإِلَّا تَصْرِفْ عَنِّي كَيْدَهُنَّ أَصْبُ إِلَيْهِنَّ وَأَكُنْ مِنَ الْجَاهِلِينَ ﴿٣٣﴾ فَاسْتَجَابَ لَهُ رَبُّهُ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ۚ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٣٤﴾

اور شہر کی عورتیں کہنے لگیں کہ عزیز کی بیوی اپنے نوجوان غلام کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ وہ اس کی محبت میں فریفتہ ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کھلی ہوئی غلطی پر ہے۔ پھر جب اس نے ان کا فریب سنا تو اس نے ان کو بلا بھیجا۔ اور

ان کے لئے ایک مجلس تیار کی اور ان میں سے ہر ایک کو ایک ایک چھری دی اور یوسف سے کہا کہ تم ان کے سامنے آؤ۔ پھر جب عورتوں نے اس کو دیکھا تو وہ دنگ رہ گئیں۔ اور انھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے۔ اور انھوں نے کہا حاشا للہ، یہ آدمی نہیں ہے، یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے۔ اس نے کہا یہ وہی ہے جس کے بارے میں تم مجھ کو ملامت کر رہی تھیں اور میں نے اس کو رجھانے کی کوشش کی تھی مگر وہ بچ گیا۔ اور اگر اس نے وہ نہیں کیا جو میں اس سے کہہ رہی ہوں تو وہ قید میں پڑے گا اور ضرور بے عزت ہوگا۔ یوسف نے کہا، اے میرے رب، قید خانہ مجھ کو اس چیز سے زیادہ پسند ہے جس کی طرف یہ مجھے بلا رہی ہیں۔ اور اگر تونے ان کے فریب کو مجھ سے دفع نہ کیا تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور جاہلوں میں سے ہو جاؤں گا۔ پس اس کے رب نے اس کی دعا قبول کر لی اور ان کے فریب کو اس سے دفع کر دیا۔ بے شک وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ ۳۴-۳۰

اس قصہ میں ایک طرف مصر کی اونچے طبقہ کی خواتین تھیں اور دوسری طرف حضرت یوسف۔ خواتین آپ کو بس ایک خوبصورت جوان کی صورت میں دیکھ رہی تھیں۔ اسی طرح حضرت یوسف ان خواتین کو تسکین نفس کے سامان کے روپ میں دیکھ سکتے تھے۔ مگر انتہائی ہیجان خیز حالات میں بھی آپ نے ایسا نہیں کیا۔

خواتین کا حال یہ تھا کہ وہ سب کی سب آپ کی پرکشش شخصیت کی طرف متوجہ تھیں۔ حتیٰ کہ شدت محویت میں انھوں نے چھری سے پھل کاٹتے ہوئے اپنے ہاتھ زخمی کر لئے۔ مگر حضرت یوسف اپنی تمام تر توجہ خدا کی طرف لگائے ہوئے تھے۔ خدا کی عظمت و کبریائی کا احساس آپ کے اوپر اتنا غالب آچکا تھا کہ کوئی دوسری چیز آپ کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی ــــ کتنا فرق ہے ایک انسان اور دوسرے انسان میں۔

ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۳۵﴾ وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ۭ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّىْٓ اَرٰىنِىْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّىْٓ اَرٰىنِىْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ۭ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۶﴾

پھر نشانیاں دیکھ لینے کے بعد ان لوگوں کی سمجھ میں آیا کہ ایک مدت کے لئے اس کو قید کر دیں۔ اور قید خانہ میں اس کے ساتھ دو اور جوان داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک نے (ایک روز) کہا کہ میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں شراب نچوڑ رہا ہوں اور دوسرے نے کہا کہ میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ اپنے سر پر روٹی اٹھائے ہوئے ہوں جس میں سے چڑیاں کھا رہی ہیں۔ ہم کو اس کی تعبیر بتاؤ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تم نیک

لوگوں میں سے ہو۔ ۳۶-۳۵

مصر کے اعلیٰ طبقہ کی خواتین جب حضرت یوسف کو اپنی طرف راغب نہ کرسکیں تو اس کے بعد انھوں نے آپ کے لئے جو مقام پسند کیا وہ قید خانہ تھا۔ چونکہ اس وقت آپ کی حیثیت ایک غلام کی تھی اس لئے قدیم رواج کے مطابق آپ کو قید خانہ بھیجنے کے لئے کسی عدالتی کارروائی کی ضرورت نہ تھی۔ آپ کا آقا خود اپنے فیصلہ سے آپ کو قید میں ڈالنے کا اختیار رکھتا تھا۔

مگر قید خانہ آپ کے لئے نیا عظیم تر زینہ بن گیا۔ اب تک ایسا تھا کہ مصر کے ایک یا چند افسروں کے گھرانے آپ سے متعارف ہوئے تھے۔ اب اس کا امکان پیدا ہوگیا کہ آپ کی شخصیت کا چرچا خود بادشاہ مصر تک پہنچے۔

اس کی صورت یہ ہوئی کہ آپ جس قید خانہ میں رکھے گئے اس میں دو اور نوجوان قید ہوکر آئے۔ یہ دونوں شاہی محل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان دونوں نے قید خانہ میں خواب دیکھے اور آپ سے اس کی تعبیر پوچھی۔ آپ نے انھیں خواب کی تعبیر بتادی۔ یہ تعبیر بالکل صحیح ثابت ہوئی۔ اس کے بعد ان میں سے ایک قید خانہ سے چھوٹ کر دوبارہ شاہی محل میں پہنچا تو اس نے ایک موقع پر بادشاہ سے بتایا کہ قید خانہ میں ایک ایسا نیک انسان ہے جو خواب کی بالکل صحیح تعبیر بتاتا ہے ——— اس طرح آپ کا قید ہونا آپ کے لئے شاہی محل تک رسائی کا ابتدائی زینہ بن گیا۔

قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهِ إِلَّا نَبَّأْتُكُمَا بِتَأْوِيلِهِ قَبْلَ أَنْ يَأْتِيَكُمَا ۚ ذَٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّي ۚ إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ ﴿٣٧﴾ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِي إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ ۚ مَا كَانَ لَنَا أَنْ نُشْرِكَ بِاللَّهِ مِنْ شَيْءٍ ۚ ذَٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللَّهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿٣٨﴾ يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ أَأَرْبَابٌ مُتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿٣٩﴾ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءً سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ ۚ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۚ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٤٠﴾

یوسف نے کہا، جو کھانا تم کو ملتا ہے اس کے آنے سے پہلے میں تمھیں ان خوابوں کی تعبیر بتا دوں گا۔ یہ اس علم میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے سکھایا ہے۔ میں نے ان لوگوں کے مذہب کو چھوڑا جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور وہ لوگ آخرت کے منکر ہیں اور میں نے اپنے بزرگوں ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کے مذہب کی پیروی کی۔ ہم کو یہ حق نہیں کہ ہم کسی چیز کو اللہ کا شریک ٹھہرائیں۔ یہ اللہ کا فضل ہے ہمارے اوپر اور سب لوگوں کے اوپر مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ اے میرے جیل کے ساتھیو، کیا جدا جدا کئی معبود بہتر ہیں یا اللہ اکیلا زبردست۔ تم اس کے سوا نہیں پوجتے ہو مگر کچھ ناموں کو جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں۔ اللہ نے اس کی کوئی سند نہیں اتاری۔ اقتدار صرف اللہ کے لئے ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ یہی سیدھا دین ہے۔ مگر بہت لوگ نہیں جانتے۔ ۳۷ ۔ ۴۰

نوجوان قیدیوں نے اپنے خواب کی تعبیر جاننے کے لئے حضرت یوسف سے رجوع کیا۔ انھوں نے جس انداز سے سوال کیا اس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ آپ کی شخصیت سے متاثر ہیں۔ اور آپ کی رائے پر اعتماد کرتے ہیں۔ حضرت یوسف جیسے نیک اور بااصول انسان کے ساتھ ایک عرصہ تک رہنے کے بعد ایسا ہونا بالکل فطری تھا۔

حضرت یوسف کے دعوتی جذبہ نے فوراً محسوس کر لیا کہ یہ بہترین موقع ہے کہ ان نوجوانوں کو دین حق کا پیغام پہنچایا جائے۔ مگر خواب کی تعبیر فوراً بتا دینے کے بعد ان کی توجہ آپ کی طرف سے ہٹ جاتی۔ چنانچہ آپ نے حکیمانہ انداز اختیار کیا اور خواب کی تعبیر کو تھوڑی دیر کے لئے مؤخر کر دیا۔ اس کے بعد آپ نے توحید پر مختصر تقریر کی۔ اس میں مخاطب کی نفسیات کی رعایت کرتے ہوئے نہایت خوبصورت استدلال کے ساتھ اپنا پیغام انھیں سنا دیا۔

درخت، پتھر، ستارے یا ارواح وغیرہ کو جو لوگ پوجتے ہیں اس کا راز یہ ہے کہ وہ بطور خود ان کو مشکل کشا اور حاجت روا جیسے القاب دیتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ واقعتہً وہ مشکل کشا اور حاجت روا ہیں۔ حالانکہ یہ سب انسان کے اپنے بنائے ہوئے اسم ہیں جن کا مسمّیٰ خارج میں کہیں موجود نہیں۔

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّاۤ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ؕ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ﴿۴۱﴾ وَقَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ ؗ فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ ﴿۴۲﴾

اے میرے قید خانہ کے ساتھیو تم میں سے ایک اپنے آقا کو شراب پلائے گا۔ اور جو دوسرا ہے اس کو سولی دی

جائے گی۔ پھر پرندے اس کے سر میں سے کھائیں گے۔ اس امر کا فیصلہ ہو گیا جس کے بارہ میں تم پوچھ رہے تھے۔ اور یوسف نے اس شخص سے کہا جس کے بارہ میں اس نے گمان کیا تھا کہ بچ جائے گا کہ اپنے آقا کے پاس میرا ذکر کرنا۔ پھر شیطان نے اس کو اپنے آقا سے ذکر کرنا بھلا دیا۔ پس وہ قید خانہ میں کئی سال پڑا رہا۔ ۴۱-۴۲

دو نوجوان جو جیل میں لائے گئے وہ شاہ مصر (ریان بن الولید) کے ساقی اور خباز تھے۔ دونوں پر یہ الزام تھا کہ انھوں نے بادشاہ کے کھانے میں زہر ملانے کی کوشش کی۔ ان میں سے جو ساقی تھا وہ تحقیق کے بعد الزام سے بری ثابت ہوا اور رہائی پاکر دوبارہ بادشاہ کا ساقی مقرر ہوا۔ اس کے خواب کا مطلب یہ تھا کہ اب وہ بادشاہ کو خواب میں شراب پلا رہا ہے کچھ دن بعد وہ بیداری میں اس کو شراب پلائے گا۔ خباز پر الزام ثابت ہو گیا۔ اس کو سولی دے کر چھوڑ دیا گیا کہ چڑیاں اس کا گوشت کھائیں اور وہ لوگوں کے لئے عبرت ہو۔

حضرت یوسف کی دونوں تعبیریں بالکل درست ثابت ہوئیں۔ مگر ساقی قید سے چھوٹ کر دوبارہ محل میں پہنچا تو وہ حسب وعدہ بادشاہ سے حضرت یوسف کا ذکر کرنا بھول گیا۔ اس کو اپنا کیا ہوا وعدہ صرف اس وقت یاد آیا جب کہ بادشاہ نے ایک خواب دیکھا اور درباریوں سے کہا کہ اس کی تعبیر بتاؤ۔

وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّيٓ أَرَىٰ سَبْعَ بَقَرَٰتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعَ سُنۢبُلَٰتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَٰتٍ ۖ يَٰٓأَيُّهَا الْمَلَأُ أَفْتُونِي فِي رُءْيَٰيَ إِن كُنتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُونَ ﴿٤٣﴾ قَالُوٓا أَضْغَٰثُ أَحْلَٰمٍ ۖ وَمَا نَحْنُ بِتَأْوِيلِ الْأَحْلَٰمِ بِعَٰلِمِينَ ﴿٤٤﴾ وَقَالَ الَّذِي نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ أُمَّةٍ أَنَا۠ أُنَبِّئُكُم بِتَأْوِيلِهِۦ فَأَرْسِلُونِ ﴿٤٥﴾

اور بادشاہ نے کہا کہ میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ سات موٹی گائیں ہیں جن کو سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات ہری بالیاں ہیں اور دوسری سات سوکھی۔ اے دربار والو میرے خواب کی تعبیر مجھے بتاؤ اگر تم خواب کی تعبیر دیتے ہو۔ وہ بولے یہ خیالی خواب ہیں۔ اور ہم کو ایسے خوابوں کی تعبیر معلوم نہیں۔ ان دو قیدیوں میں سے جو شخص بچ گیا تھا اور اس کو ایک مدت کے بعد یاد آیا، اس نے کہا کہ میں تم لوگوں کو اس کی تعبیر بتاؤں گا، پس مجھ کو (یوسف کے پاس) جانے دو۔ ۴۳-۴۵

مصر کا بادشاہ اگرچہ مشرک اور شرابی تھا، مگر خدا کی طرف سے اس کو مستقبل کے بارے میں ایک سچا خواب دکھایا گیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خدا حق کے داعیوں کی مدد کن کن طریقوں سے کرتا ہے۔ ان میں سے ایک طریقہ یہ ہے کہ فریق ثانی کو کوئی ایسا خواب دکھایا جائے جس سے اس کے ذہن پر داعی کی عظمت اور اہمیت قائم ہو اور اس کا دل نرم ہو کر داعی کے لئے نئے راستے کھل جائیں۔

بادشاہ کے ساقی نے جب بادشاہ کا خواب سنا اس وقت اس کو قید خانہ کا ماجرا یاد آیا۔ اس نے بادشاہ اور درباریوں کے سامنے اپنا ذاتی تجربہ بتایا کہ کس طرح یوسف کی بتائی ہوئی خواب کی تعبیر دو قیدیوں کے حق میں لفظ بلفظ صحیح ثابت ہوئی۔ اس کے بعد وہ بادشاہ سے اجازت لے کر قید خانہ پہنچا تاکہ یوسف سے بادشاہ کے خواب کی تعبیر دریافت کرے۔

حضرت یوسف کی اسی حیثیت کے تعارف سے ان کے لئے قید خانہ سے باہر آنے کا راستہ کھلا خدا ایسا کر سکتا تھا کہ ساقی کی رہائی کے بعد حضرت یوسف کو مزید قید خانہ میں نہ رہنے دے۔ وہ ساقی کو محل کے اندر پہنچتے ہی یاد دلا سکتا تھا کہ وہ وعدہ کے مطابق بادشاہ کے سامنے یوسف کا ذکر کرے۔ مگر خدا کا ہر کام اپنے مقرر وقت پر ہوتا ہے۔ وقت سے پہلے کوئی کام کرنا خدا کا طریقہ نہیں۔

يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ أَفْتِنَا فِي سَبْعِ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعِ سُنْبُلَاتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَاتٍ لَعَلِّي أَرْجِعُ إِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٤٦﴾ قَالَ تَزْرَعُونَ سَبْعَ سِنِينَ دَأَبًا فَمَا حَصَدْتُمْ فَذَرُوهُ فِي سُنْبُلِهِ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّا تَأْكُلُونَ ﴿٤٧﴾ ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَأْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّا تُحْصِنُونَ ﴿٤٨﴾ ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ عَامٌ فِيهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيهِ يَعْصِرُونَ ﴿٤٩﴾ ع

یوسف اے سچے، مجھے اس خواب کا مطلب بتا کر سات موٹی گائیں ہیں جن کو سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں۔ اور سات بالیں ہری ہیں اور دوسری سات سوکھی۔ تاکہ میں ان لوگوں کے پاس جاؤں تاکہ وہ جان لیں۔ یوسف نے کہا کہ تم سات سال تک برابر کھیتی کرو گے۔ پس جو فصل تم کاٹو اس کو اس کی بالیوں میں چھوڑ دو مگر تھوڑا سا جو تم کھاؤ۔ پھر اس کے بعد سات سخت سال آئیں گے۔ اس زمانہ میں وہ غلہ کھا لیا جائے گا جو تم اس وقت کے لئے جمع کرو گے، بجز تھوڑا سا جو تم محفوظ کر لو گے۔ پھر اس کے بعد ایک سال آئے گا جس میں لوگوں پر مینھ برسے گا۔ اور وہ اس میں رس نچوڑیں گے۔ ۴۹ – ۴۶

حضرت یوسف نے بادشاہ کے خواب کی تعبیر یہ بتائی کہ سات موٹی گائیں اور سات ہری بالیں سات برس ہیں۔ ان میں لگاتار اچھی پیداوار ہوگی۔ حیوانات اور نباتات خوب بڑھیں گے۔ اس کے بعد سات سال قحط پڑے گا جس میں تم سارا پچھلا اندوختہ کھا کر ختم کر ڈالو گے۔ صرف آئندہ بیج ڈالنے کے لئے تھوڑا سا باقی رہ جائے گا۔ یہ بعد کے سات سال گویا دبلی گائیں اور سوکھی بالیں ہیں جو پچھلی موٹی گایوں اور ہری بالوں کا خاتمہ کر دیں گی۔

اسی کے ساتھ حضرت یوسف نے اس کی تدبیر بھی بتادی۔ آپ نے کہا کہ پہلے سات سال میں جو پیداوار ہو اس کو نہایت حفاظت سے رکھو اور کفایت کے ساتھ خرچ کرو۔ ضروری خوراک سے زیادہ جو غلہ ہے اس کو بالوں کے اندر رہنے دو۔ اس طرح وہ کیڑے وغیرہ سے محفوظ رہے گا۔ اور سات سال کی پیداوار بعد کے سال تک کام آئے گی۔ مزید آپ نے یہ خوش خبری بھی سنادی کہ بعد کے سات سالہ قحط کے بعد جو سال آئے گا وہ دوبارہ فراوانی کا سال ہوگا۔ اس میں خوب بارش ہوگی، کثرت سے دودھ اور پھل لوگوں کو حاصل ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ نے بادشاہ کو ایک عجیب خواب دکھایا اور حضرت یوسف کے ذریعہ اس کی کامیاب تعبیر ظاہر فرمائی۔ اس طرح آپ کے لئے یہ موقع فراہم کیا گیا کہ مصر کے نظام حکومت میں آپ کو نہایت اعلیٰ مقام حاصل ہو۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ ۖ فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُولُ قَالَ ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ اللَّاتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ ۚ إِنَّ رَبِّي بِكَيْدِهِنَّ عَلِيمٌ ﴿٥٠﴾ قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ إِذْ رَاوَدْتُنَّ يُوسُفَ عَن نَّفْسِهِ ۚ قُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِن سُوءٍ ۚ قَالَتِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ الْآنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ أَنَا رَاوَدتُّهُ عَن نَّفْسِهِ وَإِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِينَ ﴿٥١﴾

اور بادشاہ نے کہا کہ اس کو میرے پاس لاؤ۔ پھر جب قاصد اس کے پاس آیا تو اس نے کہا کہ تم اپنے آقا کے پاس واپس جاؤ اور اس سے پوچھو کہ ان عورتوں کا کیا معاملہ ہے جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے۔ میرا رب تو ان کے فریب سے خوب واقف ہے۔ بادشاہ نے پوچھا، تمھارا کیا ماجرا ہے جب تم نے یوسف کو پھسلانے کی کوشش کی تھی۔ انھوں نے کہا کہ حاشَ للّٰہ، ہم نے اس میں کچھ برائی نہیں پائی۔ عزیز کی بیوی نے کہا اب حق کھل گیا، میں نے ہی اس کو پھسلانے کی کوشش کی تھی اور بلاشبہ وہ سچا ہے۔ ۵۱ - ۵۰

قیدخانہ سے نکل کر حضرت یوسف کو ایک ملکی کردار ادا کرنا تھا، اس لئے ضروری تھا کہ آپ کی شخصیت ملکی سطح پر ایک معروف شخصیت بن جائے۔ اس کی صورت بادشاہ کے خواب کے ذریعہ پیدا ہوگئی۔ بادشاہ نے ایک عجیب خواب دیکھا۔ وہ اس کی تعبیر کے لئے اتنا بے چین ہوا کہ عام اعلان کرکے تمام ملک کے علماء، پیروں اور دانشوروں کو اپنے دربار میں جمع کیا۔ اور ان سے کہا کہ وہ اس خواب کی تعبیر بتائیں مگر سب کے سب عاجز رہے۔ اس طرح خواب کا واقعہ ایک عمومی شہرت کا واقعہ بن گیا۔ اب جب حضرت یوسف نے خواب کی تعبیر بیان کی اور بادشاہ نے اس کو پسند کیا تو اچانک وہ تمام ملک کی نظروں میں آگئے۔

بادشاہ نے ساری بات سننے کے بعد متعلقہ عورتوں سے اس کی تحقیق کی۔ سب نے بیک زبان حضرت یوسف کو بری الذمہ قرار دیا۔ عزیز مصر کی بیوی اعتراف حق میں سب سے آگے نکل گئی۔ اس نے صاف لفظوں میں اعلان کیا کہ اب سچائی کھل چکی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سارا قصور میرا تھا۔ یوسف کا کچھ بھی قصور نہ تھا۔ عزیز مصر کی بیوی (زلیخا) کا یہ اقرار اتنا عظیم عمل ہے کہ عجب نہیں کہ اس کے بعد اس کو ایمان کی توفیق دے دی گئی ہو۔

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّىْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِىْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ﴿۵۲﴾ وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِىْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّىْ ۚ اِنَّ رَبِّىْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۳﴾

الجزء الثالث عشر ۱۳

یہ اس لئے کہ (عزیز مصر) یہ جان لے کہ میں نے درپردہ اس کی خیانت نہیں کی۔ اور بے شک اللہ خیانت کرنے والوں کی چال کو چلنے نہیں دیتا۔ اور میں اپنے نفس کی برأت نہیں کرتا۔ نفس تو بدی ہی سکھاتا ہے الّا یہ کہ میرا رب رحم فرمائے۔ بے شک میرا رب بخشنے والا مہربان ہے۔ ۵۳ - ۵۲

بادشاہ نے جب حضرت یوسف کو بلایا تو وہ فوراً قیدخانہ سے باہر نہیں آگئے۔ بلکہ یہ کہا کہ پہلے اس واقعہ کی تحقیق ہونی چاہئے جس کو بہانہ بنا کر مجھ کو قید کیا گیا تھا۔ خدا کے نزدیک اگرچہ آپ پوری طرح بری الذمہ تھے مگر مسئلہ یہ تھا کہ آپ کو عوام کے درمیان پیغمبری کی خدمت انجام دینی تھی۔ یعنی خدا کی امانتِ ہدایت کو اس کے بندوں تک پہنچانا تھا۔ مذکورہ واقعہ میں آپ پر اپنے آقا کے ساتھ خیانت کا الزام لگایا گیا تھا۔ یہ ایک بہت نازک معاملہ تھا اور عوام کے سامنے آنے سے پہلے ضروری تھا کہ آپ کے اوپر سے یہ الزام ختم ہو۔ کیونکہ جس شخص کو لوگ بندوں کے معاملہ میں امانت دار نہ سمجھیں اس کو وہ خدا کے معاملہ میں امانت دار نہیں سمجھ سکتے۔

مومن بیک وقت دو چیزوں کے درمیان ہوتا ہے۔ ایک انسان اور دوسرے خدا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے

کہ اس کو انسانوں کی نسبت سے معاملہ کی وضاحت کے لئے کوئی ایسا کلمہ بولنا پڑتا ہے جس میں بظاہر ادعا کا پہلو نظر آتا ہو۔ مگر اس کا دل اس وقت بھی عجز کے احساس سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ کیونکہ جب وہ اپنے آپ کو خدا کی نسبت سے دیکھتا ہے تو وہ پاتا ہے کہ خدا کی نسبت سے وہ صرف عاجز ہے اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ خدا کا تصور ہر آن مومن کو متوازن کرتا رہتا ہے ـــــ حضرت یوسف کا مذکورہ کلام مومن کی شخصیت کے اسی دوگونہ پہلو کی تصویر ہے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِي ۖ فَلَمَّا كَلَّمَهُ قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ ﴿٥٤﴾ قَالَ اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ ۖ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ ﴿٥٥﴾ وَكَذَٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ يَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ ۚ نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَشَاءُ ۖ وَلَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٥٦﴾ وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِلَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ﴿٥٧﴾

ع ۷/۸

اور بادشاہ نے کہا اس کو میرے پاس لاؤ۔ میں اس کو خاص اپنے لئے رکھوں گا۔ پھر جب یوسف نے اس سے بات کی تو بادشاہ نے کہا، آج سے تم ہمارے یہاں معزز اور معتمد ہوئے۔ یوسف نے کہا کہ مجھ کو ملک کے خزانوں پر مقرر کر دو۔ میں نگہبان ہوں اور جاننے والا ہوں۔ اور اس طرح ہم نے یوسف کو ملک میں با اختیار بنا دیا۔ وہ اس میں جہاں چاہے جگہ بنائے۔ ہم جس پر چاہیں اپنی عنایت متوجہ کر دیں۔ اور ہم نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔ اور آخرت کا اجر کہیں زیادہ بڑھ کر ہے ایمان اور تقویٰ والوں کے لئے۔ ۵۷-۵۴

"مجھے زمین کے خزانوں پر مقرر کر دو"، یہاں خزانوں سے مراد غلّہ کے کھتے ہیں۔ حضرت یوسف نے بادشاہ کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر شاہ مصر سے یہ اختیار مانگا کہ وہ حکومتی وسائل کے تحت سارے ملک میں غلّہ کے بڑے بڑے کھتے بنوائیں تاکہ ابتدائی سات سالوں میں کسانوں سے فاضل غلّہ لے کر وہاں محفوظ کیا جا سکے (تفسیر ابن کثیر) بادشاہ راضی ہو گیا اور اپنے آئینی اور قانونی اقتدار کے تحت آپ کو ہر قسم کا اختیار دے دیا۔

مصر کا بادشاہ مشرک تھا۔ آیت نمبر ۷۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف کے تقرر کے تقریباً دس سال بعد تک بھی اسی بادشاہ کا قانون (دین الملک) مصر میں رائج تھا۔ یہ خدا کے ایک پیغمبر کا اسوہ ہے جو بتاتا ہے کہ غیر مسلم حکومت کے تحت کوئی ذیلی عہدہ قبول کرنا اسلام کے خلاف نہیں ہے۔ اسی بنا پر اسلاف نے ظالم بادشاہوں کے تحت قضا کے عہدے قبول کئے۔ (تفسیر النسفی)

مصر میں اختیار سنبھالنے سے حضرت یوسف کا مقصد کیا تھا، قرآن کی تفصیل سے بظاہر اس کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ بندگان خدا کو طویل قحط کی مصیبت سے بچایا جائے، اور پھر اس کے نتیجہ میں بنی اسرائیل کے لئے مصر میں آباد ہونے کے مواقع فراہم کئے جائیں۔

ایمان اور تقویٰ کی روش اختیار کرنے والوں کے لئے خدا نے ابدی جنت کا یقینی وعدہ کیا ہے۔ دنیا کی زندگی میں بھی ان کو خدا کی مدد حاصل ہوتی ہے۔ تاہم اس میں ایک فرق ہے۔ جہاں تک حق کے اعلان کا معاملہ ہے، اس کی توفیق ہر ایک کو یکساں طور پر ملتی ہے۔ مگر عملی یافت کے معاملہ میں سب کی نصرت یکساں انداز میں نہیں۔ عملی نصرت کسی کو ایک ڈھنگ پر ملتی ہے اور کسی کو دوسرے ڈھنگ پر۔

وَجَآءَ إِخْوَةُ يُوسُفَ فَدَخَلُوا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهُ مُنكِرُونَ ۝ وَلَمَّا جَهَّزَهُم بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُونِي بِأَخٍ لَّكُم مِّنْ أَبِيكُمْ ۚ أَلَا تَرَوْنَ أَنِّي أُوفِي الْكَيْلَ وَأَنَا خَيْرُ الْمُنزِلِينَ ۝ فَإِن لَّمْ تَأْتُونِي بِهِ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِندِي وَلَا تَقْرَبُونِ ۝ قَالُوا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ أَبَاهُ وَإِنَّا لَفَاعِلُونَ ۝

اور یوسف کے بھائی مصر آئے پھر اس کے پاس پہنچے، پس یوسف نے ان کو پہچان لیا۔ اور انھوں نے یوسف کو نہیں پہچانا۔ اور جب اس نے ان کا سامان تیار کر دیا تو کہا کہ اپنے سوتیلے بھائی کو بھی میرے پاس لے آنا۔ تم دیکھتے نہیں ہو کہ میں غلہ بھی پورا ناپ کر دیتا ہوں اور بہترین میزبانی کرنے والا بھی ہوں۔ اور اگر تم اس کو میرے پاس نہ لائے تو نہ میرے پاس تمھارے لئے غلہ ہے اور نہ تم میرے پاس آنا۔ انھوں نے کہا کہ ہم اس کے بارے میں اس کے باپ کو راضی کرنے کی کوشش کریں گے اور ہم کو یہ کام کرنا ہے۔ ۵۸-۶۱

حضرت یوسف کے اقتدار کے ابتدائی سات سال تک خوب فصل پیدا ہوئی۔ آپ نے سارے ملک میں بڑے بڑے کھتے بنوائے اور کسانوں سے ان کا فاضل غلہ خرید کر ہر سال ان کھتوں میں محفوظ کرتے رہے اس کے بعد جب قحط کے سال شروع ہوئے تو آپ نے اس غلہ کو دارالسلطنت میں منگوا کر مناسب قیمت پر فروخت کرنا شروع کر دیا۔

یہ قحط چونکہ مصر کے علاوہ اطراف کے علاقوں (شام، فلسطین، شرق اردن وغیرہ) تک پھیلا ہوا تھا، اس لئے جب یہ خبر مشہور ہوئی کہ مصر میں غلہ سستی قیمت پر فروخت ہو رہا ہے تو برادران یوسف بھی غلہ لینے کے لئے مصر آئے۔ یہاں حضرت یوسف کو اگرچہ انھوں نے بیس سال بعد دیکھا تھا، تاہم آپ کی شکل وصورت میں انھیں اپنے بھائی کی جھلک نظر آئی۔ مگر جلد ہی انھوں نے اس کو اپنے دل سے نکال دیا۔ کیونکہ ان کی

سمجھ میں نہیں آیا کہ جس شخص کو وہ اندھے کنویں میں ڈال چکے ہیں وہ مصر کے تخت پر متمکن ہو سکتا ہے۔

حضرت یوسف نے اپنے بھائیوں کو ایک ایک اونٹ فی کس غلہ دلوایا۔ اب ان کے دل میں یہ خواہش ہوئی کہ بن یامین کے نام پر ایک اونٹ غلہ اور حاصل کریں۔ انھوں نے درخواست کی کہ ہمارے ایک بھائی (بن یامین) کو بوڑھے باپ نے اپنے پاس روک لیا ہے۔ اگر ہم کو اس بھائی کے حصہ کا غلہ بھی دیا جائے تو بڑی عنایت ہو۔ حضرت یوسف نے کہا کہ غائب کا حصہ دینا ہمارا طریقہ نہیں۔ تم دوبارہ آؤ تو اپنے اس بھائی کو بھی ساتھ لاؤ۔ اس وقت تم اس کا حصہ پا سکو گے۔ تم میری بخشش کا حال دیکھ چکے ہو۔ کیا اس کے بعد بھی تمھیں اپنے بھائی کو لانے میں تردد ہے۔ حضرت یوسف نے مزید کہا کہ جو بھائی تم بنا رہے ہو اگر تم اگلی بار اس کو نہ لائے تو سمجھا جائے گا کہ تم جھوٹ بولتے ہو اور محض دھوکہ دے کر ایک اونٹ غلہ اور لینا چاہتے تھے۔ اس کی سزا یہ ہوگی کہ آئندہ خود تمھارے حصہ کا غلہ بھی تم کو نہیں دیا جائے گا۔

وَقَالَ لِفِتْيٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَآ إِذَا انْقَلَبُوْٓا إِلٰٓى أَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿٦٢﴾ فَلَمَّا رَجَعُوْٓا إِلٰٓى أَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰٓأَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَأَرْسِلْ مَعَنَآ أَخَانَا نَكْتَلْ وَإِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿٦٣﴾ قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ إِلَّا كَمَآ أَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى أَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ۭ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۠ وَّهُوَ أَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿٦٤﴾

اور اس نے اپنے کارندوں سے کہا کہ ان کا مال ان کے اسباب میں رکھ دو تا کہ جب وہ اپنے گھر پہنچیں تو اس کو پہچان لیں، شاید وہ پھر آئیں۔ پھر جب وہ اپنے باپ کے پاس لوٹے تو کہا کہ اے باپ، ہم سے غلہ روک دیا گیا، پس ہمارے بھائی (بن یامین) کو ہمارے ساتھ جانے دے کہ ہم غلہ لائیں اور ہم اس کے نگہبان ہیں۔ یعقوب نے کہا، کیا میں اس کے بارہ میں تمھارا ویسا ہی اعتبار کروں جیسا اس سے پہلے اس کے بھائی کے بارہ میں تمھارا اعتبار کر چکا ہوں۔ پس اللہ بہتر نگہبان ہے اور وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے۔ ۶۲ - ۶۴

حضرت یوسف نے غالباً بھائیوں سے قیمت لینا مروت کے خلاف سمجھا یا اس خیال سے کہ مال کی کمی ان کے دوبارہ یہاں آنے میں رکاوٹ نہ بن جائے، اپنے آدمیوں کو ہدایت کی کہ جو رقم انھوں نے غلہ کی قیمت کے طور پر ادا کی ہے وہ خاموشی سے ان کے سامان میں ڈال دی جائے تا کہ جب وہ گھر پر جا کر اپنا سامان کھولیں تو اس کو پا لیں اور اپنے بھائی (بن یامین) کو لے کر دوبارہ یہاں آئیں۔

حضرت یعقوب نے ایک طرف بن یامین کے سلسلے میں اپنے بیٹوں پر بے اعتمادی کا اظہار کیا دوسری طرف یہ بھی فرمایا کہ تم کو یا کسی اور کو کوئی طاقت حاصل نہیں۔ ہونا وہی ہے جو خدا چاہے۔ مگر یہ ہونا انسان کے ہاتھوں کرایا جاتا ہے تاکہ جو بُرا ہے وہ برا کرکے اپنی حقیقت کو ثابت کرے۔ اور جو اچھا ہے وہ اچھا کرکے اپنے آپ کو اس فہرست میں لکھوائے جس کا وہ مستحق ہے۔

وَلَمَّا فَتَحُوا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ إِلَيْهِمْ ۖ قَالُوا يَا أَبَانَا مَا نَبْغِي ۖ هَٰذِهِ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ إِلَيْنَا ۖ وَنَمِيرُ أَهْلَنَا وَنَحْفَظُ أَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيرٍ ۖ ذَٰلِكَ كَيْلٌ يَسِيرٌ ﴿٦٥﴾ قَالَ لَنْ أُرْسِلَهُ مَعَكُمْ حَتَّىٰ تُؤْتُونِ مَوْثِقًا مِنَ اللَّهِ لَتَأْتُنَّنِي بِهِ إِلَّا أَنْ يُحَاطَ بِكُمْ ۖ فَلَمَّا آتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللَّهُ عَلَىٰ مَا نَقُولُ وَكِيلٌ ﴿٦٦﴾

اور جب انھوں نے اپنا سامان کھولا تو دیکھا کہ ان کی پونجی بھی ان کو لوٹا دی گئی ہے۔ انھوں نے کہا: اے ہمارے باپ اور ہم کو کیا چاہئے۔ یہ ہماری پونجی بھی ہم کو لوٹا دی گئی ہے۔ اب ہم جائیں گے اور اپنے اہل وعیال کے لئے رسد لائیں گے۔ اور اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے۔ اور ایک اونٹ کا بوجھ غلّہ اور زیادہ لائیں گے۔ یہ غلّہ تو تھوڑا ہے۔ یعقوب نے کہا: میں اس کو تمھارے ساتھ ہرگز نہ بھیجوں گا جب تک تم مجھ سے خدا کے نام پر یہ عہد نہ کرو کہ تم اس کو ضرور میرے پاس لے آؤگے، اِلّا یہ کہ تم سب گھر جاؤ۔ پھر جب انھوں نے اس کو اپنا پکا قول دے دیا، اس نے کہا کہ جو ہم کہہ رہے ہیں اس پر اللہ نگہبان ہے۔ ۶۵-۶۶

گھر لوٹ کر جب انھوں نے دیکھا کہ ان کی رقم ان کی غلّہ کی بوری میں موجود ہے تو وہ بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے اپنے والد سے کہا کہ آپ ضرور ہمارے ساتھ بن یامین کو جانے دیں۔ ہم اس کی پوری حفاظت کریں گے۔ اور اپنے حصہ کے علاوہ اس کے حصہ کا بھی مزید ایک اونٹ غلّہ لائیں گے۔ یہ غلّہ جو ہم لائے ہیں یہ تو اخراجات کے لئے تھوڑا ہے۔

حضرت یوسف نے تقسیم کا جو نظام قائم کیا تھا، اس کے تحت غالباً ایسا تھا کہ باہر کے ایک آدمی کو ایک اونٹ غلّہ دیا جاتا تھا۔

وَقَالَ يَا بَنِيَّ لَا تَدْخُلُوا مِنْ بَابٍ وَاحِدٍ وَادْخُلُوا مِنْ أَبْوَابٍ مُتَفَرِّقَةٍ ۖ وَمَا أُغْنِي عَنْكُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ ۖ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۖ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖ وَعَلَيْهِ

فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ ﴿٦٧﴾ وَلَمَّا دَخَلُوا مِنْ حَيْثُ أَمَرَهُمْ أَبُوهُمْ مَا كَانَ يُغْنِي عَنْهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا حَاجَةً فِي نَفْسِ يَعْقُوبَ قَضَاهَا ۚ وَإِنَّهُ لَذُو عِلْمٍ لِمَا عَلَّمْنَاهُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٦٨﴾

ع ۸ / ۲

اور یعقوب نے کہا کہ اے میرے بیٹو، تم سب ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ الگ الگ دروازوں سے داخل ہونا۔ اور میں تم کو اللہ کی کسی بات سے نہیں بچا سکتا۔ حکم تو بس اللہ کا ہے۔ میں اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور بھروسہ کرنے والوں کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہئے۔ اور جب وہ داخل ہوئے جہاں سے ان کے باپ نے ان کو ہدایت کی تھی، وہ ان کو نہیں بچا سکتا تھا اللہ کی کسی بات سے۔ وہ بس یعقوب کے دل میں ایک خیال تھا جو اس نے پورا کیا۔ بے شک وہ ہماری دی ہوئی تعلیم سے صاحب علم تھا مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔ ۶۸-۶۷

مصر کا قدیم دار السلطنت ایک ایسا شہر تھا جس کے چاروں طرف اونچی فصیل تھی اور مختلف سمتوں میں داخلہ کے لئے دروازے بنے ہوئے تھے۔ حضرت یعقوب کا اپنے بیٹوں سے یہ کہنا کہ تم لوگ اکٹھا ہو کر ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہو بلکہ متفرق دروازوں سے داخل ہو، اس اندیشہ کی بنا پر تھا کہ ان کے دشمن انھیں ہلاک کرنے کی کوشش نہ کریں (قیل انّہ احب ان لا یفطن بھم اعدا ؤھم فیحتالوا لاھلاکھم، تفسیر النسفی)۔

اس اندیشہ کا معاملہ اسی سورہ کی آیت نمبر ۷۳ سے واضح ہے جس میں برادران یوسف اپنی برأت ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ ہم یہاں فساد کے لئے یا چوری کے لئے نہیں آئے ہیں۔ برادران یوسف مصر میں باہر سے آئے تھے۔ ان کے لباس مقامی لوگوں کے لباس سے مختلف تھے۔ وہ اپنے حلیہ سے یقیناً مصر والوں کو اجنبی دکھائی دیتے ہوں گے۔ ایسے گیارہ آدمیوں کا ایک ساتھ شہر میں داخل ہونا انھیں لوگوں کی نظر میں مشتبہ بنا سکتا تھا۔ اس لئے مقامی لوگوں سے کسی غیر ضروری ٹکراؤ سے بچنے کے لئے انھوں نے ان کو یہ ہدایت کی کہ شہر میں داخل ہو تو ایک ساتھ جتھے کی صورت میں داخل نہ ہو۔

مومن کی نظر ایک طرف خدا کی قدرت کاملہ پر ہوتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس کائنات میں خدا کے سوا کسی کو کوئی اختیار حاصل نہیں۔ اسی کے ساتھ وہ جانتا ہے کہ یہ دنیا دار الامتحان ہے۔ یہاں امتحان کی مصلحت سے خدا نے ہر معاملہ کو ظاہری اسباب کے ماتحت کر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت یعقوب نے ایک طرف اپنے بیٹوں کو دنیوی تدبیر اختیار کرنے کی تلقین فرمائی۔ دوسری طرف یہ بھی فرما دیا کہ جو کچھ ہوگا خدا کے حکم سے ہوگا کیونکہ یہاں خدا کے سوا کسی کو کوئی طاقت حاصل نہیں۔

وَلَمَّا دَخَلُوا عَلٰی یُوسُفَ اٰوٰۤی اِلَیۡهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّیۡۤ اَنَا اَخُوۡكَ فَلَا تَبۡتَئِسۡ بِمَا
كَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۶۹﴾ فَلَمَّا جَهَّزَهُمۡ بِجَهَازِهِمۡ جَعَلَ السِّقَایَةَ فِیۡ رَحۡلِ اَخِیۡهِ ثُمَّ
اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَیَّتُهَا الۡعِیۡرُ اِنَّكُمۡ لَسٰرِقُوۡنَ ﴿۷۰﴾ قَالُوۡا وَاَقۡبَلُوۡا عَلَیۡهِمۡ مَّاذَا تَفۡقِدُوۡنَ ﴿۷۱﴾
قَالُوۡا نَفۡقِدُ صُوَاعَ الۡمَلِكِ وَلِمَنۡ جَآءَ بِهٖ حِمۡلُ بَعِیۡرٍ وَّاَنَا بِهٖ زَعِیۡمٌ ﴿۷۲﴾ قَالُوۡا تَاللّٰهِ
لَقَدۡ عَلِمۡتُمۡ مَّا جِئۡنَا لِنُفۡسِدَ فِی الۡاَرۡضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِیۡنَ ﴿۷۳﴾ قَالُوۡا فَمَا جَزَآؤُهٗۤ اِنۡ
كُنۡتُمۡ كٰذِبِیۡنَ ﴿۷۴﴾ قَالُوۡا جَزَآؤُهٗ مَنۡ وُّجِدَ فِیۡ رَحۡلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ؕ كَذٰلِكَ
نَجۡزِی الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۷۵﴾ فَبَدَاَ بِاَوۡعِیَتِهِمۡ قَبۡلَ وِعَآءِ اَخِیۡهِ ثُمَّ اسۡتَخۡرَجَهَا مِنۡ وِّعَآءِ
اَخِیۡهِ ؕ كَذٰلِكَ كِدۡنَا لِیُوۡسُفَ ؕ مَا كَانَ لِیَاۡخُذَ اَخَاهُ فِیۡ دِیۡنِ الۡمَلِكِ اِلَّاۤ اَنۡ
یَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ نَرۡفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنۡ نَّشَآءُ ؕ وَفَوۡقَ كُلِّ ذِیۡ عِلۡمٍ عَلِیۡمٌ ﴿۷۶﴾

اور جب وہ یوسف کے پاس پہنچے تو اس نے اپنے بھائی کو اپنے پاس رکھا۔ کہا کہ میں تمہارا بھائی (یوسف) ہوں۔ پس غمگین نہ ہو اس سے جو وہ کر رہے ہیں۔ پھر جب ان کا سامان تیار کرا دیا تو پینے کا پیالہ اپنے بھائی کے اسباب میں رکھ دیا۔ پھر ایک پکارنے والے نے پکارا کہ اے قافلہ والو، تم لوگ چور ہو۔ انھوں نے ان کی طرف متوجہ ہو کر کہا، تمہاری کیا چیز کھوئی گئی ہے۔ انھوں نے کہا، ہم شاہی پیمانہ نہیں پا رہے ہیں۔ اور جو اس کو لائے گا اس کے لئے ایک بار شتر غلہ ہے اور میں اس کا ذمہ دار ہوں۔ انھوں نے کہا۔ خدا کی قسم تم کو معلوم ہے کہ ہم لوگ اس ملک میں فساد کرنے کے لئے نہیں آئے اور نہ ہم کبھی چور تھے۔ انھوں نے کہا، اگر تم جھوٹے نکلے تو اس چوری کرنے والے کی سزا کیا ہے۔ انھوں نے کہا، اس کی سزا یہ ہے کہ جس شخص کے اسباب میں ملے پس وہی شخص اپنی سزا ہے۔ ہم لوگ ظالموں کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں۔ پھر اس نے اس کے (چھوٹے) بھائی سے پہلے ان کے تھیلوں کی تلاشی لینا شروع کیا۔ پھر اس کے بھائی کے تھیلے سے اس کو برآمد کر لیا۔ اس طرح ہم نے یوسف کے لئے تدبیر کی۔ وہ بادشاہ کے قانون کی رو سے اپنے بھائی کو نہیں لے سکتا تھا مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ ہم جس کے درجے چاہتے ہیں بلند کر دیتے ہیں۔ اور ہر علم والے سے بالاتر ایک علم والا ہے۔ ۷۶ - ۶۹

برادران یوسف روانہ ہونے لگے تو حضرت یوسف نے ازراہِ محبت اپنا پانی پینے کا پیالہ (جو غالباً چاندی کا تھا) اپنے بھائی بن یامین کے سامان میں رکھ دیا۔ اس کی خبر نہ بن یامین کو تھی اور نہ دربار والوں کو۔ اس کے بعد خدا کی قدرت سے ایسا ہوا کہ غلہ ناپنے کا شاہی پیمانہ (جو خود بھی قیمتی تھا) کہیں اِدھر اُدھر (Misplace)

ہوگیا۔ تلاش کے باوجود جب وہ نہیں نکلا تو کارندوں کا شبہہ برادران یوسف کی طرف گیا جو ابھی ابھی یہاں سے روانہ ہوئے تھے۔ ایک کارندہ نے آواز دے کر قافلہ کو بلایا۔ پوچھ گچھ کے دوران انھوں نے بطور خود چوری کی وہ سزا تجویز کی جو شریعت ابراہیمی کی رو سے ان کے یہاں رائج تھی۔ یعنی جو سارق ہے وہ ایک سال تک مالک کے یہاں غلام بن کر رہے۔

اس کے بعد کارندے نے تلاشی شروع کی۔ اب غلہ کا پیمانہ تو ان کے یہاں نہیں ملا۔ مگر دربار کی ایک اور خاص چیز (چاندی کا پیالہ) بن یامین کے سامان سے برآمد ہوگیا۔ چنانچہ بن یامین کو حسب فیصلہ حضرت یوسف کے حوالہ کر دیا گیا۔ اگر شاہ مصر کے قانون پر فیصلہ کی قرارداد ہوئی ہوتی تو حضرت یوسف اپنے بھائی کو نہ پاتے۔ کیونکہ شاہ مصر کے مروجہ قانون میں چور کی سزا یہ تھی کہ اس کو مارا جائے اور مسروقہ چیز کی قیمت اس سے وصول کی جائے۔ اس واقعہ میں حضرت یوسف کی نیت شامل نہ تھی، یہ خدائی تدبیر سے ہوا اس لیے خدا نے اس کو اپنی طرف منسوب فرمایا۔

نوٹ: بن یامین کے سامان میں سقایہ رکھا گیا تھا جس کی ضمیر ھا ہے۔ مگر شاہی کارندہ صواع تلاش کر رہا تھا جس کی ضمیر ہٗ ہے۔ اب تلاشی کے بعد کارندہ نے جو چیز برآمد کی اس کے لیے قرآن میں ضمیر ھا استعمال ہوئی ہے (ثم استخرجھا من وعاء اخیہ) ضمیر کا یہ فرق بتاتا ہے کہ تلاش کے بعد بن یامین کے سامان سے سقایہ نکلا تھا نہ کہ صواع۔

قَالُوٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ ﴿۷۷﴾ قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗٓ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۷۸﴾ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ﴿۷۹﴾

انھوں نے کہا اگر یہ چوری کرے تو اس سے پہلے اس کا ایک بھائی بھی چوری کر چکا ہے۔ پس یوسف نے اس بات کو اپنے دل میں رکھا۔ اور اس کو ان پر ظاہر نہیں کیا۔ اس نے اپنے جی میں کہا، تم خود ہی برے لوگ ہو، اور جو کچھ تم بیان کر رہے ہو اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اے عزیز، اس کا ایک بہت بوڑھا باپ ہے سو تو اس کی جگہ ہم میں سے کسی کو رکھ لے۔ ہم تجھ کو بہت نیک دیکھتے ہیں۔ اس نے کہا، اللہ کی پناہ کہ ہم اس کے سوا کسی کو پکڑیں جس کے پاس ہم نے اپنی چیز پائی ہے۔ اس صورت میں ہم ضرور ظالم ٹھہریں گے۔ ۷۹-۷۷

مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت یوسف کی کسی نانی کے یہاں ایک بت تھا۔ حضرت یوسف اپنے بچپن میں

اس کو چپکے سے ان کے یہاں سے اٹھالائے اور اس کو توڑ ڈالا۔ اسی واقعہ کو بہانہ بنا کر برادران یوسف نے کہا کہ "اس کا بڑا بھائی بھی اس سے پہلے چوری کر چکا ہے"۔ ایک واقعہ جو آپ کی عزت توحید کو بتا رہا تھا اس کو محض ایک ظاہری مشابہت کی وجہ سے انھوں نے چوری کے خانہ میں ڈال دیا۔

برادران یوسف کا حال یہ تھا کہ مصر کے تخت پر بیٹھے ہوئے یوسف کو تو وہ عزیز (حضور، سرکار) کہہ رہے تھے اور اس کے سامنے خوب تواضع دکھا رہے تھے۔ مگر کنعان کا یوسف جوان کی نظر میں صرف ایک دیہاتی لڑکا تھا، اس کو عین اسی وقت ناحق چوری کے الزام میں ملوث کر رہے تھے۔

حضرت یوسف کو علم تھا کہ ان کے رکھے ہوئے پیالہ کی وجہ سے بن یامین خواہ مخواہ چور بن رہا ہے، مگر وقتی مصلحت کی بنا پر وہ خاموش رہے اور واقعہ کو اپنی رفتار سے چلنے دیا جو بھائیوں اور شاہی کارندے کے درمیان ہو رہا تھا۔ ایک بار جب آپ کو بولنا پڑا تو یہ نہیں کہا کہ "جس نے ہماری چوری کی ہے" بلکہ یہ فرمایا کہ "جس کے پاس ہم نے اپنا مال پایا ہے"۔

فَلَمَّا اسْتَايْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ۭ قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْٓ اَبِيْٓ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ۝ اِرْجِعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ۝ وَسْـَٔــلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ۭ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝

جب وہ اس سے ناامید ہو گئے تو الگ ہو کر باہم مشورہ کرنے لگے۔ ان کے بڑے نے کہا کیا تم کو معلوم نہیں کہ تمہارے باپ نے اللہ کے نام پر پکا اقرار لیا اور اس سے پہلے یوسف کے معاملہ میں جو زیادتی تم کر چکے ہو وہ بھی تم کو معلوم ہے۔ پس میں اس زمین سے ہرگز نہیں ٹلوں گا جب تک میرا باپ مجھے اجازت نہ دے یا اللہ میرے لیے کوئی فیصلہ فرما دے۔ اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ تم لوگ اپنے باپ کے پاس جاؤ اور کہو کہ اے ہمارے باپ، تیرے بیٹے نے چوری کی اور ہم وہی بات کہہ رہے ہیں جو ہم کو معلوم ہوئی اور ہم غیب کے نگہبان نہیں اور تو اس بستی کے لوگوں سے پوچھ لے جہاں ہم تھے اور اس قافلہ سے پوچھ لے جس کے ساتھ ہم آئے ہیں۔ اور ہم بالکل سچے ہیں۔ ۸۰–۸۲

حضرت یوسف کے سوتیلے بھائیوں میں غالباً ایک بھائی دوسروں سے مختلف تھا۔ اسی بھائی نے ابتدائی مرحلہ میں مشورہ دیا تھا کہ یوسف کو قتل نہ کرو بلکہ کسی اندھے کنوئیں میں ڈال دو تاکہ کوئی آتا جاتا قافلہ اس کو نکال لے جائے۔ یہی حال اب اس بھائی کا مصر میں ہوا۔ وہ دوسرے بھائیوں سے الگ ہوگیا۔ اس کی غیرت نے گوارا نہیں کیا کہ جس باپ کے نزدیک وہ ایک بھائی کو کھونے کا مجرم بن چکا ہے، اسی باپ کے سامنے اب وہ دوسرے بھائی کو کھونے کا مجرم بن کر حاضر ہو۔

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۖ فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۖ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا ۚ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۸۳﴾ وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۸۴﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ﴿۸۵﴾ قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾ يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۖ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۷﴾

باپ نے کہا، بلکہ تم نے اپنے دل سے ایک بات بنا لی ہے، پس میں صبر کروں گا۔ امید ہے کہ اللہ ان سب کو میرے پاس لائے گا۔ وہ جاننے والا، حکیم ہے۔ اور اس نے رخ پھیر لیا اور کہا، ہائے یوسف۔ اور غم سے اس کی آنکھیں سفید پڑ گئیں۔ وہ گھٹا گھٹا رہنے لگا۔ انھوں نے کہا، خدا کی قسم تو یوسف ہی کی یاد میں رہے گا یہاں تک کہ گھل جائے یا ہلاک ہو جائے۔ اس نے کہا، میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کا شکوہ صرف اللہ سے کرتا ہوں اور میں اللہ کی طرف سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ اے میرے بیٹو، جاؤ یوسف اور اس کے بھائی کی تلاش کرو اور اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ اللہ کی رحمت سے صرف منکر ہی ناامید ہوتے ہیں۔ ۸۳ - ۸۷

"تم نے بات بنا لی ہے"، کہہ کر حضرت یعقوب نے برادران یوسف کے دل کا کھوٹ واضح کیا۔ وہ باپ کے یہاں سے گئے تو مکمل حفاظت کا وعدہ کرکے اس کو ساتھ لے گئے۔ اور جب بن یامین کے اسباب میں سے پیالہ برآمد ہوا تو اس کی طرف سے اتنی مدافعت بھی نہ کر سکے کہ یہ کہتے کہ محض پیالہ برآمد ہونے سے وہ چور کیسے ثابت ہوگیا۔ شاید کسی اور نے رکھ دیا ہو یا کسی غلطی سے وہ اس کے اسباب کے ساتھ بندھ گیا ہو۔

اس کے برعکس انھوں نے یہ کیا کہ یہ کہہ کر اس کے جرم کو مصریوں کی نظر میں اور پختہ کر دیا کہ اس کا بھائی بھی اس سے پہلے چوری کر چکا ہے۔

حضرت یعقوب اگر چہ دو عزیز بیٹوں کو کھونے کی وجہ سے بے حد غم زدہ تھے۔ مگر اس کے ساتھ وہ خدا سے اس کی رحمت کی امید بھی لگائے ہوئے تھے۔ ان کا اب بھی یہ خیال تھا کہ یوسف کا ابتدائی زمانہ کا خواب ایک خدائی بشارت تھا اور وہ ضرور پورا ہوگا۔ اسی لئے انھوں نے بیٹوں سے کہا کہ جاؤ یوسف کو تلاش کرو اور بن یامین کی رہائی کی بھی کوشش کرو۔

فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَيْهِ قَالُوا يَا أَيُّهَا الْعَزِيزُ مَسَّنَا وَأَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُزْجَاةٍ فَأَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ۖ إِنَّ اللَّهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِينَ ﴿٨٨﴾ قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَا فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَأَخِيهِ إِذْ أَنْتُمْ جَاهِلُونَ ﴿٨٩﴾ قَالُوا أَإِنَّكَ لَأَنْتَ يُوسُفُ ۖ قَالَ أَنَا يُوسُفُ وَهَٰذَا أَخِي ۖ قَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا ۖ إِنَّهُ مَنْ يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٩٠﴾

پھر جب وہ یوسف کے پاس پہنچے، انھوں نے کہا، اے عزیز، ہم کو اور ہمارے گھر والوں کو بڑی تکلیف پہنچ رہی ہے اور ہم تھوڑی پونجی لے کر آئے ہیں، تو ہم کو پورا غلہ دے اور ہم کو صدقہ بھی دے بیشک اللہ صدقہ کرنے والوں کو اس کا بدلہ دیتا ہے۔ اس نے کہا، کیا تم کو خبر ہے کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا جب کہ تم کو سمجھ نہ تھی۔ انھوں نے کہا، کیا سچ مچ تم ہی یوسف ہو۔ اس نے کہا ہاں میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔ اللہ نے ہم پر فضل فرمایا۔ جو شخص ڈرتا ہے اور صبر کرتا ہے تو اللہ نیک کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ ۹۰-۸۸

"تقویٰ اور صبر کرنے والوں کا اجر خدا ضائع نہیں کرتا"۔ یہی بات پورے قصہ یوسف کا خلاصہ ہے اللہ تعالیٰ کو اس کی ایک واضح مثال قائم کرنی تھی کہ معاملات دنیا میں جو شخص اللہ سے ڈرنے والا طریقہ اختیار کرے اور بے صبری والے طریقوں سے بچے، بالآخر وہ خدا کی مدد سے ضرور کامیاب ہوتا ہے حضرت یوسف کے واقعہ کو اسی حقیقت کی ایک نظر آنے والی مثال بنا دیا گیا۔

مصر میں ابتداءً سات اچھے سال اور اس کے بعد سات خراب سال دونوں خدا کے اذن کے تحت ہوئے۔ خدا چاہتا تو تمام سالوں کو اچھے سال بنا دیتا۔ اسی طرح حضرت یوسف کا کنویں میں ڈالا جانا اور پھر اس سے نکل کر مصر پہنچنا دونوں خدا کی نگرانی میں ہوا۔ خدا چاہتا تو آپ کو کنویں کے مرحلہ

سے گذار کے بغیر مصر کے اقتدار تک پہنچا دیا۔ لیکن اگر یہ تمام غیر معمولی حالات پیش نہ آتے تو اسباب کی اس دنیا میں وہ اس بات کی مثال کیسے بنتے کہ خدا ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے تقویٰ اور صبر کی روش پر قائم رہیں۔

واقعات دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جس کے اندر شہرت کا مادہ ہو۔ اور دوسرا وہ جس کے اندر شہرت کا مادہ نہ ہو۔ دو واقعات نوعیت کے اعتبار سے بالکل یکساں درجے کے ہوسکتے ہیں۔ مگر ایک واقعہ شہرت پکڑ لے گا اور دوسرا گمنام ہو کر رہ جائے گا۔ حضرت یوسف کے ساتھ نصرت خداوندی کا جو معاملہ ہوا وہ دوسرے صلحاء اور محسنین کے ساتھ بھی پیش آتا ہے۔ مگر حضرت یوسف کے واقعہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شہرت کا مادہ بھی پوری طرح موجود تھا۔ اس لئے وہ بخوبی طور پر لوگوں کی نظر میں آگیا۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕيْنَ ۝ قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۭ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۡ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝ اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰي وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝

بھائیوں نے کہا، خدا کی قسم اللہ نے تم کو ہمارے اوپر فضیلت دی، اور بے شک ہم غلطی پر تھے۔ یوسف نے کہا، آج تم پر کوئی الزام نہیں، اللہ تم کو معاف کرے اور وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے۔ تم میرا یہ کرتا لے جاؤ اور اس کو میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو، اس کی بینائی پلٹ آئے گی اور تم اپنے گھر والوں کے ساتھ میرے پاس آجاؤ۔ ۹۳-۹۱

جب حقیقت کھل گئی تو بھائیوں نے حضرت یوسف کی بڑائی کو تسلیم کرتے ہوئے کھلے طور پر اپنی غلطی کا اقرار کر لیا۔ دوسری طرف حضرت یوسف نے بھی اس عالی ظرفی کا ثبوت دیا جو ایک سچے خدا پرست کو ایسے موقع پر دینا چاہئے۔ انھوں نے اپنے بھائیوں کو کوئی ملامت نہیں کی۔ انھوں نے ماضی کے تلخ واقعات کو اچانک بھلا دیا اور بھائیوں سے دوبارہ برادرانہ تعلقات استوار کر لئے۔

اس واقعہ میں انفرادی نصرت کے ساتھ اجتماعی نصرت کی مثال بھی موجود ہے۔ اسی کے ذریعہ وہ حالات پیدا ہوئے کہ بنی اسرائیل فلسطین سے نکل کر مصر پہنچیں اور وہاں عزت اور خوش حالی کا مقام حاصل کریں۔ چنانچہ حضرت یوسف کے زمانہ میں حضرت یعقوب کا خاندان مصر منتقل ہو گیا اور تقریباً پانچ سو سال تک وہاں عزت کے ساتھ رہا۔ بائبل کے بیان کے مطابق سب افراد خاندان جو اس موقع پر مصر گئے

ان کی تعداد ۶۷ تھی۔

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَا أَنْ تُفَنِّدُونِ ﴿٩٤﴾ قَالُوا تَاللَّهِ إِنَّكَ لَفِي ضَلَالِكَ الْقَدِيمِ ﴿٩٥﴾ فَلَمَّا أَنْ جَاءَ الْبَشِيرُ أَلْقَاهُ عَلَىٰ وَجْهِهِ فَارْتَدَّ بَصِيرًا ۖ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٩٦﴾ قَالُوا يَا أَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا إِنَّا كُنَّا خَاطِئِينَ ﴿٩٧﴾ قَالَ سَوْفَ أَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّي ۖ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿٩٨﴾

اور جب قافلہ (مصر سے) چلا تو اس کے باپ نے (کنعان میں) کہا کہ اگر تم مجھ کو بڑھاپے میں بہکی باتیں کرنے والا نہ سمجھو تو میں یوسف کی خوشبو پا رہا ہوں۔ لوگوں نے کہا، خدا کی قسم، تم تو ابھی تک اپنے پرانے غلط خیال میں مبتلا ہو۔ پس جب خوشخبری دینے والا آیا، اس نے کُرتا یعقوب کے چہرے پر ڈال دیا، پس اس کی بینائی لوٹ آئی۔ اس نے کہا، کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں اللہ کی جانب سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ برادرانِ یوسف نے کہا، اے ہمارے باپ، ہمارے گناہوں کی معافی کی دعا کیجئے بیشک ہم خطاوار تھے۔ یعقوب نے کہا، میں اپنے رب سے تمہارے لئے مغفرت کی دعا کروں گا۔ بے شک وہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔ ۹۸-۹۴

حضرت یوسف اپنے باپ سے جدا ہو کر ۲۰ سال سے زیادہ مدت تک پڑوسی ملک مصر میں رہے۔ مگر حضرت یعقوب کو اس کا علم نہ ہو سکا۔ البتہ آخر وقت میں آپ کا پیرہن مصر سے چلا تو آپ کو اس کے پہنچنے سے پہلے اس کی خوشبو محسوس ہونے لگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبروں کا علم ان کا ذاتی علم نہیں ہوتا بلکہ خدا کا عطیہ ہوتا ہے۔ اگر ذاتی علم ہوتا تو حضرت یعقوب پہلے ہی جان لیتے کہ ان کے صاحبزادے مصر میں ہیں۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ آپ حضرت یوسف کے بارہ میں صرف اس وقت مطلع ہوئے جب کہ اللہ نے آپ کو اس کی خبر کر دی۔

حضرت یعقوب کے ساتھ آپ کے خاندان والوں کی گفتگوئیں جو اس سورۃ میں مختلف مقامات پر نقل ہوئی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ خاندان والوں کی نظر میں حضرت یعقوب کو وہ عظمت حاصل نہ تھی جو ایک پیغمبر کے لئے ہونی چاہئے۔ وہی لوگ جو ماضی کے بزرگوں کی پرستش کر رہے ہوتے ہیں وہ زندہ بزرگوں کی عظمت ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مُردہ بزرگوں کے گرد ہمیشہ مبالغہ آمیز قصوں اور طلسماتی کہانیوں کا ہالہ بنا دیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے لوگوں کے ذہن میں "بزرگ" کی ایک

مصنوعی تصویر بیٹھ جاتی ہے۔ چونکہ زندہ بزرگ اس مصنوعی تصویر کے مطابق نہیں ہوتا اس لئے وہ لوگوں کو بزرگ بھی نظر نہیں آتا۔

فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَىٰ يُوسُفَ آوَىٰ إِلَيْهِ أَبَوَيْهِ وَقَالَ ادْخُلُوا مِصْرَ إِن شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ ۝ وَرَفَعَ أَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوا لَهُ سُجَّدًا ۖ وَقَالَ يَا أَبَتِ هَٰذَا تَأْوِيلُ رُؤْيَايَ مِن قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّي حَقًّا ۖ وَقَدْ أَحْسَنَ بِي إِذْ أَخْرَجَنِي مِنَ السِّجْنِ وَجَاءَ بِكُم مِّنَ الْبَدْوِ مِن بَعْدِ أَن نَّزَغَ الشَّيْطَانُ بَيْنِي وَبَيْنَ إِخْوَتِي ۚ إِنَّ رَبِّي لَطِيفٌ لِّمَا يَشَاءُ ۚ إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ۝

پس جب وہ سب یوسف کے پاس پہنچے تو اس نے اپنے والدین کو اپنے پاس بٹھایا۔ اور کہا کہ مصر میں انشاء اللہ امن چین سے رہو اور اس نے اپنے والدین کو تخت پر بٹھایا اور سب اس کے لئے سجدے میں جھک گئے۔ اور یوسف نے کہا اے باپ، یہ ہے میرے خواب کی تعبیر جو میں نے پہلے دیکھا تھا۔ میرے رب نے اس کو سچا کر دیا اور اس نے میرے ساتھ احسان کیا کہ اس نے مجھے قید سے نکالا اور تم سب کو دیہات سے یہاں لایا بعد اس کے کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈال دیا تھا۔ بے شک میرا رب جو کچھ چاہتا ہے اس کی عمدہ تدبیر کر لیتا ہے، وہ جاننے والا حکمت والا ہے۔ ۹۹ - ۱۰۰

یہاں تخت سے مراد تخت شاہی نہیں ہے بلکہ وہ تخت ہے جس پر حضرت یوسف اپنے عہدہ کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لئے بیٹھتے تھے۔ سجدہ سے مراد بھی معروف سجدہ نہیں بلکہ رکوع کے انداز پر جھکنا ہے۔ کسی بڑے کی تعظیم کے لئے اس انداز میں جھکنا قدیم زمانہ میں بہت معروف تھا۔

"اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَاءُ" کا مطلب یہ ہے کہ میرا رب جس کام کو کرنا چاہے اس کے لئے وہ نہایت مخفی راہیں نکال لیتا ہے۔ خدا اپنے منصوبہ کی تکمیل کے لئے ایسی تدبیریں پیدا کر لیتا ہے جس کی طرف عام انسانوں کا گمان بھی نہیں جا سکتا۔

رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِي مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِي مِن تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ ۚ فَاطِرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ أَنتَ وَلِيِّي فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۖ تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ ۝

اے میرے رب، تونے مجھ کو حکومت میں سے حصہ دیا اور مجھ کو باتوں کی تعبیر کرنا سکھایا۔ اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے، تو میرا کارساز ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ مجھ کو فرماں برداری کی حالت میں وفات دے اور مجھ کو نیک بندوں میں شامل فرما۔ ۱۰۱

غیر مومن ہر چیز کو انسان کے اعتبار سے دیکھتا ہے اور مومن ہر چیز کو خدا کے اعتبار سے۔ حضرت یوسف کو اعلیٰ حکومتی عہدہ ملا تو اس کو بھی انھوں نے خدا کا عطیہ قرار دیا۔ ان کو تاویل اور تعبیر کا علم حاصل ہوا تو انھوں نے کہا کہ یہ مجھ کو خدا نے سکھایا ہے۔ ان کے اپنوں نے انھیں مصیبت میں ڈالا تو اس کو بھی انھوں نے اس نظر سے دیکھا کہ یہ خدا کی لطیف تدبیریں تھیں جن کے ذریعہ وہ مجھ کو ارتقائی سفر کرا رہا تھا۔

خدا کی عظمت کے احساس نے ان سے ذاتی عظمت کے تمام احساسات چھین لئے تھے۔ دنیوی بلندی کی چوٹی پر پہنچ کر بھی ان کی زبان سے جو الفاظ نکلے وہ یہ تھے — خدایا، تو ہی تمام طاقتوں کا مالک ہے۔ تو ہی میرے سب کام بنانے والا ہے۔ تو دنیا اور آخرت میں میری مدد فرما۔ مجھ کو ان لوگوں میں شامل فرما جو دنیا میں تیری پسند پر چلنے کی توفیق پاتے ہیں اور آخرت میں تیرا ابدی انعام حاصل کرتے ہیں۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ۝ وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ ع ۱۱ ۵

یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم تم پر وحی کر رہے ہیں اور تم اس وقت ان کے پاس موجود نہ تھے جب یوسف کے بھائیوں نے اپنی رائے پختہ کی اور وہ تدبیریں کر رہے تھے اور تم خواہ کتنا ہی چاہو، اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ اور تم اس پر ان سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتے۔ یہ تو صرف ایک نصیحت ہے تمام جہان والوں کے لئے۔ ۱۰۴-۱۰۲

حضرت یوسف کا قصہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر جاری ہوا وہ بجائے خود اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن وحی ربانی ہے نہ کہ کلام انسانی۔ یہ واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تقریباً ڈھائی ہزار سال پہلے پیش آیا۔ آپ نے اس واقعہ کو نہ تو بطور خود دیکھا تھا اور نہ وہ کسی تاریخ میں لکھا ہوا تھا کہ آپ اس کو پڑھیں یا کسی سے پڑھوا کر سنیں۔ وہ صرف تورات کے صفحات میں تھا۔ اور پریس کے دور سے قبل تورات ایک ایسی کتاب تھی جس کی واقفیت صرف

یہودی مراکز کے چند یہودی علماء کو ہوتی تھی، اور کسی کو نہیں۔

مزید یہ کہ قرآن میں اس واقعہ کو جس طرح بیان کیا گیا ہے، بنیادی طور پر تورات کے مطابق ہونے کے باوجود، تفصیلات میں وہ اس سے کافی مختلف ہے۔ یہ اختلاف بذات خود قرآن کے وحی الٰہی ہونے کا ثبوت ہے۔ کیونکہ جہاں جہاں دونوں میں اختلاف ہے وہاں قرآن کا بیان واضح طور پر عقل و فطرت کے مطابق معلوم ہوتا ہے۔ قرآن کا بیان پڑھ کر واقعی یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ حضرت یعقوب اور حضرت یوسف کی پیغمبرانہ سیرت کے مناسب ہے جب کہ تورات کے بیانات پیغمبرانہ سیرت کے مناسب حال نہیں۔ اسی طرح واقعہ کے کئی بے حد قیمتی اجزاء (مثلاً قید خانہ میں حضرت یوسف کی تقریر، آیت ۴۰-۳۷) جو قرآن میں منقول ہوئی ہے۔ بائبل یا تالمود میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ حتیٰ کہ بعض تاریخی غلطیاں جو بائبل میں موجود ہیں ان کا اعادہ قرآن میں نہیں ہوا ہے۔ مثال کے طور بائبل حضرت یوسف کے زمانہ کے بادشاہ کو فرعون کہتی ہے۔ حالانکہ فرعون کا خاندان حضرت یوسف کے پانچ سو سال بعد مصر میں حکمراں بنا ہے حضرت یوسف کے زمانہ میں مصر میں ایک عرب خاندان حکومت کر رہا تھا جس کو چرواہے بادشاہ (Hyksos kings) کہا جاتا ہے۔ (تقابل کے لئے ملاحظہ ہو، بائبل، کتاب پیدائش)

حق کو نہ ماننے کا سبب اگر دلیل ہو تو دلیل سامنے آنے کے بعد آدمی فوراً اس کو مان لے گا۔ مگر اکثر حالات میں انکار حق کا سبب ہٹ دھرمی ہوتا ہے۔ ایسے لوگ حق کو اس لئے نہیں مانتے کہ وہ اس کو ماننا نہیں چاہتے۔ حق کو ماننا اکثر حالات میں اپنے کو چھوٹا کرنے کے ہم معنی ہوتا ہے، اور اپنے کو چھوٹا کرنا آدمی کے لئے سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے لوگ ہر قسم کے دلائل اور قرائن سامنے آنے کے بعد بھی اپنی روش کو نہیں چھوڑتے۔ وہ اس کو گوارا کر لیتے ہیں کہ حق چھوٹا ہو جائے مگر وہ اپنے آپ کو چھوٹا کرنے پر راضی نہیں ہوتے۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ جو دنیا میں اپنے آپ کو چھوٹا کر لے وہ آخرت میں بڑا کیا جائے گا۔ اور جو شخص دنیا میں اپنے کو چھوٹا نہ کرے وہی وہ شخص ہے جو آئندہ آنے والی دنیا میں ہمیشہ کے لئے چھوٹا ہو کر رہ جائے گا۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ اَفَاَمِنُوْٓا اَنْ تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

وقف النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام

اور آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر ان کا گذر ہوتا رہتا ہے اور وہ ان پر دھیان نہیں کرتے۔ اور اکثر لوگ جو خدا کو مانتے ہیں وہ اس کے ساتھ دوسروں کو شریک بھی ٹھہراتے ہیں۔ کیا یہ لوگ اس بات سے مطمئن ہیں کہ ان پر عذاب الٰہی کی کوئی آفت آپڑے یا اچانک ان پر قیامت آجائے اور وہ اس سے بے خبر ہوں۔ کہو یہ میرا راستہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں سمجھ بوجھ کر، میں بھی اور وہ لوگ بھی جنھوں نے میری پیروی کی ہے۔ اور اللہ پاک ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔ ۱۰۸ - ۱۰۵

حق کے ظہور کے بعد جو لوگ اس کو نہ مانیں وہ اپنے انکار کو ہمیشہ اس رنگ میں پیش کرتے ہیں کہ جو دلیل مطلوب تھی وہ دلیل حق کی طرف سے ان کے سامنے نہیں آئی۔ اگر ایسی دلیل ہوتی تو وہ اس کو ضرور مان لیتے۔ گویا ان کے اعراض یا انکار کا سبب ان کے باہر ہے نہ کہ ان کے اندر۔

مگر حقیقت حال اس کے برعکس ہے۔ حق اتنا واضح ہے کہ جب وہ ظاہر ہوتا ہے تو زمین و آسمان کی تمام نشانیاں اس کی تصدیق کرتی ہیں۔ وہ ساری کائنات میں سب سے زیادہ ثابت شدہ چیز ہوتا ہے۔ مگر حق کو پانے کے لئے اصل ضرورت دیکھنے والی آنکھ اور عبرت پکڑنے والے دماغ کی ہے۔ اور یہی چیز منکرین کے یہاں موجود نہیں ہوتی۔

حق کے مقابلہ میں آدمی جب سرکشی دکھاتا ہے تو اکثر حالات میں اس کی وجہ "شرک" ہوتا ہے۔ بیشتر لوگوں کا حال یہ ہے کہ خدا کو مانتے ہوئے انھوں نے کچھ اور زندہ یا مُردہ ہستیاں فرض کر رکھی ہیں جن پر وہ اپنا اعتماد قائم کئے ہوئے ہیں جن کو وہ بڑائی کا مقام دیتے ہیں۔ اس طرح ہر ایک نے خدا کے سوا کچھ "بڑے" بنا رکھے ہیں۔ وہ انھیں بڑوں کے بھروسہ پر جی رہے ہیں۔ حالانکہ خدا کے یہاں سب چھوٹے ہیں۔ وہاں کسی کو جو چیز بچائے گی وہ اس کا ذاتی عمل ہے نہ کہ مفروضہ بڑوں کی بڑائی۔

پیغمبر کا کام ایک اللہ کی طرف بلانا ہے۔ یہی اس کا مشن ہے۔ اس مشن کو اس نے بصیرت کے طور پر اختیار کیا ہے نہ کہ تقلید کے طور پر۔ گویا پیغمبرانہ دعوت وہ دعوت ہے جو انسان کو ایک خدا سے جوڑنے کی دعوت ہو اور جس کی صداقت داعی کے اوپر اتنی کھل چکی ہو کہ وہ اس کے لئے بصیرت اور معرفت بن جائے۔ اسی طرح پیغمبر کے پیرو وہ لوگ ہیں جو حق کو بصیرت کی سطح پر پائیں اور توحید کی سطح پر اس کا اعلان کریں۔

آدمی اپنے وقتی اطمینان کو مستقل اطمینان سمجھ لیتا ہے۔ حالانکہ کسی کے پاس اس بات کی ضمانت نہیں کہ اس کی مہلت عمر کب تک ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ کب موت آکر اس کے تمام مزعومات کو باطل کر دے گی۔ کب قیامت کا زلزلہ اس کی بنی بنائی دنیا کو الٹ پلٹ دے گا۔ آدمی اپنے آپ کو یقینی انجام

کی دنیا میں سمجھتا ہے۔ حالانکہ وہ ہر لمحہ ایک غیر یقینی انجام کے کنارے کھڑا ہوا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ؕ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ حَتّٰٓى اِذَا اسْتَايْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَآءُ ؕ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۰﴾

اور ہم نے تم سے پہلے مختلف بستی والوں میں سے جتنے رسول بھیجے سب آدمی ہی تھے۔ ہم ان کی طرف وحی کرتے تھے۔ کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ ان لوگوں کا انجام کیا ہوا جو ان سے پہلے تھے اور آخرت کا گھر ان لوگوں کے لئے بہتر ہے جو ڈرتے ہیں، کیا تم سمجھتے نہیں۔ یہاں تک کہ جب پیغمبر مایوس ہوگئے اور وہ خیال کرنے لگے کہ ان سے جھوٹ کہا گیا تھا تو ان کو ہماری مدد آپہنچی۔ پس نجات ملی جس کو ہم نے چاہا اور مجرم لوگوں سے ہمارا عذاب ٹالا نہیں جا سکتا۔ ۱۱۰ - ۱۰۹

تاریخ بتاتی ہے کہ جو لوگ رسالت اور پیغمبری کو مانتے تھے وہ بھی اس وقت اس کے منکر ہوگئے، جب کہ خود اپنی قوم کے اندر سے ایک شخص پیغمبر ہو کر ان کے سامنے کھڑا ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ماضی کا پیغمبر تاریخی طور پر ثابت شدہ پیغمبر بن چکا ہوتا ہے، جب کہ حال کا پیغمبر ایک نزاعی شخصیت ہوتا ہے۔ تاریخی پیغمبر کو ماننا ہمیشہ انسان کے لئے آسان ترین کام رہا ہے اور نزاعی پیغمبر کو ماننا ہمیشہ اس کے لئے مشکل ترین کام۔

عاد اور ثمود اور مدین اور قوم لوط وغیرہ کی تباہ شدہ بستیاں قریش کے آس پاس کے علاقوں میں موجود تھیں۔ وہ اپنے سفروں کے دوران ان کو دیکھتے تھے۔ یہ آثار زبان حال سے کہہ رہے تھے کہ پیغمبر کو نزاعی دور میں نہ پہچاننے ہی کی وجہ سے ان قوموں پر خدا کا عذاب آیا اور وہ ہلاک کر دی گئیں۔ اس کے باوجود قریش نے ان سے سبق نہیں لیا۔ اس کی وجہ انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ ایک غلط کام کرتا ہے مگر کچھ خود ساختہ خیالات کی بنا پر اپنے آپ کو غلط کاروں کی فہرست سے الگ کر لیتا ہے۔

سورہ یوسف کی آیت ۱۱۰ کی تشریح سورہ بقرہ کی آیت ۲۱۴ سے ہو رہی ہے جس میں ارشاد ہوا ہے ——— "کیا تم خیال کرتے ہو کہ تم جنت میں داخل کر دئے جاؤ گے۔ حالانکہ تم پر ابھی وہ حالات گزرے ہی نہیں جو تم سے پہلے والوں پر گزرے تھے۔ ان کو سختی اور تکلیف پہنچی اور وہ ہلا مارے گئے۔

یہاں تک کہ رسول اور اس کے ساتھ ایمان لانے والے پکار اٹھے کہ خدا کی مدد کب آئے گی۔ جان لو، خدا کی مدد قریب ہے۔"

خدا ہمیشہ داعی کی مدد کرتا ہے۔ مگر یہ مدد مدعو کے خلاف داعی کے حق میں خدا کا فیصلہ ہوتا ہے، اسی لئے یہ مدد ہمیشہ اس وقت آتی ہے جب کہ دعوتی جدوجہد اپنی تکمیل کے آخری مرحلہ میں پہنچ چکی ہو، خواہ اس تاخیر کی وجہ سے دعوت دینے والوں پر مایوسی کے احساسات طاری ہونے لگیں۔

"اور آخرت کا گھر متقیوں کے لئے زیادہ بہتر ہے" اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں اہل ایمان کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے وہ آخرت میں ان کے ساتھ کئے جانے والے سلوک کی علامت ہوتا ہے۔

دنیا میں خدا حق کے داعیوں کی اس طرح مدد کرتا ہے کہ ان کی بات تمام دوسری باتوں پر بلند و بالا ثابت ہوتی ہے۔ وہ اپنے دشمنوں کی تمام سازشوں اور مخالفتوں کے باوجود اپنا مشن پورا کرنے میں کامیاب ثابت ہوتے ہیں۔ یہی عزت اور سربلندی ان کو آخرت میں زیادہ کامل اور معیاری صورت میں حاصل ہوگی۔

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُولِي الْأَلْبَابِ ۗ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَٰكِنْ تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿۱۱۱﴾

ان کے قصوں میں سمجھ دار لوگوں کے لئے بڑی عبرت ہے۔ یہ کوئی گھڑی ہوئی بات نہیں، بلکہ تصدیق ہے اس چیز کی جو اس سے پہلے موجود ہے۔ اور تفصیل ہے ہر چیز کی۔ اور ہدایت اور رحمت ہے ایمان والوں کے لئے۔ ۱۱۱

پچھلے پیغمبروں اور ان کی قوموں کی کہانی عبرت کے اعتبار سے تمام انسانوں کی کہانی ہے۔ اگر آدمی عقل سے کام لے تو وہ ماضی کے واقعہ میں حال کی نصیحت پالے گا۔ دوسروں کے انجام کو دیکھ کر وہ اپنے احوال کو درست کرلے گا۔

قرآن کسی انسان کی گھڑی ہوئی کتاب نہیں، وہ خدا کی طرف سے اتری ہوئی کتاب ہے۔ وہ عین اس پیشین گوئی کے مطابق آئی ہے جو پچھلی آسمانی کتابوں میں کی گئی تھیں۔ اس میں ہدایت سے متعلق ہر ضروری چیز کا بیان موجود ہے۔ وہ اپنے آغاز کے اعتبار سے انسانوں کے لئے رہنمائی ہے اور اپنے انجام کے اعتبار سے ان کے لئے رحمت۔

سُوْرَةُ الرَّعْدِ مَدَنِيَّةٌ وَهِيَ ثَلٰثٌ وَأَرْبَعُوْنَ آيَةً وَسِتُّ رُكُوْعَاتٍ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ ۭ وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ① اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَاۗءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ②

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

الف۔ل۔م۔ر۔ یہ کتاب الٰہی کی آیتیں ہیں۔ اور جو کچھ تمہارے اوپر تمہارے رب کی طرف سے اترا ہے وہ حق ہے۔ مگر اکثر لوگ نہیں مانتے۔ اللہ ہی ہے جس نے آسمان کو بلند کیا بغیر ایسے ستون کے جو تمھیں نظر آئیں۔ پھر وہ اپنے تخت پر متمکن ہوا اور اس نے سورج اور چاند کو ایک قانون کا پابند بنایا، ہر ایک ایک مقرر وقت پر چلتا ہے۔ اللہ ہی ہر کام کا انتظام کرتا ہے۔ وہ نشانیوں کو کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم اپنے رب سے ملنے کا یقین کرو۔ ۲-۱

قرآن ایک خدا کو ماننے کی دعوت دیتا ہے۔ جو لوگ خدا کو نہیں مانتے ان کی سب سے بڑی دلیل یہ ہوتی ہے کہ خدا اگر ہے تو ہم کو دکھائی کیوں نہیں دیتا۔ مگر ہماری معلوم کائنات بتاتی ہے کہ کسی چیز کا دکھائی نہ دینا اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ اس کا کوئی وجود بھی نہیں۔ اس کی ایک مثال قوت کشش ہے۔ خلا میں بے شمار الگ الگ ستارے اور سیارے ہیں۔ انسانی علم کہتا ہے کہ ان اجرام سماوی کے درمیان ایک غیر مرئی قوت کشش ہے جو وسیع خلا میں ان کو سنبھالے ہوئے ہے۔ پھر انسان جب غیر مرئی ہونے کے باوجود قوت کشش کی موجودگی کا اقرار کر رہا ہے تو غیر مرئی ہونے کی وجہ سے خدا کے وجود کا انکار کرنے میں وہ کیوں کر حق بجانب ہوگا۔

یہی معاملہ وحی و رسالت کا ہے۔ کائنات کا طالب علم جب کائنات کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ پاتا ہے کہ یہاں ہر چیز ایک نظام کی پابند ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام چیزیں کسی خاص حکم میں جکڑی ہوئی ہیں۔ یہ "حکم" خود ان چیزوں کے اندر موجود نہیں ہے۔ یقیناً وہ خارج سے آتا ہے۔ گویا تمام دنیا اپنے عمل کے لئے "خارج" سے ہدایات لے رہی ہے۔ انسان کے علاوہ بقیہ دنیا میں اس خارجی ہدایت کا نام قانون فطرت ہے، اور انسان کی دنیا میں اس کا نام وحی و الہام۔ وحی دراصل اسی خارجی رہنمائی کی انسانی دنیا تک توسیع ہے جس کو بقیہ دنیا میں قانون فطرت کہا جاتا ہے۔

کائنات گویا ایک مشین ہے اور قرآن اس کی گائڈ بک۔ اول الذکر خدا کی تدبیر امر کی مثال ہے اور ثانی الذکر خدا کی تفصیل آیات کی مثال۔ ان دونوں کے درمیان کامل مطابقت ہے۔ جو کچھ کائنات میں عملاً نظر آتا ہے وہ قرآن میں لفظی طور پر موجود ہے۔ یہ مطابقت بیک وقت دو باتیں ثابت کرتی ہے۔ ایک یہ کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے۔ اور دوسرے یہ کہ قرآن اسی خالق کی کتاب ہے نہ کہ محدود انسانی دماغ کی تخلیق۔

وَهُوَ الَّذِي مَدَّ الْأَرْضَ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْهَارًا ۖ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ جَعَلَ فِيهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ ۖ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴿٣﴾

اور وہی ہے جس نے زمین کو پھیلایا۔ اور اس میں پہاڑ اور ندیاں رکھ دیں اور ہر قسم کے پھلوں کے جوڑے اس میں پیدا کئے۔ وہ رات کو دن پر اڑھا دیتا ہے۔ بے شک ان چیزوں میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور کریں۔ ۳

آسمان کی نشانیوں کے بعد جب زمین کے حالات پر غور کیا جائے تو وہ انسان کی رہائش کے لئے انتہائی بامعنی طور پر موزوں نظر آتی ہے۔

زمین ایک قدرتی فرش کی مانند آدمی کے قدموں کے نیچے پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں ایک طرف انسان کی ضرورت کے لئے سمندر کی گہرائیاں ہیں تو دوسری طرف پہاڑوں کی بلندیاں بھی ہیں تاکہ دونوں مل کر زمین کا توازن برقرار رکھیں۔ درخت ایک دوسرے سے الگ الگ بھی ہوسکتے تھے مگر ان میں جوڑے ہیں جن کے درمیان تزویج کے عمل سے دانے اور پھل پیدا ہوتے ہیں۔ زمین کا یہ حال ہے کہ سورج کے چاروں طرف اپنی سالانہ دوری گردش کے ساتھ اپنے محور پر بھی مسلسل گردش کرتی ہے جس کا دور ۲۴ گھنٹہ میں پورا ہوتا ہے اور جس سے رات اور دن پیدا ہوتے ہیں۔

اس قسم کی نشانیوں پر جو شخص بھی سنجیدگی سے غور کرے گا وہ یہ ماننے پر مجبور ہوگا کہ یہ دنیا ایک بااختیار مالک کے تحت ہے اور اس نے اپنے ارادہ کے تحت اس کی ایک بامقصد منصوبہ بندی کر رکھی ہے۔ باشعور منصوبہ بندی کے بغیر زمین پر یہ معنویت ہرگز ممکن نہ تھی۔

وَفِي الْأَرْضِ قِطَعٌ مُتَجَاوِرَاتٌ وَجَنَّاتٌ مِنْ أَعْنَابٍ وَزَرْعٌ وَنَخِيلٌ صِنْوَانٌ وَغَيْرُ صِنْوَانٍ يُسْقَىٰ بِمَاءٍ وَاحِدٍ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الْأُكُلِ ۚ

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿۴﴾

اور زمین میں پاس پاس مختلف قطعے ہیں اور انگوروں کے باغ ہیں اور کھیتی ہے اور کھجوریں ہیں، ان میں سے کچھ اکہرے ہیں اور کچھ دُہرے۔ سب ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں۔ اور ہم ایک کو دوسرے پر پیداوار میں فوقیت دیتے ہیں۔ بے شک ان میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور کریں۔ ۴

حضرت عبد اللہ بن عباس نے فرمایا کہ کوئی اچھی زمین ہے اور کوئی بنجر زمین۔ ایک اگتی ہے اور اسی کے پاس دوسری نہیں اگتی (ارض طيبة وارض سبخة تُنبت هذه وهذه الى جنبها لا تنبت) مجاہد نے کہا کہ یہی معاملہ بنی آدم کا ہے۔ ان میں اچھے بھی ہیں اور برے بھی، حالانکہ سب کی اصل ایک ہے (كمثل بني آدم صالحهم وخبيثهم وابوهم واحد) حسن بصری نے کہا کہ یہ ایک مثال ہے جو اللہ نے بنی آدم کے دلوں کے لئے دی ہے (هذا مثل ضرب الله لقلوب بني آدم)

زمین میں ایک عجیب نشانی یہ ہے کہ ایک ہی مٹی ہے۔ ایک ہی پانی سے اس کو سیراب کیا جاتا ہے مگر ایک جگہ سے ایک درخت نکلتا ہے اور اسی کے پاس دوسری جگہ سے دوسرا درخت۔ ایک میں میٹھا پھل ہے اور دوسرے میں کھٹا پھل۔ کوئی زیادہ پیداوار دیتا ہے اور کوئی کم پیداوار۔

یہ انسانی واقعہ کی زمینی تمثیل ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ تمام انسان بظاہر یکساں ہیں اور ان سب کے پاس ایک ہی ہدایت آتی ہے۔ مگر ہدایت سے استفادہ کے معاملہ میں ایک انسان اور دوسرے انسان میں بہت زیادہ فرق ہو جاتا ہے۔ کوئی اس سے رہنمائی حاصل کرتا ہے اور کوئی اس کا منکر بن جاتا ہے۔ کوئی تھوڑی ہدایت لیتا ہے اور کسی کی زندگی ہدایت سے مالا مال ہو جاتی ہے۔ گویا کہ زمین دیسی پیداوار کا اصول یہاں بھی ہے اور وہاں بھی۔

وَإِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ أَإِذَا كُنَّا تُرَابًا أَإِنَّا لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ ۗ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ الْأَغْلَالُ فِي أَعْنَاقِهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۵﴾

اور اگر تم تعجب کرو تو تعجب کے قابل ان کا یہ قول ہے کہ ——— جب وہ مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہم نئے سرے سے پیدا کئے جائیں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کا انکار کیا اور یہ وہ لوگ ہیں جن کی گردنوں میں طوق پڑے ہوئے ہیں وہ آگ والے لوگ ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۵

دوسری زندگی کے منکرین کا کیس نہایت عجیب ہے۔ وہ جس واقعہ کے ظہور کو ایک بار مان رہے ہیں اسی واقعہ کے دوبارہ ظہور کا انکار کر دیتے ہیں۔

جو لوگ دوسری زندگی کے وقوع کو نہیں مانتے وہ دوسری زندگی کا عقیدہ رکھنے والوں پر حیرانی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ دوسری زندگی کو ماننا ایک غیر علمی بات کو ماننا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ کیونکہ کوئی منکر جس چیز کا انکار کر سکتا ہے، وہ صرف دوسری زندگی ہے۔ جہاں تک پہلی زندگی کا تعلق ہے اس کا انکار کرنا کسی شخص کے لئے ممکن نہیں۔ کیونکہ وہ تو ایک زندہ واقعہ کے طور پر ہر آدمی کے سامنے موجود ہے۔ پھر جب پہلی زندگی کا وجود میں آنا ممکن ہے تو دوسری زندگی کا وجود میں آنا ناممکن کیوں ہو۔

ایسے لوگ ہمیشہ بہت کم پائے گئے ہیں جو خدا کے منکر ہوں۔ بیشتر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ ایک خالق کو مانتے ہیں مگر وہ آخرت کو نہیں مانتے۔ مگر آخرت کے انکار کے بعد خالق کے اقرار کی کوئی قیمت باقی نہیں رہتی۔ خدا اس کائنات کا خالق ہی نہیں وہ بذات خود حق بھی ہے۔ خدا کا سراپا حق اور عدل ہونا لازمی طور پر تقاضا کرتا ہے کہ وہ جو کچھ کرے حق اور عدل کے مطابق کرے۔ آخرت دراصل خدا کی صفت عدل کا ظہور ہے۔ خدا کو ماننا وہی ماننا ہے جب کہ اس کے ساتھ آخرت کو بھی مانا جائے۔ آخرت کو مانے بغیر خدا کا عقیدہ مکمل نہیں ہوتا۔

جو لوگ حق کے سیدھے اور سچے پیغام کو نہیں مانتے اس کی وجہ اکثر یہ ہوتی ہے کہ وہ جمود اور تعصب اور انانیت کے شکار ہوتے ہیں۔ ان سے بات کیجئے تو ایسا معلوم ہوگا کہ وہ خود اپنے خیالات کے قیدی بنے ہوئے ہیں۔ اس سے نکل کر وہ آزادانہ طور پر کسی خارجی حقیقت پر غور نہیں کر سکتے۔ اسی حالت کو "گردن میں طوق پڑنا" فرمایا۔ کیونکہ گردن میں طوق ہونا غلامی کی علامت ہے۔ گویا کہ یہ لوگ خود اپنے خیالات کے غلام ہیں۔ جو لوگ اس طرح اپنے آپ کو دنیا میں قیدی بنا لیں، آخرت میں بھی ان کے حصہ میں قید ہی آئے گی۔

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ۭ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰي ظُلْمِهِمْ ۚ وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝

وہ بھلائی سے پہلے برائی کے لئے جلدی کر رہے ہیں۔ حالانکہ ان سے پہلے مثالیں گذر چکی ہیں اور تمہارا رب لوگوں کے ظلم کے باوجود ان کو معاف کرنے والا ہے۔ اور بے شک تمہارا رب سخت سزا دینے والا ہے۔ ۶

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے لوگوں سے کہتے تھے کہ خدا کی ہدایت کو مانو ورنہ تم خدا کی پکڑ میں آجاؤ گے۔ اس کے جواب میں انھوں نے کہا " خدایا، محمد جو کچھ پیش کر رہے ہیں اگر وہ حق ہے تو ہمارے

اوپر آسمان سے پتھر برسا"، یہ دعا بظاہر خدا سے تھی مگر حقیقۃً اس کا رخ رسول کی طرف تھا۔ آپ اس وقت مکہ کے لوگوں کو بالکل بے وزن معلوم ہوتے تھے۔ ان کو یقین نہیں آتا تھا کہ ایسے معمولی آدمی کے انکار پر خدا ہمیں سزا دے گا۔ "محمد" کے انکار پر عذاب آنا ان کو اتنا بعید از وقوع نظر آتا تھا کہ وہ بطور استہزا کہتے تھے کہ تم جس خدائی عذاب کی دھمکی دے رہو، ہم چاہتے ہیں کہ وہ ہمارے اوپر آجائے۔

فرمایا کہ تمہارے انکار حق کے سبب سے تمہارے اوپر خدا کا عذاب تو آنے ہی والا ہے۔ یہ صرف تمہاری بدبختی ہے کہ تم اس کو جلد بلانا چاہتے ہو۔ حالانکہ تم کو چاہئے تھا کہ اس وقفہ کو دعوت قرآن پر غور وفکر اور اس کی قبولیت میں استعمال کرو نہ کہ عذاب کو قبل از وقت بلانے میں۔

لوگ چاہتے ہیں کہ خدا کے عذاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں پھر اس کو مانیں۔ مگر یہ صرف اندھے پن کا مطالبہ ہے۔ اگر ان کے پاس آنکھیں ہوں تو جو کچھ دوسروں کے ساتھ پیش آیا وہی ان کے سبق کے لئے کافی ہے ان سے پہلے کتنی قومیں گذر چکی ہیں جنھوں نے انھیں کی طرح اپنے زمانے کے پیغمبروں کو جھٹلایا اور بالآخر انھیں اس کی سزا بھگتنی پڑی۔

خدا کا قانون یہ ہے کہ وہ انسان کو عمل کی مہلت دیتا ہے۔ یہی قانون مہلت ہے جس نے لوگوں کو سرکش بنا رکھا ہے۔ مگر مہلت کی ایک حد ہے۔ اس حد کے بعد جو چیز ان کا انتظار کر رہی ہے وہ صرف دردناک عذاب ہے جس سے وہ اپنے آپ کو بچا نہ سکیں گے۔

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ ۗ إِنَّمَا أَنْتَ مُنْذِرٌ ۖ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴿٧﴾

ع ۷

اور جن لوگوں نے انکار کیا وہ کہتے ہیں کہ اس شخص پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتری۔ تم تو صرف خبردار کر دینے والے ہو۔ اور ہر قوم کے لئے ایک راہ بتانے والا ہے۔

آج ساری دنیا میں ایک ارب سے بھی زیادہ انسان محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کو خدا کا رسول مانتے ہیں۔ مگر آپ کی زندگی میں مکہ والوں کی سمجھ میں نہ آسکا کہ آپ کو خدا نے اپنا رسول بنایا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اپنی تاریخ کے ابتدائی دور میں آپ کی نبوت ایک نزاعی (Controversial) نبوت تھی۔ مگر اب اپنی تاریخ کے انتہائی دور میں آپ کی نبوت ایک ثابت شدہ (Established) نبوت بن چکی ہے۔ نزاعی دور میں پیغمبر کو پہچاننا جتنا مشکل ہے، اثباتی دور میں اس کو پہچاننا اتنا ہی آسان ہو جاتا ہے۔

مکہ کے لوگوں کے پاس جو پیمانہ تھا وہ دولت، اقتدار، اور مقبولیت عوام کا پیمانہ تھا۔ اس اعتبار سے آپ ان کو غیر معمولی نظر نہ آتے تھے۔ اس لئے انھوں نے چاہا کہ آپ کے ساتھ کوئی غیر معمولی نشانی ہو جو ان

کے لئے آپ کے پیغمبر ہونے کا قطعی ثبوت بن جائے۔ اس کے جواب میں فرمایا گیا کہ یہ لوگ ایسی چیز مانگ رہے ہیں جو خدائی منصوبہ کے مطابق نہیں، اس لئے وہ کسی کو ملنے والی بھی نہیں۔

موجودہ دنیا دار الامتحان ہے۔ یہاں ہدایت ایسی صریح نشانیوں کے ساتھ نہیں آسکتی کہ اس کے بعد آدمی کے لئے شبہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔ کیونکہ ایسی حالت میں امتحان کی مصلحت فوت ہو جاتی ہے۔ یہاں بہر حال یہی ہوگا کہ آدمی کو "خبر" کی سطح پر جانچ کر اس کا یقین کرنا پڑے گا۔ جو شخص اس امتحان میں پورا نہ اترے، اس کے حصہ میں ہدایت بھی کبھی نہیں آسکتی۔

خدا ہر قوم میں اس کے اپنے اندر کے ایک آدمی کو کھڑا کرتا ہے تاکہ وہ اس کی مانوس زبان میں اس کو خدا کا پیغام پہنچا دے۔ یہ انتظام قوموں کی آسانی کے لئے تھا۔ مگر اکثر ایسا ہوا کہ قوموں نے اس سے الٹا اثر لے کر خدا کے پیغمبروں کا انکار کر دیا۔ ان کی نگاہیں پیغام رساں کے معمولی پن پر اٹک کر رہ گئیں، وہ پیغام کے غیر معمولی پن کو نہ دیکھ سکیں۔

اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ؕ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ۝ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ ۝ سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ۝

اللہ جانتا ہے ہر مادہ کے حمل کو۔ اور جو کچھ رحموں میں گھٹتا اور بڑھتا ہے اس کو بھی۔ اور ہر چیز کا اس کے یہاں ایک اندازہ ہے۔ وہ پوشیدہ اور ظاہر کو جاننے والا ہے، سب سے بڑا ہے، سب سے برتر۔ تم میں سے کوئی شخص چپکے سے بات کہے اور جو پکار کر کہے اور جو رات میں چھپا ہوا ہو۔ اور دن میں چل رہا ہو، خدا کے لئے سب یکساں ہیں۔ ۱۰ - ۸

ماں کا پیٹ ایک حیرت انگیز فیکٹری ہے۔ اس خدائی فیکٹری میں جو انسانی پیداوار تیار ہوتی ہے اس کا ایک عجیب پہلو یہ ہے کہ وہ "مقرر مقدار" کے مطابق عمل کرتی ہے۔ آج کل کی زبان میں گویا ڈیمانڈ اور سپلائی کے درمیان مسلسل ایک توازن برقرار رہتا ہے۔

مثلاً یہ فیکٹری ہزاروں سال سے کام کر رہی ہے۔ اس سے مرد بھی پیدا ہو رہے ہیں اور عورتیں بھی۔ مگر دونوں جنسوں کی تعداد کے درمیان ہمیشہ ایک تناسب قائم رہتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ اس فیکٹری سے سب مرد ہی مرد پیدا ہو جائیں یا سب عورتیں ہی عورتیں پیدا ہونے لگیں۔ جنگ جیسا کوئی حادثہ مقامی طور پر کبھی اس تناسب کو برہم کر دیتا ہے۔ مگر حیرت انگیز طور پر دیکھا گیا ہے کہ کچھ عرصہ بعد ہی یہ قدرتی کارخانہ اس تناسب کو دوبارہ قائم کر دیتا ہے۔

یہی معاملہ اس فیکٹری سے نکلنے والے مرد و عورت کے درمیان صلاحیتوں کے توازن کا ہے۔ مطالعہ بتاتا ہے کہ پیدا ہونے والے مرد و عورت سب یکساں استعداد کے نہیں ہوتے۔ ان کی صلاحیتوں میں بہت زیادہ تنوع ہے۔ اس تنوع کی غیر معمولی تمدنی اہمیت ہے۔ کیونکہ تمدن کے کاروبار کو چلانے کے لئے مختلف قسم کی صلاحیتوں کے انسان درکار ہیں۔ ماں کی فیکٹری نہایت خاموشی سے ہر قسم کی استعداد والے انسان اس طرح کامیابی کے ساتھ تیار کر رہی ہے جیسے اس کو باہر سے "آرڈر" موصول ہوتے ہوں۔ اور وہ پیٹ کے اندر اس کے مطابق انسانوں کی تشکیل کر رہی ہو۔ اگر انسانی پیداوار میں یہ تنوع نہ ہو تو تمدن کا سارا نظام سرد پڑ جائے اور تمام ترقیاں ماند ہو کر رہ جائیں۔

ماں کے پیٹ کے عمل میں اس منصوبہ بندی کا ہونا صریح طور پر اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کے پیچھے کوئی منصوبہ ساز ہے۔ بالارادہ منصوبہ بندی کے بغیر اس قسم کا نظام اس قدر تسلسل کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتا۔

اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس دنیا کا خالق و مالک ایک ایسی ہستی ہے جس کو نہ صرف کھلے کی خبر ہے بلکہ وہ چھپے کو بھی جانتا ہے۔ رحم کے اندر اور ماں کے پیٹ میں جو کچھ ہوتا ہے وہ بظاہر ایک مخفی چیز ہے۔ مگر مذکورہ واقعہ بتاتا ہے کہ خدا کو اس کی مکمل خبر ہے۔ پھر جو ہستی ایک کے چھپے اور کھلے کو جانتی ہے وہ دوسرے کے چھپے اور کھلے کو کیوں نہیں جانے گی۔ فرشتوں کا عقیدہ بھی اسی سے ثابت ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ "نگرانی" کے موجودہ نظام کی گویا توسیع ہے۔

لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۭ وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْۗءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ⑪

ہر شخص کے آگے اور پیچھے اس کے نگراں ہیں جو اللہ کے حکم سے اس کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ بے شک اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اس کو نہ بدل ڈالیں جو ان کے جی میں ہے۔ اور جب اللہ کسی قوم پر کوئی آفت لانا چاہتا ہے تو پھر اس کے ہٹنے کی کوئی صورت نہیں اور اللہ کے سوا اس کے مقابلہ میں کوئی ان کا مددگار نہیں۔ ۱۱

دنیا میں قوموں کا عروج و زوال الل ٹپ طور پر نہیں ہوتا بلکہ خدا کی نگرانی اور فیصلہ کے تحت ہوتا ہے۔ خدا جب کسی قوم کو اپنی نعمت سے نوازتا ہے تو وہ اس نعمت کو اس وقت تک اس کے لئے باقی

رکھتا ہے جب تک وہ اپنے اندر اس کی استعداد باقی رکھے۔ استعداد کھو دینے کے بعد وہ قوم لازمی طور پر خدائی نعمت کو بھی کھو دیتی ہے، مثلاً اپنے درمیان اتحاد کھونے کے بعد خارجی دنیا میں رعب سے محروم ہو جانا وغیرہ۔

دنیا میں کوئی قوم جو کچھ پاتی ہے، خدا کے قانون کے تحت پاتی ہے اور کوئی قوم جو کچھ کھوتی ہے خدا کے قانون کے تحت کھوتی ہے۔ خدا کے سوا یہاں نہ کوئی دینے والا ہے اور نہ کوئی چھیننے والا۔

هُوَ الَّذِیْ یُرِیْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ یُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ﴿۱۲﴾ وَ یُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ مِنْ خِیْفَتِهٖ ۚ وَ یُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَیُصِیْبُ بِهَا مَنْ یَّشَآءُ وَ هُمْ یُجَادِلُوْنَ فِی اللّٰهِ ۚ وَ هُوَ شَدِیْدُ الْمِحَالِ ﴿۱۳﴾

وہی ہے جو تم کو بجلی دکھاتا ہے جس سے ڈر بھی پیدا ہوتا ہے اور امید بھی۔ اور وہی ہے جو پانی سے لدے ہوئے بادل اٹھاتا ہے۔ اور بجلی کی گرج اس کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرتی ہے اور فرشتے بھی اس کے خوف سے۔ اور وہ بجلیاں بھیجتا ہے، پھر جس پر چاہے انھیں گرا دیتا ہے اور وہ لوگ خدا کے باب میں جھگڑتے ہیں، حالانکہ وہ زبردست ہے قوت والا ہے۔ ۱۲-۱۳

بجلی چمکتی ہے تو کبھی وہ نئے خوشگوار موسم کی آمد کا پیغام ہوتی ہے اور کبھی وہ صاعقہ بن کر زمین پر گرتی ہے اور چیزوں کو جلا ڈالتی ہے۔ اسی طرح بادل اٹھتے ہیں تو کبھی وہ مفید بارش کی صورت میں زمین پر برستے ہیں اور کبھی طوفان اور سیلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں ایک ہی چیز میں ڈر کا پہلو بھی ہے اور امید کا پہلو بھی۔ دنیا کا انتظام کرنے والا جس چیز کے ذریعہ دنیا والوں پر اپنی رحمت بھیجتا ہے اسی کو وہ تباہ کن عذاب بھی بنا سکتا ہے۔ اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ آدمی کبھی اپنے آپ کو خدا کی پکڑ سے مامون نہ سمجھے۔

غافل انسان ہمیشہ کسی انوکھی اور طلسماتی نشانی کے ظہور کے منتظر رہتے ہیں۔ مگر جن لوگوں کا شعور بیدار ہے، وہ اپنے آس پاس روزمرہ کے واقعات میں ہر قسم کی اعلیٰ نشانی پا لیتے ہیں۔ بجلی کی کڑک چمک ان کے دل کی دھڑکنیں تیز کر دیتی ہے۔ اور بارش کے قطرے دیکھ کر ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ پڑتا ہے۔ خدا کی طاقتوں کو براہ راست دیکھ کر فرشتوں کا جو حال ہوتا ہے وہی حال سچے انسانوں کا اس وقت ہو جاتا ہے جب کہ انھوں نے خدا کی طاقتوں کو ابھی براہ راست نہیں دیکھا ہے۔

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ وَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا یَسْتَجِیْبُوْنَ لَهُمْ بِشَیْءٍ اِلَّا

كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ إِلَى الْمَاءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهِ ۚ وَمَا دُعَاءُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ ﴿١٤﴾

سچا پکارنا صرف خدا کے لئے ہے۔ اور اس کے سوا جن کو لوگ پکارتے ہیں وہ ان کی اس سے زیادہ دادرسی نہیں کر سکتے جتنا پانی اس شخص کی کرتا ہے جو اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلائے ہوئے ہو تاکہ وہ اس کے منہ تک پہنچ جائے اور وہ اس کے منہ تک پہنچنے والا نہیں۔ اور منکرین کی پکار سب بے فائدہ ہے۔ ۱۴

اگر آپ ہاتھ پھیلا کر سمندر کے پانی کو پکاریں تو ایسا کبھی نہیں ہوگا کہ سمندر آپ کی پکار کو سنے اور اس کا پانی سمندر کی گہرائیوں سے نکل کر آپ کی طرف آئے اور آپ کے کھیتوں اور باغوں کو سیراب کرے۔ مگر اسی سمندر کے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ قدرت کے قانون کے تحت اس کا پانی نمک کے جز کو چھوڑ کر فضا میں بلند ہوتا ہے۔ پھر گرمی اور کشش اور ہوا کے عمل سے متحرک ہو کر وہ آپ کی بستی کے اوپر آتا ہے اور میٹھے پانی کی صورت میں برس کر آپ کی زمین کو سیراب کر دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سمندر بظاہر عظیم ہونے کے باوجود سراسر عاجز ہے اس کو کسی قسم کا ذاتی اختیار حاصل نہیں۔

یہی اس دنیا کی تمام چیزوں کا حال ہے۔ ایسی حالت میں عقلمند انسان صرف وہ ہے جو خالق کو پوجے نہ کہ مخلوق کو، جو چیزوں کے رب کو اپنا مرکز توجہ بنائے نہ کہ خود چیزوں کو۔

وَلِلَّهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَظِلَالُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ ۩ ﴿١٥﴾ قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ قُلِ اللَّهُ ۚ قُلْ أَفَاتَّخَذْتُمْ مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ لَا يَمْلِكُونَ لِأَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَلَا ضَرًّا ۚ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ أَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمَاتُ وَالنُّورُ ۗ أَمْ جَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ خَلَقُوا كَخَلْقِهِ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ۚ قُلِ اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿١٦﴾

اور آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں سب خدا ہی کو سجدہ کرتے ہیں۔ خوشی سے یا مجبوری سے اور ان کے سائے بھی صبح اور شام۔ کہو، آسمانوں اور زمین کا رب کون ہے۔ کہہ دو کہ اللہ۔ کہو کیا پھر بھی تم نے اس کے سوا ایسے مددگار بنا رکھے ہیں جو خود اپنی ذات کے نفع اور نقصان کا بھی اختیار نہیں رکھتے۔ کہو کیا اندھا اور آنکھوں والا دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔ یا کیا اندھیرا اور اجالا دونوں برابر ہو جائیں گے۔ کیا

انھوں نے خدا کے ایسے شریک ٹھہرائے ہیں جنھوں نے بھی پیدا کیا ہے جیسا کہ اللہ نے پیدا کیا، پھر پیدائش ان کی نظر میں مشتبہ ہوگئی۔ کہو، اللہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور وہی ہے اکیلا، زبردست ۱۵-۱۶

خدا کا مطالبہ انسان سے یہ ہے کہ وہ اس کے آگے جھک جائے۔ یہی "جھکنا"، تمام کائنات کا دین ہے۔ اس دنیا کی ہر چیز خدا کے حکم کے آگے کامل طور پر جھکی ہوئی ہے۔ اسی جھکاؤ کی ایک علامت ہے چیزوں کے سایہ کا صبح و شام مغرب اور مشرق کی طرف گرنا۔ چیزوں کا یہ سایہ گویا اس سجدہ کو مادی طور پر ممثل کر رہا ہے جو انسان سے شعوری طور پر مطلوب ہے۔ اوّل الذکر سجدے کا علامتی روپ ہے اور ثانی الذکر اس کا حقیقی روپ۔

وسیع کائنات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ساری کائنات ایک ہی آفاقی قانون میں بندھی ہوئی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کا خالق اور مالک ایک ہے۔ انسان کا علمی اور عقلی مطالعہ کسی بھی طرح یہ ثابت نہیں کرتا کہ اس کائنات میں ایک سے زیادہ طاقتوں کی کارفرمائی ہو۔ ایسی حالت میں ایک خدا کے سوا مزید خدا ماننا سراسر بے بنیاد مفروضہ ہے۔

"آنکھ" کا مشاہدہ تو صرف ایک خدا کا پتہ دیتا ہے۔ اس لئے جو لوگ ایک خدا سے زیادہ خدا مانیں وہ صرف اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ وہ اندھے ہیں۔ انھوں نے اپنے اندھے پن کی وجہ سے کئی خدا فرض کر لئے ہیں نہ کہ حقیقی معنوں میں علم اور مشاہدہ کی بنیاد پر۔

أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَابِيًا ۚ وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِثْلُهُ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۚ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ۖ وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ ﴿١٧﴾

اللہ نے آسمان سے پانی اتارا۔ پھر نالے اپنی اپنی مقدار کے موافق بہہ نکلے۔ پھر سیلاب نے ابھرتے جھاگ کو اٹھا لیا اور اسی طرح کا جھاگ ان چیزوں میں بھی ابھر آتا ہے جن کو لوگ زیور یا اسباب بنانے کے لئے آگ میں پگھلاتے ہیں۔ اس طرح اللہ حق اور باطل کی مثال بیان کرتا ہے۔ پس جھاگ تو سوکھ کر جاتا رہتا ہے اور جو چیز انسانوں کو نفع پہنچانے والی ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے۔ اللہ اسی طرح مثالیں بیان کرتا ہے ۱۷

خدا نے اپنی دنیا اس طرح بنائی ہے کہ یہاں مادی واقعات اخلاقی حقیقتوں کی تمثیل بن گئے ہیں۔ جو

کچھ اللہ تعالیٰ کو انسان سے شعور کی سطح پر مطلوب ہے، انھیں کو بقیہ دنیا میں مادی سطح پر دکھایا جارہا ہے۔

یہاں قرآن میں فطرت کے دو واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ جب بارش ہوتی ہے اور اس کا پانی بہہ کر ندیوں اور نالوں میں پہنچتا ہے تو پانی کے اوپر ہر طرف جھاگ پھیل جاتی ہے۔ اسی طرح جب چاندی اور دوسری معدنیات کو صاف کرنے کے لیے آگ پر تپاتے ہیں تو اس کا میل کچیل جھاگ کی صورت میں اوپر آجاتا ہے۔ مگر جلد ہی بعد یہ ہوتا ہے کہ دونوں چیزوں کا جھاگ، جس میں انسان کے لیے کوئی فائدہ نہیں فضا میں اڑ جاتا ہے۔ اور پانی اور دھات اپنی جگہ پر محفوظ رہ جاتے ہیں جو انسان کے لیے مفید ہے۔

یہ فطرت کے واقعات ہیں جن کے ذریعے خدا تمثیل کے روپ میں دکھا رہا ہے کہ اس نے زندگی کی کامیابی اور ناکامی کے لیے کیا اصول مقرر فرمایا ہے۔ وہ اصول یہ ہے کہ اس دنیا میں صرف اس شخص یا قوم کو جگہ ملتی ہے جو دوسروں کے لیے نفع بخشی کا ثبوت دے۔ جو فرد یا گروہ دوسرے انسانوں کو نفع پہنچانے کی طاقت کھو دے اس کے لیے خدا کی بنائی ہوئی دنیا میں کوئی جگہ نہیں۔

لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى ۚ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ سُوْۗءُ الْحِسَابِ ڏ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝۱۸

وقف النبی

جن لوگوں نے اپنے رب کی پکار کو لبیک کہا ان کے لیے بھلائی ہے اور جن لوگوں نے اس کی پکار کو نہ مانا، اگر ان کے پاس وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے، اور اس کے برابر اور بھی تو وہ سب اپنی رہائی کے لیے دے ڈالیں۔ ان لوگوں کا حساب سخت ہوگا اور ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ اور وہ کیسا برا ٹھکانا ہے۔ ۱۸

دنیا میں خدا کا یہ قانون ہے کہ خواہ وقتی طور پر میل اور جھاگ ابھر کر اوپر آجائے مگر بالآخر جس چیز کو یہاں مقام ملتا ہے وہ وہی ہے جو حقیقی ہے اور جس میں نفع بخشی کی صلاحیت ہے۔ آخرت کے اعتبار سے بھی انسانوں کا معاملہ یہی ہے۔ دنیا میں کچھ لوگ اپنی اضافی حیثیت کی بنا پر نمایاں ہو سکتے ہیں۔ مگر آخرت میں وہی لوگ اونچی جگہ پائیں گے جو حقیقی اوصاف کے مالک ہوں۔

دنیا میں جو لوگ حق کی پکار پر لبیک نہیں کہتے۔ اس کی وجہ ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ بے آمیز حق کی طرف بڑھنے میں انھیں دنیا کے فائدے ہاتھ سے جاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو حق کو نظر انداز کرنے کی قیمت ہمیشہ یہ ملتی ہے کہ وہ دنیا میں عزت اور مقبولیت اور خوش حالی کے مالک بن جاتے ہیں۔ وہ حق

کا انکار کر کے اونچی گدیوں پر سرفراز نظر آتے ہیں۔
مگر ان چیزوں کی حیثیت میل اور جھاگ سے زیادہ نہیں۔ آخرت میں یہ سارے لوگ وقتی جھاگ کی طرح دور پھینکے جا چکے ہوں گے۔ اور وہی لوگ نمایاں نظر آئیں گے جنھوں نے تمام وقتی فائدوں کو نظر انداز کر کے اپنے آپ کو حق کے حوالے کیا تھا۔
جو لوگ دنیا کی حیثیت اور دنیا کے فائدوں کو اتنی اہمیت دے رہے ہیں کہ اس کی خاطر حق کو نظر انداز کر دیتے ہیں، آخرت میں یہ چیزیں ان کو اتنی حقیر دکھائی دیں گی کہ وہ چاہیں گے کہ یہ ساری دنیا اور اس کے برابر ایک اور دنیا مل جائے تو وہ ان سب کو صرف عذاب سے بچنے کی خاطر فدیہ میں دے دیں۔

أَفَمَنْ يَعْلَمُ أَنَّمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ أَعْمَى ۚ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿١٩﴾

جو شخص یہ جانتا ہے کہ جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے اُتارا گیا ہے وہ حق ہے، کیا وہ اس کے مانند ہو سکتا ہے جو اندھا ہے۔ نصیحت تو عقل والے لوگ ہی قبول کرتے ہیں۔ ۱۹

انسانوں میں ہمیشہ دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک انسان وہ ہے جس نے خدا کی دی ہوئی عقل سے سوچا اور حقائق کی روشنی میں ایک یقینی فیصلہ تک پہنچا۔ اس طرح بے لاگ جائزہ کے نتیجہ میں اس کا دل جس چیز پر مطمئن ہوا اس کو اس نے ارادہ اور شعور کے ساتھ اختیار کر لیا۔
دوسرے لوگ وہ ہیں جو قومی روایات اور تقلیدی خیالات کے دائرہ میں سوچتے ہوں۔ جو چیزوں کو دلائل کی نظر سے دیکھنے کے بجائے رواج کی نظر سے دیکھتے ہوں۔ اور پھر جو چیز انھیں عوام میں چلتی ہوئی دکھائی دے اسی کو حق سمجھ کر اختیار کر لیں۔
قرآن کے نزدیک پہلا شخص وہ ہے جو علم کی روشنی میں ایمان لایا ہے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا آدمی قرآن کی نظر میں اندھا ہے۔ پہلا آدمی خود اپنی بصیرت سے حق اور باطل کو جانتا ہے۔ جب کہ دوسرے آدمی کا سرمایہ صرف سنی سنائی باتیں ہیں۔ لوگ جس کو باطل سمجھ لیں اس کو اس نے باطل سمجھ لیا، لوگ جس کو حق سمجھیں، اس کے متعلق اس نے بھی یقین کر لیا کہ وہ حق ہوگی۔
حق کی دعوت ایسے لوگوں کی تلاش کے لیے اٹھتی ہے جو اپنی عقل سے کام لے کر فیصلہ کر سکتے ہوں۔ باقی جو لوگ آنکھ رکھتے ہوئے اندھے بنے ہوئے ہوں ان کو حق کی دعوت کچھ فائدہ نہیں پہنچائے گی۔

الَّذِينَ يُوفُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَلَا يَنْقُضُونَ الْمِيثَاقَ ﴿٢٠﴾ وَالَّذِينَ يَصِلُونَ مَا أَمَرَ

اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ وَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَ یَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ﴿۲۱﴾ وَ الَّذِیْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِیَةً وَّ یَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّیِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۲﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ یَّدْخُلُوْنَهَا وَ مَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ وَ ذُرِّیّٰتِهِمْ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ یَدْخُلُوْنَ عَلَیْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ﴿۲۳﴾ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۴﴾

وہ لوگ جو اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اس کے عہد کو نہیں توڑتے۔ اور جو اس کو جوڑتے ہیں جس کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اور وہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور وہ برے حساب کا اندیشہ رکھتے ہیں اور جنھوں نے اپنے رب کی رضا کے لئے صبر کیا۔ اور نماز قائم کی۔ اور ہمارے دئے میں سے پوشیدہ اور علانیہ خرچ کیا۔ اور جو برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں۔ آخرت کا گھر انھیں لوگوں کے لئے ہے۔ ابدی باغ جن میں وہ داخل ہوں گے۔ اور وہ بھی جو اس کے اہل بنیں، ان کے آباء واجداد اور ان کی بیویوں اور ان کی اولاد میں سے۔ اور فرشتے ہر دروازے سے ان کے پاس آئیں گے، کہیں گے تم لوگوں پر سلامتی ہو اس صبر کے بدلے جو تم نے کیا۔ پس کیا ہی خوب ہے یہ آخرت کا گھر۔ ۲۰ - ۲۴

انسان کو خدا نے پیدا کیا۔ اس نے اس کو رہنے کے لیے بہترین دنیا دی۔ وہ ہر آن اس کی پرورش کر رہا ہے۔ یہ واقعہ انسان کو اپنے خالق و مالک کے ساتھ ایک فطری عہد میں باندھ دیتا ہے۔ اس کا کا تقاضا ہے کہ انسان سرکش نہ بنے بلکہ حقیقت واقعہ کا اعتراف کرتے ہوئے خدا کے آگے جھک جائے۔

دنیا میں انسان کی زندگی مختلف قسم کے تعلقات و روابط کے درمیان ہے۔ انسان کی عبدیت کا تقاضا ہے کہ وہ اسی سے جڑے جس سے جڑنا خدا کو پسند ہے اور اس سے کٹ جائے جس سے کٹنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس پر خدا کی عظمت کا احساس اتنی شدت سے طاری ہو کہ وہ اس کے آگے جھک جائے، جس کی ایک مقرر صورت کا نام نماز ہے۔ وہ اپنے اثاثہ میں سے دوسروں کو اسی طرح دے جس طرح خدا نے اپنے اثاثہ میں سے اس کو دیا ہے۔ اس کو کسی کی طرف سے برے سلوک کا تجربہ ہو تو وہ اچھے سلوک کے ساتھ اس کا جواب دے۔ کیونکہ وہ خود بھی یہ چاہتا ہے کہ آخرت میں خدا اس کی برائیوں کو نظر انداز کر دے اور اس کے ساتھ فضل و رحمت کا معاملہ فرمائے۔

یہ سب کچھ مسلسل صبر کا طالب ہے۔ نفس کے محرکات کے مقابلہ میں صبر۔ مفادات کے ضیاع کے

مقابلہ میں صبر۔ ماحول کے دباؤ کے مقابلہ میں صبر۔ مگر مومن کو جنت کی خاطر ان تمام چیزوں پر صبر کرنا ہے۔ صبر ہی جنت کی قیمت ہے۔ صبر کی قیمت ادا کئے بغیر کسی کو خدا کی ابدی جنت نہیں مل سکتی۔

وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۙ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْۗءُ الدَّارِ ۝ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَقْدِرُ ۭ وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ۝

اور جو لوگ اللہ کے عہد کو مضبوط کرنے کے بعد توڑتے ہیں اور اس کو کاٹتے ہیں جس کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اور زمین میں فساد کرتے ہیں، ایسے لوگوں پر لعنت ہے اور ان کے لئے برا گھر ہے۔ اللہ جس کو چاہتا ہے روزی زیادہ دیتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ اور وہ دنیا کی زندگی پر خوش ہیں۔ اور دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلہ میں ایک متاع قلیل کے سوا اور کچھ نہیں۔

۲۵-۲۶

انسان اپنے خدا سے عہد فطرت میں بندھا ہوا ہے اور دوسرے انسانوں سے عہد آدمیت میں۔ ان دونوں عہدوں کو توڑنا خدا کی زمین میں فساد کرنا ہے۔ خدا کی زمین میں اصلاح یافتہ بن کر رہنا یہ ہے کہ آدمی مذکورہ دونوں عہدوں کا پابند بن کر زندگی گزارے۔ اس کے برعکس خدا کی زمین میں فسادی بننا یہ ہے کہ آدمی ان عہدوں سے آزاد ہو جائے۔ اس کو نہ خدا کے حقوق کی پروا ہو اور نہ انسانوں کے حقوق کی۔

ایسے لوگ خدا کے نزدیک لعنت زدہ ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کی رحمتوں میں حصہ دار نہیں بنائے جائیں گے۔ انھوں نے خدا کی زمین کو گندا کیا، اس لئے وہ اسی قابل ہیں کہ آئندہ ان کو صرف گندے گھر میں جگہ ملے۔

دنیا میں کسی کو کم ملتا ہے اور کسی کو زیادہ۔ اب جس کو زیادہ ملا وہ احساس برتری میں مبتلا ہو جاتا ہے اور جس کو کم ملا وہ احساس کمتری میں۔ مگر خدا کی نظر میں یہ دونوں غلط ہیں۔ صحیح ردعمل یہ ہے کہ زیادہ ملے تو آدمی خدا کا شکر گزار بنے۔ کم ملے تو وہ صبر اور قناعت کا طریقہ اختیار کرے۔

دنیا پرست لوگ ہمیشہ حق کے داعی کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا پرست آدمی صرف ظاہری عظمتوں کو پہچان پاتا ہے۔ چوں کہ داعی کے پاس صرف معنوی عظمت ہوتی ہے اس لئے وہ اس کو پہچان نہیں پاتا۔ وہ اس کو حقیر سمجھ کر نظر انداز کر دیتا ہے۔ مگر جب حقیقت کا پردہ پھٹے گا

اس وقت انسان جانے گا کہ جس نظر آنے والی رونق کو وہ سب کچھ سمجھے ہوئے تھا وہ بالکل بے قیمت تھی۔ قدر وقیمت کی چیز دراصل وہ تھی جو دکھائی نہ دینے کی وجہ سے اس کی توجہ کا مرکز نہ بن سکی۔

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۗ قُلْ إِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ ﴿٢٧﴾ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُم بِذِكْرِ اللَّهِ ۗ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ ﴿٢٨﴾ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ طُوبَىٰ لَهُمْ وَحُسْنُ مَآبٍ ﴿٢٩﴾

اور جنھوں نے انکار کیا وہ کہتے ہیں کہ اس شخص پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی۔ کہو کہ اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور وہ راستہ اس کو دکھاتا ہے جو اس کی طرف متوجہ ہو۔ وہ لوگ جو ایمان لائے اور جن کے دل اللہ کی یاد سے مطمئن ہوتے ہیں۔ سنو، اللہ کی یاد ہی سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے اچھے کام کئے ان کے لئے خوشخبری ہے اور اچھا ٹھکانا ہے۔ ۲۷-۲۹

حق کے داعی کو نہ ماننے کی وجہ عام طور پر یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کو داعی کے گرد محسوس قسم کے کرشمے نظر نہیں آتے۔ مگر یہ عین اسی مقام پر ناکام ہونا ہے جہاں آدمی کو کامیابی کا ثبوت دینا چاہئے۔ خدا یہ چاہتا ہے کہ آدمی حق کو اس کے مجرد روپ میں پہچانے اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دے۔ اب جو شخص اصرار کرے کہ وہ محسوس کرشموں کی دلیل کے بغیر نہیں مانے گا، اس کا انجام اس دنیا میں یہی ہو سکتا ہے کہ خدا کے قانون کے مطابق کبھی اس کو حق نہ ملے۔ وہ ہمیشہ کے لئے ہدایت سے محروم ہو جائے۔

یہ دنیا دارالامتحان ہے۔ یہاں آدمی صرف "یاد" کی سطح پر خدا کو پا سکتا ہے۔ وہ اس کو "مشاہدہ" کی سطح پر نہیں پا سکتا۔ جو لوگ اس خدائی منصوبہ پر راضی ہوں گے وہ خدا کو پائیں گے۔ اور جو لوگ اس پر راضی نہ ہوں وہ خدا کو پانے سے اسی طرح محروم رہیں گے جس طرح ننگی آنکھ سے سورج کو دیکھنے پر اصرار کرنے والا سورج کو دیکھنے سے۔

اس دنیا میں کامیابی صرف اس شخص کے لئے ہے جو خدا کے منصوبہ کو مانے اور اس کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھال لے۔ کیوں کہ دنیا کی تخلیق کرنے والا خدا ہے نہ کہ کوئی انسان۔

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا۟ عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ۭ قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ مَتَابِ ﴿۳۰﴾

اسی طرح ہم نے تم کو بھیجا ہے، ایک امت میں جس سے پہلے بہت سی امتیں گذر چکی ہیں، تاکہ تم لوگوں کو وہ پیغام سنا دو جو ہم نے تمہاری طرف بھیجا ہے۔ اور وہ مہربان خدا کا انکار کر رہے ہیں۔ کہو کہ وہی میرا رب ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی کی طرف لوٹنا ہے۔ ۳۰

جب یہ دنیا دار الامتحان ہے تو اس کا فطری تقاضا یہ ہے کہ حسی نشانیاں دکھانے کے بعد لوگوں کا فیصلہ کر دیا جائے۔ اب اگر لوگوں کے مطالبہ پر خدا فوراً کوئی حسی نشانی ظاہر کر دے اور اس کے بعد بھی لوگ نہ مانیں تو فوراً وہ ہلاکت کے مستحق ہو جائیں گے۔ مگر یہ خدائے رحمان و رحیم کی خاص عنایت ہے کہ وہ لوگوں کے مطالبہ کے باوجود حسی نشانیاں ظاہر نہیں کرتا۔ بلکہ نصیحت اور دلیل کی زبان میں حق کا پیغام پہنچاتا رہتا ہے۔ اس طرح لوگوں کو زیادہ سے زیادہ مہلت ملتی ہے کہ وہ اپنی اصلاح کر کے خدا کی رحمتوں کے مستحق بن سکیں۔

ایسی حالت میں داعی کو چاہئے کہ وہ لوگوں کے نادان مطالبہ کی وجہ سے گھبرا نہ جائے۔ وہ خدا کے منصوبہ پر راضی رہتے ہوئے لوگوں کو اس کی طرف بلاتا رہے۔

وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ۭ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ۭ اَفَلَمْ يَايْـــَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ لَّوْ يَشَاۗءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۳۱﴾ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۣ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ﴿۳۲﴾

اور اگر ایسا قرآن اترتا جس سے پہاڑ چلنے لگتے، یا اس سے زمین ٹکڑے ہو جاتی یا اس سے مردے بولنے لگتے ـــــ بلکہ سارا اختیار اللہ ہی کے لئے ہے۔ کیا ایمان لانے والوں کو اس سے اطمینان نہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو سارے لوگوں کو ہدایت دے دیتا۔ اور انکار کرنے والوں پر کوئی نہ کوئی آفت

آتی رہتی ہے، ان کے اعمال کے سبب سے، یا ان کی بستی کے قریب کہیں نازل ہوتی رہے گی، یہاں تک کہ اللہ کا وعدہ آجائے۔ یقیناً اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔ اور تم سے پہلے بھی رسولوں کا مذاق اڑایا گیا تو میں نے انکار کرنے والوں کو ڈھیل دی، پھر میں نے ان کو پکڑ لیا۔ تو دیکھو کیسی تھی میری سزا۔ ۳۲ - ۳۱

حق کو نہ ماننے کا اصل سبب دلیل کی کمی نہیں بلکہ انسان کی یہ آزادی ہے کہ وہ چاہے تو مانے اور چاہے تو نہ مانے۔ جب تک انسان کو انکار کی آزادی حاصل ہے وہ کسی بھی چیز کا انکار کرنے کے لیے عذر تلاش کرسکتا ہے۔

اس کے سامنے الفاظ میں ایک دلیل لائی جائے تو وہ کچھ دوسرے الفاظ بول کر اسے رد کردے گا۔ کائنات کی نشانیوں کا حوالہ دیا جائے تو وہ اس کی تردید کے لیے خود ساختہ توجیہہ تلاش کرلے گا۔ حتیٰ کہ اگر پہاڑ چلائے جائیں اور زمین پھاڑ دی جائے اور مُردوں کو زندہ کردیا جائے تب بھی کوئی چیز آدمی کو یہ کہنے سے روک نہیں سکتی کہ یہ تو جادو ہے۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انکار کرنے والا بظاہر دلیل مانگتا ہے۔ مگر حقیقۃً وہ استہزاء کر رہا ہوتا ہے۔ وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ یہ شخص جو چیز پیش کر رہا ہے وہ حق نہیں۔ اگر وہ فی الواقع حق ہوتا تو ضرور اس کے پاس ایسی دلیل ہوتی کہ سارے لوگ اس کو ماننے پر مجبور ہوجاتے۔

خدا نے لوگوں کو مہلت دی ہے اس کی وجہ سے لوگ بے خوف ہوگئے ہیں۔ مگر جب مہلت ختم ہوگی اور خدا لوگوں کو پکڑے گا تو آدمی دیکھے گا کہ وہ کس قدر بے اختیار تھا، اگرچہ وہ فرضی طور پر اپنے کو خود مختار سمجھتا رہا۔

أَفَمَنْ هُوَ قَائِمٌ عَلَىٰ كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ ۗ وَجَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ ۖ قُلْ سَمُّوهُمْ ۚ أَمْ تُنَبِّئُونَهُ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْأَرْضِ أَمْ بِظَاهِرٍ مِنَ الْقَوْلِ ۗ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوا عَنِ السَّبِيلِ ۗ وَمَنْ يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ۝ لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَشَقُّ ۖ وَمَا لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَاقٍ ۝

پھر کیا جو ہر شخص سے اس کے عمل کا حساب کرنے والا ہے، اور لوگوں نے اللہ کے شریک بنا لئے ہیں۔ کہو کہ ان کا نام لو۔ کیا تم اللہ کو ایسی چیز کی خبر دے رہو جس کو وہ زمین میں نہیں جانتا۔ یا تم اوپر

ہی اوپر باتیں کر رہے ہو بلکہ انکار کرنے والوں کو ان کا فریب خوشنما بنا دیا گیا ہے۔ اور وہ راستہ سے روک دیے گئے ہیں۔ اور اللہ جس کو گمراہ کرے اس کو کوئی راہ بتانے والا نہیں۔ ان کے لیے دنیا کی زندگی میں بھی عذاب ہے اور آخرت کا عذاب تو بہت سخت ہے۔ کوئی ان کو اللہ سے بچانے والا نہیں۔ ۳۴-۳۳

مطالعہ بتاتا ہے کہ کائنات میں ریکارڈنگ کا نظام ہے۔ آدمی جو کچھ بولتا ہے یا جو کچھ کرتا ہے، وہ کائناتی انتظام کے تحت فوراً ریکارڈ ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کائنات کا خدا کسی ایسی ہستی ہی کو مانا جا سکتا ہے جس کے اندر "سننے" اور "دیکھنے" کی طاقت ہو۔ مگر انسانوں نے اب تک جتنے شرکاء فرض کیے ہیں، سب کے سب وہ ہیں جن کے اندر نہ سننے کی طاقت ہے اور نہ دیکھنے کی۔ ایسی حالت میں کیوں کر وہ موجودہ کائنات جیسی دنیا کے خالق و مالک ہو سکتے ہیں۔ جو خود نہ سنے وہ اپنی مخلوقات میں سننے کا مادہ کس طرح پیدا کرے گا۔ جو خود نہ دیکھے وہ دوسری چیزوں کو دیکھنے کے قابل کیسے بنائے گا۔

اسی طرح کائنات میں اتنی زیادہ وحدت ہے کہ وہ کسی طرح شرک کو قبول نہیں کرتی۔ جس شریک کا بھی نام لیا جائے، کائنات پورے وجود کے ساتھ اس کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے گی۔

منکرین کے لیے ان کا مکر خوش نما بنا دیا گیا ہے ——— یہاں مکر سے مراد ان کا "قول" ہے جس کا ذکر اسی آیت میں اوپر موجود ہے۔ جب بھی آدمی حق کا انکار کرتا ہے تو اس کا ذہن اپنے انکار کو جائز ثابت کرنے کے لیے کوئی قول گھڑ لیتا ہے۔ یہ قول اگرچہ بے حقیقت الفاظ کے مجموعہ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ مگر جو لوگ حق کے معاملہ میں زیادہ سنجیدہ نہ ہوں وہ کچھ نہ کچھ الفاظ بول کر سمجھ لیتے ہیں کہ انھوں نے اپنے انکار و اعراض کو حق بجانب ثابت کر دیا ہے۔ خواہ ان کے بولے ہوئے الفاظ ان کے اپنے ذہن کے باہر کوئی قیمت نہ رکھتے ہوں۔

اس قسم کے جھوٹے الفاظ کسی آدمی کو صرف موجودہ دنیا میں سہارا دے سکتے ہیں۔ آخرت میں جب ہر چیز کی حقیقت کھلے گی تو یہ خوشنما الفاظ اتنے بے وزن ہو جائیں گے کہ آدمی ان کو دہراتے ہوئے بھی شرم محسوس کرے گا۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ أُكُلُهَا دَآئِمٌ وَ ظِلُّهَا تِلْكَ عُقْبَى الَّذِينَ اتَّقَوْا وَّعُقْبَى الْكٰفِرِينَ النَّارُ ۝

اور جنت کی مثال جس کا متقیوں سے وعدہ کیا گیا ہے یہ ہے کہ اس کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ اس

کا پھل اور سایہ ہمیشہ رہے گا۔ یہ انجام ان لوگوں کا ہے جو خدا سے ڈرے اور منکروں کا انجام آگ ہے۔ ۳۵

جنت کی قیمت تقویٰ ہے۔ یعنی اللہ کی عظمت کا اتنا شدید احساس جو ڈر بن کر آدمی کے دل میں سما جائے۔ جو لوگ دنیا میں خدا سے ڈریں وہی وہ لوگ ہیں جو آخرت کے ان گھروں میں بسائے جائیں گے جہاں آدمی کے لئے کسی قسم کا ڈر نہ ہوگا۔ جس کے چاروں طرف سرسبز باغات ان کی عظمت و شان کو دوچند کر رہے ہوں گے۔

اس کے برعکس حال ان لوگوں کا ہے جو دنیا میں بے خوف بن کر رہے۔ وہ آخرت میں اپنے آپ کو آگ کی دنیا میں پائیں گے۔

وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ ۭ قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَآ اُشْرِكَ بِهٖ ۭ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَاٰبِ ۝ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ۭ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَهُمْ بَعْدَ مَا جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ ۝ ع

اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی تھی وہ اس چیز پر خوش ہیں جو تم پر اتاری گئی ہے۔ اور ان گروہوں میں ایسے بھی ہیں جو اس کے بعض حصہ کا انکار کرتے ہیں۔ کہو کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کی عبادت کروں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤں۔ میں اسی کی طرف بلاتا ہوں اور اسی کی طرف میرا لوٹنا ہے اور اسی طرح ہم نے اس کو ایک حکم کی حیثیت سے عربی میں اتارا ہے۔ اور اگر تم ان کی خواہشوں کی پیروی کرو بعد اس کے کہ تمہارے پاس علم آچکا ہے تو خدا کے مقابلہ میں تمہارا نہ کوئی مددگار ہوگا اور نہ کوئی بچانے والا۔ ۳۶-۳۷

قرآن آیا تو یہود و نصاریٰ میں دو گروہ ہو گئے۔ ان میں جو لوگ اللہ سے ڈرنے والے تھے اور حضرت موسیٰ اور حضرت مسیح کی سچی تعلیمات پر قائم تھے، انھوں نے قرآن کو اپنے دل کی آواز سمجھا اور خوش ہو کر اس کو قبول کر لیا۔ مگر جو لوگ عصبیت اور گروہ بندی کو دین سمجھے ہوئے تھے وہ اپنے مانوس دائرہ سے باہر آنے والی سچائی کو پہچان نہ سکے اور اس کے مخالف بن کر کھڑے ہو گئے اللہ سے ان کی بے خوفی نے دعوت حق کی مخالفت میں بھی ان کو بے خوف بنا دیا۔

جو شخص عصبیت اور گروہ بندی کی بنا پر سچائی کا مخالف بنتا ہے وہ در اصل خدا کو چھوڑ کر اپنی خواہشات پر چلتا ہے۔ ایسے لوگوں کی رعایت سے دعوت حق میں کوئی تبدیلی کرنا داعی کے لئے جائز نہیں۔ داعی کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے قول اور فعل سے بے لاگ حق پر پوری طرح جما رہے۔ ایسے لوگوں کے مقابلہ میں اس کو استقامت کا ثبوت دینا ہے نہ کہ مصالحت کا۔

آدمی کے سامنے اس کی قابل فہم زبان میں حق کا علم آجائے۔ اس کے باوجود وہ خواہشات کا پیرو بنا رہے تو یہ بے حد سنگین بات ہے۔ کیونکہ یہ ایسا فعل ہے جو آدمی کو خدا کی مدد سے یکسر محروم کر دیتا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ۭ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ﴿۳۸﴾ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَاۗءُ وَيُثْبِتُ ښ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ ﴿۳۹﴾

اور ہم نے تم سے پہلے کتنے رسول بھیجے اور ہم نے ان کو بیویاں اور اولاد عطا کیا اور کسی رسول کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ اللہ کی اذن کے بغیر کوئی نشانی لے آئے۔ ہر ایک وعدہ لکھا ہوا ہے۔ اللہ جس کو چاہے مٹاتا ہے اور جس کو چاہے باقی رکھتا ہے۔ اور اسی کے پاس ہے اصل کتاب۔ ۳۹ - ۳۸

خدا کی طرف سے جتنے پیغمبر آئے وہ سب عام انسانوں کی طرح ایک انسان تھے اور دنیوی تعلقات رکھتے تھے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ قوموں نے اس کے باوجود پچھلے پیغمبروں کو مانا اور اپنے معاصر پیغمبر کا اسی سبب سے انکار کر دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پچھلے پیغمبروں کے ساتھ مزید ایک چیز شامل تھی جو معاصر پیغمبر کو حاصل نہ تھی۔ یہ مزید چیز تاریخ کی عظمت ہے۔ قوموں نے تاریخی عظمت کی بنا پر پچھلے پیغمبروں کو مانا اور تاریخی عظمت سے خالی ہونے کی بنا پر معاصر پیغمبر کا انکار کر دیا۔

انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ حقیقت کو اس کے مجرد روپ میں دیکھ نہیں پاتا۔ زندہ پیغمبر کے ساتھ حقیقت مجرد روپ میں تھی۔ اس لئے انسان ان کو پہچان نہ سکا۔ تاریخ کے پیغمبر کے ساتھ اضافی اہمیتیں بھی شامل ہو چکی تھیں اس لئے اس نے ان کو پہچان لیا اور ان کا معتقد بن گیا۔

"ام الکتاب" سے مراد خدا کا وہ اصل نوشتہ ہے جو خدا کے پاس ہے اور جس میں ہدایت کی وہ تمام اصولی باتیں لکھی ہوئی ہیں جو خدا کو انسان سے مطلوب ہیں۔ مختلف پیغمبروں پر جو کتابیں اتریں وہ سب اسی ام الکتاب سے ماخوذ تھیں۔ خدا نے اپنی یہ کتاب کبھی ایک زبان میں اتاری اور کبھی دوسری زبان میں۔ کبھی اس کے لئے تمثیل کا پیرایہ اختیار کیا گیا اور کبھی اس کو براہ راست پیرایہ میں بیان کیا

گیا۔ کبھی نازل ہونے کے بعد اس کی حفاظت کی ذمہ داری انسانوں پر ڈالی گئی اور کبھی اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود خدا نے لے لی۔

وَإِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ۞ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا ۚ وَاللَّهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهِ ۚ وَهُوَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۞ وَقَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلَّهِ الْمَكْرُ جَمِيعًا ۖ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ۗ وَسَيَعْلَمُ الْكُفَّارُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ ۞

اور جس کا ہم ان سے وعدہ کر رہے ہیں اس کا کچھ حصہ ہم تم کو دکھا دیں یا ہم تم کو وفات دے دیں، پس تمہارے اوپر صرف پہنچا دینا ہے اور ہمارے اوپر ہے حساب لینا۔ کیا وہ دیکھتے نہیں کہ ہم زمین کی طرف اس کو اس کے اطراف سے کم کرتے چلے آرہے ہیں۔ اور اللہ فیصلہ کرتا ہے، کوئی اس کے فیصلہ کو ہٹانے والا نہیں اور وہ جلد حساب لینے والا ہے۔ جو ان سے پہلے تھے انھوں نے بھی تدبیریں کیں مگر تمام تدبیریں اللہ کے اختیار میں ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ ہر ایک کیا کر رہا ہے اور منکرین جلد جان لیں گے کہ آخرت کا گھر کس کے لئے ہے۔ ۴۲-۴۰

خدا کے دین کو اختیار نہ کرنے کا انجام عام طور پر آخرت میں سامنے آتا ہے۔ مگر پیغمبر کے مخاطبین اگر پیغمبر کی دعوت کا انکار کر دیں تو اس کا برا انجام ان کے لئے موجودہ دنیا ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔

تاہم اس دنیوی انجام کا کوئی ایک اصول نہیں۔ یہ مختلف پیغمبروں کے زمانہ میں مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا رہا ہے۔ پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص مصالح کی بنا پر خدا کا یہ فیصلہ اس شکل میں ظاہر ہوا کہ پیغمبر کے متبعین کو پیغمبر کے منکرین پر غالب کر دیا گیا۔

مکی دور کے آخری زمانہ میں جب کہ مکہ کے سرداروں نے آپ کا انکار کر دیا تھا، عین اسی وقت یہ ہو رہا تھا کہ اسلام کی دعوت دھیرے دھیرے مدینہ میں اور مکہ کے بیرونی قبائل میں پھیل رہی تھی۔ گویا اسلام کی دعوتی قوت مکہ کے اطراف کو فتح کرتی ہوئی مکہ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ پیغمبر آخر الزماں کے لئے خدا کی سنت دعوتی فتوحات کی صورت میں ظاہر ہوئی۔

یہاں دعوتی تدبیر کو خدائی تدبیر کہا گیا ہے۔ اس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ قریش نے جب مکہ سے آپ کو نکالا تو انھوں نے یہ سمجھا تھا کہ انھوں نے آپ کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اس وقت آپ ایک

ایسے شخص تھے جس کی معاشیات برباد ہو چکی تھیں۔ جس کو خود اپنے قبیلہ کی حمایت سے محروم کر دیا گیا تھا۔

قریش یہ سب کر کے اپنے طور پر خوش تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ انھوں نے پیغمبر کے "مسئلہ" کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا ہے۔ مگر وہ اس راز کو سمجھ نہ سکے کہ داعی کا سب سے بڑا ہتھیار دعوت ہے اور یہ وہ چیز ہے جس کو کوئی شخص کبھی داعی سے چھین نہیں سکتا۔ داعی کی دوسری محرومیاں اس کے داعیانہ زور کو اور بڑھا دیتی ہیں، وہ کسی طرح اس کو کم نہیں کرتیں۔ چنانچہ عین اس وقت جبکہ قریش اپنے خیال کے مطابق پیغمبر سے اس کا سب کچھ چھین چکے تھے، اس کی دعوت چاروں طرف عرب کے قبائل میں پھیل رہی تھی۔ لوگوں کے دل اس سے مسخر ہوتے جا رہے تھے۔ یہ عمل خاموشی کے ساتھ مسلسل جاری تھا۔ اور فتح مکہ گویا اسی کا انتہائی نقطہ تھا ——— مکہ والوں نے جن لوگوں کو "دس سو" سمجھ کر گھر سے بے گھر کیا تھا وہ صرف چند سال میں "دس ہزار" بن کر دوبارہ مکہ میں اس طرح واپس آئے کہ مکہ والوں کو یہ ہمت بھی نہ تھی کہ ان کو مکہ میں داخل ہونے سے روکنے کی کوشش کریں۔

حق کی دعوت سے جن لوگوں کے مفادات پر زد پڑتی ہے وہ اس کو زیر کرنے کے لئے اس کے خلاف تدبیریں کرتے ہیں۔ مگر تمام تدبیروں کا سرا خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہ ہر ایک کے اوپر پورا اختیار رکھتا ہے۔ خدا کی اس برتر حیثیت کا ابتدائی ظہور اسی موجودہ دنیا میں ہو رہا ہے۔ اس کا کامل اور انتہائی ظہور آخرت میں ہوگا جب کہ اندھے بھی اس کو دیکھ لیں اور بہرے بھی اس کو سننے لگیں۔

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَسْتَ مُرْسَلًا ۚ قُلْ كَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ ﴿٤٣﴾

ع ۱۲

اور منکرین کہتے ہیں کہ تم خدا کے بھیجے ہوئے نہیں ہو، کہو کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ کی گواہی کافی ہے۔ اور اس کی گواہی جس کے پاس کتاب کا علم ہے۔ ۴۳

ظاہر پرست لوگ جس وقت حق کے داعی میں نشانیاں نہ پاکر اس کی صداقت کے بارہ میں شبہہ کر رہے ہوتے ہیں، عین اسی وقت معنوی نشانیاں پوری طرح اس کی تصدیق کے لئے موجود ہوتی ہیں۔ سچائی اپنی دلیل آپ ہے۔ مگر اس کو محسوس کرنا صرف اس شخص کے لئے ممکن ہے جو ظواہر سے گزر کر حقائق کو دیکھنے کی نگاہ اپنے اندر پیدا کر چکا ہو۔ ورنہ جن لوگوں کی نگاہیں ظواہر میں اٹکی ہوئی ہوں وہ حق کو بے دلیل سمجھ کر اس کا انکار کر دیں گے۔ حالانکہ عین اسی وقت دلائل کا انبار اس کی تصدیق کے لئے ان کے قریب موجود ہوگا۔

سُوْرَةُ اِبْرٰهِيْمَ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ اِثْنَتَانِ وَخَمْسُوْنَ اٰيَةً وَسَبْعُ رُكُوْعَاتٍ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۙ﴿۱﴾ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدِ ۙ﴿۲﴾ الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۳﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

الف۔ل۔ر۔ یہ کتاب ہے جس کو ہم نے تمہاری طرف نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کو اندھیروں سے نکال کر اجالے کی طرف لاؤ، ان کے رب کے حکم سے خدائے عزیز وحمید کے راستے کی طرف، اس اللہ کی طرف کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے اور منکروں کے لئے ایک عذاب شدید کی تباہی ہے جو کہ آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی کو پسند کرتے ہیں اور اللہ کے راستے سے روکتے ہیں اور اس میں کجی نکالنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ راستہ سے بھٹک کر دور جا پڑے ہیں۔ ۳-۱

ایمان یہ ہے کہ آدمی خدا کو ایک ایسی ہستی کی حیثیت سے پالے جو ساری طاقتوں کا مالک ہے اور ساری خوبیوں والا بھی ہے۔ ایسا واقعہ کسی آدمی کے لئے محض ایک رسمی عقیدہ نہیں ہوتا۔ یہ کسی آدمی کا بے علمی کی تاریکی سے نکل کر علم کی روشنی میں آنا ہے۔ یہ غیب کے پردہ سے گذر کر شہود کے جلوے کو دیکھ لینا ہے۔ یہ دنیا میں رہتے ہوئے آخرت کا ادراک کر لینا ہے۔ ایمان اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک شعوری یافت ہے نہ کہ کسی مجموعۂ الفاظ کی بے روح تکرار ــــــ خدا کی کتاب اس لئے آتی ہے کہ آدمی کو اس شعوری درجہ پر پہنچائے۔

اللہ کے اذن سے ہدایت ملنا، بظاہر ہدایت کے معاملہ کو اللہ کی طرف منسوب کرنا ہے۔ مگر اس ارشاد کا رخ حقیقۃً خود انسان کی طرف ہے۔ "اذن" سے مراد خدا کا وہ مقررہ قانون ہے جو اس نے انسان کی ہدایت وضلالت کے لئے مقرر کیا ہے۔ اس قانون کے مطابق آدمی کی اپنی سنجیدہ طلب واحد شرط ہے جو اس کو ہدایت تک پہنچاتی ہے۔ اس دنیا میں جس شخص کو ہدایت ملتی ہے وہ محض کسی داعی کی داعیانہ کوششوں سے نہیں ملتی بلکہ خدا کے قانون کے تحت ملتی ہے۔ اور خدا کا قانون یہ ہے کہ ہدایت کی نعمت کو صرف وہ شخص پائے گا جو خود ہدایت کا طالب ہو۔ ذاتی طلب کے بغیر کسی کو ہدایت نہیں

مل سکتی۔

ہدایت کے راستہ کو خدا نے انتہائی حد تک صاف اور روشن بنایا ہے۔ زمین و آسمان میں اس کی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ خدا کی کتاب اس کے حق میں ناقابل انکار دلائل فراہم کرتی ہے۔ انسانی فطرت اس کی صداقت کی گواہی دے رہی ہے۔ گویا تمام بہترین قرائن اس کے حق میں جمع ہیں۔ ایسی حالت میں جو لوگ ہدایت کے راستہ کو اختیار نہ کریں وہ یقینی طور پر دنیوی مفاد کی بنا پر ایسا کر رہے ہیں نہ کہ کسی واقعی سبب کی بنا پر۔ اگرچہ ایسے لوگ اپنی روش کو درست ثابت کرنے کے لئے کچھ "دلائل" بھی پیش کرتے ہیں مگر یہ دلائل صرف سیدھی بات میں ٹیڑھ نکالنے کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ وہ صرف اس لئے ہوتے ہیں کہ لوگوں کی نظر میں اپنے نہ ماننے کا جواز فراہم کریں۔

ایسی حالت میں ہدایت سے محروم صرف وہی شخص رہ سکتا ہے جس کی مفاد پرستی اور دنیوی رغبت نے اس کو بالکل اندھا بہرا بنا دیا ہو۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ۭ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ④

اور ہم نے جو پیغمبر بھی بھیجا اس کی قوم کی زبان میں بھیجا تاکہ وہ ان سے بیان کر دے پھر اللہ جس کو چاہتا ہے بھٹکا دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ وہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔ ۴

خدا کا طریقہ یہ ہے کہ وہ پیغمبروں کو خود مدعو قوم کے اندر سے اٹھاتا ہے۔ تاکہ وہ لوگوں کی نفسیات کی رعایت کرتے ہوئے، ان کی اپنی قابل فہم زبان میں انھیں حق کی طرف بلائے۔ مگر عجیب بات ہے کہ جو چیز انسان کی بہتری کے لئے کی گئی تھی اس سے اس نے الٹا نتیجہ نکال لیا۔ اس نے جب دیکھا کہ پیغمبر انھیں کی طرح کا ایک آدمی ہے اور ان کی اپنی مانوس زبان میں کلام کر رہا ہے تو انھوں نے پیغمبر کو معمولی سمجھ کر اس کا انکار کر دیا۔ جو چیز ان کی ہدایت کو آسان بنانے کے لئے کی گئی تھی اس کو انھوں نے اپنی گمراہی کا ذریعہ بنا دیا۔

خدا ایسا نہیں کرتا کہ وہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے شعبدے دکھائے۔ وہ کسی قوم کے پاس ایسا پیغمبر بھیجے جو انوکھی زبان یا طلسماتی اسلوب میں کلام کر کے لوگوں کو اچنبھے میں ڈال دے۔ خدا لوگوں کی عجائب پسندی کی خاطر کرشمے دکھانے کے انداز اختیار نہیں کرتا۔ خدا کا طریقہ سادگی اور حقیقت پسندی کا طریقہ ہے۔ خدا نے اپنی دنیا کو حقائق کی بنیاد پر قائم کیا ہے۔ اور انسان کی ہدایت کی اسکیم کو بھی وہ حقائق کی بنیاد پر چلاتا ہے نہ کہ طلسمات کی بنیاد پر۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۞

اور ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیجا کہ اپنی قوم کو اندھیروں سے نکال کر اجالے میں لاؤ اور ان کو اللہ کے دنوں کی یاد دلاؤ۔ بے شک ان کے اندر بڑی نشانیاں ہیں ہر اس شخص کے لیے جو صبر اور شکر کرنے والا ہو۔ ۵

"آیات اللہ" سے مراد کائنات کی وہ نشانیاں ہیں جو خدا کی بات کو برحق ثابت کرتی ہیں۔ "ایام اللہ" سے مراد تاریخ کے وہ یادگار واقعات ہیں جب کہ خدا کا فیصلہ ظاہر ہوا اور خدا کی خصوصی مدد سے حق نے باطل کے اوپر فتح پائی۔ ایک اگر کائناتی دلیل ہے تو دوسری تاریخی دلیل۔

مگر عجیب بات ہے کہ یہی دونوں چیزیں ہماری دنیا میں سب سے زیادہ غیر موجود نظر آتی ہیں۔ آیات اللہ کو غلط تشریح وتعبیر کے پردہ میں چھپا دیا گیا ہے اور ایام اللہ کا یہ حال ہے کہ تاریخ نگاری کا کام جن لوگوں کے ہاتھ میں تھا انھوں نے ایام الانسان تو خوب قلم بند کیے مگر ایام اللہ ان کی کتابوں میں غیر مذکور رہ گئے۔

ایسی حالت میں کسی بندۂ خدا کے لیے باطل کے اندھیرے سے نکلنے کی صورت صرف یہ ہے کہ وہ صبر اور شکر کا ثبوت دے۔

حق کے اعتراف کی واحد قیمت اپنی بے اعترافی ہے۔ حق کو پانے کے لیے اپنے آپ کو کھونا پڑتا ہے۔ اور یہ چیز صبر کے بغیر کسی کو حاصل نہیں ہوتی۔ پھر حق کا ادراک آدمی کو یہ بتاتا ہے کہ اس کائنات میں جو تقسیم ہے وہ منعم اور منعم علیہ کی ہے۔ خدا دینے والا ہے اور انسان پانے والا۔ اس حقیقت واقعہ کی دریافت کے بعد آدمی کے اندر جو صحیح جذبہ پیدا ہونا چاہیے اسی کا نام شکر ہے۔ گویا حقیقت تک پہنچنے کے لیے آدمی کو صبر کا ثبوت دینا پڑتا ہے اور حقیقت کو اپنے اندر اتارنے کے لیے شکر کا۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۞ وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۞ وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنْ تَكْفُرُوْٓا

اَنۡتُمۡ وَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰہَ لَغَنِیٌّ حَمِیۡدٌ ﴿۸﴾

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اپنے اوپر اللہ کے اس انعام کو یاد کرو جب کہ اس نے تم کو فرعون کی قوم سے چھڑایا جو تم کو سخت تکلیفیں پہنچاتے تھے اور وہ تمھارے لڑکوں کو مار ڈالتے تھے اور تمھاری عورتوں کو زندہ رکھتے تھے اور اس میں تمھارے رب کی طرف سے بڑا امتحان تھا۔ اور جب تمھارے رب نے تم کو آگاہ کر دیا کہ اگر تم شکر کرو گے تو میں تم کو زیادہ دوں گا۔ اور اگر تم ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بڑا سخت ہے۔ اور موسیٰ نے کہا کہ اگر تم انکار کرو اور زمین کے سارے لوگ بھی منکر ہو جائیں تو اللہ بے پروا ہے، خوبیوں والا ہے۔ ۸-۶

ان آیات میں حضرت موسیٰ کی جس تقریر کا حوالہ ہے وہ غالباً آپ کی وہ تقریر ہے جو آپ نے اپنی وفات سے کچھ دنوں پہلے صحرا سینا میں بنی اسرائیل کے سامنے فرمائی تھی۔ یہ تقریر موجودہ بائبل (کتاب استثناء) میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔

حضرت موسیٰ کی اس مفصل تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر تم دنیا میں خدا والے بن کر رہو اور خدا کی باتوں کا چرچا کرو تو دنیا کی تمام چیزیں تمھارا ساتھ دیں گی۔ سب قوموں کے درمیان تمھارا رعب قائم ہوگا۔ خدا تمھارے دشمنوں کو زیر کرے گا۔ حتیٰ کہ اگر کبھی دریا تمھارے راستہ میں حائل ہو تو خدا حکم دے گا اور دریا پھٹ کر تمھیں راستہ دے دے گا، جب کہ اسی دریا میں تمھارے دشمن غرق ہو جائیں گے۔

اس کے برعکس اگر تم ایسا نہ کرو تو تم خدا کی نظر میں لعنتی ٹھہرو گے، یعنی تم خدا کی رحمتوں سے دور ہو جاؤ گے۔ تمھاری محنت کی پیداوار دوسرے لوگ کھائیں گے۔ تمھارے ہر کام بگڑتے چلے جائیں گے تم فکری اور عملی اعتبار سے دوسری قوموں کے زیر دست ہو جاؤ گے۔

خدا کا یہ قانون معروف معنوں میں "یہود" کے لئے نہیں ہے بلکہ حامل کتاب قوم کے لئے ہے۔ جو قوم بھی حامل کتاب ہو، اس کے ساتھ خدا کا یہی معاملہ ہے، خواہ وہ ماضی کے حاملین کتاب ہوں یا حال کے حاملین کتاب۔

اَلَمۡ یَاۡتِکُمۡ نَبَؤُا الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ قَوۡمِ نُوۡحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوۡدَ ۬ۛ وَ الَّذِیۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ ۛ؃ لَا یَعۡلَمُہُمۡ اِلَّا اللّٰہُ ؕ جَآءَتۡہُمۡ رُسُلُہُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ فَرَدُّوۡۤا اَیۡدِیَہُمۡ فِیۡۤ اَفۡوَاہِہِمۡ وَ قَالُوۡۤا اِنَّا کَفَرۡنَا بِمَاۤ اُرۡسِلۡتُمۡ بِہٖ وَ اِنَّا لَفِیۡ شَکٍّ مِّمَّا تَدۡعُوۡنَنَاۤ

إِلَيْهِ مُرِيبٍ ⑨

کیا تم کو ان لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں ـــــ قوم نوح اور عاد اور ثمود اور جو لوگ ان کے بعد ہوئے ہیں، جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ان کے پیغمبر ان کے پاس دلائل لے کر آئے تو انھوں نے اپنے ہاتھ ان کے منہ میں دے دئے اور کہا کہ جو تم کو دے کر بھیجا گیا ہے، ہم اس کو نہیں مانتے اور جس چیز کی طرف تم ہم کو بلاتے ہو، ہم اس کے بارے میں سخت الجھن والے شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ 9

خدا کے جتنے رسول مختلف قوموں میں آئے سب کے ساتھ ایک ہی قصہ پیش آیا۔ ہر قوم نے اپنے پیغمبروں کی مخالفت کی۔ ہر جگہ ان کا منہ بند کرنے کی کوشش کی گئی۔

اس کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ ان کا "شک" تھا۔ یہ شک اس لئے تھا کہ ان کے سامنے ایک طرف ان کا آبائی دین تھا جس کی پشت پر اکابر اور اعاظم کے نام تھے۔ دوسری طرف پیغمبر کا دین تھا جو بظاہر ایک معمولی انسان کے ذریعہ پیش کیا جا رہا تھا۔ دلائل کا زور پیغمبر کے دین کے ساتھ نظر آتا تھا مگر تاریخی عظمت اور عوامی بھیڑ آبائی دین کے ساتھ دکھائی دیتی تھی۔ پیغمبر کے مخاطبین کا یہ حال ہوا کہ وہ دلائل کو رد کرنے کی قوت اپنے اندر نہ پاتے تھے۔ اور یہ بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اعاظم اور اکابر کو کس طرح غلط سمجھ لیں۔ اس دوطرفہ صورت حال نے انھیں شک میں مبتلا کر دیا۔ عملاً اگرچہ وہ آبائی دین کے ساتھ وابستہ رہے مگر اپنے قلب و دماغ کو شک سے آزاد بھی نہ کر سکے۔

قَالَتْ رُسُلُهُمْ أَفِي اللَّهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ يَدْعُوكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِنْ ذُنُوبِكُمْ وَيُؤَخِّرَكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى ۚ قَالُوا إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا تُرِيدُونَ أَنْ تَصُدُّونَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا فَأْتُونَا بِسُلْطَانٍ مُبِينٍ ⑩

ان کے پیغمبروں نے کہا، کیا خدا کے بارہ میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کو وجود میں لانے والا ہے۔ وہ تم کو بلا رہا ہے کہ تمھارے گناہ معاف کر دے اور تم کو ایک مقرر مدت تک مہلت دے۔ انھوں نے کہا کہ تم اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہمارے جیسے ایک آدمی ہو۔ تم چاہتے ہو کہ ہم کو ان چیزوں کی عبادت سے روک دو جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے تھے۔ تم ہمارے سامنے کوئی کھلی سند لے آؤ۔ 10

اس آیت کا تعلق اصلاً قدیم قوموں سے ہے۔ مگر قرآن کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں خدا کی ابدی تعلیمات کو تاریخ کے سانچہ میں ڈھال کر پیش کیا گیا ہے۔ اس لئے قرآن میں ایسے الفاظ استعمال کئے

جاتے ہیں جن میں مخاطب اول کی رعایت کے ساتھ بعد کے انسانوں کی رعایت بھی پوری طرح شامل ہو۔
اس آیت میں "فاطر" کا لفظ اسی کی ایک مثال ہے۔ فاطر کے لفظی معنی ہیں "پھاڑنے والا"۔ عمومی مفہوم کے لحاظ سے فاطر کا لفظ یہاں خالق کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مگر اس کا خالص لفظی ترجمہ کیا جائے تو وہ ہوگا "کیا تم کو خدا کے بارہ میں شک ہے جو زمین و آسمان کا پھاڑنے والا ہے"۔

لفظی ترجمہ کے اعتبار سے یہ آیت موجودہ زمانہ میں منکرین خدا کے لئے خدا کے وجود کو ثابت کر رہی ہے۔ جدید تحقیقات بتاتی ہیں کہ زمین و آسمان کا مادہ ابتداءً ایک سالم گولے کی صورت میں تھا۔ جس کو سپر ایٹم کہا جاتا ہے۔ معلوم قوانین فطرت کے مطابق اس کے تمام اجزاء انتہائی شدت کے ساتھ اندر کی طرف جڑے ہوئے تھے۔ موجودہ وسیع کائنات اسی سپر ایٹم میں انفجار سے وجود میں آئی۔ اس آیت میں فاطر (پھاڑنے والا) کا لفظ اسی کائناتی واقعہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو ایک خالق کے وجود کا قطعی ثبوت ہے۔ کیونکہ سپر ایٹم کے اجزاء جو مکمل طور پر اندر کی طرف کھنچے ہوئے تھے۔ ان کو بیرونی سمت میں متحرک کرنا اپنے آپ نہیں ہو سکتا۔ لازم ہے کہ اس کے لئے کسی خارجی مداخلت کو مانا جائے۔ اسی مداخلت کرنے والی طاقت کا دوسرا نام خدا ہے۔

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ إِنْ نَحْنُ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَمُنُّ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۖ وَمَا كَانَ لَنَا أَنْ نَأْتِيَكُمْ بِسُلْطَانٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿۱۱﴾ وَمَا لَنَا أَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللَّهِ وَقَدْ هَدَانَا سُبُلَنَا ۚ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلَىٰ مَا آذَيْتُمُونَا ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ ﴿۱۲﴾ ع ۱۴

ان کے رسولوں نے ان سے کہا، ہم اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمہارے ہی جیسے انسان ہیں مگر اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اپنا انعام فرماتا ہے اور یہ ہمارے اختیار میں نہیں کہ ہم تم کو کوئی معجزہ دکھائیں بغیر خدا کے حکم کے۔ اور ایمان والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ اور ہم کیوں نہ اللہ پر بھروسہ کریں جب کہ اس نے ہم کو ہمارے راستے بتائے۔ اور جو تکلیف تم ہمیں دوگے ہم اس پر صبر کریں گے۔ اور بھروسہ کرنے والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے — ۱۲-۱۱

پیغمبروں کے مخاطبین نے جب اپنے ہم عصر پیغمبروں کو یہ کہہ کر رد کیا کہ "تم تو ہمارے جیسے ایک بشر ہو" تو اس کی وجہ حقیقۃً یہ نہیں تھی کہ وہ پیغمبری کے لئے غیر بشر ہونے کو ضروری سمجھتے تھے۔

اس کی وجہ دراصل وہ فرق تھا جو ان کے اپنے تصور کے مطابق ان کو پچھلے پیغمبر اور ہمعصر پیغمبر میں نظر آتا تھا۔

گذرا ہوا پیغمبر بھی اگرچہ اپنے وقت میں ویسا ہی تھا جیسا کہ ہمعصر پیغمبر۔ مگر بعد کے دور میں گزرے ہوئے پیغمبروں کے متبعین نے ان کے گرد طلماتی قصوں کا ہالہ بنا دیا۔ بعد کے دور میں پیغمبروں کی شخصیتوں کو ایسا افسانوی رنگ دے دیا گیا جو ابتداءً ان کے یہاں موجود نہ تھا۔ اب قوموں کے سامنے ایک طرف فرضی شعبدوں والا پیغمبر تھا، دوسری طرف حقیقی واقعات والا پیغمبر۔ اس تقابل میں پچھلا پیغمبر پیغمبری کے لئے معیاری نمونہ بن گیا۔ اور جب قوموں نے اس معیار کے اعتبار سے دیکھا تو وقت کا حقیقی پیغمبر ان کو ماضی کے افسانوی پیغمبر سے کم نظر آیا۔ چنانچہ انھوں نے اس کو حقیر سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

پیغمبروں نے اپنے مخاطبین سے کہا کہ تمھاری ان باتوں کے جواب میں ہمارے پاس صبر کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ تم غیر بشریت کی سطح پر ہدایت کے طالب ہو۔ اور خدا نے ہم کو صرف بشریت کی سطح پر ہدایت دینے کی طاقت عطا کی ہے۔ ایسی حالت میں ہم اس کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں کہ تمھاری ایذاؤں کو برداشت کریں اور اس سارے معاملہ کو خدا کے حوالے کر دیں۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِنْ أَرْضِنَا أَوْ لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا ۖ فَأَوْحَىٰ إِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظَّالِمِينَ ﴿١٣﴾ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِهِمْ ۚ ذَٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِي وَخَافَ وَعِيدِ ﴿١٤﴾

اور انکار کرنے والوں نے اپنے پیغمبروں سے کہا کہ یا تو ہم تم کو اپنی زمین سے نکال دیں گے یا تم کو ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا۔ تو پیغمبروں کے رب نے ان پر وحی بھیجی کہ ہم ان ظالموں کو ہلاک کر دیں گے۔ اور ان کے بعد تم کو زمین پر بسائیں گے۔ یہ اس شخص کے لئے ہے جو میرے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرے اور جو میری وعید سے ڈرے۔ ۱۴-۱۳

پیغمبروں کی دعوت سے ان کی قوموں کے دین پر زد پڑتی تھی۔ وہ لوگ اپنے جن افراد کو قوم کے اکابر کا درجہ دئے ہوئے تھے، پیغمبروں کے تجزیہ میں وہ اصاغر قرار پا رہے تھے۔ اس بنا پر وہ پیغمبروں سے بگڑ گئے۔ وہ دلائل سے تو ان کو رد نہیں کر سکتے تھے۔ البتہ وقت کے نظام میں ان کو ہر قسم کا اختیار حاصل تھا۔ چنانچہ ان کی متکبرانہ نفسیات نے انھیں سمجھایا کہ پیغمبر کو بے گھر اور بے زمین کر دیا جائے۔ جس چیز کا توڑ ان کے پاس دلیل کی زبان میں نہ تھا، اس کا توڑ انھوں نے طاقت

کے ذریعہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

جو زمین آدمی کے پاس ہے، وہ اس کے پاس بطور امتحان ہے نہ کہ بطور حق۔ اگر آدمی یہ سمجھے کہ یہ خدا کی چیز ہے جس کو اس نے امتحان کی غرض سے اس کی تحویل میں دیا ہے تو اس سے آدمی کے اندر تواضع کی نفسیات پیدا ہوگی۔ وہ ڈرے گا کہ جس خدا نے دیا ہے وہ اس کو دوبارہ اس سے چھین نہ لے۔ مگر غافل لوگ اس کو اپنا ذاتی حق سمجھ لیتے ہیں۔ ان کا یہی احساس ان کو ظالم اور متکبر بنا دیتا ہے۔

پیغمبر کی دعوت جب تکمیل کے مرحلہ پر پہنچتی ہے تو یہ مخاطب قوم کے لئے مہلت امتحان ختم ہونے کے ہم معنی ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ لوگ دنیا کو اپنے لئے بالکل بدلا ہوا پاتے ہیں۔ جن چیزوں کو وہ اپنی چیز سمجھ کر متکبرانہ منصوبے بنا رہے تھے وہ چیزیں اچانک ان کا ساتھ چھوڑ دیتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ وقت آتا ہے جب کہ زمین ان سے چھین کر دوسرے لوگوں کو دے دی جائے جو ان کے مقابلہ میں ان کا زیادہ استحقاق رکھتے ہوں۔

وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۱۵﴾ مِّنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ ﴿۱۶﴾ يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ۭ وَمِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ ﴿۱۷﴾

اور انھوں نے فیصلہ چاہا اور ہر سرکش، ضدی نامراد ہوا۔ اس کے آگے دوزخ ہے اور اس کو پیپ کا پانی پینے کو ملے گا وہ اس کو گھونٹ گھونٹ پئے گا اور اس کو حلق سے مشکل سے اتار سکے گا۔ موت ہر طرف سے اس پر چھائی ہوئی ہوگی۔ مگر وہ کسی طرح نہیں مرے گا اور اس کے آگے سخت عذاب ہوگا۔ ۱۵ — ۱۷

خدا کے نزدیک کسی آدمی کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ اس کو خدا کی طرف بلایا جائے اور وہ جبّار اور عنید بن کر اس کا جواب دے۔ ایسے لوگوں کے لئے دنیا میں ذلت ہے اور آخرت میں ایسا شدید عذاب کہ وہ ہر وقت اپنے آپ کو موت اور ہلاکت کے کنارے پائیں گے۔

جب آدمی کسی کے خلاف ظلم اور سرکشی کا رویہ اختیار کرتا ہے تو وہ کسی برتے پر ایسا کرتا ہے۔ یہ مخالفین اپنے آپ کو "اکابر" کے دین پر سمجھتے تھے۔ اس کے مقابلہ میں پیغمبر اور اس کے ساتھی ان کو "اصاغر" دکھائی دیتے تھے۔ ان کی یہی نفسیات تھی جس نے انھیں آمادہ کیا کہ وہ پیغمبر اور اس کے ساتھیوں کے اوپر ہر قسم کے ظلم کو اپنے لئے جائز سمجھ لیں۔ اپنے کو "اکابر" سے منسوب کرنے ہی کی وجہ

سے وہ "اصاغر" کے خلاف ہر قسم کی کارروائیوں کے لیے دلیر ہو گئے۔

مَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ أَعْمَالُهُمْ كَرَمَادٍ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيحُ فِي يَوْمٍ عَاصِفٍ ۖ لَا يَقْدِرُونَ مِمَّا كَسَبُوا عَلَىٰ شَيْءٍ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الضَّلَالُ الْبَعِيدُ ﴿١٨﴾ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ إِن يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيدٍ ﴿١٩﴾ وَمَا ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ ﴿٢٠﴾

جن لوگوں نے اپنے رب کا انکار کیا ان کے اعمال اس راکھ کی طرح ہیں جس کو ایک طوفانی دن کی آندھی نے اڑا دیا ہو۔ وہ اپنے کئے میں سے کچھ بھی نہ پا سکیں گے۔ یہی دور کی گمراہی ہے۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو بالکل ٹھیک ٹھیک پیدا کیا ہے۔ اگر وہ چاہے تو تم لوگوں کو لے جائے اور ایک نئی مخلوق لے آئے۔ اور یہ خدا پر کچھ دشوار بھی نہیں۔ ۱۸-۲۰

عرب کے جن لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا وہ سب خدا اور مذہب کو ماننے والے لوگ تھے۔ پھر کیوں وہ آپ کے منکر بن گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کی سطح پر حق اپنی مجرد صورت میں ظاہر ہوا تھا۔ جب کہ وہ لوگ صرف اس چیز کو حق سمجھتے تھے جو ان کے قومی بزرگوں کے ذریعہ انھیں ملا ہو۔ انھوں نے اپنے مسلّم قومی بزرگوں کے دین کو پہچانا، مگر وہ "محمد بن عبد اللہ" کے دین کو پہچاننے میں ناکام رہے۔

جو لوگ قومی روایات کے زیر اثر دین کو پائیں ان کے یہاں بھی دینی مظاہر موجود ہوتے ہیں۔ بلکہ اکثر ان کے یہاں دین کی دھوم پائی جاتی ہے۔ تاہم یہ سب کچھ محض ظاہری دینداری ہوتی ہے، دین کی اصل حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مگر خدا کو جو چیز مطلوب ہے وہ حقیقی دینداری ہے نہ کہ ظاہری ہنگامے۔

خدا کو وہ انسان مطلوب ہے جس نے ذاتی شعور کی سطح پر حق کو پایا ہو۔ جس نے عالم غیب میں خدا کا مشاہدہ کیا ہو۔ جس نے حق کو اس کی مجرد صورت میں پہچانا ہو اور اس کا ساتھ دیا ہو۔ جس کی روح خدا کے سمندر میں نہائی ہو۔ جو خدا کی محبت میں تڑپا ہو اور خدا کے خوف سے جس کی آنکھوں نے آنسو بہائے ہوں۔

پہلی قسم کے لوگوں کی دینداری اوپری دینداری ہے۔ قیامت کی آندھی اس کو اسی طرح اڑا لے جائے گی جس طرح سطح زمین کی خس و خاشاک تیز ہوا میں اڑ جاتی ہے۔ اس کے برعکس دوسری قسم کے لوگوں کا دین حقیقی دین ہے۔ وہ انسانی وجود کی آخری گہرائی تک پیوست ہوتا ہے۔ ایسے وجود کے لئے

آندھی صرف اس لئے آتی ہے کہ وہ اس کی مضبوطی کو ثابت کرے نہ کہ اس کو اکھاڑ لے جائے۔

کائنات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس کی تخلیق حقائق پر ہوئی ہے۔ ایسی کائنات میں صرف حقیقی عمل کی قیمت ہوسکتی ہے نہ کہ مفروضوں اور خوش گمانیوں کی۔

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِیْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَیْنٰكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَیْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِیْصٍ ﴿۲۱﴾ ع ۱۵

اور خدا کے سامنے سب پیش ہوں گے۔ پھر کمزور لوگ ان لوگوں سے کہیں گے جو بڑائی والے تھے، ہم تمہارے تابع تھے تو کیا تم اللہ کے عذاب سے کچھ ہم کو بچاؤ گے۔ وہ کہیں گے کہ اگر اللہ ہم کو کوئی راہ دکھاتا تو ہم تم کو بھی ضرور وہ راہ دکھا دیتے۔ اب ہمارے لئے یکساں ہے کہ ہم بے قرار ہوں یا صبر کریں، ہمارے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ ۲۱

انسان، بطور واقعہ اگرچہ ہر وقت "خدا کے سامنے" ہے۔ مگر موجودہ دنیا میں آدمی اپنے آپ کو بظاہر خدا کے سامنے نہیں پاتا۔ آخرت میں یہ پردہ ہٹ جائے گا۔ اس وقت آدمی دیکھے گا کہ وہ اس طرح کامل طور پر خدا کے سامنے تھا کہ اس کی کوئی چیز خدا سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔

دنیا میں جو لوگ حق کو نظر انداز کرتے ہیں ان کا سب سے بڑا سہارا ان کے مفروضہ اکابر ہوتے ہیں۔ خواہ وہ مُردہ اکابر ہوں یا زندہ اکابر۔ چھوٹے جو کچھ کرتے ہیں اپنے بڑوں کے بل پر کرتے ہیں۔ آخرت میں جب یہ لوگ اپنے آپ کو بالکل بے بسی کی حالت میں پائیں گے تو وہ اپنے بڑوں سے کہیں گے کہ دنیا میں ہم تمہاری رہنمائی پر اعتماد کئے ہوئے تھے، اب یہاں بھی تم ہماری کچھ رہنمائی کرو۔

اس کے جواب میں ان کے بڑے اپنے چھوٹوں سے کہیں گے کہ آج کا دن تو اسی لئے آیا ہے کہ وہ ہم بے رہنما ہونے کو بے نقاب کرے۔ پھر اب ہم تم کو کیا رہنمائی دے سکتے ہیں۔ ہماری رہنمائی تو محض وقتی فریب تھی جو پچھلی دنیا میں ختم ہوگئی۔ اب تو یہی ہے کہ تم بھی اپنے بھٹکنے کا نتیجہ بھگتو اور ہم بھی اپنی گمراہی کا نتیجہ بھگتیں۔ ہم چاہیں یا نہ چاہیں، بہر حال اب ہمارا اس کے سوا کوئی اور انجام نہیں۔

وَقَالَ الشَّیْطٰنُ لَمَّا قُضِیَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَمَا كَانَ لِیَ عَلَیْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ

لِیْ فَلَا تَلُوْمُوْنِیْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِیَّ اِنِّیْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ اِنَّ الظّٰلِمِیْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ

اور جب معاملہ کا فیصلہ ہو جائے گا تو شیطان کہے گا کہ اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے تم سے وعدہ کیا تو میں نے اس کی خلاف ورزی کی۔ اور میرا تمہارے اوپر کوئی زور نہ تھا۔ مگر یہ کہ میں نے تم کو بلایا تو تم نے میری بات کو مان لیا پس تم مجھ کو الزام نہ دو، اور تم اپنے آپ کو الزام دو۔ نہ میں تمہارا مددگار ہو سکتا ہوں اور نہ تم میرے مددگار ہو سکتے ہو۔ میں خود اس سے بیزار ہوں کہ تم اس سے پہلے مجھ کو شریک ٹھہراتے تھے۔ بے شک ظالموں کے لئے دردناک عذاب ہے۔ ۲۲

خدا کی دنیا واقعات کی دنیا ہے نہ کہ تخیلات کی دنیا۔ یہاں شیطان کے وعدہ پر اٹھنا یہ ہے کہ آدمی غیر حقیقی بنیادوں پر اپنی زندگی کی تعمیر کرنا چاہے۔

آدمی حق کے داعی کو نظر انداز کر دے اور دوسرے دوسرے کارنامے دکھا کر حق کا علمبردار ہونے کا کریڈٹ لے۔ وہ آخرت کے لئے عمل نہ کرے اور خود ساختہ مفروضوں کے تحت یہ امید قائم کر لے کہ اس کی نجات ہو جائے گی۔ وہ خدا کے احکام کے مطابق زندگی نہ گزارے اور یہ یقین کر لے کہ اس کا نام اپنے آپ خدا کے محبوب بندوں میں لکھ لیا جائے گا ——— یہ سب شیطان کے وعدوں پر بھروسہ کرنا ہے۔ اور آخرت میں آدمی جان لے گا کہ صرف خدا کا وعدہ سچا وعدہ تھا۔ اور باقی تمام وعدے جھوٹے بھروسے تھے جو کبھی پورے ہونے والے نہیں۔

خدا کی دنیا میں غیر خدا سے امید قائم کرنا شرک ہے۔ اس لئے جو لوگ خدائی حقیقتوں کو نظر انداز کرتے ہیں اور غیر خدائی توقعات پر اپنی زندگی کا محل کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ گویا خدا کے ساتھ دوسری چیزوں کو خدا کا شریک ٹھہرا رہے ہیں۔ یہ دوسری چیزیں فیصلہ کے دن ان کا کچھ بھی سہارا نہ بن سکیں گی۔

وَاُدْخِلَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ تَحِیَّتُهُمْ فِیْهَا سَلٰمٌ

اور جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کئے وہ ایسے باغوں میں داخل کئے جائیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ ان میں وہ اپنے رب کے حکم سے ہمیشہ رہیں گے۔ اس میں ان کی ملاقات ایک دوسرے پر سلامتی ہوگی۔ ۲۳

ملاقات کے وقت السلام علیکم کہنا محض ایک معاشرتی رسم نہیں۔ یہ قلبی تعلق کی ایک ظاہری علامت ہے۔ دنیا کا السلام علیکم بھی اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہی ہے اور آخرت کا السلام علیکم بھی مزید اضافہ کے ساتھ یہی۔

جو لوگ دنیا میں اس طرح رہے کہ ان کے اندر ایک دوسرے کے لئے خیر خواہی کے جذبات بھرے ہوئے تھے۔ جو شکایتوں کو نظر انداز کرکے ایک دوسرے سے محبت کرنا جانتے تھے۔ جو دوسرے کے لئے ہمیشہ وہ الفاظ بولتے تھے جس میں اس کا اعتراف اور احترام شامل ہو۔ جو دوسرے کے لئے وہی چیز پسند کرتے تھے جو اپنے لئے پسند کرتے تھے۔ جن کے سینے میں دوسروں کے لئے سلامتی کے چشمے ابلتے تھے اور جن کی آنکھیں دوسرے کی بھلائی کو دیکھ کر ٹھنڈی ہوتی تھیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو جنت کی نفیس دنیا میں بسائے جانے کے اہل ٹھہریں گے۔ دنیا میں بھی ان کا یہ حال تھا کہ جب وہ اپنے بھائیوں سے ملتے تو ان کے لئے ان کی محبت اور خیر خواہی "السلام علیکم" کی صورت میں ٹپکتی تھی۔ آخرت میں یہی چیز اور زیادہ لطیف اور خالص بن کر اپنے جنتی پڑوسیوں کے بارہ میں ان کی زبانوں سے نکلے گی۔

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ﴿٢٤﴾ تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا ۗ وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿٢٥﴾ وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴿٢٦﴾

کیا تم نے نہیں دیکھا، کس طرح مثال بیان فرمائی اللہ نے کلمۂ طیبہ کی۔ وہ ایک پاکیزہ درخت کی مانند ہے جس کی جڑ زمین میں جمی ہوئی ہے۔ اور جس کی شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ وہ ہر وقت پر اپنا پھل دیتا ہے اپنے رب کے حکم سے اور اللہ لوگوں کے لئے مثال بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ اور کلمۂ خبیثہ کی مثال ایک خراب درخت کی ہے جو زمین کے اوپر ہی سے اکھاڑ لیا جائے۔ اس کو کوئی ثبات نہ ہو۔ ۲۶-۲۴

موجودہ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے مختلف حقیقتوں کی ظاہری تمثیلات قائم کی ہیں۔ شجرۂ طیبہ (اچھا درخت) ایک اعتبار سے مومن کی تمثیل ہے۔

درخت کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ وہ پوری کائنات کو اپنا غذائی دسترخوان بناتا ہے اور اس طرح بیج سے ترقی کرکے ایک عظیم درخت کی صورت میں زمین کے اوپر کھڑا ہو جاتا ہے۔

درخت زمین سے پانی اور معدنیات اور نمکیات لے کر بڑھتا ہے۔ اسی کے ساتھ وہ ہوا اور سورج سے اپنے لئے غذا حاصل کرتا ہے۔ وہ نیچے سے بھی خوراک لیتا ہے اور اوپر سے بھی۔

یہی مومن کا معاملہ بھی ہے۔ عام درخت اگر مادی درخت ہے تو مومن شعوری درخت۔ مومن ایک طرف دنیا میں خدا کی تخلیقات اور اس کے نظام کو دیکھ کر عبرت اور نصیحت حاصل کرتا ہے۔ دوسری طرف "اوپر" سے اس کو مسلسل خدا کا فیضان پہنچتا رہتا ہے۔ وہ مخلوقات سے بھی اپنے لئے اضافۂ ایمان کی خوراک حاصل کرتا ہے اور خالق سے بھی اس کی قربت اور ملاقات برابر جاری رہتی ہے۔

درخت ہر موسم میں اپنے پھل دیتا ہے۔ اسی طرح مومن ہر موقع پر وہ صحیح رویہ ظاہر کرتا ہے جو اسے ظاہر کرنا چاہیے۔ معاشی تنگی ہو یا معاشی فراخی، خوشی کا لمحہ ہو یا غم کا۔ شکایت کی بات ہو یا تعریف کی۔ زور آوری کی حالت ہو یا بے زوری کی، ہر موقع پر اس کی زبان اور اس کا کردار وہی ردعمل ظاہر کرتا ہے جو خدا کے سچے بندے کی حیثیت سے اسے ظاہر کرنا چاہیے۔

دوسری مثال شجرۂ خبیثہ (جھاڑ جھنکاڑ) کی ہے۔ اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کائنات سے اس کو بالکل برعکس قسم کی خوراک مہیا کی جارہی ہے جس کے نتیجے میں اس کے اوپر کانٹے اگتے ہیں۔ اس کی شاخوں میں کڑوے اور بدمزہ پھل لگتے ہیں۔ اس کے پاس کوئی شخص جائے تو وہ بدبو سے اس کا استقبال کرتا ہے۔ ایسے درخت کو کوئی پسند نہیں کرتا۔ وہ جہاں اُگے وہاں سے اس کو اکھاڑ کر پھینک دیا جاتا ہے۔

یہی معاملہ غیر مومن کا ہے۔ وہ زمین میں ایک غیر مطلوب وجود کی حیثیت سے اُگتا ہے۔ کائنات اپنی تمام بہترین نشانیوں کے باوجود اس کے لئے ایسی ہو جاتی ہے جیسے یہاں اس کے لئے نہ کوئی دلیل ہے اور نہ کوئی نصیحت۔ خدا کا فیضان اگرچہ ہر وقت برستا ہے مگر اس کو اس میں سے کوئی حصہ نہیں ملتا۔ اس کے کردار اور معاملات میں اس کا اظہار نہیں ہوتا۔

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَ يُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۙ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ﴿٢٧﴾ ع ۴

اللہ ایمان والوں کو ایک پکی بات سے دنیا اور آخرت میں مضبوط کرتا ہے۔ اور اللہ ظالموں کو بھٹکا دیتا ہے۔ اور اللہ کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ ۲۷

"خدا اہل ایمان کو کلمۂ توحید کے ذریعہ دنیا میں بھی ثابت قدم رکھتا ہے اور آخرت میں بھی"۔۔۔۔ دنیا میں ثابت قدم رہنے سے مراد اپنی زندگی کے ہر موڑ پر خیر اور عمل صالح کی روش پر قائم رہنا ہے۔ آخرت میں ثابت قدم رہنے سے مراد یہ ہے کہ قبر کے سوال و جواب کے وقت وہ کامیاب

رہیں گے۔

انسان ہر لمحہ حالت امتحان میں ہے۔ اس پر طرح طرح کے پسندیدہ اور ناپسندیدہ احوال آتے ہیں۔ ان مواقع پر صحیح خدائی روش پر صرف وہ لوگ قائم رہتے ہیں جو اپنے اندر "درخت ایمان" اگا چکے ہوں۔ وہ پیش آمدہ صورت حال میں اس صحیح ترین ردعمل کا ثبوت دیتے ہیں جو خدا کی مرضی کے مطابق انھیں دینا چاہئے۔ اس کے برعکس جس آدمی کی شخصیت جھاڑ جھنکاڑ کی مانند اگی ہو وہ ہر تجربہ میں کڑواہٹ کا ثبوت دیتا ہے۔ وہ ہر موقع پر کانٹا اور بدبو ثابت ہوتا ہے۔

دونوں قسم کے انسان جب قبر کے مرحلہ میں آخری طور پر جانچے جائیں گے تو جو شجرۂ طیبہ تھا وہ شجرۂ طیبہ ثابت ہو کر جنت کے باغ میں داخل کر دیا جائے گا۔ اور جو شجرۂ خبیثہ تھا اس کے ساتھ ایسا معاملہ ہوگا گویا وہ دنیا سے صرف اس لئے اکھاڑا گیا تھا کہ جہنم کا ایندھن بننے کے لئے جہنم کی آگ میں پھینک دیا جائے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿٢٨﴾ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا ۖ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿٢٩﴾ وَجَعَلُوا لِلَّهِ أَندَادًا لِّيُضِلُّوا عَن سَبِيلِهِ ۗ قُلْ تَمَتَّعُوا فَإِنَّ مَصِيرَكُمْ إِلَى النَّارِ ﴿٣٠﴾

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھوں نے اللہ کی نعمت کے بدلے کفر کیا اور جنھوں نے اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں پہنچا دیا، وہ اس میں داخل ہوں گے اور وہ کیسا برا ٹھکانا ہے۔ اور انھوں نے اللہ کے مقابل ٹھہرائے تاکہ وہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں۔ کہو کہ چند دن فائدہ اٹھا لو، آخر کار تمہارا ٹھکانا دوزخ ہے۔ ۲۸-۳۰

ان آیات کا ابتدائی خطاب قریش کے سرداروں سے ہے۔ مگر اس کے عمومی انطباق میں وہ تمام لیڈر شامل ہیں جو انکار حق کی مہم کی سرداری کرتے ہیں۔

کسی قوم کے بڑے وہی لوگ بنتے ہیں جن کو خصوصی نعمتیں اور مواقع حاصل ہوں۔ ان نعمتوں اور مواقع کا صحیح ترین استعمال یہ ہے کہ جب ان کے سامنے حق کی دعوت اٹھے تو وہ اپنے تمام وسائل کے ساتھ اس کی جانب کھڑے ہوں اور اس کی پوری مدد کریں۔ جو چیزیں خدا کی دی ہوئی ہیں ان پر سب سے زیادہ حق خدا کا ہے نہ کہ کسی اور کا۔

مگر اکثر حالات میں معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ ایسے لوگ نہ صرف یہ کہ حق کو قبول نہیں کرتے بلکہ اس کے خلاف اٹھنے والی تحریک کی قیادت کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنے سے باہر اٹھنے والے

حق کو قبول کرنا گویا اپنے آپ کو اس کے مقابلہ میں چھوٹا کرنا ہے۔ اور ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ وہ لوگ اس پر راضی ہو جائیں جن کو کسی وجہ سے ماحول میں بڑائی کا درجہ مل گیا ہو۔

انسان کو ایک خدا چاہیے۔ ایک ایسی ہستی جسے وہ اپنی زندگی میں سب سے بڑا مقام دے سکے۔ چنانچہ جب بھی کوئی شخص لوگوں کی توجہ خدائے واحد سے ہٹاتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کی توجہ کسی غیر خدا کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ خدا کو چھوڑنا ہمیشہ غیر خدا کو اپنا خدا بنانے کی قیمت پر ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ خدا سے لوگوں کو ہٹانے والے کسی غیر خدا میں فرضی طور پر وہ اعلیٰ صفات ثابت کرتے ہیں جو صرف خدا میں پائی جاتی ہیں۔ کیوں کہ جب تک غیر خدا میں وہ اعلیٰ صفات ثابت نہ کی جائیں لوگ اس کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی جب ایک خدا کی پرستش چھوڑتا ہے تو وہ اس کے بعد لازمی طور پر توہم پرستی میں پڑ جاتا ہے۔ خدا کو چھوڑنے کا واحد بدل اس دنیا میں توہم پرستی ہے۔

قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ ﴿۳۱﴾

میرے جو بندے ایمان لائے ہیں ان سے کہہ دو کہ وہ نماز قائم کریں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے کھلے اور چھپے خرچ کریں قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی اور نہ دوستی کام آئے گی۔ ۳۱

آدمی کے اوپر جب کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ اس سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ اگر اس کے کچھ ساتھی ہیں تو وہ ساتھیوں کا زور استعمال کرتا ہے۔ اور اگر دولت ہے تو دولت کو اس کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔ اپنے کو بچانے کی تڑپ آدمی کو مجبور کرتی ہے کہ وہ ان دونوں چیزوں کی طرف دوڑے۔

نماز اور انفاق حقیقۃً مسئلہ آخرت کے بارہ میں آدمی کے اسی احساس کا دنیوی اظہار ہیں۔ نماز گویا آخرت کی ہولناکی کو یاد کرکے خدا کی پناہ کی طرف بھاگنا ہے تاکہ اس کی مدد سے وہ اپنے آپ کو بچائے۔ اسی طرح دنیا میں کھلے اور چھپے خرچ کرنا گویا اپنی کمائی کو آخرت کی مد میں دینا ہے تاکہ وہ آخرت کی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ذریعہ بنے۔

آخرت میں وہی آدمی سہارا پائے گا جس نے دنیا میں خدا کا سہارا پکڑا ہو۔ آخرت میں وہی آدمی چھٹکارا حاصل کرے گا جس نے دنیا میں اس کی خاطر اپنے دائیں بائیں خرچ کیا ہو۔ جو لوگ دنیا میں ایسا نہ کر سکیں وہ آخرت میں سہارا کے لئے دوڑیں گے مگر وہاں وہ کوئی سہارا نہ پائیں گے۔ وہ آخرت میں خرچ کرنا چاہیں گے مگر ان کے پاس کچھ نہ ہوگا جس کو فدیہ دے کر وہ وہاں کی مصیبتوں سے نجات حاصل کریں۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ﴿۳۲﴾ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآىِٕبَیْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ ﴿۳۳﴾ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ﴿۳۴﴾ ع

اللہ وہ ہے جس نے آسمان اور زمین بنائے اور آسمان سے پانی اتارا۔ پھر اس سے مختلف پھل نکالے تمہاری روزی کے لئے اور کشتی کو تمہارے لئے مسخر کر دیا کہ سمندر میں اس کے حکم سے چلے اور اس نے دریاؤں کو تمہارے لئے مسخر کیا۔ اور اس نے سورج اور چاند کو تمہارے لئے مسخر کر دیا کہ برابر چلے جارہے ہیں اور اس نے رات اور دن کو تمہارے لئے مسخر کر دیا۔ اور اس نے تم کو ہر چیز میں سے دیا جو تم نے مانگا۔ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گنو تو تم گن نہیں سکتے۔ بے شک انسان بہت بے انصاف اور بڑا ناشکرا ہے۔ ۳۲-۳۴

موجودہ دنیا انتہائی حیرتناک حد تک خدا کی گواہی دے رہی ہے۔ وسیع خلا میں ستاروں اور سیاروں کی گردش، پانی کے ذریعہ زمین پر زندگی اور رزق کی فراہمی، خشکی اور تری اور فضا پر انسان کو یہ قدرت ہونا کہ ان میں وہ اپنی سواریاں دوڑائے، دریاؤں اور پہاڑوں کے ذریعہ زمین کا انسان کے موافق ہوجانا سورج اور چاند کے ذریعہ موسموں کا اور رات دن کا انتظام، سب کچھ اس سے زیادہ عظیم ہے کہ ان کو لفظوں میں بیان کیا جاسکے۔ انسان اور کائنات میں اتنی کامل مطابقت ہے کہ انسان کی ہر قابل قیاس یا ناقابل قیاس ضرورت پیشگی طور پر یہاں بافراط موجود ہے۔

یہ تمام چیزیں اتنی زیادہ عجیب ہیں کہ آدمی کو ہلا دیں اور اس کو عبدیت کے جذبے سے سرشار کر دیں اس کے باوجود ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ کائنات کو دیکھ کر آدمی کے اندر استعجاب کی کیفیت پیدا ہو۔ خالق کائنات کے تصور سے اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوجائیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی پیدا ہوتے ہی کائنات کو دیکھتا ہے، دیکھتے دیکھتے وہ اس کو ایک عام چیز معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس میں اسے کوئی انوکھا پن نظر نہیں آتا۔

مزید یہ کہ اس دنیا میں آدمی کو جب کوئی چیز ملتی ہے تو وہ بظاہر اس کو اسباب کے تحت ملتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس بنا پر وہ سمجھ لیتا ہے کہ جو چیز اس کو ملی ہے وہ اس کی اپنی محنت اور صلاحیت کی بنا پر ملی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی کے اندر دینے والے خدا کے لئے شکر کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ انسان کی یہی وہ غفلت ہے جس کو یہاں بے انصافی اور ناشکر گزاری سے تعبیر کیا گیا ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ۝ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

اور جب ابراہیم نے کہا، اے میرے رب، اس شہر کو امن والا بنا۔ اور مجھ کو اور میری اولاد کو اس سے دور رکھ کہ ہم بتوں کی عبادت کریں۔ اے میرے رب ان بتوں نے بہت لوگوں کو گمراہ کر دیا۔ پس جس نے میری پیروی کی وہ میرا ہے۔ اور جس نے میرا کہا نہ مانا تو تو بخشنے والا مہربان ہے۔ ۳۵-۳۶

حضرت ابراہیم کے زمانہ تک ملکوں اور قوموں کا یہ حال ہو چکا تھا کہ ہر طرف شرک کا دور دورہ تھا سورج چاند اور دوسرے مظاہر فطرت انسان کی پرستش کا موضوع بنے ہوئے تھے۔ قدیم زمانہ میں زندگی کی تمام سرگرمیوں پر شرک کا اس طرح غلبہ ہوا کہ انسانی نسلوں میں شرک کا تسلسل قائم ہو گیا۔ بظاہر یہ ناممکن نظر آنے لگا کہ لوگوں کو شرک کی فضا سے نکال کر توحید کے دائرے میں لایا جاسکے۔ اس وقت خدا کے حکم خاص کے تحت حضرت ابراہیم عراق سے نکل کر عرب کے صحرا میں آئے جو تمدن سے دور بالکل غیر آباد علاقہ تھا۔ آپ نے الگ تھلگ ماحول میں اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنے بچہ اسماعیل کو بسایا۔ تاکہ یہاں وقت کے مشرکانہ تسلسل سے کٹ کر ایک نئی نسل تیار ہو۔ جو آزادانہ فضا میں پرورش پا کر اپنی فطرت صحیحہ پر قائم ہو سکے ـــــ حضرت ابراہیم کا کلام دعا کے انداز میں اسی خاص حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے۔

بنو اسماعیل کو خشک اور غیر آباد بیابان میں بسانے سے خدا کا منصوبہ یہی تھا، اب یہاں کے جن لوگوں نے توحید کو اپنے دل کی آواز بنایا وہ گویا باغ ابراہیم کی صحیح پیداوار تھے۔ اس کے برعکس جن لوگوں نے دوبارہ شرک کا طریقہ اختیار کر لیا وہ اس باغ کی ناقص پیداوار قرار پائیں گے۔

رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ۝

اے ہمارے رب، میں نے اپنی اولاد کو ایک بے کھیتی کی وادی میں تیرے محترم گھر کے پاس بسایا ہے۔ اے ہمارے رب تاکہ وہ نماز قائم کریں۔ پس تو لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے، اور ان کو پھلوں کی روزی عطا فرما۔ تاکہ وہ شکر کریں۔ ۳۷

قدیم مکہ جہاں بنو اسماعیل بسائے گئے وہاں کی پہاڑی اور صحرائی دنیا گویا خدا کی معرفت کی قدرتی تربیت گاہ تھی۔ دوسری طرف وہاں انسانی تعمیرات کے اعتبار سے واحد قابل لحاظ نشان کعبۃ اللہ تھا۔ ایک طرف فطرت کا ماحول انسان کے اندر خدا کی یاد ابھارنے والا تھا۔ اس کے بعد اپنے قریب اس کو جو نمایاں چیز نظر آتی تھی وہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کی بنائی ہوئی پتھروں کی مسجد تھی جس میں داخل ہو کر وہ خدا کی یاد میں مشغول ہو جائے۔

پھر اس ماحول میں بنو اسمٰعیل کو معجزاتی طور پر زمزم کے ذریعہ پانی مہیا کیا گیا۔ اسی کے ساتھ ان کے لئے یہ انتظام کیا گیا کہ ایسی پیداوار سے ان کو رزق ملے جو ان کے قدموں کے نیچے پیدا نہیں ہوتا۔ یہ گویا ان کو شاکر بنانے کا خصوصی اہتمام تھا۔ غیر معمولی نعمت سے آدمی کے اندر شکر کا غیر معمولی جذبہ ابھرتا ہے۔ اور یہی وہ حکمت ہے جو حضرت ابراہیم کی اس دعا میں چھپی ہوئی تھی کہ صحرا میں انھیں پھلوں کی روزی دے۔

رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ ۭ وَمَا يَخْفٰى عَلَي اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاۗءِ ۝ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَي الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَاۗءِ ۝ رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ڰ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاۗءِ ۝ رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ۝ ع ۶ / ۱۸

اے ہمارے رب، تو جانتا ہے جو کچھ ہم چھپاتے ہیں اور جو کچھ ہم ظاہر کرتے ہیں۔ اور اللہ سے کوئی چیز مخفی نہیں، نہ زمین میں اور نہ آسمان میں۔ شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھ کو بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق دئے۔ بے شک میرا رب دعا کا سننے والا ہے۔ اے میرے رب، مجھے نماز قائم کرنے والا بنا۔ اور میری اولاد میں بھی۔ اے میرے رب میری دعا قبول کر۔ اے ہمارے رب، مجھے معاف فرما اور میرے والدین کو اور مومنین کو، اس روز جب کہ حساب قائم ہوگا۔ ۴۱ - ۳۸

حضرت ابراہیم کی اس دعا میں وہ تمام جذبات جھلک رہے ہیں جو ایک سچے بندے کے اندر خدا کو پکارتے ہوئے امڈتے ہیں۔ اس کی عبدیت زور کرتی ہے کہ وہ خدا کے سامنے اپنے عجز کا اقرار کرے۔ جو کچھ مانگے احتیاج کی بنیاد پر مانگے نہ کہ استحقاق کی بنیاد پر۔ ایک طرف وہ ملی ہوئی نعمتوں کا اعتراف کرے اور دوسری طرف ادب کے تمام تقاضوں کے ساتھ اپنی درخواست پیش کرے۔ وہ اقرار کرے کہ خدا دینے والا ہے اور انسان پانے والا۔

وہ اپنے رب سے یہ توفیق مانگے کہ وہ دنیا میں اس کا پرستار بن کر رہے۔ اسی کی درخواست وہ اپنے لئے

بھی کرے اور اپنے اہل خاندان کے لئے بھی اور اسی کی درخواست تمام مومنین کے لئے بھی۔ دعا کے وقت اس کے سامنے جو سب سے بڑا مسئلہ ہو وہ دنیا کا نہ ہو بلکہ آخرت کا ہو جہاں ابدی طور پر آدمی کو رہنا ہے۔

ان آداب کے ساتھ جو دعا کی جائے وہ پیغمبرانہ دعا ہے اور ایسی دعا اگر سچے دل سے نکلے تو وہ ضرور خدا کے یہاں قبولیت کا درجہ حاصل کرتی ہے۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ۬ؕ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ﴿۴۲﴾ مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ ﴿۴۳﴾

اور ہرگز مت خیال کرو کہ اللہ اس سے بے خبر ہے جو ظالم لوگ کر رہے ہیں۔ وہ ان کو اس دن کے لئے ڈھیل دے رہا ہے جس دن آنکھیں پتھرا جائیں گی۔ وہ سر اٹھائے ہوئے بھاگ رہے ہوں گے۔ ان کی نظر ان کی طرف ہٹ کر نہ آئے گی اور ان کے دل بدحواس ہوں گے۔ ۴۲ - ۴۳

آدمی کے سامنے حق آتا ہے تو وہ اس کا مخالف بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ اس کے مقابلہ میں ایسی بے خوفی کا مظاہرہ کرتا ہے جیسے کہ اس سے زیادہ بہادر دنیا میں اور کوئی نہیں۔

مگر یہی حق جو موجودہ دنیا میں "داعی" کی سطح پر ظاہر ہوتا ہے وہ آخرت میں "خدا" کی سطح پر ظاہر ہوگا۔ اس دن ایسے لوگوں کی ساری بہادری جاتی رہے گی۔ آخرت کا ہولناک منظر دیکھ کر ان کا یہ حال ہوگا کہ جب ان کی نگاہیں اٹھیں گی تو وہ اٹھی کی اٹھی رہ جائیں گی، پلک جھپکنے کی نوبت بھی نہیں آئے گی۔ وہ سر اٹھائے ہوئے تیزی سے میدان حشر کی طرف بھاگ رہے ہوں گے۔ اور ان کے دل دہشت کی وجہ سے اڑ رہے ہوں گے۔

وَاَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ ؕ اَوَلَمْ تَكُوْنُوْٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ﴿۴۴﴾ وَّسَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ ﴿۴۵﴾ وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ؕ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ﴿۴۶﴾

اور لوگوں کو اس دن سے ڈراؤ جب دن ان پر عذاب آجائے گا۔ اس وقت ظالم لوگ کہیں گے کہ اے

ہمارے رب، ہم کو تھوڑی مہلت اور دے دے، ہم تیری دعوت قبول کرلیں گے اور رسولوں کی پیروی کریں گے۔ کیا تم نے اس سے پہلے قسمیں نہیں کھائی تھیں کہ تم پر کچھ زوال آنا نہیں ہے۔ اور تم ان لوگوں کی بستیوں میں آباد تھے جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ اور تم پر کھل چکا تھا کہ ہم نے ان کے ساتھ کیا کیا۔ اور ہم نے تم سے مثالیں بیان کیں۔ اور انھوں نے اپنی ساری تدبیریں کیں اور ان کی تدبیریں اللہ کے سامنے تھیں۔ اگرچہ ان کی تدبیریں ایسی تھیں کہ ان سے پہاڑ بھی ٹل جائیں۔ ۴۴ — ۴۶

آدمی کا حال یہ ہے کہ ایک دن پہلے تک بھی وہ اپنے انجام کا احساس نہیں کرتا۔ اس کو اگر کوئی قوت یا حیثیت حاصل ہو تو وہ اس طرح اکڑتا ہے گویا کہ اس کی حیثیت کبھی اس سے چھننے والی نہیں۔ وہ خدا کی دعوت کو ٹھکرا تا ہے اور بھول جاتا ہے کہ وہ جن چیزوں کے بل پر اس کو ٹھکرا رہا ہے وہ سب خدا ہی کی دی ہوئی ہیں۔ اس کے سامنے دلائل آتے ہیں مگر وہ ان پر دھیان نہیں دیتا۔ ماضی کے سرکشوں کا انجام اس کے سامنے ہوتا ہے مگر وہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ ہوا وہ صرف دوسروں کے لئے تھا۔ خود اس کے اپنے لئے کبھی ایسا ہونے والا نہیں۔

موجودہ دنیا میں جن لوگوں کو مواقع حاصل ہیں وہ حق کو نظر انداز کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ مگر موت کے بعد جب وہ اپنی سرکشی کا انجام دیکھیں گے تو ان کو اپنے ماضی پر اس قدر شرم آئے گی کہ وہ چاہیں گے کہ اگر انھیں دوبارہ مہلت ملے تو وہ موجودہ دنیا میں آکر خود اپنی تردید کریں۔ اور اس چیز کو مان لیں جس کا اس سے پہلے انھوں نے فخریہ طور پر انکار کر دیا تھا۔

حق کی مخالفت خدا کی مخالفت ہے۔ جس حق کے ساتھ خدا ہو اس کی مخالفت کرنے والے ہمیشہ ناکام رہتے ہیں، خواہ وہ اس کے خلاف اتنی بڑی تیاریوں کے ساتھ آئے ہوں جو پہاڑ کو ہلانے کے لئے بھی کافی ثابت ہو۔

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۴۷﴾ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۴۸﴾ وَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَىِٕذٍ مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ﴿۴۹﴾ سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ﴿۵۰﴾ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۵۱﴾ هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَلِيَعْلَمُوْٓا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۵۲﴾ ع

[19] پس تم اللہ کو اپنے پیغمبروں سے وعدہ خلافی کرنے والا نہ سمجھو۔ بے شک اللہ زبردست ہے،

بدلہ لینے والا ہے۔ جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل جائے گی اور آسمان بھی۔ اور سب ایک زبردست اللہ کے سامنے پیش ہوں گے۔ اور تم اس دن مجرموں کو زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھو گے۔ ان کے لباس تارکول کے ہوں گے۔ اور ان کے چہروں پر آگ چھائی ہوتی ہوگی تاکہ اللہ ہر شخص کو اس کے کئے کا بدلہ دے۔ بے شک اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔ یہ لوگوں کے لئے ایک اعلان ہے اور تاکہ اس کے ذریعے سے وہ ڈرا دئے جائیں۔ اور تاکہ وہ جان لیں کہ وہی ایک معبود ہے اور تاکہ دانش مند لوگ نصیحت حاصل کریں۔ ۴۷-۵۲

پیغمبر خدا کے دین کی گواہی اپنی کامل صورت میں دیتا ہے۔ اس لئے پیغمبر کے ساتھ خدا کی نصرت بھی اپنی کامل صورت میں آتی ہے۔ بعد کے پیرو جتنا جتنا پیغمبر کے نمونہ پر پورے اتریں گے اتنا اتنا وہ خدا کی نصرت کے مستحق ہوتے چلے جائیں گے۔

آج انسان زمین پر ایسا محسوس کرتا ہے جیسے وہ خشکی اور تری کا مالک ہو۔ وہ فضاؤں اور خلاؤں کو کنٹرول کر سکتا ہے۔ وہ اختیار رکھتا ہے کہ یہاں کے وسائل کو جس طرح چاہے استعمال کرے اور جس طرح چاہے استعمال نہ کرے۔ مگر یہ سب کچھ صرف اس لئے ہے کہ خدا نے امتحان کی مدت تک زمین و آسمان کو انسان کے لئے مسخر کر رکھا ہے۔ امتحان کی مدت ختم ہوتے ہی حالات یکسر بدل جائیں گے۔ اس کے بعد زمین بھی دوسری زمین ہوگی اور آسمان بھی دوسرا آسمان۔ انسان اچانک اپنے کو ایک اور ہی دنیا میں پائے گا۔

جہاں آدمی اپنے آپ کو حکمراں سمجھتا تھا وہاں ساری حکومت صرف خدا کے لئے ہو چکی ہوگی۔ جہاں ہر چیز اس کے حکم کے تابع تھی وہاں ہر چیز اس کی تابعداری کرنا چھوڑ دے گی۔ موجودہ دنیا میں جو لوگ بڑے بنے ہوئے تھے وہ اس دن بے بس مجرم کے روپ میں نظر آئیں گے۔ جو لباس آج جسم کو زینت دیتا ہے وہ اس دن ایسا ہو جائے گا جیسے جسم کے اوپر تارکول پھیر دی گئی ہو۔ پُر رونق چہرے اس دن آگ میں جھلسے ہوئے ہوں گے۔ اور یہ سب کچھ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جو دنیا میں خدا کا بندہ بن کر رہنے پر راضی نہ ہوئے۔ جنھوں نے خدا کی طرف سے ہونے والے اعلان کو نظر انداز کیا۔

حقیقت کا حقیقت ہونا کافی نہیں ہے کہ آدمی اس کو مان لے۔ حقیقت کو ماننے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی خود بھی اس کو ماننا چاہے۔ جو شخص حقیقت کے معاملہ میں سنجیدہ ہو، جو خالی الذہن ہو کر اس کو سنے وہی حقیقت کو سمجھے گا، وہی حقیقت کا صحیح استقبال کرنے میں کامیاب ہوگا۔

سُوْرَةُ الْحِجْرِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ اٰيَةً وَّسِتَّةُ رُكُوْعَاتٍ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱﴾ رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ﴿۲﴾ ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۳﴾ وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿۴﴾ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ﴿۵﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

الف۔ل۔ر۔ یہ آیتیں ہیں کتاب کی اور ایک واضح قرآن کی۔ وہ وقت آئے گا جب انکار کرنے والے لوگ تمنا کریں گے کہ کاش وہ ماننے والے بنے ہوتے۔ ان کو چھوڑو کہ وہ کھائیں اور فائدہ اٹھائیں اور خیالی امید ان کو بھلاوے میں ڈالے رکھے، پس آئندہ وہ جان لیں گے۔ اور ہم نے اس سے پہلے جس بستی کو بھی ہلاک کیا ہے اس کا ایک مقرر وقت لکھا ہوا تھا۔ کوئی قوم نہ اپنے مقرر وقت سے آگے بڑھتی اور نہ پیچھے ہٹتی۔ ۵-۱

دنیا میں انسان کو جو آزادی ملی ہوئی ہے وہ صرف امتحان کی مدت تک کے لئے ہے۔ یہ ایک بہت نازک صورت حال ہے۔ اگر آدمی واقعی طور پر اس کو سوچے تو وہ ایسا محسوس کرے گا کہ جو مدت کل ختم ہونے والی ہے وہ گویا آج ختم ہو چکی ہے۔ یہ خیال اس کو ہلا کر رکھ دے گا۔ مگر آدمی صرف "آج" میں جیتا ہے، وہ "کل" پر دھیان نہیں دیتا۔ اس کے سامنے حقیقت کھولی جاتی ہے مگر وہ خوش فہمیوں میں مبتلا ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ خود ساختہ طور پر کچھ فرضی سہارے تلاش کر لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ سہارے فیصلہ کے وقت اس کے کام آئیں گے۔

مگر غفلت اور خوش گمانی کا طلسم اس وقت ٹوٹ جاتا ہے جب مدت ختم ہوتی ہے اور خدا کے فرشتے اس کے پاس آجاتے ہیں تاکہ اس کو امتحان کی دنیا سے نکال کر انجام کی دنیا میں پہنچا دیں۔

اس وقت اس کو وہ مواقع یاد آنے لگتے ہیں جب کہ اس نے ایک سچی دلیل کو جھوٹے الفاظ کے ذریعہ رد کرنے کی کوشش کی تھی۔ جب اس نے ضمیر کی آواز کو چھوڑ کر اپنی خواہشات کی پیروی کی تھی۔ جب اس نے خدا کے داعی میں خدا کی جھلکیاں پانے کے باوجود ذاتی پندار کی خاطر اس کو نظر انداز کر دیا تھا۔ جب وہ دیکھے گا کہ میری کوئی تدبیر میرے کام نہیں آئی تو وہ کہے گا کہ کاش میں نے وہ نہ کیا ہوتا جو میں نے کیا۔ کاش میں "منکر" کا طریقہ اختیار کرنے کے بجائے "مسلم" کا طریقہ اختیار کرتا۔

وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۝ لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ ۝

اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اے وہ شخص جس پر نصیحت اتری ہے تو بے شک دیوانہ ہے۔ اگر تو سچا ہے تو ہمارے پاس فرشتوں کو کیوں نہیں لے آتا۔ ہم فرشتوں کو صرف فیصلہ کے لئے اتارتے ہیں اور اس وقت لوگوں کو مہلت نہیں دی جاتی۔ ۸ - ۶

پیغمبر کے مخاطبین نے پیغمبر کے اوپر دیوانگی کا شبہ کیا۔ اس کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ پیغمبر کی دعوت تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ "میں خدا کا نمائندہ ہوں۔ جو شخص میری بات مانے گا وہ کامیاب ہوگا اور جو شخص نہیں مانے گا وہ ناکام ہو کر رہ جائے گا"

مگر یہ مخاطبین عملاً جو کچھ دیکھ رہے تھے وہ اس کے برعکس تھا۔ ان کا اپنا یہ حال تھا کہ ان کو رائج الوقت نظام میں سرداری اور پیشوائی کا مقام حاصل تھا۔ دوسری طرف پیغمبر ایک غیر رواجی دین کا داعی ہونے کی وجہ سے مروجہ نظام میں بے حیثیت اور اجنبی بنا ہوا تھا۔ اس فرق کی بنا پر مخاطبین کو یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ تم ہم کو دیوانہ معلوم ہوتے ہو۔ ہر قسم کی دنیوی خوبیاں تو خدا نے ہم کو دے رکھی ہیں اور تم کہتے ہو کہ کامیابی تمہارے لئے ہے اور تمہارا ساتھ دینے والوں کے لئے۔

مگر یہ ان کے زاویۂ نظر کا فرق تھا۔ وہ اپنی چیزوں کو "انعام" کے طور پر دیکھ رہے تھے۔ حالانکہ یہ تمام چیزیں صرف "آزمائش" کا سامان ہیں جو موجودہ دنیا میں کسی کو وقتی طور پر دی جاتی ہیں۔

وہ یہ بھی کہتے تھے کہ تمہارے دعوے کے مطابق تمہارے پاس خدا کے فرشتے آتے ہیں تو یہ فرشتے ہمیں کیوں نہیں دکھائی دیتے۔ یہ بھی زاویۂ نظر کے فرق کی بنا پر تھا۔ پیغمبر کے پاس جو فرشتہ آتا ہے وہ وحی کا فرشتہ ہوتا ہے جو خدا کا کلام پیغمبر تک پہنچاتا ہے۔ اس کے علاوہ خدا کے وہ فرشتے بھی ہیں جو اس لئے آتے ہیں کہ وہ حقیقت کو لوگوں کے سامنے بے نقاب کر دیں۔ مگر وہ دعوت کی تکمیل کے بعد آتے ہیں اور جب وہ آتے ہیں تو یہ فیصلہ کرنے کا وقت ہوتا ہے نہ کہ ایمان کی طرف بلانے کا۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝

یہ یاد دہانی (کتاب)، ہم ہی نے اتاری ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔ ۹

قرآن کو خدا نے اتارا ہے اور وہی اس کی حفاظت کرنے والا ہے —— نزول قرآن کے وقت اس ارشاد کا براہ راست خطاب قریش سے تھا۔ مگر وسیع تر معنوں میں یہ پوری انسانیت کے لئے ایک چیلنج تھا۔ اس طرح ساتویں صدی عیسوی سے لے کر قیامت تک کے انسانوں کے سامنے ایک ایسا قطعی معیار رکھ دیا گیا جس کے اوپر جانچ کر وہ دیکھ سکیں کہ قرآن واقعی خدا کی کتاب ہے یا نہیں۔

جس وقت یہ چیلنج دیا گیا اس وقت تمام ظاہری امکانات اس کے سراسر خلاف تھے۔ کسی نزاعی کتاب کو مستقل طور پر محفوظ رکھنے کے لئے طاقت و رجاہت درکار ہے۔ اور نزول قرآن کے وقت اس کے حاملین اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں بالکل کمزور حیثیت رکھتے تھے۔ کاغذ اور پریس کا دور ابھی دنیا میں نہیں آیا تھا جس نے موجودہ زمانہ میں کسی کتاب کی حفاظت کو بہت آسان بنا دیا ہے۔ کتاب جیسی ایک چیز کو محفوظ رکھنے کے لئے اس کی زبان کو محفوظ رکھنا بھی لازمی طور پر ضروری تھا، جب کہ تاریخ بتاتی ہے کہ کوئی زبان کبھی مستقل طور پر باقی نہیں رہتی۔ قرآن موجودہ سائنسی دور سے بہت پہلے روایتی دور میں آیا۔ ایسی حالت میں اس کے زندہ اور محفوظ رہنے کے لئے ضروری تھا کہ اس کے مضامین ابدی جانچ میں پورے اتریں۔

ان تمام چیلنجوں کا مقابلہ کرتے ہوئے قرآن پوری طرح محفوظ رہا۔ اور آج بھی وہ پوری طرح محفوظ ہے۔ یہ اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ یہ خدا کی کتاب ہے۔ ڈیڑھ ہزار سال پہلے کے دور میں تیار کی جانے والی کوئی بھی کتاب اس طرح زندہ اور محفوظ نہیں جس طرح قرآن آج زندہ اور محفوظ ہے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ فِي شِيَعِ الْأَوَّلِينَ ۝ وَمَا يَأْتِيهِم مِّن رَّسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ۝ كَذَٰلِكَ نَسْلُكُهُ فِي قُلُوبِ الْمُجْرِمِينَ ۝ لَا يُؤْمِنُونَ بِهِ ۖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْأَوَّلِينَ ۝ وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِم بَابًا مِّنَ السَّمَاءِ فَظَلُّوا فِيهِ يَعْرُجُونَ ۝ لَقَالُوا إِنَّمَا سُكِّرَتْ أَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُورُونَ ۝

اور ہم تم سے پہلے گذری ہوئی قوموں میں رسول بھیج چکے ہیں۔ اور جو رسول بھی ان کے پاس آیا وہ اس کا استہزا کرتے رہے۔ اسی طرح ہم یہ (استہزاء) مجرمین کے دلوں میں ڈال دیتے ہیں۔ وہ اس پر ایمان نہیں لائیں گے۔ اور یہ دستور اگلوں سے ہوتا آیا ہے۔ اور اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ کھول دیتے جس پر وہ چڑھنے لگتے تب بھی وہ کہہ دیتے کہ ہماری آنکھوں کو دھوکہ ہو رہا ہے۔ بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے۔ ۱۵ — ۱۰

ہر دور میں خدا کے پیغمبروں کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ لوگوں نے بطور خود جو فرضی معیار کسی کو نمائندۂ خدا قرار دینے کے لئے بنا رکھے تھے، اس پر ان کے پیغمبر پورے نہیں اترتے تھے اس معیار کے اعتبار سے پیغمبر انھیں کم تر نظر آتا تھا۔ اس لئے لوگوں نے پیغمبروں کو استہزار کا موضوع بنا لیا۔

کسی نئی حقیقت کو پانے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی کھلے ذہن کے ساتھ سوچنے اور خالص واقعات کی بنیاد پر رائے قائم کرنے کے لئے تیار ہو۔ جو لوگ سچائی کا انکار کرتے ہیں وہ اکثر اس لئے ایسا کرتے ہیں کہ سچائی ان کو اپنے مانوس معیار کے اعتبار سے اجنبی معلوم ہوتی ہے۔ یہ مانوس معیار لمبے عرصے کے بعد ان کے دل میں ایسا رچ بس جاتا ہے کہ اس سے باہر نکل کر سوچنا ان کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے۔ وہ آخر وقت تک بھی اپنے مانوس دائرے سے باہر کی سچائی کو پہچان نہیں پاتے۔

قوموں کے اسی مزاج کا نتیجہ تھا کہ معجزے کو دیکھ کر بھی لوگ ایمان نہیں لائے۔ جس شخصیت کے بارے میں ان کے مادی حالات کی بنا پر ان کا یہ ذہن بن گیا تھا کہ یہ ایک معمولی آدمی ہے وہ پھر بھی ان کی نظر میں معمولی ہی رہا۔ بعد کو اگر اس نے کوئی خارق عادت چیز دکھائی تو چونکہ دوسرے پہلوؤں کے اعتبار سے وہ بظاہر اب بھی ان کے لئے غیر اہم تھا۔ انھوں نے سمجھ لیا کہ یہ کوئی جادو یا نظر بندی ہے نہ کہ حقیقۃً ان کے نمائندۂ خدا ہونے کا ثبوت۔

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَزَيَّنَّاهَا لِلنَّاظِرِينَ ﴿١٦﴾ وَحَفِظْنَاهَا مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ رَجِيمٍ ﴿١٧﴾ إِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ مُبِينٌ ﴿١٨﴾

اور ہم نے آسمان میں برج بنائے اور دیکھنے والوں کے لئے اسے رونق دی۔ اور اس کو ہر شیطان مردود سے محفوظ کیا۔ اگر کوئی چوری چھپے سننے کے لئے کان لگاتا ہے تو ایک روشن شعلہ اس کا پیچھا کرتا ہے۔ ۱۸-۱۶

کائنات میں بے شمار ستارے پھیلے ہوئے ہیں۔ مگر یہ ستارے مجموعوں کی صورت میں ہیں۔ ہر ایک مجموعہ کو ایک کہکشاں کہا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بروج سے مراد یہ کہکشائیں ہوں۔

زَیَّنّٰھا لِلنّٰظِرِین میں سادہ طور پر صرف "زینت" مراد نہیں ہے بلکہ آسمان کا وہ حیران کن منظر مراد ہے جو رات کے وقت اس کا ہوتا ہے۔ رات کو جب بادل اور گرد و غبار نہ ہوں، کھلے میدان میں کھڑے ہو کر آسمان کی طرف نظر ڈالیں تو وسیع آسمان میں جگمگاتے ہوئے ستاروں کا منظر اتنا حیران کن حد تک شاندار ہوتا ہے کہ آدمی اس کو دیکھ کر خدا کی عظمت و جلال کے احساس میں ڈوب جاتے۔

جو لوگ پیغمبر سے کہتے تھے کہ آسمان سے فرشتہ اترتا ہوا ہمیں دکھاؤ ان سے کہا گیا کہ تاروں بھرے آسمان کا وہ منظر جو ہر روز تمہارے سامنے کھولا جاتا ہے کیا وہ تمہارے شعور کو جگانے اور تمہارے دلوں کو پگھلانے کے لئے کم ہے کہ تم دوسرے معجزات کا تقاضا کرتے ہو۔

زمین پر انسان کے ساتھ شیطان بھی بسائے گئے ہیں۔ یہاں شیاطین کو پوری آزادی ہے کہ وہ جدھر چاہیں جائیں اور جس طرح چاہیں لوگوں کو بہکائیں۔ مگر زمین سے ماورا جو خدا کی دنیا ہے اس میں شیاطین کی پرواز کے لئے ناقابل عبور رکاوٹیں قائم کر دی گئی ہیں۔ وہ ایک خاص حد سے آگے اس کے اندر داخل نہیں ہو پاتے۔

وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ ۝ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ ۝

اور ہم نے زمین کو پھیلایا اور اس پر ہم نے پہاڑ رکھ دئے اور اس میں ہر چیز ایک اندازے سے اُگائی۔ اور ہم نے تمہارے لئے اس میں معیشت کے اسباب بنائے اور وہ چیزیں جن کو تم روزی نہیں دیتے۔ ۲۰-۱۹

جغرافی مطالعہ بتاتا ہے کہ زمین ابتداءً خشک گولے کی صورت میں تھی پھر وہ پھٹی جس کی وجہ سے سمندر کی گہرائیاں پیدا ہوئیں اور ان میں پانی جمع ہو گیا۔ ان گہرائیوں کو متوازن رکھنے کے لئے زمین پر جگہ جگہ اونچے پہاڑ ابھر آئے۔

اس کے بعد زمین پر نباتات اور حیوانات وجود میں آئے اور خوب پھیلے۔ ان میں سے ہر ایک کے اندر بڑھنے کی لامحدود صلاحیت ہے مگر ان کو دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک کا ایک اندازہ مقرر ہے۔ ہر چیز بڑھتے بڑھتے ایک خاص حد پر رک جاتی ہے، وہ اس سے آگے نہیں جانے پاتی۔

مثلاً پودوں اور درختوں میں اپنی نسل بڑھانے کی اتنی زیادہ استعداد ہے کہ اگر کسی ایک پودے کو اس کی اندرونی استعداد کے اعتبار سے بلا روک ٹوک بڑھنے دیا جائے تو چند سال کے اندر ساری سطح زمین پر ہر طرف بس وہی پودا نظر آئے گا۔ کسی دوسری چیز کے لئے یہاں کوئی جگہ باقی نہ رہے گی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی زبردست ناظم ہے جو ہر ایک پر کنٹرول قائم کئے ہوئے ہے۔ یہی معاملہ حیوانات کا ہے۔ ان کے اندر بھی افزائش نسل کی لامحدود صلاحیت ہے۔ مگر ہر ایک کی تعداد ایک حد پر پہنچ کر رک جاتی ہے۔ اسی طرح حیوانات میں اپنی جسامت بڑھانے کی استعداد اتنی زیادہ

ہے کہ ایک پتنگے کو بڑھنے دیا جائے تو وہ ہاتھی کے برابر ہو جائے۔ مگر قدرتی کنٹرول ایک خاص حد پر اس کی جسامت کو روک دیتا ہے۔ اگر چیزیں اپنی حد پر نہ رکیں تو زمین پر انسان کی رہائش ناممکن ہو جائے۔

انسان کو اپنی معیشت اور تمدن کے لئے بے شمار چیزیں درکار ہیں۔ یہ ساری چیزیں عین ہماری ضرورت کے مطابق زمین پر مہیا کر دی گئی ہیں۔ ان تمام چیزوں کی فراہمی اور ہر ایک کی بقا کا انتظام خدا کی طرف سے ہے۔ اگر ہم کو انھیں ان کا رزق دینا ہو تو ہمارے لئے ان کا حصول ناممکن ہو جائے۔

وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ ۝ وَأَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَأَسْقَيْنٰكُمُوهُ وَمَآ أَنْتُمْ لَهُ بِخٰزِنِيْنَ ۝

اور کوئی چیز ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں اور ہم اس کو ایک معین اندازے کے ساتھ ہی اتارتے ہیں۔ اور ہم ہی ہواؤں کو بار آور بنا کر چلاتے ہیں۔ پھر ہم آسمان سے پانی برساتے ہیں پھر اس پانی سے تم کو سیراب کرتے ہیں۔ اور تمہارے بس میں نہ تھا کہ تم اس کا ذخیرہ جمع کر کے رکھتے۔ ۲۲-۲۱

حد بندی کا اصول کائنات کی تمام چیزوں میں رائج ہے۔ ہوا ایک حد کے اندر چلتی ہے، حالانکہ خدا کبھی کبھی دکھاتا ہے کہ وہ آندھی بھی بن سکتی ہے۔ سورج ایک خاص فاصلہ پر ہے۔ اگر وہ اس سے اوپر چلا جائے تو زمین برف کی طرح جم جائے۔ سورج نیچے آجائے تو زمین جلتی ہوئی بھٹی بن جائے۔ زمین کی کشش نہایت موزوں مقدار میں ہے۔ اگر زمین کی جسامت دگنا ہوتی تو اس کی کشش اتنی بڑھ جاتی کہ بوجھ کی وجہ سے آدمی کے لئے زمین پر چلنا مشکل ہوتا۔ اور اگر زمین کی جسامت موجودہ جسامت سے نصف کے بقدر کم ہوتی تو اس کی کشش اتنی گھٹ جاتی کہ آدمی اور اس کے مکانات ہلکے پن کی وجہ سے زمین پر ٹھہر نہ سکتے۔ یہی حال ان تمام چیزوں کا ہے جن کے درمیان انسان رہتا ہے۔ ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر ہے وہ نہ اس سے گھٹتا ہے اور نہ اس سے بڑھتا ہے۔

زمین پر انسان اور تمام جانداروں کی زندگی کا انحصار پانی پر ہے۔ زیر زمین پانی کے ذخیروں سے لے کر فضائی بادلوں تک پانی کی فراہمی کا نظام اتنے عجیب اور اتنے عظیم پیمانے پر ہے جس کا قائم کرنا ہرگز انسان کے بس میں نہیں۔ اس عجیب اور عظیم انتظام کو خدا مسلسل عین انسانی ضرورت کے مطابق قائم کئے ہوئے ہے۔

انسان ایک بے حد نازک مخلوق ہے۔ اس کے ماحول میں کوئی فرق اس کی پوری ہستی کو تہ و بالا کر دینے کے لئے کافی ہے۔ ایسی حالت میں بیشمار اجزاء کی ایک کائنات، لاتعداد امکانات کا حامل

ہونے کے باوجود، عین اسی مخصوص امکانی انداز سے پر قائم ہے جو انسان جیسی ایک مخلوق کے لئے مناسب ہے۔ یہ اعتدال اور تناسب ہرگز اتفاقی نہیں ہو سکتا۔ یقیناً اس کا کوئی زبردست خالق اور ناظم ہے۔ ایسی حالت میں جو شخص خدا کو نہ مانے یا خدا کو مان کر اس کا شریک ٹھہرائے وہ صرف اپنے غیر معقول ہونے کا ثبوت دیتا ہے نہ کہ عقیدۂ توحید کے غیر معقول ہونے کا۔

وَإِنَّا لَنَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ وَنَحْنُ الْوَارِثُونَ ﴿٢٣﴾ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِينَ مِنكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَأْخِرِينَ ﴿٢٤﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ۚ إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿٢٥﴾

اور بے شک ہم ہی زندہ کرتے ہیں اور ہم ہی مارتے ہیں۔ اور ہم ہی باقی رہ جائیں گے اور ہم تمہارے اگلوں کو بھی جانتے ہیں اور تمہارے پچھلوں کو بھی جانتے ہیں۔ اور بے شک تمہارا رب ان سب کو اکٹھا کرے گا۔ وہ علم والا ہے، حکمت والا ہے۔ ۲۵-۲۳

دنیا میں انسان کو بسانا، پھر یہاں سے اس کو اٹھا لینا دونوں خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ اگر یہ انسان کی مرضی سے ہوتا تو وہ کبھی یہاں نہ آسکتا اور آنے کے بعد کبھی یہاں سے واپس نہ جاتا۔ اسی سے یہ بھی ثابت ہے کہ انسان کی پیدائش سے پہلے بھی زمین و آسمان خدا کے تھے اور اس کے بعد بھی وہ خدا کے رہیں گے۔

زمین پر ان گنت چیزیں ہیں۔ مگر ہر ایک کی ایک انفرادیت ہے۔ ہر چیز وہی خاص اور متعین کردار ادا کرتی ہے جو اس کو ادا کرنا چاہئے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ زمین کا خالق ایک ایک چیز کا انفرادی علم رکھتا ہے۔ وہ ہر چیز کو اس کے اپنے خصوصی وظیفہ میں لگائے ہوئے ہے۔ حتیٰ کہ ایک آدمی کے ہاتھ کے انگوٹھے پر جو نشان ہوتا ہے وہ بھی تمام دوسرے انسانوں سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ ایک شخص کے انگوٹھے کا نشان پھر کبھی کسی دوسرے انسان کے ساتھ دہرایا نہیں جاتا۔

ایسے قادر اور باخبر خدا کے لئے اس میں کیا مشکل ہے کہ وہ ہر آدمی کا الگ الگ حساب لے اور ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرے جس کا وہ فی الواقع مستحق ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ ﴿٢٦﴾ وَالْجَانَّ خَلَقْنَاهُ مِن قَبْلُ مِن نَّارِ السَّمُومِ ﴿٢٧﴾

اور ہم نے انسان کو سنے ہوئے گارے کی کھنکھناتی مٹی سے پیدا کیا اور اس سے پہلے جنوں کو ہم نے آگ کی لپٹ سے پیدا کیا۔ ۲۷-۲۶

انسان کا وجود دو چیزوں سے مرکب ہے۔ ایک جسم اور دوسرے روح۔ جسم تمام تر ارضی مادوں سے بنا ہے۔ انسانی جسم کا تجزیہ بتاتا ہے کہ وہ انھیں اجزا کی ترکیب سے بنا ہے جن کو عرف عام میں پانی اور مٹی کہتے ہیں۔ گویا جسم کے اعتبار سے انسان سراسر ایک بے حیات اور بے شعور وجود کا نام ہے۔ مگر جب خدا اس کے اندر اپنے پاس سے روح ڈال دے تو اچانک یہی جسم ایسی صلاحیتوں کا حامل بن جاتا ہے جو معلوم کائنات میں کسی دوسری مخلوق کو حاصل نہیں۔

یہاں دوسری مخلوق وہ ہے جس کو جن کہتے ہیں۔ جن انسان کے حریف ہیں۔ جن آگ کے شعلے سے بنائے گئے ہیں۔ گویا کہ وہ عین اپنی پیدائش کے اعتبار سے جلانے والی مخلوق ہیں۔ جس طرح مٹی والی زمین اپنے آپ کو آگ والے سورج سے دور رکھتی ہے تاکہ وہ جل نہ جائے۔ اسی طرح انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو جنوں سے بچائے۔ ورنہ وہ اس کو اخلاقی اور دینی اعتبار سے جلا ڈالیں گے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۝ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ۝ قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ۝ قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝

اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں سنے ہوئے گارے کی سوکھی مٹی سے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں۔ جب میں اس کو پورا بنالوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تو تم اس کے لئے سجدہ میں گر پڑنا۔ پس تمام فرشتوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس، کہ اس نے سجدہ کرنے والوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ خدا نے کہا اے ابلیس، تجھ کو کیا ہوا کہ تو سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا۔ ابلیس نے کہا کہ میں ایسا نہیں کہ بشر کو سجدہ کروں جس کو تو نے سنے ہوئے گارے کی سوکھی مٹی سے پیدا کیا ہے۔ ۲۸ - ۳۳

ابلیس نے سجدہ نہ کرنے کی وجہ بظاہر یہ بتائی کہ انسان میرے مقابلہ میں کم تر ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کی وجہ خود ابلیس کا اپنا احساس کمتری تھا۔ وہ یہ دیکھ کر جل اٹھا کہ میں پہلے سے کائنات میں ہوں اور مجھ کو یہ عزت نہیں ملی کہ تمام مخلوقات سے مجھے سجدہ کرایا جائے۔ اور انسان جو ابھی پیدا کیا گیا

ہے اس کو تمام مخلوقات سے سجدہ کرایا جارہا ہے۔ اس نے انسان کو سجدہ کرنے سے انکار کردیا۔ "انسان مجھ سے کم تر ہے" کا مطلب یہ ہے کہ سجدہ کا مستحق در اصل میں تھا پھر غیر مستحق کی عزت افزائی کو میں کیوں کر تسلیم کروں۔

یہی گھمنڈ اور حسد تمام اجتماعی خرابیوں کی جڑ ہے۔ موجودہ دنیا میں ایسے مواقع انسان کے سامنے بار بار آتے ہیں۔ جو شخص ایسے موقع پر جلن کی نفسیات میں مبتلا نہ ہو اس نے فرشتوں کی پیروی کی اور جو شخص جلن کا شکار ہو جائے وہ گویا شیطان کا پیرو بنا۔

قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ ۝ وَإِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ إِلَىٰ يَوْمِ الدِّينِ ۝ قَالَ رَبِّ فَأَنْظِرْنِي إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ۝ قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِينَ ۝ إِلَىٰ يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ ۝

خدا نے کہا تو یہاں سے نکل جا کیوں کہ تو مردود ہے، اور بے شک تجھ پر روز جزا تک لعنت ہے۔ ابلیس نے کہا، اے میرے رب، تو مجھے اس دن تک کے لئے مہلت دے جس دن لوگ اٹھائے جائیں گے۔ خدا نے کہا تجھ کو مہلت ہے اس مقرر وقت کے دن تک۔ ۳۸ - ۳۴

انسان کی تخلیق کے بعد واقعات نے جو رخ اختیار کیا اس نے شیطان کو مستقل طور پر انسان کا دشمن بنا دیا۔ اب قیامت تک کے لئے آدمی شیطان کی زد میں ہے۔ انسان کے لئے سب سے زیادہ قابل لحاظ بات یہ ہے کہ وہ شیطان کے فریب سے چوکنا رہے۔ موجودہ دنیا میں یہی وہ مقام ہے جہاں انسان کی کامیابی کا فیصلہ بھی ہو رہا ہے اور اسی مقام پر اس کی ناکامی کا بھی۔

قَالَ رَبِّ بِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَلَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ۝

ابلیس نے کہا، اے میرے رب، جیسا تو نے مجھ کو گمراہ کیا ہے اسی طرح میں زمین میں ان کے لئے مزین کروں گا اور سب کو گمراہ کر دوں گا۔ سوا ان کے جو تیرے چنے ہوئے بندے ہیں۔ ۴۰ - ۳۹

ابلیس کے سامنے ایک آزمائشی صورت حال آئی۔ اس میں وہ شکست کھا گیا۔ اب اس کے لئے صحیح طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنی ہار مان لے۔ مگر اس کے بجائے اس نے یہ کیا کہ خود خدا پر الزام دینے لگا کہ

اس نے جو کچھ کیا مجھ کو گمراہ کرنے کی خاطر کیا۔ جس واقعہ سے اس کی اپنی کمزوری ثابت ہو رہی تھی اس کو اس نے چاہا کہ خدا کے اوپر ڈال دے —— اپنی شکست کا ذمہ دار دوسروں کو قرار دینا اسی شیطانی اسوہ کی پیروی ہے۔

ابلیس نے انسان کو سجدہ نہ کرنے کا سبب یہ بتایا کہ انسان کو مٹی سے بنایا گیا ہے اور مجھ کو آگ سے۔ اس کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ مٹی کے مقابلہ میں آگ کو فضیلت کیوں حاصل ہو۔ مگر ابلیس کے اپنے ذہنی خانہ میں خودساختہ تصور کے تحت یہ ہوا کہ مٹی حقیر چیز بن گئی اور آگ افضل چیز۔ اسی کا نام تزئین ہے۔ یہ ایک نفسیاتی چیز ہے نہ کہ کوئی عقلی چیز۔ ابلیس نے اپنی غلطی ماننے کے بجائے یہ فیصلہ کیا کہ وہ دوسروں سے بھی وہی غلطی کرائے۔ وہ خود جس نفسیاتی کمزوری کا شکار ہوا ہے، اسی نفسیاتی کمزوری میں تمام انسانوں کو مبتلا کر دے۔

ابلیس نے کہا کہ تیرے منتخب بندوں کے علاوہ سب کو میں گمراہ کروں گا —— یہ خدا کے منتخب بندے کون ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کے مقابلہ میں سیدھی راہ پر آچکے ہوں۔ یعنی عبدیت کی راہ۔ بالفاظ دیگر، خدا کے مقابلہ میں اپنی حیثیت واقعی کے اعتراف کی راہ۔

قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيمٌ ﴿۴۱﴾ إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ إِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِينَ ﴿۴۲﴾ وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۴۳﴾ لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَابٍ لِكُلِّ بَابٍ مِنْهُمْ جُزْءٌ مَقْسُومٌ ﴿۴۴﴾

ع ۳

اللہ نے فرمایا، یہ ایک سیدھا راستہ ہے جو مجھ تک پہنچتا ہے۔ بے شک جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا زور نہیں چلے گا۔ سوا ان کے جو گمراہوں میں سے تیری پیروی کریں۔ اور ان سب کے لئے جہنم کا وعدہ ہے۔ اس کے سات دروازے ہیں۔ ہر دروازہ کے لئے ان لوگوں کے الگ الگ حصے ہیں — ۴۱-۴۴

صراط مستقیم کی تشریح مجاہد اور حسن اور قتادہ سے یہ مروی ہے کہ اس سے مراد حق کا راستہ ہے جو اللہ کی طرف نکلتا ہے اور اسی پر ختم ہوتا ہے (طريق الحق مرجعها الى الله تعالىٰ واليه تنتهى، تفسیر ابن کثیر) اگر آدمی شرک کی راہ چلے تو وہ راہ خدا تک نہیں پہنچے گی بلکہ شریکوں تک پہنچے گی۔ وہ اگر سرکشی کا طریقہ اختیار کرے تو اس کی منزل آدمی کا اپنا وجود ہوگا نہ کہ خدا۔ اگر وہ بے قید ہو کر زندگی گزارے تو وہ مختلف سمتوں میں بھٹکے گا۔ اس کا سفر خدا پر منتہی نہیں ہو سکتا۔

مگر جب آدمی صرف خدا کو اپنا مرکز توجہ بناتا ہے اور اسی کو سب کچھ سمجھ کر اپنی زندگی کو خدا کے

رخ پر چلاتا ہے تو بالکل قدرتی بات ہے کہ اس کا سفر خدا کی طرف جاری ہو اور بالآخر وہ خدا تک پہنچ جائے۔ خدا آقا در ہے اور انسان عاجز۔ اس لئے خدا اور بندے کے درمیان ایک ہی صحیح نسبت ہے اور وہ عبدیت کی نسبت ہے۔ عبدیت کی روش اختیار کرنا خدا کے ساتھ اپنی صحیح ترین نسبت کو پالینا ہے۔ جس شخص کی نسبت خدا کے ساتھ قائم ہو جائے اس پر شیطان کا زور نہیں چلتا۔ اور جس نے خدا کے ساتھ اپنی نسبت قائم نہ کی اس کی نسبت شیطان کے ساتھ قائم ہو جاتی ہے۔ پھر وہ شیطان کے مشوروں پر چلنے لگتا ہے یہاں تک کہ وہیں پہنچ جاتا ہے جہاں بالآخر شیطان کو پہنچنا ہے۔

جہنم جو شیطان اور اس کے ساتھیوں کا آخری ٹھکانا ہے۔ اس کے سات درجے ہیں۔ (قال عکرمة سبعة ابواب سبعة اطباق، تفسیر ابن کثیر) جہنمی لوگ اپنے اعمال کے فرق کے لحاظ سے سات بڑے گروہوں میں تقسیم کئے جائیں گے اور اس کے مطابق جہنم کے سات طبقات میں سے کسی ایک طبقہ میں جگہ پائیں گے۔

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ۝ ادْخُلُوهَا بِسَلَامٍ آمِنِينَ ۝ وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُتَقَابِلِينَ ۝ لَا يَمَسُّهُمْ فِيهَا نَصَبٌ وَمَا هُمْ مِنْهَا بِمُخْرَجِينَ ۝ نَبِّئْ عِبَادِي أَنِّي أَنَا الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ۝ وَأَنَّ عَذَابِي هُوَ الْعَذَابُ الْأَلِيمُ ۝

بے شک ڈرنے والے باغوں اور چشموں میں ہوں گے۔ داخل ہو جاؤ ان میں سلامتی اور امن کے ساتھ۔ اور ان کے سینوں کی کدورتیں ہم نکال دیں گے، سب بھائی بھائی کی طرح رہیں گے تختوں پر آمنے سامنے۔ وہاں ان کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی اور نہ وہ وہاں سے نکالے جائیں گے میرے بندوں کو خبر دے دو کہ میں بخشنے والا رحمت والا ہوں اور میری سزا دردناک سزا ہے۔ ۵۰-۴۵

جنت کی زندگی بے خوف زندگی ہوگی۔ اس کے مستحق وہ لوگ قرار پائیں گے جنھوں نے دنیا میں خدا کا خوف کیا۔ دنیا میں خدا کا خوف آخرت کی بے خوفی کی قیمت ہے۔

آپس کی رنجشیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک سرکشی کی وجہ سے، دوسری غلط فہمی کی وجہ سے۔ سرکشی کی بنا پر رنجش اور عناد پیدا ہونا سب سے بڑی اجتماعی برائی ہے۔ اہل ایمان کو اسے دنیا ہی میں ختم کر لینا ہے۔ جو لوگ اس کو دنیا میں ختم نہ کریں وہ آخرت میں جہنم کا خطرہ مول رہے ہیں۔

دوسری رنجش وہ ہے جو غلط فہمی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ کبھی ختم ہو جاتی ہے اور

کبھی طرفین کے اخلاص کے باوجود آخر وقت تک باقی رہتی ہے۔ یہ دوسری قسم کی رنجش آخرت میں مکمل طور پر ختم ہوجائے گی۔ کیونکہ آخرت حقیقتوں کے کامل ظہور کی دنیا ہے۔ جب تمام حقیقتیں بے نقاب ہوکر سامنے آجائیں گی تو ایک مخلص آدمی کے لئے کوئی وجہ باقی نہ رہے گی کہ وہ کیوں اپنے بھائی کے خلاف خواہ مخواہ رنجش رکھے۔

جنت کی زندگی اتنی لطیف اور نفیس زندگی ہے کہ موجودہ دنیا میں اس کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم موجودہ دنیا کی لذتیں اور خوشیاں آنے والی لذتوں اور خوشیوں کی دنیا کا ایک ابتدائی تعارف ہیں۔ ہر آدمی سمجھ سکتا ہے کہ جس جنت کا تعارف اتنا لذیذ ہو وہ خود کتنی زیادہ لذیذ ہوگی۔

موجودہ دنیا میں کوئی شخص بالفرض ہر قسم کی لذتیں جمع کرلے تب بھی طرح طرح کی ناخوشگواریاں اس کی ہر لذت کو بے معنیٰ بنادیتی ہیں۔ مگر جنت ایک ایسی جگہ ہے جس کی لذتیں ہر قسم کی ناخوشگواریوں سے پاک ہوں گی۔ حدیث میں آیا ہے کہ اہل جنت سے کہا جائے گا کہ اب تم ہمیشہ صحت مند رہوگے اور کبھی بیمار نہ ہوگے اب تم ہمیشہ جیوگے اور کبھی نہ مروگے۔ اب تم ہمیشہ جوان رہوگے اور کبھی بوڑھے نہ ہوگے۔ اب تم ہمیشہ یہاں رہوگے تم کو یہاں سے کبھی جانا نہ ہوگا (یقال لاهل الجنة ان لكم ان تصحوا و لا تمرضوا ابدا وان لكم ان تعيشوا فلا تموتوا ابدا وان لكم ان تشبوا ولا تهرموا ابدا وان لكم ان تقيموا فلا تظعنوا ابدا)

وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ ﴿٥١﴾ إِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ فَقَالُوا سَلَامًا قَالَ إِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُونَ ﴿٥٢﴾ قَالُوا لَا تَوْجَلْ إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ ﴿٥٣﴾ قَالَ أَبَشَّرْتُمُونِي عَلَىٰ أَنْ مَسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُونَ ﴿٥٤﴾ قَالُوا بَشَّرْنَاكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِنَ الْقَانِطِينَ ﴿٥٥﴾ قَالَ وَمَنْ يَقْنَطُ مِنْ رَحْمَةِ رَبِّهِ إِلَّا الضَّالُّونَ ﴿٥٦﴾

وقف لازم

اور ان کو ابراہیم کے مہمانوں سے آگاہ کرو۔ جب وہ اس کے پاس آئے پھر انھوں نے سلام کیا۔ ابراہیم نے کہا کہ ہم تم لوگوں سے اندیشہ ناک ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اندیشہ نہ کرو ہم تم کو ایک لڑکے کی بشارت دیتے ہیں جو بڑا عالم ہوگا۔ ابراہیم نے کہا کیا تم اس بڑھاپے میں مجھ کو اولاد کی بشارت دیتے ہو۔ پس تم کس چیز کی بشارت مجھ کو دے رہے ہو۔ انھوں نے کہا کہ ہم تمھیں حق کے ساتھ بشارت دیتے ہیں۔ پس تو ناامید ہونے والوں میں سے نہ ہو۔ ابراہیم نے کہا کہ اپنے رب کی رحمت سے گمراہوں کے سوا اور کون ناامید ہوسکتا ہے۔ ۵۶-۵۱

حضرت ابراہیم کے پاس فرشتے انسانی صورت میں آئے۔ سوال وجواب کے دوران انھوں نے کہا کہ ہم حق کے ساتھ آئے ہیں۔ یہ حق (امر واقعی) کیا تھا جس کے لئے فرشتے حضرت ابراہیم کے پاس آئے۔ یہ ایک

غیر معمولی انعام کی بشارت تھی جس کی عام حالات میں توقع نہیں کی جا سکتی۔ انسان پر جب خدا کوئی غیر معمولی انعام کرنا چاہتا ہے تو اس کی تکمیل کے لئے وہ اس کے پاس خصوصی فرشتے بھیجتا ہے۔

اس قسم کے فرشتے پیغمبروں کے پاس بھی آتے ہیں اور غیر پیغمبروں کے پاس بھی۔ فرق یہ ہے کہ پیغمبر کے پاس فرشتے آتے ہیں تو وہ ان کو دیکھتا ہے اور شعوری طور پر واقف ہوتا ہے کہ یہ فرشتے ہیں۔ مگر عام انسان کو اس قسم کا یقینی ادراک نہیں ہوتا۔ البتہ فرشتوں کی خصوصی قربت اس کے اندر خصوصی کیفیات پیدا کر دیتی ہے۔ یہ کیفیات گویا اس کا اشارہ ہوتی ہیں کہ اس وقت آدمی خدا کے بھیجے ہوئے خصوصی فرشتوں کی صحبت میں ہے۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ۝ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ۝ اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ؕ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ اِلَّا امْرَاَتَهٗ قَدَّرْنَآ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝

کہا اے بھیجے ہوئے فرشتو اب تمہاری مہم کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ مگر لوط کے گھر والے کہ ہم ان سب کو بچا لیں گے بجز اس کی بیوی کے کہ ہم نے ٹھیرا لیا ہے کہ وہ ضرور مجرم لوگوں میں رہ جائے گی۔ ۵۷-۶۰

حضرت ابراہیم فلسطین میں رہتے تھے۔ اس کے قریب ہی بحر مردار کے کنارے آپ کے بھتیجے حضرت لوط تھے۔ حضرت لوط نے اس علاقہ میں بسنے والوں پر تبلیغ کی۔ مگر وہ اصلاح قبول کرنے پر راضی نہ ہوئے۔ ان کی سرکشی بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ خدا کا فیصلہ یہ ہوا کہ ان کو ہلاک کر دیا جائے۔ یہ فرشتے اسی خدائی فیصلہ کے نفاذ کے لئے آئے تھے۔

غالباً حضرت لوط کے چند اہل خاندان کے سوا اور کوئی شخص ان پر ایمان نہ لایا۔ گھر سے باہر والوں کے لئے داعی حق کو قبول کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ کیوں کہ ان کے لئے بہت سی نفسیاتی رکاوٹیں حائل ہو جاتی ہیں۔ تاہم خود اپنے خونی رشتہ داروں کے لئے یہ رکاوٹیں نہیں ہوتیں۔ چنانچہ یہ لوگ نسبتاً زیادہ آسانی کے ساتھ داعی حق کے ساتھی بن جاتے ہیں۔

حضرت لوط کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ آپ کی دعوت پر غالباً صرف آپ کی لڑکیاں ایمان لائیں۔ اولاد کو اپنے باپ سے جو خصوصی تعلق ہوتا ہے وہ باپ کی دعوت کو قبول کرنے میں خصوصی مددگار بن جاتا ہے۔ ان لڑکیوں نے حضرت لوط کے ساتھ نجات پائی۔ مگر آپ کی بیوی دل سے آپ کی مومن نہ بن سکی۔ چنانچہ اس کو دوسرے مجرموں کے ساتھ ہلاک کر دیا گیا۔ خدا کے قانون میں محض رشتہ داری کی بنیاد پر کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی جاتی۔

فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ ِۨ الْمُرْسَلُوْنَ ۝ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ۝ قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ

بِمَا كَانُوا فِيهِ يَمْتَرُونَ ﴿٦٣﴾ وَأَتَيْنَاكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ﴿٦٤﴾ فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ اللَّيْلِ وَاتَّبِعْ أَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنكُمْ أَحَدٌ وَامْضُوا حَيْثُ تُؤْمَرُونَ ﴿٦٥﴾ وَقَضَيْنَا إِلَيْهِ ذَٰلِكَ الْأَمْرَ أَنَّ دَابِرَ هَٰؤُلَاءِ مَقْطُوعٌ مُّصْبِحِينَ ﴿٦٦﴾

پھر جب بھیجے ہوئے فرشتے خاندان لوط کے پاس آئے۔ انھوں نے کہا کہ تم لوگ اجنبی معلوم ہوتے ہو۔ انھوں نے کہا کہ نہیں بلکہ ہم تمھارے پاس وہ چیز لے کر آئے ہیں جس میں یہ لوگ شک کرتے ہیں۔ اور ہم تمھارے پاس حق کے ساتھ آئے ہیں، اور ہم بالکل سچے ہیں۔ پس تم کچھ رات رہے اپنے گھر والوں کے ساتھ نکل جاؤ۔ اور تم ان کے پیچھے چلو اور تم میں سے کوئی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے اور وہاں چلے جاؤ جہاں تم کو جانے کا حکم ہے۔ اور ہم نے لوط کے پاس یہ حکم بھیجا کہ صبح ہوتے ہی ان لوگوں کی جڑ کٹ جائے گی۔ ۶۶ - ۶۱

ایک "حق" وہ تھا جس کو لے کر فرشتے حضرت ابراہیم کے پاس آئے تھے۔ دوسرا حق وہ ہے جس کو لے کر وہ حضرت لوط کے پاس پہنچے۔ پہلا حق خدا کے خصوصی انعام کی صورت میں تھا۔ دوسرا حق خدا کی خصوصی سزا کی صورت میں۔

حضرت لوط کے پاس فرشتے انسان کی صورت میں آئے۔ یہ فرشتے اس لئے آئے تھے کہ وہ پیغمبر کو نہ ماننے والوں کے درمیان وہ فیصلہ نافذ کر دیں جو خدا نے ان کی سرکشی کی بنا پر ان کے لئے مقدر کیا ہے۔ ان کی ہدایت کے مطابق حضرت لوط رات کے اندھیرے میں دوسرے اہل ایمان کو لے کر بستی سے نکل گئے۔ اس کے بعد صبح سویرے شدید زلزلہ کے دھماکوں سے وہ پورا علاقہ تل پٹ ہو گیا۔ تمام منکرین انتہائی بے دردی کے ساتھ ھلاک کر دیے گئے۔

یہ ھلاکت کہاں ہوئی۔ یہ ان کی اسی دنیا میں ہوئی جس کو وہ اپنی دنیا سمجھے ہوئے تھے۔ جہاں کی ہر چیز ان کو اپنی ساتھی اور مددگار دکھائی دیتی تھی۔ خدا جب حکم دیتا ہے تو عین وہی نقشہ آدمی کے لئے ہلاکت کا نقشہ بن جاتا ہے جس کو وہ اپنے لئے کامیابی کا نقشہ سمجھے ہوئے تھا۔ جس محل کے اندر اپنے آپ کو پا کر آدمی فخر کرتا ہے اس محل کو اس طرح کھنڈر کر دیا جاتا ہے جیسے کہ وہ ایک ملبہ تھا جو آدمی کے سر پر پٹک دیا گیا۔

وَجَاءَ أَهْلُ الْمَدِينَةِ يَسْتَبْشِرُونَ ﴿٦٧﴾ قَالَ إِنَّ هَٰؤُلَاءِ ضَيْفِي فَلَا تَفْضَحُونِ ﴿٦٨﴾ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَلَا تُخْزُونِ ﴿٦٩﴾ قَالُوا أَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعَالَمِينَ ﴿٧٠﴾ قَالَ هَٰؤُلَاءِ بَنَاتِي إِن كُنتُمْ فَاعِلِينَ ﴿٧١﴾

اور شہر کے لوگ خوش ہو کر آئے۔ اس نے کہا یہ لوگ میرے مہمان ہیں، تم لوگ مجھ کو رسوا نہ کرو۔ اور تم اللہ سے ڈرو اور مجھ کو ذلیل نہ کرو۔ انھوں نے کہا، کیا ہم نے تم کو دنیا بھر کے لوگوں سے منع نہیں کر دیا۔ اس نے کہا یہ میری بیٹیاں ہیں اگر تم کو کرنا ہے۔ ۶۷-۷۱

قوم لوط کی بستی (سدوم) میں جو فرشتے آئے وہ نہایت خوبصورت نوجوان کی صورت میں آئے۔ یہ گویا فحاشی میں ڈوبی ہوئی اس قوم کی جانچ کا آخری پرچہ تھا۔ چنانچہ یہ لوگ اپنی بڑھی ہوئی سرکشی کی بنا پر ان نوجوان پر ٹوٹ پڑے۔ وہ حسب عادت ان کے ساتھ بدکاری کرنا چاہتے تھے۔ مگر انھیں معلوم نہ تھا کہ وہ جن کو پرکشش نوجوان سمجھ رہے ہیں وہ دراصل عذاب کے فرشتے ہیں جو صرف اس لئے آئے ہیں کہ ان کو ہمیشہ کے لئے ذلیل کر کے چھوڑ دیں۔

"میری بیٹیاں" سے مراد قوم کی بیٹیاں ہیں۔ حضرت لوط نے جب دیکھا کہ ظالم لوگ منع کرنے کے باوجود مہمانوں پر ٹوٹے پڑ رہے ہیں تو آپ نے ان سے کہا کہ خدارا، میرے مہمانوں کے معاملہ میں مجھ کو رسوا نہ کرو۔ اگر تم کو کچھ کرنا ہے تو یہ قوم کی لڑکیاں ہیں ان میں سے جس سے چاہو نکاح کر لو۔

لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿٧٢﴾ فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِينَ ﴿٧٣﴾ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّن سِجِّيلٍ ﴿٧٤﴾ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِينَ ﴿٧٥﴾ وَإِنَّهَا لَبِسَبِيلٍ مُّقِيمٍ ﴿٧٦﴾ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ ﴿٧٧﴾

تیری جان کی قسم، وہ اپنی سرمستی میں مدہوش تھے۔ پس دن نکلتے ہی ان کو چنگھاڑ نے پکڑ لیا۔ پھر ہم نے اس بستی کو تلپٹ کر دیا اور ان لوگوں پر کنکر کے پتھر کی بارش کر دی۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں دھیان کرنے والوں کے لئے۔ اور یہ بستی ایک سیدھی راہ پر واقع ہے۔ بے شک اس میں نشانی ہے ایمان والوں کے لئے۔ ۷۲-۷۷

قوم لوط کا یہ حال کیوں ہوا کہ وہ سرکشی میں آپے سے باہر ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے معاملہ کو حضرت لوط کی نسبت سے دیکھا۔ چونکہ وہ حضرت لوط کے مقابلہ میں طاقت ور تھے۔ اس لئے انھوں نے سمجھا کہ ہم جو چاہیں کریں۔ کوئی ہمارا کچھ بگاڑنے والا نہیں۔

اگر وہ معاملہ کو اللہ کی نسبت سے دیکھتے تو صورت حال بالکل برعکس ہوتی۔ اب ان کو معلوم ہوتا کہ ان کی سرکشی سراسر مضحکہ خیز ہے۔ کیوں کہ خدا کے مقابلہ میں کسی بھی طاقت ور کی کوئی حیثیت نہیں۔ چنانچہ عین صبح کو ان پر کڑک چمک کا شدید طوفان آیا۔ خدا نے ہواؤں کو حکم دیا اور انھوں نے قوم لوط کی بستیوں

(سدوم اور عمورہ) پر کنکریوں کی بارش شروع کردی۔ قوم کی قوم تھوڑی دیر میں تباہ ہو کر رہ گئی۔

اس واقعہ میں غور کرنے والوں کے لئے یہ نصیحت ہے کہ اس دنیا میں کسی کا سابقہ حقیقۃً انسان سے نہیں بلکہ خدا سے ہے۔ اگر آدمی اس حقیقت کو جان لے تو اس کی ساری سرکشی ختم ہو جائے۔

وَإِنْ كَانَ أَصْحٰبُ الْأَيْكَةِ لَظٰلِمِينَ ﴿۷۸﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ وَإِنَّهُمَا لَبِإِمَامٍ مُبِينٍ ﴿۷۹﴾ وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِينَ ﴿۸۰﴾ وَآتَيْنٰهُمْ آيٰتِنَا فَكَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ﴿۸۱﴾ وَكَانُوا يَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا آمِنِينَ ﴿۸۲﴾ فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِينَ ﴿۸۳﴾ فَمَا أَغْنٰى عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿۸۴﴾

اور ایکہ والے یقیناً ظالم تھے۔ پس ہم نے ان سے انتقام لیا۔ اور یہ دونوں بستیاں کھلے راستے پر واقع ہیں۔ اور حجر والوں نے بھی رسولوں کو جھٹلایا۔ اور ہم نے ان کو اپنی نشانیاں دیں۔ مگر وہ اس سے منہ پھیرتے رہے اور وہ پہاڑوں کو تراش کر ان میں گھر بناتے تھے کہ امن میں رہیں۔ پس ان کو صبح کے وقت سخت آواز نے پکڑ لیا۔ پس ان کا کیا ہوا ان کے کچھ کام نہ آیا۔ ۷۸ - ۸۴

اصحاب ایکہ سے مراد حضرت شعیب کی قوم ہے۔ اس قوم کا اصل نام بنی مدیان تھا۔ یہ لوگ موجودہ تبوک کے علاقہ میں آباد تھے۔ اصحاب حجر سے مراد قوم ثمود ہے جس کی طرف حضرت صالح مبعوث ہوئے۔ یہ علاقہ موجودہ مدینہ کے شمال میں واقع تھا۔

اصحاب ایکہ کی سرکشی نے ان کو نہ صرف شرک میں مبتلا کیا بلکہ ان کو بدترین اخلاقی جرائم تک پہنچا دیا۔ حضرت شعیب کی یاددہانی کے باوجود انھوں نے سبق نہیں لیا تو خدا نے زمین کو حکم دیا۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ جو زمین ان کے لئے گہوارۂ عیش بنی ہوئی تھی وہی ان کے لئے گہوارۂ عذاب بن گئی۔

قوم ثمود سنگ تراشی کے فن میں ماہر تھے۔ انھوں نے پہاڑوں کو کاٹ کر ان کو شاندار گھروں میں تبدیل کر دیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ انھوں نے اپنی حفاظت کا آخری انتظام کر لیا ہے۔ جب انھوں نے خدا کی پکار کو نظرانداز کر دیا تو خدا نے حکم دیا اور ان کے عظیم مکانات ان کے لئے عظیم قبروں میں تبدیل ہو گئے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ ۗ وَإِنَّ السَّاعَةَ لَآتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ ﴿۸۵﴾ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيمُ ﴿۸۶﴾

اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے حکمت کے بغیر نہیں بنایا اور بلاشبہ قیامت

آنے والی ہے۔ پس تم خوبی کے ساتھ درگذر کرو۔ بے شک تمہارا رب سب کا خالق ہے، جاننے والا ہے۔
۸۵ - ۸۶

زمین و آسمان کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ پورا نظام حد درجہ حکمت کے ساتھ بنایا گیا ہے۔ یہاں ہر چیز ٹھیک ویسی ہی ہے جیسا کہ اسے ہونا چاہئے۔ اس پورے نظام میں صرف انسان ہے جو خلاف حقیقت رویہ اختیار کرتا ہے۔ انسان اور کائنات میں یہ تضاد تقاضا کرتا ہے کہ وہ ختم ہو۔ قیامت کا عقیدہ اس اعتبار سے عین عقلی اور منطقی عقیدہ ہے۔ کیوں کہ قیامت کے سوا کوئی اور چیز نہیں ہے جو اس تضاد کو ختم کرنے والی ہو۔

دعوت الی اللہ کے عمل کا ایک اہم جزء "اعراض" ہے۔ یعنی مخاطب جب غیر متعلق بحث اور جھگڑا چھیڑے تو اس کے ساتھ مشغول ہونے کے بجائے اس سے الگ ہو جانا۔ اعراض کا اصول اختیار کئے بغیر دعوت کا کام موثر طور پر نہیں کیا جا سکتا۔

اعراض کی مصلحت یہ ہے کہ مدعو ہمیشہ داعی سے غیر متعلق جھگڑے چھیڑتا ہے۔ اب اگر داعی یہ کرے کہ ہر ایسے موقع پر مدعو سے لڑ جائے تو غیر متعلق امور پر ٹکراؤ تو خوب ہوگا مگر اصل دعوتی کام بغیر ہوئے پڑا رہ جائے گا۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ﴿۸۷﴾ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾ وَقُلْ اِنِّيْٓ اَنَا النَّذِيْرُ الْمُبِيْنُ ﴿۸۹﴾ كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ ﴿۹۰﴾ الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ ﴿۹۱﴾ فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۹۲﴾ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾

اور ہم نے تم کو سات مثانی اور قرآن عظیم عطا کیا ہے۔ تم اس متاع دنیا کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھو جو ہم نے ان میں سے مختلف لوگوں کو دی ہیں اور ان پر غم نہ کرو اور ایمان والوں پر اپنے شفقت کے بازو جھکا دو اور کہو کہ میں ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ اسی طرح ہم نے تقسیم کرنے والوں پر بھی اتارا تھا جنھوں نے اپنے قرآن کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے۔ پس تیرے رب کی قسم، ہم ان سب سے ضرور پوچھیں گے، جو کچھ وہ کرتے تھے۔ ۸۷ - ۹۳

سات مثانی سے مراد سورہ فاتحہ ہے۔ سورہ فاتحہ پورے قرآن کا خلاصہ ہے اور بقیہ قرآن اس کی تفصیل

یہ قرآن بلاشبہ زمین وآسمان کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ اس کا ہدایت نامہ ہونا اس کے ماننے والوں کے لئے آخرت کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ اور اس کا آخری کتاب ہونا لازم ٹھہراتا ہے کہ ضرور اس کو اپنے مخالفین کے اوپر غلبہ حاصل ہو۔ کیونکہ اگر غلبہ نہ ہو تو وہ آخری کتاب کی حیثیت سے باقی نہیں رہ سکتی۔

داعی کو چاہئے کہ جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کو سوچ کر وہ مایوس نہ ہو۔ بلکہ جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کو دیکھ کر مطمئن ہو اور ان کی دلجوئی اور تربیت میں پوری توجہ صرف کرے۔

قرآن کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے سے مراد تورات کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہے۔ یہود نے اپنی آسمانی کتاب کو عملاً دو حصوں میں بانٹ رکھا تھا اس کی جو تعلیم ان کی خواہشات کے خلاف ہوتی اس کو وہ چھوڑ دیتے اور جو ان کی خواہشوں کے مطابق ہوتی اس کو لے لیتے۔ پہلی قسم کی آیتیں ان کے یہاں صرف تقدس کے خانہ میں پڑی رہتیں۔ ان پر وہ نہ زیادہ دھیان دیتے اور نہ ان کو زیادہ پھیلاتے۔ البتہ دوسری قسم کی آیتوں کی وہ خوب اشاعت کرتے۔ بالفاظ دیگر انھوں نے کتاب خداوندی کو اپنے مفادات کے تابع بنا لیا تھا نہ کہ خدائی احکام کے تابع۔

کسی چیز کو پانے کے دو درجے ہیں۔ ایک ہے اس کے اجزار کو پانا۔ دوسرا ہے اس کو اس کی۔ کلی حیثیت میں پانا۔ درخت کو جب آدمی اس کی کلی حیثیت میں پہچان لے تو وہ کہتا ہے کہ یہ درخت ہے۔ لیکن اگر وہ اس کو اس کی کلی حیثیت میں نہ پہچانے تو وہ تنہ اور شاخ اور پتی اور پھول اور پھل کا ذکر کرے گا۔ وہ اس واحد لفظ کو نہ بول سکے گا جس کے بولنے کے بعد اس کے تمام متفرق اجزار ایک اصل میں جڑ کر وحدت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

یہی معاملہ خدا کی کتاب کا بھی ہے۔ خدا کی کتاب میں بہت سے متفرق احکام ہیں۔ اسی کے ساتھ اس کا ایک کلی اور مرکزی نکتہ ہے۔ جو لوگ خدا کی کتاب میں گم ہوں وہ خدا کی کتاب کو اس کی کلی حیثیت میں پالیں گے۔ اس کے برعکس جو لوگ خود اپنے آپ میں گم ہوں وہ خدا کی کتاب کو دیکھتے ہیں تو خدا کی کتاب ان کو بس مختلف اور متفرق احکام کا مجموعہ دکھائی دیتی ہے۔ وہ ان میں سے اپنے ذوق اور حالات کے مطابق کوئی جزر لے لیتے ہیں اور اس پر اس طرح زور صرف کرنے لگتے ہیں جیسے کہ بس وہی ایک چیز سب کچھ ہو۔

درخت کی جڑ میں پانی دینے سے پورے درخت میں پانی پہنچ جاتا ہے۔ اسی طرح جب خدا کی کتاب کے کلی اور مرکزی پہلو کو زندہ کیا جائے تو اس کے زندہ ہوتے ہی بقیہ تمام اجزار لازمی طور پر زندہ ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر کسی ایک جزر کو لے کر اس پر زور دیا جائے تو اس کی ظاہری دھوم تو مچ سکتی ہے مگر اس سے دین کا حقیقی احیار نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کو زندگی مرکزی پہلو کے زندہ ہونے سے ملتی اور وہ سرے سے زندہ ہی نہیں ہوا۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۴﴾ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ﴿۹۵﴾ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴿۹۷﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۹۸﴾ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴿۹۹﴾

پس جس چیز کا تم کو حکم ملا ہے اس کو کھول کر سنادو اور مشرکوں سے اعراض کرو۔ ہم تمہاری طرف سے ان مذاق اڑانے والوں کے لئے کافی ہیں جو اللہ کے ساتھ دوسرے معبود کو شریک کرتے ہیں۔ پس عنقریب وہ جان لیں گے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں اس سے تمہارا دل تنگ ہوتا ہے۔ پس تم اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو۔ اور سجدہ کرنے والوں میں سے بنو اور اپنے رب کی عبادت کرو۔ یہاں تک کہ تمہارے پاس یقینی بات آجائے۔ ۹۹-۹۴

موجودہ دنیا میں ہر آدمی کو بولنے اور کرنے کی چھوٹ ملی ہوئی ہے۔ اس لئے داعی جب خدا کی طرف بلانے کا کام شروع کرتا ہے تو دوسروں کی طرف سے طرح طرح کی بے معنی باتیں کہی جاتی ہیں۔ لوگ مختلف قسم کے غیر متعلق مسائل چھیڑ دیتے ہیں۔ ایسے مواقع پر داعی کے لئے لازم ہے کہ وہ ان تمام باتوں کے مقابلہ میں اعراض کا طریقہ اختیار کرے۔ اگر وہ ایسے مواقع پر لوگوں سے لڑنے لگے تو وہ دعوت حق کے مثبت کام کو انجام نہیں دے سکتا۔

اس دنیا میں حق کے داعی کے لئے ایک ہی مثبت طریقہ ہے۔ وہ یہ کہ وہ الجھنے والوں سے نہ الجھے۔ اور جو حق اسے ملا ہے اس کا وہ پوری طرح اعلان کر دے۔ ہر اس بات کو وہ خدا کے حوالے کر دے جس سے نمٹنے کی طاقت وہ اپنے اندر نہ پاتا ہو۔ دنیا کے ناموافق حالات جب اس کو ستائیں تو وہ آخرت کی طرف اپنی توجہ کو پھیر دے۔ انسانوں کی بے اعتنائی جب اس کو تنگ دل کرے تو وہ خدا کی یاد میں مشغول ہو جائے۔

سچے داعی کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب اس پر غم کی کوئی حالت طاری ہوتی ہے تو وہ ہمہ تن خدا کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ جو چیز وہ انسانوں سے نہ پاسکا اس کو وہ خدا سے پانے کی کوشش کرتا ہے نماز میں خدا کے سامنے کھڑے ہونے سے اس کو تسکین ملتی ہے۔ آنکھوں سے آنسو بہا کر اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے۔ خدا کے ساتھ سرگوشیوں میں مشغول ہو کر وہ محسوس کرتا ہے کہ اس نے وہ سب کچھ پالیا جو اس کو پانا چاہیے تھا۔

سورۃ النحل مکیۃ وھی مائۃ وثمان وعشرون اٰیۃ وستۃ عشر رکوعا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱﴾ يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اَنْ اَنْذِرُوْۤا اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ﴿۲﴾ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۳﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

آگیا اللہ کا فیصلہ، پس اس کی جلدی نہ کرو۔ وہ پاک ہے اور برتر ہے اس سے جس کو وہ شریک ٹھہراتے ہیں۔ وہ فرشتوں کو اپنے حکم کی روح کے ساتھ اتارتا ہے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے کہ لوگوں کو خبردار کردو کہ میرے سوا کوئی لائق عبادت نہیں۔ پس تم مجھ سے ڈرو۔ اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ وہ برتر ہے اس شرک سے جو وہ کر رہے ہیں۔ ۳-۱

دین کی حقیقت یہ ہے کہ انسان خدا کی ہستی اور کائنات میں اس کی کارفرمائی کو اس طرح جان لے کہ ایک خدا کی ذات ہی اس کو سب کچھ نظر آنے لگے۔ اسی سے وہ ڈرے اور اسی سے وہ ہر قسم کی امید رکھے۔ ایک خدا اس کے قلب و دماغ کی تمام توجہات کا مرکز بن جائے۔

یہی اللہ کو الٰہ بنانا اور اس کی عبادت کرنا ہے۔ انسانوں کے اندر یہی کیفیت پیدا کرنے کے لئے تمام پیغمبر اس دنیا میں آئے۔ جو لوگ اس عبدیت کا ثبوت دیں وہ فیصلہ کے دن کامیاب ٹھہریں گے۔ جو لوگ اس کے خلاف چلیں وہ فیصلہ کے دن نامراد ہو جائیں گے۔ یہ فیصلہ عام انسانوں کے لئے قیامت میں ہوگا۔ مگر پیغمبر کے مخاطبین کے لئے وہ اسی دنیا سے شروع ہو جاتا ہے۔

کائنات میں مکمل وحدت ہے اور اسی کے ساتھ مکمل مقصدیت بھی۔ کائنات کی وحدت اس سے انکار کرتی ہے کہ یہاں ایک خدا کے سوا کسی اور کو مرکز توجہ بنانا کسی کے لئے جائز ہو۔ اور اس کی مقصدیت تقاضا کرتی ہے کہ اس کا خاتمہ ایک بامعنیٰ انجام پر ہونا چاہیے نہ کہ بے معنی انجام پر۔ گویا کائنات کا نظام بیک وقت توحید کی دلیل بھی فراہم کرتا ہے اور آخرت کی دلیل بھی۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ﴿۴﴾ وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۵﴾ وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ

وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ ۝ وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ۭ اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً ۭ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

اس نے انسان کو ایک بوند سے بنایا۔ پھر وہ یکایک کھلم کھلا جھگڑنے لگا اور اس نے چوپایوں کو بنایا ان میں تمہارے لئے پوشاک بھی ہے اور خوراک بھی اور دوسرے فائدے بھی، اور ان میں سے کھاتے بھی ہو۔ اور ان میں تمہارے لئے رونق ہے، جب کہ شام کے وقت ان کو لاتے ہو اور جب صبح کے وقت چھوڑتے ہو اور وہ تمہارے بوجھ ایسے مقامات تک پہنچاتے ہیں جہاں تم سخت محنت کے بغیر نہیں پہنچ سکتے تھے۔ بے شک تمہارا رب بڑا شفیق مہربان ہے۔ اور اس نے گھوڑے اور خچر اور گدھے پیدا کئے تاکہ تم ان پر سوار ہو اور زینت کے لئے بھی اور وہ ایسی چیزیں پیدا کرتا ہے جو تم نہیں جانتے۔ ۸ - ۴

انسان کا آغاز ایک حقیر مادہ سے ہوتا ہے۔ مگر انسان جب بڑا ہوتا ہے تو وہ خدا کا مدمقابل بننے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ خدا کی کائنات میں بے خدا بن کر رہنا چاہتا ہے۔ اگر انسان اپنی ابتدائی حقیقت کو نظر میں رکھے تو کبھی وہ زمین میں سرکشی کا رویہ اختیار نہ کرے۔

انسان کو موجودہ دنیا میں جو نعمتیں حاصل ہیں ان میں سے ایک چوپائے ہیں۔ یہ گویا قدرت کی زندہ مشینیں ہیں جو انسان کی مختلف ضروریات فراہم کرنے میں لگی ہوئی ہیں۔ یہ چوپائے گھاس اور چارہ کھاتے ہیں۔ اور ان کو انسانی خوراک کے لئے گوشت اور دودھ میں تبدیل کرتے ہیں۔ وہ اپنے جسم پر بال اور اون نکالتے ہیں جن سے آدمی اپنی پوشاک بناتا ہے۔ وہ انسان کو اور اس کے سامان کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ پہنچاتے ہیں۔ ان چوپایوں کا گلہ آدمی کے اثاثہ میں شامل ہو کر اس کی حیثیت اور شان میں اضافہ کرتا ہے۔

"اور خدا ایسی چیزیں پیدا کرتا ہے جن کو تم نہیں جانتے"، اس سے مراد وہ فائدے ہیں جو چوپایوں کے علاوہ دوسرے ذرائع سے حاصل ہوتے ہیں۔ ان دوسرے ذرائع کا ایک حصہ قدیم زمانہ میں بھی انسان کو حاصل تھا۔ اور ان کا بڑا حصہ موجودہ زمانہ میں دریافت کرکے انسان ان سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ مثال کے طور پر جانور کی جگہ مشین۔

دنیا میں انسان کے لئے جو بے شمار نعمتیں ہیں وہ انسان نے خود نہیں بنائی ہیں بلکہ وہ خدا کی طرف سے اس کے لئے مہیا کی گئی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دنیا کا خالق ایک مہربان خالق ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ انسان اپنے خالق کا شکرگزار بنے اور اس کا وہ حق ادا کرے جو

محسن ہونے کی حیثیت سے اس کے اوپر لازم آتا ہے۔

وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ ۚ وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝

اور اللہ تک پہنچتی ہے سیدھی راہ۔ اور بعض راستے ٹیڑھے بھی ہیں اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔ ۹

ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرنے کے لئے متعین سڑک ہوتی ہے جو سیدھی منزل تک پہنچاتی ہے۔ سواریاں اپنی منزل مقصود کے مطابق انھیں سیدھی سڑکوں پر چلتی ہیں۔ تاہم ان سڑکوں کے علاوہ اطراف میں بھی راستے اور پگڈنڈیاں ہوتی ہیں۔ اگر کوئی شخص ان متفرق راستوں کو راستہ سمجھ کر ان پر چل پڑے تو وہ کبھی اپنی مطلوبہ منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ وہ اصل منزل کے دائیں بائیں بھٹک کر رہ جائے گا۔

یہی معاملہ خدا تک پہنچنے کا بھی ہے۔ خدا نے انسان کو واضح طور پر بتا دیا ہے کہ وہ کون سا راستہ ہے جو اس کو خدا تک پہنچانے والا ہے۔ یہ راستہ توحید اور تقویٰ کا راستہ ہے۔ جو شخص اس راستہ کو اختیار کرے گا وہ خدا تک پہنچے گا اور جو شخص دوسرے راستوں پر چلے گا وہ اِدھر اُدھر بھٹک جائے گا۔ وہ کبھی اپنے رب تک نہیں پہنچ سکتا۔

دنیا میں ہر چیز خدا کے مقرر کئے ہوئے راستے پر چلتی ہے۔ خدا اگر چاہتا تو اسی طرح انسان کو بھی ایک مقرر راستہ کا پابند بنا دیتا۔ مگر انسان کا تخلیقی منصوبہ دوسری اشیاء کے تخلیقی منصوبہ سے مختلف ہے۔ دوسری اشیاء سے صرف پابندی مطلوب ہے۔ مگر انسان سے جو چیز مطلوب ہے وہ اختیاری پابندی ہے۔ اسی اختیاری پابندی کا موقع دینے کا یہ نتیجہ ہے کہ کوئی شخص سچے راستے پر چلتا ہے اور کوئی اس کو چھوڑ کر خود ساختہ راہوں میں بھٹکنے لگتا ہے۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ ۝ يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝

وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا۔ تم اس میں سے پیتے ہو اور اسی سے درخت ہوتے ہیں جن میں تم چراتے ہو۔ وہ اسی سے تمہارے لئے کھیتی اور زیتون اور کھجور اور انگور اور ہر قسم کے پھل اگاتا ہے۔

بے شک اس کے اندر نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو غور کرتے ہیں۔ ۱۱-۱۰

بادل اوپر فضا سے پانی برساتے ہیں اور نیچے زمین پر اس سے نہایت بامعنی قسم کے نتائج ظاہر ہوتے ہیں "زمین و آسمان" کا اس طرح ہم آہنگ ہو کر عمل کرنا واضح طور پر یہ ثابت کرتا ہے کہ جو خدا آسمان کا ہے وہی خدا زمین کا بھی ہے۔

کائنات کے مختلف حصوں کے درمیان کامل ہم آہنگی ہے۔ یہ ہم آہنگی اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ ساری کائنات کا خالق و مالک صرف ایک ہے۔ کائنات کے موجودہ ڈھانچہ میں ایک سے زیادہ خدا کی کوئی گنجائش نہیں۔ اور جب خالق و مالک حقیقۃً صرف ایک خدا ہے تو اس کے سوا دوسری جس چیز کو بھی معبودیت کا درجہ دیا جائے گا وہ سراسر بے بنیاد ہوگا۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۗ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ۗ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ۗ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ۝

اور اس نے تمہارے کام میں لگا دیا رات کو اور دن کو اور سورج کو اور چاند کو اور ستارے بھی اس کے حکم سے مسخر ہیں۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں عقل مند لوگوں کے لئے۔ اور زمین میں جو چیزیں مختلف قسم کی تمہارے لئے پھیلائیں، بے شک اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو سبق حاصل کریں۔ ۱۳-۱۲

سورج، چاند، ستارے وسیع خلا میں انتہائی صحت کے ساتھ مسلسل گردش کرتے ہیں۔ زمین میں طرح طرح کی مخلوقات (حیوانات، نباتات، جمادات) بے شمار تعداد میں پائی جاتی ہیں۔ اوّل الذکر میں تسخیر امر کا پہلو نمایاں ہے۔ اور ثانی الذکر میں اختلاف الوان کا پہلو۔ ایک منظر خدا کی قدرت کے بے پناہ ہونے کو یاد دلاتا ہے۔ دوسرا منظر خدائی صفات کے ان گنت ہونے کو۔

یہ مناظر اتنے حیرت ناک ہیں کہ جو شخص ان کو نظر ٹھہرا کر دیکھے وہ ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان چیزوں میں اس کو خدا کی عظمت اور اس کی ربوبیت دکھائی دے گی۔ وہ ظاہری واقعات کے اندر چھپے ہوئے غیبی حقائق کو دریافت کرے گا۔ وہ مخلوقات کو دیکھ کر خالق کی معرفت میں ڈوب جائے گا۔

وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۱۴﴾

اور وہی ہے جس نے سمندر کو تمہارے کام میں لگا دیا تاکہ تم اس میں سے تازہ گوشت کھاؤ اور اس سے زیور نکالو جس کو تم پہنتے ہو اور تم کشتیوں کو دیکھتے ہو کہ اس میں چیرتی ہوئی چلتی ہیں اور تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو اور تاکہ تم شکر کرو۔ ۱۴

سمندر میں لوہے کا ٹکڑا ڈالیں تو فوراً ڈوب کر پانی کی تہ میں چلا جائے گا۔ مگر اسی لوہے کو جب جہاز کی شکل دے دی جائے تو وہ بھاری بوجھ لئے ہوئے سمندر میں تیرنے لگتا ہے اور ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچ جاتا ہے۔

یہ خدا کا خاص قانون ہے جس کے ذریعہ اس نے سمندر جیسی مہیب مخلوق کو انسان کے لئے کارآمد بنا رکھا ہے۔ اسی طرح سمندر کے اندر حیرت ناک انتظام کے تحت مچھلی کی صورت میں تازہ گوشت تیار کیا جاتا ہے اور اس کے اندر انسانی زینت کے لئے قیمتی موتی بنتے ہیں۔

خدا کے لئے انتظام دنیا کی دوسری صورتیں بھی ممکن تھیں۔ مثلاً ایسا ہو سکتا تھا کہ زمین پر سمندر نہ ہوں۔ یا انسان جس طرح خشکی پر چلتا ہے اسی طرح وہ سمندر میں چلنے لگے۔ مگر خدا نے ایسا نہیں کیا اس کا مقصد آدمی کے اندر شکرگزاری کا جذبہ پیدا کرنا تھا۔ آدمی جب اپنے پیروں سے سمندر میں نہ چل سکے اور کشتی اور جہاز پر بیٹھے تو نہایت آسانی سے سمندر کو عبور کرنے لگے تو اس کو دیکھ کر قدرتی طور پر آدمی کے اندر شکر کا جذبہ موجزن ہوتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ جس سمندر کو میں اپنے قدموں کے ذریعہ پار نہیں کر سکتا تھا، خدا نے کشتی اور جہاز کے ذریعہ اس کو پار کرنے کا انتظام کر دیا۔ وہ فضا جس میں میں خود نہیں اڑ سکتا تھا، اس میں ہوائی جہاز کے ذریعہ نہایت تیز رفتاری کے ساتھ اڑنے کی صورت پیدا کر دی۔

اس قسم کے فرق نظام قدرت میں اسی لئے رکھے گئے ہیں کہ وہ انسان کے شعور کو جگائیں اور اس کے اندر اپنے رب کے لئے شکر اور احسان مندی کا جذبہ پیدا کریں۔

وَأَلْقَى فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِكُمْ وَأَنْهَارًا وَسُبُلًا لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۱۵﴾ وَعَلَامَاتٍ ۚ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ ﴿۱۶﴾

اور اس نے زمین میں پہاڑ رکھ دئے تاکہ وہ تم کو لے کر ڈگمگانے نہ لگے اور اس نے نہریں اور راستے

بنائے تاکہ تم راہ پاؤ۔ اور بہت سی دوسری علامتیں بھی ہیں، اور لوگ تاروں سے بھی راستہ معلوم کرتے ہیں۔ ۱۶-۱۵

یہاں دو چیزوں کا ذکر ہے۔ پہاڑ ابھار کر زمین پر توازن قائم کرنے کا۔ اور زمین و آسمان میں ایسی علامتیں قائم کرنے کا جو لوگوں کے لئے راستہ معلوم کرنے کا کام دیں۔

جغرافی مطالعہ بتاتا ہے کہ زمین میں جب گہرائیاں پیدا ہوئیں اور ان میں پانی جمع ہو کر سمندر بنے تو زمین ہلنے لگی۔ اس کے بعد خشکی پر اونچے پہاڑ ابھر آئے۔ اس طرح دو طرفہ عمل کے نتیجے میں زمین پر توازن قائم ہو گیا۔ اگر زمین کی سطح پر یہ توازن نہ ہوتا تو انسان کے لئے یہاں زندگی ناممکن یا کم از کم سخت دشوار ہو جاتی۔

اسی طرح انسان کو اپنے سفر اور نقل و حرکت کے لئے علامتوں کی ضرورت ہے جن کی مدد سے وہ سمت کو پہچانے اور بھٹکے بغیر اپنی منزل پر پہنچ جائے۔ اس کا انتظام بھی یہاں کامل طور پر موجود ہے۔ قدیم زمانہ کا انسان دریاؤں اور ستاروں جیسی چیزوں سے اپنے راستے پہچانتا تھا۔ اب وہ مقناطیسی آلات کی مدد سے اپنا راستہ اور دوسری ضروری باتیں معلوم کرتا ہے۔ خشکی اور تری، نیز فضاؤں اور خلاؤں میں تیز رفتار پروازیں اسی کی مدد سے ممکن ہوتی ہیں۔ اگر اس قسم کی علامتیں موجود نہ ہوں تو انسانی سرگرمیاں انتہائی حد تک سمٹ کر رہ جائیں۔

أَفَمَنْ يَخْلُقُ كَمَنْ لَا يَخْلُقُ ۗ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿١٧﴾ وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا ۗ إِنَّ اللَّهَ لَغَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٨﴾ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّونَ وَمَا تُعْلِنُونَ ﴿١٩﴾

پھر کیا جو پیدا کرتا ہے وہ برابر ہے اس کے جو کچھ پیدا نہیں کر سکتا، کیا تم سوچتے نہیں۔ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گنو تو تم ان کو گن نہ سکو گے، بے شک اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔ اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو تم ظاہر کرتے ہو۔ ۱۹-۱۷

دنیا میں جتنی چیزیں ہیں ان میں سے کسی کے اندر تخلیق (عدم سے وجود میں لانے) کی طاقت نہیں۔ اس سے ثابت ہے کہ یہ دنیا اپنی خالق آپ نہیں ہے۔ اس کا خالق وہی ہو سکتا ہے جس کے اندر یہ طاقت ہو کہ ایک چیز جو موجود نہیں ہے اس کو موجود کر دے۔ اس لئے ایک خدا کا عقیدہ عین فطری ہے۔ کائنات کی توجیہ ایک ایسے خدا کو مانے بغیر نہیں ہو سکتی جس کے اندر تخلیق کی

صلاحیت کامل درجہ میں پائی جائے۔

مشرکین نے خدا کے سوا جتنے شریک خدا گھڑے ہیں۔ یا منکرین نے خدا کو چھوڑ کر جن دوسری چیزوں کو خدا کا بدل بنانے کی کوشش کی ہے ان میں سے کوئی بھی نہیں جس کے اندر ذاتی تخلیق کی صلاحیت ہو۔ یہی واقعہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ شرک اور الحاد کے گھڑے ہوئے تمام خدا سراسر فرضی ہیں۔ کیونکہ جس کے اندر تخلیقی قوت نہ ہو اس کے متعلق یہ دعویٰ کرنا سراسر بے بنیاد ہے کہ وہ ایک موجود کائنات کا خدا ہے۔ جو خود ذاتی وجود نہ رکھتا ہو وہ کس طرح دوسری چیز کو وجود دے سکتا ہے۔

خدا کو اپنے بندوں سے سب سے زیادہ جو چیز مطلوب ہے وہ اس کی نعمتوں پر شکر گزاری ہے۔ اگرچہ خدا کی نعمتیں اس سے زیادہ ہیں کہ کوئی شخص بھی ان کا واقعی شکر ادا کر سکے۔ مگر خدا بے نیاز ہے۔ وہ زیادہ نعمت کے لئے تھوڑا شکر بھی قبول کر لیتا ہے۔ تاہم یہ شکر حقیقی شکر ہونا چاہئے نہ کہ محض رسمی قسم کی حمد خوانی۔

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿۲۰﴾ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۲۱﴾ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۲۲﴾ لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ﴿۲۳﴾

اور جن کو لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں وہ کسی چیز کو پیدا نہیں کر سکتے اور وہ خود پیدا کئے ہوئے ہیں۔ وہ مُردہ ہیں جن میں جان نہیں اور وہ نہیں جانتے کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے۔ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے مگر جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل منکر ہیں اور وہ تکبر کرتے ہیں اللہ یقیناً جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں۔ بے شک وہ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ۲۰ - ۲۳

اکثر شرک کی صورت یہ ہوتی ہے کہ پچھلے بزرگوں کو مقدس اور مقرب مان کر لوگ ان کی پرستش کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ یہ پرستش سراسر احمقانہ ہوتی ہے۔ جن مدفون بزرگوں کی بڑی بڑی قبریں بنا کر لوگ ان سے مرادیں مانگتے ہیں وہ خود مُردہ حالت میں عالم برزخ میں

پڑے ہوتے ہیں۔ ان کو خود اپنے بارہ میں بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے، کجا کہ وہ کسی دوسرے کی مدد کریں۔

" وہ تکبر کرتے ہیں"، کا مطلب یہ نہیں کہ وہ خدا سے تکبر کرتے ہیں۔ زمین وآسمان کے خالق سے تکبر کی جرأت کون کرے گا۔ اس سے مراد دراصل خدا کے داعی سے تکبر ہے نہ کہ خود خدا سے تکبر۔ اللہ کا جو بندہ توحید کا داعی بن کر اٹھتا ہے وہ دنیوی اعتبار سے اپنے مخاطبین کے مقابلہ میں ہمیشہ کم ہوتا ہے۔ کیونکہ مخاطب رواجی مذہب کا حامی ہونے کی وجہ سے وقت کے نقشہ میں اونچا درجہ حاصل کئے ہوئے ہوتا ہے جب کہ داعی حق "نئے دین" کا علم بردار ہونے کی بنا پر ان درجات و مقامات سے محروم ہوتا ہے۔ وہ مخاطبین کو اپنے مقابلہ میں مادی اعتبار سے کمتر نظر آتا ہے۔ چنانچہ ان کے اندر برتری کی نفسیات پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اس کی بات کو بے وزن سمجھ کر اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

ایسے لوگوں کا کیس اگرچہ تکبر کا کیس ہوتا ہے لیکن وہ اس کو اصولی اور نظریاتی کیس بنا کر پیش کرتے ہیں۔ مگر اللہ کو لوگوں کی اندرونی نفسیات کا حال خوب معلوم ہے۔ اللہ ان کی اصل حقیقت کے اعتبار سے ان کے ساتھ سلوک کرے گا نہ کہ ان کی ظاہری باتوں کے اعتبار سے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُم مَّاذَا أَنزَلَ رَبُّكُمْ ۙ قَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿٢٤﴾ لِيَحْمِلُوا أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۙ وَمِنْ أَوْزَارِ الَّذِينَ يُضِلُّونَهُم بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ أَلَا سَاءَ مَا يَزِرُونَ ﴿٢٥﴾

ع ۴

اور جب ان سے کہا جائے کہ تمھارے رب نے کیا چیز اتاری ہے تو کہتے ہیں کہ اگلے لوگوں کی کہانیاں ہیں، تاکہ وہ قیامت کے دن اپنے بوجھ بھی پورے اٹھائیں اور ان لوگوں کے بوجھ میں سے بھی جن کو وہ بغیر کسی علم کے گمراہ کر رہے ہیں۔ یاد رکھو بہت برا ہے وہ بوجھ جس کو وہ اٹھا رہے ہیں۔ ۲۵-۲۴

روایات میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ میں نبوت کا دعویٰ کیا اور اس کی خبر دھیرے دھیرے عرب کے دوسرے قبائل میں پہنچی تو وہ ملاقات کے وقت مکہ کے سرداروں سے پوچھتے کہ جس شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے۔ اس کے جواب میں مکہ کے سردار کوئی ایسی بات کہہ دیتے جس سے آپ کی شخصیت اور آپ کے کلام کے بارے میں لوگ شک میں مبتلا ہو جائیں (التفسیر المظہری)

اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ بات کو بگڑے ہوئے الفاظ میں بیان کیا جائے۔ مثلاً قرآن میں

پیغمبروں کا جو ذکر ہے اس کے متعلق وہ "پچھلے پیغمبروں کی تاریخ" کا لفظ بھی بول سکتے تھے مگر اس کو انھوں نے "پچھلے لوگوں کے قصے کہانیوں" کا نام دے دیا۔

دعوت حق سے لوگوں کو اس طرح پھیرنا یا مشتبہ کرنا خدا کے نزدیک بدترین جرم ہے۔ ایسے لوگوں کو قیامت کے دن دگنا عذاب ہوگا۔ کیوں کہ وہ نہ صرف خود گمراہ ہوئے بلکہ دوسروں کو گمراہ کرنے کا ذریعہ بھی بنے۔

قَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَأَتَى اللَّهُ بُنْيَانَهُمْ مِنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَأَتَاهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ﴿٢٦﴾ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يُخْزِيهِمْ وَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَائِيَ الَّذِينَ كُنْتُمْ تُشَاقُّونَ فِيهِمْ ۚ قَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ إِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوءَ عَلَى الْكَافِرِينَ ﴿٢٧﴾

ان سے پہلے والوں نے بھی تدبیریں کیں۔ پھر اللہ ان کی عمارت پر بنیادوں سے آگیا۔ پس چھت اوپر سے ان کے اوپر گر پڑی اور ان پر عذاب وہاں سے آگیا جہاں سے ان کو گمان بھی نہ تھا۔ پھر قیامت کے دن اللہ ان کو رسوا کرے گا اور کہے گا کہ وہ میرے شریک کہاں ہیں جن کے لئے تم جھگڑا کیا کرتے تھے۔ جن کو علم دیا گیا تھا وہ کہیں گے کہ آج رسوائی اور عذاب کافروں پر ہے۔ ۲۷-۲۶

جو لوگ جھوٹی بنیادوں پر بڑائی کا مقام حاصل کئے ہوئے ہیں، وہ جب کسی دعوت حق کو اٹھتا ہوا دیکھتے ہیں تو ان کو اپنے مقام کے لئے خطرہ محسوس ہونے لگتا ہے۔ وہ اپنے مقام کے تحفظ کے لئے یہ تدبیر کرتے ہیں کہ دعوت حق کے خلاف ایسی فتنہ انگیز باتیں پھیلاتے ہیں جن سے عوام اس کے بارے میں مشتبہ ہو جائیں اور اس کے گرد جمع نہ ہو سکیں۔

مگر دعوت حق کے خلاف ایسے لوگوں کی تدبیریں کبھی کامیاب نہیں ہوتیں۔ مخالفین حق اپنی جن بنیادوں پر بھروسہ کر رہے تھے عین وہی بنیادیں اس طرح کمزور ثابت ہوتی ہیں کہ ان کی چھت ان کے اوپر گر پڑتی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی قدرتی زلزلہ ان کی بنیادوں کو ہلا کر ان کی تعمیرات کو ان کے اوپر گرا دیتا ہے۔ کبھی ان کے عوام ان کا ساتھ چھوڑ کر حق کی صفوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اور اس طرح وہ اپنے مددگاروں کو کھو کر مجبور ہو جاتے ہیں کہ دعوت حق کے آگے ہتھیار ڈال دیں۔ یہ انجام اپنی آخری اور تکمیلی صورت میں قیامت میں سامنے آئے گا۔ جب کہ منکرین اپنی ابدی ذلت کو دیکھیں گے اور کچھ نہ کر سکیں گے۔

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۖ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ ۭ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾ فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۲۹﴾

جن لوگوں کو فرشتے اس حال میں وفات دیں گے کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کر رہے ہوں گے تو اس وقت وہ سپر ڈال دیں گے کہ ہم تو کوئی برا کام نہ کرتے تھے، ہاں بیشک اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے تھے۔ اب جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ۔ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہو۔ پس کیسا برا ٹھکانا ہے تکبر کرنے والوں کا۔ ۲۹-۲۸

تکبر سب سے بڑا جرم ہے۔ خدا انسان کی ہر غلطی معاف کر دے گا مگر وہ تکبر کو معاف نہیں کرے گا۔

تکبر کے اظہار کی دو بڑی صورتیں ہیں۔ ایک تکبر وہ ہے جو عام بندوں کے درمیان ظاہر ہوتا ہے۔ ایک آدمی طاقت، دولت اور دیگر ساز وسامان میں اپنے کو دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ پاتا ہے، اس بنا پر وہ اس سے تکبر کرنے لگتا ہے۔

دوسرا زیادہ شدید تکبر وہ ہے جو داعیٔ حق کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ خدا کا ایک بندہ خدا کے سچے دین کی دعوت لے کر اٹھتا ہے۔ اب جو لوگ جھوٹے دین کی بنیاد پر بڑائی کا مقام حاصل کئے ہوئے ہیں، وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے اوپر اس کی زد پڑ رہی ہے۔ وہ سچے دین کے معیار پر بے قیمت قرار پا رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر وہ بھڑ اٹھتے ہیں۔ اور داعیٔ حق کو متکبرانہ نفسیات کے ساتھ نظر انداز کر دیتے ہیں۔

آدمی جب کسی کے مقابلہ میں تکبر کرتا ہے تو اس لئے کرتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ وہ اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ مگر جب موت کے فرشتے آئیں گے اور اس کو بے بس کر دیں گے، اس وقت اس کو معلوم ہوگا کہ معاملہ کسی انسان کا نہیں بلکہ خدا کا تھا۔ انسان کی دوسرے انسان کے مقابلہ میں طاقت ور ہو سکتا ہے مگر خدا کے مقابلہ میں کون طاقت ور ہے۔ خدا کے فرشتے جب انسان کو اپنے قبضہ میں لیتے ہیں تو اس وقت ہر آدمی ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ مگر اللہ کا سچا بندہ وہ ہے جو اس موقع کے آنے سے پہلے خدا کے آگے ہتھیار ڈال دے۔

وَقِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۭ قَالُوْا خَيْرًا ۭ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ

الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۚ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ ۚ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِينَ ﴿٣٠﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ
يَدْخُلُونَهَا تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ ۚ كَذٰلِكَ يَجْزِي
اللّٰهُ الْمُتَّقِينَ ﴿٣١﴾ الَّذِينَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِينَ ۙ يَقُولُونَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ
ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٣٢﴾

اور جو تقویٰ والے ہیں ان سے کہا گیا کہ تمہارے رب نے کیا چیز اتاری ہے تو انھوں نے کہا کہ نیک بات۔ جن لوگوں نے بھلائی کی ان کے لئے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے اور آخرت کا گھر بہتر ہے اور کیا خوب گھر ہے تقویٰ والوں کا۔ ہمیشہ رہنے کے باغ ہیں جن میں وہ داخل ہوں گے، ان کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی۔ ان کے لئے وہاں سب کچھ ہوگا جو وہ چاہیں، اللہ پرہیزگاروں کو ایسا ہی بدلہ دے گا۔ جن کی روح فرشتے اس حالت میں قبض کرتے ہیں کہ وہ پاک ہیں۔ فرشتے کہتے ہیں تم پر سلامتی ہو، جنت میں داخل ہو جاؤ اپنے اعمال کے بدلے میں۔ ۳۲ - ۳۰

جو لوگ کبر کی نفسیات میں مبتلا ہوں وہ خدا کی بات سنتے ہیں تو ان کا ذہن الٹی سمت میں چلنے لگتا ہے۔ اس بنا پر وہ اس سے نصیحت نہیں لے پاتے۔ مگر جس شخص کے دل میں اللہ کا ڈر ہو وہ خدا کی بات کو پوری آمادگی کے ساتھ سنے گا۔ ایسے شخص کے لئے اللہ کا کلام معرفت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اس کو اس کے اندر حقیقت کی جھلکیاں دکھائی دینے لگتی ہیں۔

جنت کی صفت یہ ہے کہ وہاں وہ سب کچھ ہے جو انسان چاہے۔ یہ ایسی چیز ہے جو کبھی کسی انسان کو، حتی کہ بڑے بڑے بادشاہوں کو بھی حاصل نہ ہو سکی۔ موجودہ دنیا میں انسان کی محدودیت اور خارجی حالات کی عدم موافقت کی بنا پر کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ انسان جو کچھ چاہتا ہے اسے حاصل کر لے۔ یہ تصور کہ "جنت میں وہ سب کچھ ہوگا جو انسان چاہے گا"، اتنا پرکیف ہے کہ اس کی خاطر جو قربانی بھی دینی پڑے وہ یقیناً ہلکی ہے۔

هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ أَوْ يَأْتِيَ أَمْرُ رَبِّكَ ۚ كَذٰلِكَ فَعَلَ
الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٣٣﴾
فَأَصَابَهُمْ سَيِّئَاتُ مَا عَمِلُوا وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ﴿٣٤﴾ ع

کیا یہ لوگ اس کے منتظر ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا تمہارے رب کا حکم آجائے۔ ایسا ہی ان سے پہلے والوں نے کیا۔ اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے۔ پھر ان کو اُن کے برے کام کی سزائیں ملیں۔ اور جس چیز کا وہ مذاق اڑاتے تھے اس نے ان کو گھیر لیا۔ ۳۳-۳۴

خدا کی بات انسان کے سامنے اولاً دلائل کے ذریعہ بیان کی جاتی ہے۔ یہ دعوتی مرحلہ ہوتا ہے۔ اگر وہ دلائل کے ذریعہ نہ مانے تو پھر وہ وقت آجاتا ہے جب کہ انفرادی موت یا اجتماعی قیامت کی صورت میں اس کو لوگوں کے سامنے کھول دیا جائے۔

آدمی کے سامنے اگر خدا کی بات دلائل کے ذریعہ آئے اور وہ اس کو نظر انداز کر دے تو گویا وہ اس دوسرے مرحلہ کا انتظار کر رہا ہے جب کہ خدا اور اس کے فرشتے ظاہر ہوجائیں اور آدمی اس بات کو ذلت کے ساتھ ماننے پر مجبور ہوجائے جس کو اسے عزت کے ساتھ ماننے کا موقع دیا گیا تھا مگر اس نے نہیں مانا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ۭ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝

اور جن لوگوں نے شرک کیا وہ کہتے ہیں، اگر اللہ چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی چیز کی عبادت نہ کرتے، نہ ہم اور نہ ہمارے باپ دادا۔ اور نہ ہم اس کے بغیر کسی چیز کو حرام ٹھہراتے۔ ایسا ہی ان سے پہلے والوں نے کیا تھا، پس رسولوں کے ذمہ تو صرف صاف صاف پہنچا دینا ہے۔ ۳۵

غافل انسان اپنے حق سے انحراف کو جائز ثابت کرنے کے لئے جو باتیں کرتا ہے اس میں سے ایک بات یہ ہے کہ جب اس دنیا میں ہر چیز خدا کی مرضی سے ہوتی ہے تو ہمارا موجودہ عمل بھی خدا کی مرضی سے ہے۔ اس کی مرضی نہ ہوتی تو ہم ایسا کر ہی نہ پاتے۔ اگر واقعی خدا کو ہمارے کام پسند نہ ہوتے تو وہ ہمیں ایسا کام کرنے کیوں دیتا۔ پھر تو ایسا ہونا چاہئے تھا کہ جب بھی ہم اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام کریں تو وہ فوراً ہمیں روک دے۔

یہ بات آدمی صرف اس لئے کہتا ہے کہ وہ حق ناحق کے معاملہ میں سنجیدہ نہیں ہوتا۔ اگر وہ

سنجیدہ ہو تو فوراً اس کی سمجھ میں آجائے کہ اس کو موجودہ عمل کی جو چھوٹ ہے وہ امتحان کی وجہ سے ہے نہ کہ خدا کی پسند کی وجہ سے۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ ۖ فَمِنْهُم مَّنْ هَدَى اللَّهُ وَمِنْهُم مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلَالَةُ ۚ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ﴿٣٦﴾ إِن تَحْرِصْ عَلَىٰ هُدَاهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَن يُضِلُّ ۖ وَمَا لَهُم مِّن نَّاصِرِينَ ﴿٣٧﴾

اور ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو، پس ان میں سے کچھ کو اللہ نے ہدایت دی اور کسی پر گمراہی ثابت ہوئی۔ پس زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا۔ اگر تم اس کی ہدایت کے حریص ہو تو اللہ اس کو ہدایت نہیں دیتا جس کو وہ گمراہ کر دیتا ہے اور ان کا کوئی مددگار نہیں۔ ۳۶-۳۷

خدا نے کہیں براہ راست اپنے پیغمبر بھیجے اور کہیں پیغمبر کے نائب اور نمائندہ کے ذریعہ بالواسطہ طور پر اپنا پیغام پہنچانے کا انتظام کیا۔ ان تمام لوگوں نے انسان کو جس چیز کی تلقین کی وہ یہی تھی کہ عبادت کا حق صرف ایک خدا کو ہے۔ شیطان اس عبادت سے انسان کو پھیرنے کی کوشش کرتا ہے، اس لئے آدمی کو چاہئے کہ وہ شیطانی ترغیبات سے بچے۔ ورنہ وہ آدمی کو جھوٹے معبودوں کی پرستش کے راستہ پر ڈال دے گا۔

ہدایت اگرچہ واضح ہے۔ مگر اس کو قبول کرنے یا نہ کرنے کا انحصار تمام تر اس بات پر ہے کہ آدمی اس کے بارے میں کتنا سنجیدہ ہے۔ جو شخص ہدایت پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرے گا اس کو اس کی صداقت کو پانے میں دیر نہیں لگے گی۔ مگر جو شخص اس کے بارہ میں سنجیدہ نہ ہو وہ معمولی معمولی باتوں پر اٹک کر رہ جائے گا۔ ایسا آدمی کبھی حق کو نہیں پا سکتا۔

وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللَّهُ مَن يَمُوتُ ۚ بَلَىٰ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٣٨﴾ لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي يَخْتَلِفُونَ فِيهِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّهُمْ كَانُوا كَاذِبِينَ ﴿٣٩﴾ إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنَاهُ

اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝۴۰

اور یہ لوگ اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں، سخت قسمیں کہ جو شخص مرجائے گا اللہ اس کو نہیں اٹھائے گا۔ ہاں، یہ اس کے اوپر ایک پکا وعدہ ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ تاکہ ان کے سامنے اس چیز کو کھول دے جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں اور انکار کرنے والے لوگ جان لیں کہ وہ جھوٹے تھے۔ جب ہم کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو اتنا ہی ہمارا کہنا ہوتا ہے کہ ہم اس کو کہتے ہیں ہوجا تو وہ ہوجاتی ہے۔ ۴۰-۳۸

موجودہ دنیا کچھ اس ڈھنگ پر بنی ہے کہ یہاں حق اور ناحق اس طرح ثابت نہیں ہو پاتے کہ کسی کے لئے انکار کی گنجائش باقی نہ رہے۔ یہاں آدمی ہر دلیل کو کاٹنے کے لئے کچھ الفاظ پالیتا ہے۔ ہر ثابت شدہ چیز کو مشتبہ کرنے کے لئے وہ کوئی نہ کوئی بات نکال لیتا ہے۔

یہ بات کائنات کے مزاج کے سراسر خلاف ہے۔ مادی علوم میں آدمی کے لئے ممکن ہوتا ہے کہ وہ قطعی نتائج تک پہنچ سکے۔ اسی طرح یہ بھی ضرور ہونا چاہئے کہ انسانی معاملات میں قطعی حقائق کھل کر سامنے آجائیں۔ یہی وہ کام ہے جو قیامت میں انجام پائے گا۔ شاہ عبدالقادر دہلوی لکھتے ہیں ’’اس جہان میں بہت باتوں کا شبہ رہا۔ کسی نے اللہ کو مانا اور کوئی اس کا منکر رہا تو دوسرا جہان ہونا لازم ہے کہ جھگڑے تحقیق ہوں۔ سچ اور جھوٹ جدا ہو اور مطیع اور منکر اپنا کیا پائیں‘‘۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝۴۱ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝۴۲

اور جن لوگوں نے اللہ کے لئے اپنا وطن چھوڑا، بعد اس کے کہ ان پر ظلم کیا گیا، ہم ان کو دنیا میں ضرور اچھا ٹھکانا دیں گے اور آخرت کا ثواب تو بہت بڑا ہے، کاش وہ جانتے۔ وہ ایسے ہیں جو صبر کرتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ ۴۲-۴۱

اکثر مفسرین نے اس آیت کو ان ۸۰ صحابہ سے متعلق مانا ہے جو مکہ میں مخالفین اسلام کی زیادتیوں کا نشانہ بن رہے تھے اور بالآخر اپنا وطن چھوڑ کر حبش چلے گئے۔ یہ واقعہ ہجرت مدینہ سے پہلے مکی دور میں پیش آیا۔

حق کے معاملہ میں ہمیشہ دو گروہ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو حق کو اتنی اہمیت نہ دیں کہ اس کی خاطر ملی ہوئی چیزوں کو چھوڑیں یا اپنی زندگی کا نقشہ بدلیں۔ دوسرے وہ لوگ جو حق کو اس طرح اختیار کرتے ہیں کہ وہی ان کے نزدیک سب سے اہم چیز بن جاتا ہے۔ وہ اس کی خاطر ہر تکلیف کو سہنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ وہ حق کو اپنا اہم ترین مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ وہ ہر دوسری چیز کو چھوڑ سکتے ہیں مگر حق کو نہیں چھوڑ سکتے۔

ظاہر ہے کہ دونوں قسم کے گروہوں کا انجام یکساں نہیں ہو سکتا۔ جن لوگوں نے حق کو اپنی زندگی میں اہم ترین مقام دیا وہ خدا کی ابدی نعمتوں کے مستحق ٹھہریں گے۔ اور جن لوگوں نے حق کو نظر انداز کیا انہیں خدا بھی نظر انداز کر دے گا۔ وہ خدا کے یہاں کوئی عزت کا مقام نہیں پا سکتے۔ اور نہ وہ خدا کی نعمتوں میں حصہ دار بن سکتے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۳﴾ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ ۭ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۴۴﴾

النصف

اور ہم نے تم سے پہلے بھی آدمیوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا، جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے، پس اہل علم سے پوچھ لو اگر تم نہیں جانتے۔ ہم نے بھیجا تھا ان کو دلائل اور کتابوں کے ساتھ۔ اور ہم نے تم پر بھی یاد دہانی اتاری تاکہ تم لوگوں پر اس چیز کو واضح کر دو جو ان کی طرف اتاری گئی ہے اور تاکہ وہ غور کریں۔ ۴۳ - ۴۴

"اہل علم" سے مراد یہاں اہل کتاب ہیں۔ یا وہ لوگ جو پچھلی امتوں اور پچھلے پیغمبروں کے تاریخی حالات کا علم رکھتے ہیں۔ جو چیز ان سے پوچھنے کے لئے فرمائی گئی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا۔ بلکہ یہ کہ پچھلے زمانوں میں جو پیغمبر آئے وہ انسان تھے یا غیر انسان۔ مکہ والے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے انسان ہونے کو اس بات کی دلیل بناتے تھے کہ آپ خدا کے پیغمبر نہیں ہیں۔ ان سے کہا گیا کہ جن قوموں میں اس سے پہلے پیغمبر آتے رہے ہیں (مثلاً یہود) ان سے پوچھ کر معلوم کر لو کہ ان کے یہاں جو پیغمبر آئے وہ انسان تھے یا فرشتے۔

پیغمبر صرف "یاد دہانی" کے لئے آتا ہے، یہ یاد دہانی اصلاً دلائل کے ذریعہ ہوتی ہے۔ تاہم یہ بھی ضروری ہے کہ پیغمبر اپنے آپ کو اس معاملہ میں پوری طرح سنجیدہ ثابت کرے۔ اگر ایک شخص لوگوں کو جنت اور جہنم سے باخبر کرے اور اسی کے ساتھ وہ ایسے کاموں میں مشغول ہو جو جنت

اور جہنم کے معاملہ میں اس کو غیر سنجیدہ ثابت کرتے ہوں تو اس کا دعوتی کام لوگوں کی نظر میں مذاق بن کر رہ جائے گا۔

تاہم دعوت خواہ کتنے ہی اعلیٰ درجہ پر اور کتنے ہی کامل انداز میں پیش کر دی جائے اس سے وہی لوگ فائدہ اٹھائیں گے جو خود بھی اس پر دھیان دیں۔ جو لوگ دھیان نہ دیں وہ کسی بھی حالت میں دعوت حق سے فیضیاب نہیں ہو سکتے۔

أَفَأَمِنَ الَّذِينَ مَكَرُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ يَخْسِفَ اللَّهُ بِهِمُ الْأَرْضَ أَوْ يَأْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ﴿٤٥﴾ أَوْ يَأْخُذَهُمْ فِي تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِينَ ﴿٤٦﴾ أَوْ يَأْخُذَهُمْ عَلَىٰ تَخَوُّفٍ فَإِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوفٌ رَحِيمٌ ﴿٤٧﴾

کیا وہ لوگ جو بری تدبیریں کر رہے ہیں وہ اس بات سے بے فکر ہیں کہ اللہ ان کو زمین میں دھنسا دے یا ان پر عذاب وہاں سے آجائے جہاں سے ان کو گمان بھی نہ ہو یا ان کو چلتے پھرتے پکڑ لے تو وہ لوگ خدا کو عاجز نہیں کر سکتے یا ان کو اندیشہ کی حالت میں پکڑ لے۔ پس تمہارا رب شفیق اور مہربان ہے۔ ۴۵ - ۴۷

یہ آیت مکی دور کے آخری زمانہ کی ہے جب کہ مکہ کے مخالفین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازشیں کر رہے تھے۔ پیغمبر خدا کی زمین پر خدا کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اس لئے پیغمبر کے خلاف اس قسم کی سازش کرنا ایسے ہی لوگوں کا کام ہو سکتا ہے جو خدا کی پکڑ سے بالکل بے خوف ہو چکے ہوں۔

حالانکہ خدا انسان کے اوپر اتنا زیادہ قابو یافتہ ہے کہ وہ چاہے تو انسان کو زمین میں دھنسا دے یا جس مقام کو آدمی اپنے لئے محفوظ سمجھے ہوئے ہے وہیں سے اس کے لئے ایک عذاب پھوٹ پڑے۔ یا خدا ایسا کرے کہ لوگوں کی سرگرمیوں کے دوران انھیں پکڑ لے، پھر وہ اپنے آپ کو اس سے بچا نہ سکیں۔ خدا یہ بھی کر سکتا ہے کہ وہ اس طرح انھیں پکڑے کہ وہ خطرے کو محسوس کر رہے ہوں اور اس کے لئے پوری طرح بیدار ہوں۔

غرض خدا ہر حالت میں انسان کو پکڑ سکتا ہے۔ اگر وہ لوگوں کو شرارتیں کرتے دیکھتا ہے اور اس کے باوجود وہ ان کو نہیں پکڑتا تو لوگوں کو بے خوف نہیں ہونا چاہئے۔ کیوں کہ یہ اس کی مصلحت امتحان ہے نہ کہ اس کا عجز۔

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَىٰ مَا خَلَقَ اللَّهُ مِن شَيْءٍ يَتَفَيَّأُ ظِلَالُهُ عَنِ الْيَمِينِ وَالشَّمَائِلِ سُجَّدًا لِّلَّهِ وَهُمْ دَاخِرُونَ ﴿٤٨﴾ وَلِلَّهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مِن دَابَّةٍ وَالْمَلَائِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ﴿٤٩﴾ يَخَافُونَ رَبَّهُم مِّن فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ﴿٥٠﴾

کیا نہیں دیکھتے کہ اللہ نے جو چیز بھی پیدا کی ہے اس کے سائے دائیں طرف اور بائیں طرف جھک جاتے ہیں، اللہ کو سجدہ کرتے ہوئے، اور وہ سب عاجز ہیں۔ اور اللہ ہی کو سجدہ کرتی ہیں جتنی چیزیں چلنے والی آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ اور فرشتے بھی اور وہ تکبر نہیں کرتے۔ وہ اپنے اوپر اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم ملتا ہے۔ ۵۰-۴۸

انسان ایک ایسی دنیا میں سرکشی کرتا ہے جس میں اس کے چاروں طرف اس کو تابعداری کا سبق دیا جارہا ہے۔ مثال کے طور پر مادی اجسام کے سایے۔ ایک چیز جو کھڑی ہوئی ہو، اس کا سایہ زمین پر پڑ جاتا ہے۔ اس طرح وہ سجدہ کو ممثل کر رہا ہے۔ وہ تمثیلی انداز میں بتاتا ہے کہ انسان کو کس طرح اپنے خالق کے آگے جھک جانا چاہیے۔

فرشتے اگرچہ انسان کو نظر نہیں آتے۔ مگر عظیم کائنات کا اس قدر منظم ہو کر چلنا ثابت کرتا ہے کہ اس کو چلانے کے لئے خدا نے اپنے جو کارندے مقرر کئے ہیں وہ انتہائی طاقت ور ہیں۔ یہ فرشتے غیر معمولی طاقت ور ہونے کے باوجود خدا کے حد درجہ مطیع ہیں۔ اگر وہ حد درجہ مطیع نہ ہوں تو کائنات کا نظام اس درجہ صحت اور یکسانیت کے ساتھ مسلسل چلتا ہوا نظر نہ آئے۔

ایسی حالت میں انسان کے لئے صحیح رویہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے آپ کو خدا کی اطاعت میں دے دے، وہ مکمل طور پر اس کا فرماں بردار بن جائے۔

وَقَالَ اللَّهُ لَا تَتَّخِذُوا إِلَٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۖ إِنَّمَا هُوَ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ فَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ ﴿٥١﴾ وَلَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَهُ الدِّينُ وَاصِبًا ۚ أَفَغَيْرَ اللَّهِ تَتَّقُونَ ﴿٥٢﴾

اور اللہ نے فرمایا کہ دو معبود مت بناؤ۔ وہ ایک ہی معبود ہے تو مجھ ہی سے ڈرو اور اسی کا ہے جو کچھ

آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اور اسی کی اطاعت ہے ہمیشہ۔ تو کیا تم اللہ کے سوا اوروں سے ڈرتے ہو۔
۵۲ - ۵۱

پیغمبروں کے ذریعہ خدا نے انسان کو اس سے ڈرایا ہے کہ وہ ایک معبود کے سوا دوسرے معبود اپنے لئے بنائے۔ اس کائنات کا معبود صرف ایک ہے۔ اسی سے آدمی کو ڈرنا چاہئے۔ اسی کو صرف اسی کی تابعداری کرنا چاہئے۔

اگر آدمی کو اس بات کا صحیح ادراک ہو جائے کہ خدا ہی انسان کا اور تمام موجودات کا خالق ومالک ہے۔ اسی پر اس کی زندگی کا سارا دار ومدار ہے تو اس ادراک کے لازمی نتیجہ کے طور پر جو کیفیت آدمی کے اندر پیدا ہوتی ہے اسی کا نام تقویٰ ہے۔

زمین و آسمان میں خدا ہی کی دائمی اطاعت ہے۔ یہاں ہر چیز مکمل طور پر قانون خداوندی میں جکڑی ہوئی ہے۔ ایک ایسی دنیا میں کسی اور کی عبادت کرنا یا کسی اور سے امید قائم کرنا بالکل بے بنیاد ہے۔ موجودہ کائنات ایسے شرک کو قبول کرنے سے سراسر انکار کرتی ہے۔

وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ إِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَإِلَيْهِ تَجْئَرُوْنَ ۝ ثُمَّ إِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ إِذَا فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ۝ لِيَكْفُرُوْا بِمَا اٰتَيْنٰهُمْ ۚ فَتَمَتَّعُوْا ۫ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ وَيَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا يَعْلَمُوْنَ نَصِيْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ ۚ تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ ۝

اور تمہارے پاس جو نعمت بھی ہے وہ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ پھر جب تم کو تکلیف پہنچتی ہے تو اسی سے فریاد کرتے ہو۔ پھر جب وہ تم سے تکلیف دور کر دیتا ہے تو تم میں سے ایک گروہ اپنے رب کا شریک ٹھہرانے لگتا ہے تاکہ منکر ہو جائیں اس چیز سے جو ہم نے ان کو دی ہے۔ پس چند روزہ فائدے اٹھا لو۔ جلد ہی تم جان لوگے۔ اور یہ لوگ ہماری دی ہوئی چیزوں میں سے ان کا حصہ لگاتے ہیں جن کے متعلق ان کو کچھ علم نہیں۔ خدا کی قسم، جو افترا تم کر رہے ہو اس کی تم سے ضرور باز پرس ہوگی۔
۵۶-۵۳

پوری تاریخ کا تجربہ ہے کہ آدمی جب کسی ایسی مصیبت میں پڑتا ہے جہاں وہ اپنے کو عاجز محسوس کرنے لگے تو اس وقت وہ خدا کو یاد کرنے لگتا ہے۔ منکر اور مشرک دونوں ہی ایسا کرتے ہیں۔ اس تجربہ سے معلوم ہوا کہ خدا کا تصور انسانی فطرت میں پیوست ہے۔ جب تمام دوسرے علائق کٹ جاتے ہیں تو آخری چیز جو باقی رہتی ہے وہ صرف خدا ہے۔

مگر یہ انسان کی عجیب غفلت ہے کہ جب وہ مصیبت سے نجات پاتا ہے تو دوبارہ وہ اپنے فرضی خداؤں کی یاد میں مشغول ہوجاتا ہے۔ وہ ملی ہوئی نعمت کو خدا کے بجائے دوسری چیزوں کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔ اس کو وہ عظیم سبق یاد نہیں رہتا جو خود اس کی فطرت نے چند لمحہ پہلے اس کو دیا تھا۔

شیطان نے فرضی معبودوں کی معبودیت کے عقیدے کو پختہ کرنے کے لئے طرح طرح کی جھوٹی رسمیں عوام میں رائج کر رکھی ہیں۔ ان میں سے ایک ہے — اپنی آمدنی میں فرضی معبودوں کا حصہ نکالنا۔ اس قسم کی رسمیں خدا کی دنیا میں ایک بہتان کی حیثیت رکھتی ہیں کیوں کہ وہ خدا کی طرف سے ملی ہوئی چیز کے لئے غیر خدا کا شکر ادا کرنے کے ہم معنی ہیں۔

وَيَجْعَلُونَ لِلَّهِ الْبَنَاتِ سُبْحَانَهُ ۙ وَلَهُم مَّا يَشْتَهُونَ ﴿٥٧﴾ وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِالْأُنثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ﴿٥٨﴾ يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِن سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ ۚ أَيُمْسِكُهُ عَلَىٰ هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ ۗ أَلَا سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ﴿٥٩﴾ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ۖ وَلِلَّهِ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٦٠﴾

ع ۷ / ۱۴

اور وہ اللہ کے لئے بیٹیاں ٹھہراتے ہیں، وہ اس سے پاک ہے، اور اپنے لئے وہ جو دل چاہتا ہے۔ اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی خوش خبری دی جائے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ جی میں گھٹتا رہتا ہے۔ جس چیز کی اس کو خوش خبری دی گئی ہے اس کے عار سے لوگوں سے چھپا پھرتا ہے۔ اس کو ذلت کے ساتھ رکھ چھوڑے یا اس کو مٹی میں گاڑ دے۔ کیا ہی برا فیصلہ ہے جو وہ کرتے ہیں۔ بری مثال ہے ان لوگوں کے لئے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ اور اللہ کے لئے اعلیٰ مثالیں ہیں۔ وہ غالب اور حکیم ہے۔ ۵۷ - ۶۰

ایک خدا کے سوا انسان نے دوسرے جو معبود بنائے ہیں ان میں دیوتا بھی ہیں اور دیویاں بھی۔ یہاں دیویوں کے عقیدے کو بے بنیاد ثابت کرنے کے لئے ایک عام مثال دی گئی ہے۔ مرد کے مقابلہ میں عورت چونکہ کمزور ہوتی ہے، اس کے علاوہ عام حالات میں وہ اثاثہ سے زیادہ ذمہ داری ہوتی ہے، اس لئے عام طور پر لوگ لڑکے کی پیدائش پر زیادہ خوش ہوتے ہیں۔

اور لڑکی کی پیدائش پر کم۔ اب جب کہ لڑکے اور لڑکی میں یہ فرق ہے تو خدا اگر اپنے لئے اولاد پیدا کرتا تو وہ لڑکیاں کیوں پیدا کرتا۔

انسان کس لئے اولاد چاہتا ہے۔ اس لئے تاکہ وہ اس کے ذریعے سے اپنی کمی کو پورا کر سکے۔ مگر خدا اس طرح کی کمیوں سے بلند ہے۔ خدا کی عظمت و قدرت جو اس کی کائنات میں ظاہر ہوئی ہے وہ بتاتی ہے کہ خدا اس سے بلند و برتر ہے کہ اس کے اندر ایسی کوئی کمی ہو جس کی تلافی کے لئے وہ اپنے یہاں لڑکا اور لڑکی پیدا کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا اگر کمیوں والا ہوتا تو وہ خدا ہی نہ ہوتا۔ خدا اسی لئے خدا ہے کہ وہ ہر قسم کی تمام کمیوں سے پاک ہے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۶۱﴾

اور اگر اللہ لوگوں کو ان کے ظلم پر پکڑتا تو زمین پر کسی جاندار کو نہ چھوڑتا۔ لیکن وہ ایک مقرر وقت تک لوگوں کو مہلت دیتا ہے۔ پھر جب ان کا مقرر وقت آجائے گا تو وہ نہ ایک گھڑی پیچھے ہٹ سکیں گے اور نہ آگے بڑھ سکیں گے۔ ۶۱

ظلم پر گرفت کی ایک شکل یہ ہے کہ جیسے ہی کوئی شخص ظلم کرے فوراً اس کو پکڑ کر سخت سزا دی جائے۔ مگر خدا کا یہ طریقہ نہیں۔ اگر خدا ایسا کرے تو زمین پر کوئی چلنے والا باقی نہ رہے۔ خدا نے ہر شخص اور ہر قوم کو ایک مقرر مہلت دی ہے۔ اس مدت تک وہ ہر ایک کو موقع دیتا ہے کہ وہ اپنے ضمیر کی آواز سے یا خارجی تنبیہات سے چوکنا ہو اور اپنی اصلاح کر لے۔ اصلاح کرتے ہی لوگوں کے پچھلے تمام جرائم معاف کر دئے جاتے ہیں۔ وہ ایسے ہو جاتے ہیں کہ جیسے انھوں نے ابھی نئی زندگی شروع کی ہو۔

دوران مہلت نہ پکڑنا جس طرح خدا نے اپنے اوپر لازم کیا ہے اسی طرح اس نے یہ بھی اپنے اوپر لازم کیا ہے کہ ختم مہلت کے بعد وہ لوگوں کو ضرور پکڑے۔ مہلت ختم ہونے کے بعد کسی کو مزید موقع نہیں دیا جاتا، نہ فرد کو اور نہ قوم کو۔

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ وَتَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى ۭ لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَاَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ ﴿۶۲﴾

اور وہ اللہ کے لیے وہ چیز ٹھہراتے ہیں جس کو اپنے لیے ناپسند کرتے ہیں اور ان کی زبانیں جھوٹ بیان کرتی ہیں کہ ان کے لیے بھلائی ہے۔ لازماً ان کے لیے دوزخ ہے اور وہ ضرور اس میں پہنچا دیے جائیں گے۔ ۶۲

انسانی گمراہیوں کی بہت بڑی وجہ خدا کی خدائی کا کمتر اندازہ کرنا ہے۔ اکثر غلط عقائد اسی لیے بنے کہ خدا کو اس سے کم سمجھ لیا گیا جیسا کہ وہ حقیقۃً ہے۔ حتیٰ کہ لوگوں کا حال یہ ہے کہ جو چیزیں کمتر سمجھ کر وہ خود اپنے لیے پسند نہیں کرتے (مثلاً بیٹیاں یا اپنی ملک میں کسی اجنبی کی شرکت) اس کو بھی وہ خدا کے لیے ثابت کرنے لگتے ہیں۔

خدا کے اسی کمتر اندازہ کا نتیجہ ہے کہ لوگ خدا پر عقیدہ رکھتے ہوئے خدا سے بےخوف رہتے ہیں۔ وہ نہایت معمولی معمولی چیزوں کے بارے میں یہ عقیدہ بنا لیتے ہیں کہ وہ ان کو خدا کی قربت دے دیں گی۔ اور آخرت کی تمام نعمتیں ان کے حصہ میں لکھ دی جائیں گی۔ جو چیز ایک عام انسان کو بھی خوش نہیں کر سکتی اس کے متعلق یہ عقیدہ بنا لیا جاتا ہے کہ وہ خدا کو خوش کر دے گی۔ اس قسم کی کوئی حرکت غلطی پر سرکشی کا اضافہ ہے جس کو خدا کبھی معاف نہیں کر سکتا۔

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰۤى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾ وَمَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۶۴﴾

خدا کی قسم ہم نے تم سے پہلے مختلف قوموں کی طرف رسول بھیجے۔ پھر شیطان نے ان کے کام ان کو اچھے کر کے دکھائے۔ پس وہی آج ان کا ساتھی ہے اور ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ اور ہم نے تم پر کتاب صرف اس لیے اتاری ہے کہ تم ان کو وہ چیز کھول کر سنا دو جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں اور وہ ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں۔ ۶۴ - ۶۳

رسول کی دعوت جب اٹھتی ہے تو سننے والے محسوس کرتے ہیں کہ یہ ان کے رواجی مذہب سے ٹکرا رہی ہے۔ اب چوں کہ وہ اس رواجی مذہب سے مانوس ہوتے ہیں اور اس سے ان کے بہت سے مفادات وابستہ ہو چکے ہوتے ہیں اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ اس سے لپٹے رہیں۔ اس وقت شیطان انھیں ایسے خوب صورت الفاظ سکھا دیتا ہے جس سے وہ پیغمبر کے دین کو چھوڑنے اور رواجی دین پر قائم رہنے کو درست

ثابت کرسکیں۔

آدمی اگر رسول کی بات کو سیدھی طرح مان لے تو یہ خدا کو اپنا ساتھی بنانا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ خوب صورت تاویلات کا سہارا لے تو یہ شیطان کو اپنا ساتھی بنانا ہوگا۔

پیغمبر آخر الزمان کو بھیج کر خدا نے یہ انتظام کیا تھا کہ لوگ مذہبی اختلافات کے جنگل کے درمیان خدا کے سچے راستے کو معلوم کرسکیں۔ یہی صورت حال آج بھی باقی ہے۔ ایک شخص خدا کے راستے کی تلاش میں ہو اور وہ مختلف مذاہب کا مطالعہ کرے تو وہ یقیناً ذہنی انتشار میں پڑ جائے گا۔ کیوں کہ مذاہب کی جو تعلیمات آج موجود ہیں ان میں باہم سخت اختلافات ہیں۔ چنانچہ حق کے متلاشی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کس چیز کو صحیح سمجھے اور کس چیز کو غلط۔

ایسی حالت میں پیغمبر آخر الزماں کا لایا ہوا دین خدا کے بندوں کے لئے رحمت ہے کیونکہ دوسرے ادیان کے برعکس، آپ کا دین ایک محفوظ دین ہے۔ وہ تاریخی اعتبار سے پوری طرح مستند ہے۔ اس بنا پر پورا اعتماد کیا جاسکتا ہے کہ آپ نے جو دین چھوڑا وہی وہ حقیقی دین ہے جو خدا کو اپنے بندوں سے مطلوب ہے۔

وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ۝ ع ۱۴

اور اللہ نے آسمان سے پانی اتارا۔ پھر اس سے زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد زندہ کردیا۔ بے شک اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو سنتے ہیں۔ ۶۵

بارش اور نباتات کا نظام اپنے اندر بہت بڑا سبق رکھتا ہے۔ مختلف عوامل کی متحدہ کارفرمائی سے پانی کے قطرے فضا میں جاکر دوبارہ زمین پر بارش کی صورت میں برستے ہیں۔ پھر یہ بارش حیرت انگیز طور پر زمین پر سبزہ اگانے کا سبب بنتی ہے۔

اس واقعہ میں ایک طرف یہ سبق ہے کہ اس کائنات میں چاروں طرف ایک خدا کی کارفرمائی ہے۔ اگر یہاں کئی خداؤں کی کارفرمائی ہوتی تو کائنات کی مختلف طاقتیں اس طرح ہم آہنگ ہوکر مشترکہ عمل نہیں کرسکتی تھیں۔ کائنات کے نظام کی وحدانیت واضح طور پر اس کا ثبوت ہے کہ اس کا خالق و مالک صرف ایک ہے نہ کہ ایک سے زیادہ۔

دوسرا سبق یہ ہے کہ خدا کی قدرت اتنی عظیم ہے کہ وہ مُردہ جسم میں زندگی پیدا کرسکتی ہے۔ وہ سوکھی ہوئی چیزوں میں ہریالی، رنگ، خوشبو اور مزہ کا باغ اگا سکتی ہے۔

پہلے واقعہ میں توحید کا ثبوت ہے اور دوسرا واقعہ تمثیل کے روپ میں بتا رہا ہے کہ اسی طرح انسانی روحوں کے لئے بھی ایک خدائی بارش ہے، اور وہ وحی ہے۔ جو شخص اپنی مُردہ اور سوکھی ہوئی روح کو نئی زندگی دینا چاہیے، اسے اپنے آپ کو وحی خداوندی کی بارش میں نہلانا چاہیے۔

وَاِنَّ لَكُمۡ فِى الۡاَنۡعَامِ لَعِبۡرَةً‌ ؕ نُّسۡقِيۡكُمۡ مِّمَّا فِىۡ بُطُوۡنِهٖ مِنۡۢ بَيۡنِ فَرۡثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيۡنَ ۞ وَمِنۡ ثَمَرٰتِ النَّخِيۡلِ وَالۡاَعۡنَابِ تَتَّخِذُوۡنَ مِنۡهُ سَكَرًا وَّرِزۡقًا حَسَنًا‌ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰ لِكَ لَاٰيَةً لِّقَوۡمٍ يَّعۡقِلُوۡنَ ۞

اور بے شک تمہارے لئے چوپایوں میں سبق ہے۔ ہم ان کے پیٹوں کے اندر کے گوبر اور خون کے درمیان سے تم کو خالص دودھ پلاتے ہیں، خوش گوار پینے والوں کے لئے اور کھجور اور انگور کے پھلوں سے بھی۔ تم ان سے نشہ کی چیزیں بھی بناتے ہو اور کھانے کی اچھی چیزیں بھی۔ بے شک اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو عقل رکھتے ہیں۔ ۶۷-۶۶

دودھ دینے والے جانوروں میں یہ عجیب خصوصیت ہے کہ وہ جو کچھ کھاتے ہیں وہ ایک طرف ان کے اندر گوبر اور خون بناتا ہے، دوسری طرف اسی کے درمیان سے دودھ جیسا قیمتی سیال بھی بن کر نکلتا ہے جو انسان کے لئے بے حد قیمتی غذا ہے۔ یہی حال درختوں کا ہے۔ ان کے اندر مٹی اور پانی جیسی چیزیں داخل ہوتی ہیں اور پھر ان کے اندرونی نظام کے تحت وہ رس دار پھل کی صورت میں شاخوں میں لٹک پڑتی ہیں۔

یہ واقعات اس لئے ہیں کہ وہ لوگوں کو خدا کی یاد دلائیں۔ آدمی اس میں خدا کی قدرت کی جھلکیاں دیکھنے لگے، حتی کہ اس کا یہ احساس اتنا بڑھے کہ وہ پکار اٹھے کہ خدایا تو جو گوبر اور خون کے درمیان سے دودھ جیسی چیز نکالتا ہے، میرے ناموافق حالات کے اندر سے موافق نتائج ظاہر کر دے۔ تو جو مٹی اور پانی کو پھل میں تبدیل کر دیتا ہے، میری بے قیمت زندگی کو با قیمت زندگی بنا دے۔

"تم ان سے نشہ کی چیز بھی بناتے ہو اور رزق حسن بھی"، اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ دنیا میں خدا نے جو چیزیں پیدا کی ہیں ان کا صحیح استعمال بھی ہے اور ان کا غلط استعمال بھی۔ کھجور اور انگور کو اس کی قدرتی صورت میں کھایا جائے تو وہ صحت بخش غذا ہے جس سے جسم اور عقل کو توانائی حاصل ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اگر انسانی عمل سے اس کو نشہ میں تبدیل کر دیا

جائے تو وہ جسم کو بھی نقصان پہنچاتی ہے اور عقل کو بھی بگاڑ دینے والی ہے۔

وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ ﴿۶۸﴾ ثُمَّ كُلِیْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِیْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ؕ یَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۶۹﴾

اور تمہارے رب نے شہد کی مکھی پر وحی کیا کہ پہاڑوں اور درختوں اور جہاں ٹٹیاں باندھتے ہیں ان میں گھر بنا۔ پھر ہر قسم کے پھلوں کا رس چوس اور اپنے رب کی ہموار کی ہوئی راہوں پر چل۔ اس کے پیٹ سے پینے کی چیز نکلتی ہے، اس کے رنگ مختلف ہیں، اس میں لوگوں کے لئے شفا ہے۔ بے شک اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو غور کرتے ہیں۔ ۶۸ - ۶۹

شہد کی مکھی خدا کی قدرت کا ایک حیرت ناک شاہکار ہے۔ وہ ریاضیاتی قوانین کی پابندی کرتے ہوئے انتہائی معیاری قسم کا چھتہ بناتی ہے۔ پھر خاص منصوبہ بند انداز میں پھولوں کا رس چوس کر لاتی ہے۔ اس کو ایک کامل ترین نظام کے تحت چھتوں میں ذخیرہ کرتی ہے۔ پھر عین قوانین صحت کے مطابق شہد جیسی قیمتی چیز تیار کرتی ہے جو انسان کے لئے غذا بھی ہے اور علاج بھی۔ یہ سب کچھ اتنے عجیب اور اتنے منظم انداز میں ہوتا ہے کہ اس پر موٹی موٹی کتابیں لکھی گئی ہیں پھر بھی اس کا بیان مکمل نہیں ہوا۔

شہد کا یہ معجزاتی کارخانہ تمام انسانی کارخانوں سے زیادہ پیچیدہ اور زیادہ کامیاب ہے۔ تاہم بظاہر وہ ایسی مکھیوں کے ذریعہ چلایا جا رہا ہے جنھوں نے کہیں اس فن کی تعلیم نہیں پائی۔ حتی کہ ان کو اپنے اعمال کا ذاتی شعور بھی حاصل نہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی کروانے والا ہے جو اپنی مخفی ہدایات کے ذریعہ مکھیوں سے یہ سب کچھ کروا رہا ہے۔ شہد کی مکھیوں کو اگر کوئی دیکھنے والا دیکھے تو وہ ان کی حیران کن حد تک بامعنی سرگرمیوں میں خدا کی کارفرمائی کا زندہ مشاہدہ کرنے لگے گا۔

شہد کی مکھی کی مثال دینے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جس طرح شہد کی مکھی زبردست محنت کے ذریعہ پھولوں کا رس چوس کر شہد بناتی ہے جس میں لوگوں کے لئے غذا اور شفا ہے۔ اسی طرح اللہ کے بندوں کو چاہئے کہ وہ کائنات میں غور و فکر کے ذریعہ حکمت کی چیزیں حاصل کریں جو ان کی روح کی غذا بھی ہوں اور ان کی اخلاقی بیماریوں کا علاج بھی۔ جو چیز شہد کی مکھی کے لئے

" رس " ہے وہی انسان کی سطح پر پہنچ کر " معرفت " بن جاتی ہے۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰىكُمْ ۙ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۝۷۰

۱۵

اور اللہ نے تم کو پیدا کیا، پھر وہی تم کو وفات دیتا ہے۔ اور تم میں سے بعض وہ ہیں جو ناکارہ عمر تک پہنچائے جاتے ہیں کہ جاننے کے بعد وہ کچھ نہ جانیں۔ بے شک اللہ علم والا ہے، قدرت والا ہے۔ ۷۰

زندگی کا مظہر جو زمین پر ہے اس کے کئی پہلو انسان کے سامنے آتے ہیں ——— ایک شخص نہیں تھا اس کے بعد وہ دنیا میں موجود ہوگیا، پھر ہر ایک مرتا ہے مگر سب کا ایک وقت نہیں۔ کوئی بچپن میں مرتا ہے، کوئی جوانی میں اور کوئی بڑھاپے میں۔ پھر یہ منظر بھی عجیب ہے کہ عمر کی آخری حد پر پہنچ کر عقل اور علم اور طاقت آدمی سے بالکل رخصت ہوجاتے ہیں۔ انسان موجودہ زمین پر بظاہر آزاد ہے مگر اس کو اپنی کسی چیز پر کوئی اختیار نہیں۔

یہ سب اس لئے ہوتا ہے تاکہ انسان کو بتایا جائے کہ علم اور قدرت دونوں صرف خدا کا حصہ ہیں۔ انسانی زندگی میں مذکورہ قسم کے جو واقعات پیش آتے ہیں ان میں انسان کا اپنا کوئی دخل نہیں۔ وہ ان میں کوئی تبدیلی کرنے پر قادر نہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کسی اور کرنے والے کے ذریعہ ہو رہا ہے۔ بچپن سے موت تک انسان کی زندگی یہ گواہی دیتی ہے کہ یہاں سارا علم بھی صرف خدا کے لئے ہے اور ساری قدرت بھی صرف خدا کے لئے ——— انسان کی مجبوری قادر مطلق خدا کی موجودگی کا ثبوت ہے۔

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰي بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَاۗدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰي مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَاۗءٌ ۭ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝۷۱

اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر روزی میں بڑائی دی ہے۔ پس جن کو بڑائی دی گئی ہے وہ اپنی روزی اپنے غلاموں کو نہیں دے دیتے کہ وہ اس میں برابر ہو جائیں۔ پھر کیا وہ اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں۔ ۷۱

یہاں ایک سادہ سی مثال کے ذریعہ اس عقیدہ کو غلط ثابت کیا گیا ہے کہ خدا کے کچھ شریک ہیں۔ اور اس نے اپنے اختیارات کا ایک حصہ اپنے ان شریکوں کو دے دیا ہے۔ وہ مثال یہ کہ دنیا میں روزی کی تقسیم یکساں نہیں۔ عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ کسی کے پاس بہت زیادہ ہوتا ہے اور کسی کے پاس اتنا کم ہوتا ہے کہ وہ زیادہ والے کے یہاں نوکر اور غلام بننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اب کوئی بھی زیادہ والا ایسا نہیں کرتا کہ اپنی دولت اپنے نوکروں میں بانٹ دے اور اس طرح اپنا اور نوکروں کا فرق مٹا کر یکساں ہو جائے۔ پھر خدا کے بارے میں یہ ماننا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنے اختیارات دوسروں کو تقسیم کر دئے ہیں۔

کوئی شخص اپنی بڑائی کا آپ انکار نہیں کرتا۔ پھر جو بات ایک انسان بھی پسند نہیں کرتا، حالانکہ اس کے پاس کوئی ذاتی اثاثہ نہیں، اس بات کو خدا کیوں پسند کرے گا جس کے پاس جو کچھ ہے اس کا اپنا ذاتی ہے۔ کسی دوسرے کا دیا ہوا نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے تمام عقیدے خدا کی ہستی کی نفی کر رہے ہیں۔ وہ خدا کو غیر خدا کی سطح پر پہنچا رہے ہیں جو کسی حال میں ممکن نہیں۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۭ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَيْـــًٔا وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۷۳﴾ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۴﴾

اور اللہ نے تمہارے لئے تم ہی میں سے بیویاں بنائیں اور تمہاری بیویوں سے تمہارے لئے بیٹے اور پوتے پیدا کئے اور تم کو ستھری چیزیں کھانے کے لئے دیں۔ پھر کیا یہ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں۔ اور وہ اللہ کے سوا ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ ان کے لئے آسمان سے کسی روزی پر اختیار رکھتی ہیں اور نہ زمین سے، اور نہ وہ قدرت رکھتی ہیں۔ پس تم اللہ کے لئے مثالیں نہ بیان کرو۔ بے شک اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ ۷۲ - ۷۴

انسان ایک ایسی مخلوق ہے جس کی بے شمار ضرورتیں ہیں۔ ان تمام ضرورتوں کا انتظام نہایت کامل صورت میں دنیا کے اندر موجود ہے۔

آدمی کو بھوک پیاس لگتی ہے تو یہاں کھانے پینے کی بہترین چیزیں افراط کے ساتھ موجود ہیں۔ آدمی کو شخصی سکون کے لئے بیوی درکار ہے تو یہاں عین اس کے تقاضوں کے مطابق مسلسل عورتیں پیدا کی جارہی ہیں۔ آدمی کے سامنے اپنی نسل کی بقا کا مسئلہ ہے تو یہاں اس کے لئے بیٹے اور پوتے کی پیدائش کا نظام بھی موجود ہے۔

یہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہے۔ مگر ہر زمانے میں انسان نے یہ غلطی کی کہ خدا کی ان نعمتوں کو غیر خدا کی طرف منسوب کر دیا۔ مشرک لوگ ان کو خدا کے سوا دیوی دیوتاؤں یا زندہ مُردہ ہستیوں کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اور جو ملحد ہیں وہ اس کو قوانین فطرت کے اندھے عمل کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ نعمتوں کا یہ نظام اس لئے تھا کہ اس کو دیکھ کر آدمی کے اندر شکر خداوندی کا جذبہ امنڈے۔ مگر خود ساختہ تخیلات کی بنا پر یہ نظام اس کے لئے صرف کفر خداوندی کی غذا دینے کا ذریعہ بن گیا۔

اکثر اعتقادی گمراہیاں مثالوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً انسان کے بیٹے بیٹیاں ہیں تو اسی پر قیاس کرکے سمجھ لیا گیا کہ خدا کے بھی بیٹے بیٹیاں ہیں۔ دنیا میں بڑے لوگوں کے یہاں کچھ افراد ہوتے ہیں جو مقرب اور سفارشی ہوتے ہیں۔ اس کو مثال بنا کر فرض کر لیا گیا کہ خدا کے دربار میں بھی کچھ قربت والے ہیں اور خدا کے یہاں ان کی سفارشیں چلتی ہیں۔

اسی قسم کی تمثیلات سے شرک اور گمراہی کی اکثر قسمیں پیدا ہوئی ہیں۔ مگر یہ خالق کو مخلوق کے اوپر قیاس کرنا ہے جو سراسر جہالت ہے۔ خالق ہر اعتبار سے مخلوق سے مختلف ہے۔ مخلوق کی کوئی مثال خالق پر چسپاں نہیں ہوتی۔ مثال کے ذریعہ بات کو سمجھانا بجائے خود غلط نہیں۔ مگر مثال اسی وقت کارآمد ہے جب کہ آدمی کو اصل اور تشبیہ دونوں کا علم ہو۔ انسان جب خدا کی حقیقت کو نہیں جانتا تو کیسے وہ اس کے مطابق کوئی مثال لاسکتا ہے۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا ۭ هَلْ يَسْتَوٗنَ ۭ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۷۵

اور اللہ مثال بیان کرتا ہے ایک غلام مملوک کی جو کسی چیز پر اختیار نہیں رکھتا، اور ایک شخص ہے جس کو ہم نے اپنے پاس سے اچھا رزق دیا ہے، وہ اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتا ہے۔ کیا یہ یکساں ہوں گے۔ ساری تعریف اللہ کے لئے ہے، لیکن ان میں اکثر لوگ نہیں جانتے۔ ۷۵

مشرکانہ تمثیلات کی غلطی واضح کرنے کے لئے یہاں ایک سادہ اور عام مثال دی گئی ہے۔ ایک شخص ہے جس کے پاس ہر قسم کے اسباب ہیں اور وہ ان کا ذاتی مالک ہے۔ وہیں دوسرا شخص ہے جو کسی بھی چیز کا ذاتی مالک نہیں۔ یہ دونوں آدمی ایک دوسرے سے نوعی طور پر مختلف ہیں۔ اس لئے ایک کی مثال دوسرے پر کبھی چسپاں نہیں ہوگی۔ پھر خدا اور بندے میں یہ نوعی فرق تو اپنے کمال پر پہنچا ہوا ہے۔ ایسی حالت میں کیسے ممکن ہے کہ انسان کے واقعات سے خدا پر مثال قائم کی جائے۔ اس کائنات میں خدا اور دوسری چیزوں کے درمیان جو تقسیم ہے وہ خالق اور مخلوق کی تقسیم ہے نہ کہ خدا اور شریک خدا کی۔ خدا کی ہستی وہ ہستی ہے جو ہر قسم کے کمالات کا ذاتی سرچشمہ ہے۔ جو ہر قسم کی نعمتوں کا تنہا بخشنے والا ہے۔ اس کائنات میں سب سے زیادہ خلاف واقعہ بات یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کے لئے وہ چیزیں فرض کی جائیں جن میں کوئی بھی اس کا شریک نہیں۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۷۶﴾ ع ۱۰ / ۱۶

اور اللہ ایک اور مثال بیان کرتا ہے کہ دو شخص ہیں جن میں سے ایک گونگا ہے، کوئی کام نہیں کر سکتا اور وہ اپنے مالک پر ایک بوجھ ہے۔ وہ اس کو جہاں بھیجتا ہے وہ کوئی کام درست کر کے نہیں لاتا۔ کیا وہ اور ایسا شخص برابر ہو سکتے ہیں جو انصاف کی تعلیم دیتا ہے اور وہ ایک سیدھی راہ پر ہے۔ ۷۶

اوپر آیت نمبر ۷۵ میں خدا کے مقابلے میں شرکاء کا بے حقیقت ہونا بتایا گیا تھا۔ اب آیت ۷۶ میں رسول کے مقابلہ میں ان ہستیوں کا بے حقیقت ہونا واضح کیا جارہا ہے جن کے بل پر آدمی رسول کی ہدایت کو نظر انداز کرتا ہے۔

پیغمبر کو خدا اپنی خصوصی توجہ کے ذریعہ اس شاہراہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو حق کی شاہراہ ہے اور جو براہ راست خدا تک پہنچانے والی ہے۔ پیغمبر اور اس کے ساتھی اس شاہراہ پر خود چلتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس کی طرف رہنمائی دیتے ہیں۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو پیغمبر کے راستے کے سوا دوسرے راستوں کی طرف بلاتے ہیں۔ ان کی مثال اندھے بہرے کی ہے۔ ان کے پاس کان نہیں کہ وہ خدا کی آوازوں کو سنیں، ان کے پاس آنکھ نہیں کہ اس کے ذریعہ خدا کے جلوؤں کو دیکھیں۔ ان کے اندر وہ قلب ودماغ نہیں کہ وہ کائنات میں پھیلی ہوئی خدائی

نشانیوں کو پالیں۔

سمع وبصر وفواد اس لئے دئے گئے تھے کہ ان کے ذریعہ آدمی مخلوقات کے آئینہ میں خالق کا جلوہ دیکھے۔ مگر انسان نے ان کا استعمال یہ کیا کہ وہ خود مخلوقات میں اٹک کر رہ گیا۔

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۷۷﴾

اور آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ باتیں اللہ ہی کے لئے ہیں اور قیامت کا معاملہ بس ایسا ہوگا جیسے آنکھ جھپکنا بلکہ اس سے بھی جلد۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۷۷

عالم ظاہر کے پیچھے ایک غیبی نظام ہے۔ یہ غیبی نظام خدا کا قائم کیا ہوا ہے۔ اپنی محدودیت کی وجہ سے اگرچہ ہم اس غیبی نظام کو نہیں دیکھتے مگر خود اس غیبی نظام پر ہماری ہر چیز بالکل کھلی ہوئی ہے۔ خدا غیب میں رہ کر ہر آن اپنی دنیا کی ہر چھوٹی بڑی چیز کو دیکھ رہا ہے۔ اس کو ہر بات کا صحیح ترین اندازہ ہے۔ خدا جب فیصلہ کرے گا کہ اب انسان کے امتحان کی مدت تمام ہو چکی ہے، عین اس وقت وہ اشارہ کرے گا اور اس کے بعد پلک جھپکتے میں موجودہ نظام یک لخت ٹوٹ جائے گا۔ اور نیا نظام بالکل مختلف بنیادوں پر قائم ہوگا تاکہ ہر ایک کو اس اصل مقام پر پہنچا دیا جائے جہاں وہ باعتبار واقعہ تھا نہ کہ اس مقام پر جہاں وہ مصنوعی طور پر اپنے آپ کو بٹھائے ہوئے تھا۔

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَـيْـــًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـــِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۸﴾

اور اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے نکالا، تم کسی چیز کو نہ جانتے تھے۔ اور اس نے تمہارے لئے کان اور آنکھ اور دل بنائے تاکہ تم شکر کرو۔ ۷۸

انسان جب پیدا ہوتا ہے تو وہ بالکل عاجز اور بے کچھ بچہ ہوتا ہے۔ مگر بڑا ہو کر وہ ان حیرت انگیز قوتوں کا مالک بن جاتا ہے جن کو کان اور آنکھ اور عقل کہتے ہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ آدمی جس روز پیدا ہوا اسی روز اس کے اندر وہ تمام صلاحیتیں موجود ہوں جو بڑی عمر کو پہنچ کر اس کے اندر پیدا ہوتی ہیں۔

مگر ایسا نہیں کیا گیا۔ صرف اس لئے کہ انسان کے اندر شکر کا جذبہ پیدا ہو۔ اوّلاً وہ اپنی ابتدائی بے بسی کی حالت کو دیکھے اور پھر یہ دیکھے کہ بعد کو کس طرح وہ ایک ترقی یافتہ حالت کو پہنچ گیا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ خدا کی ملی ہوئی نعمت کا احساس کرے اور خدا کی احسان مندی کے جذبہ سے سرشار ہو جائے۔

کسی آدمی کے اندر یہ کیفیت صرف اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کہ وہ خدا کی دی ہوئی قوتوں کو صحیح طور پر استعمال کرے۔ اس کے کان اور آنکھ اور دل بس ظاہری دنیا میں اٹک کر نہ رہ جائیں بلکہ وہ اس کے لئے ایسے روشندان بن جائیں جن کے ذریعہ جھانک کر کوئی شخص غیب کی جھلکیوں کو دیکھ لیتا ہے۔

أَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرَاتٍ فِي جَوِّ السَّمَاءِ مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا اللَّهُ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿٧٩﴾ وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ بُيُوتِكُمْ سَكَنًا وَجَعَلَ لَكُمْ مِنْ جُلُودِ الْأَنْعَامِ بُيُوتًا تَسْتَخِفُّونَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ إِقَامَتِكُمْ ۙ وَمِنْ أَصْوَافِهَا وَأَوْبَارِهَا وَأَشْعَارِهَا أَثَاثًا وَمَتَاعًا إِلَىٰ حِينٍ ﴿٨٠﴾

کیا لوگوں نے پرندوں کو نہیں دیکھا کہ آسمان کی فضا میں مسخر ہو رہے ہیں۔ ان کو صرف اللہ تھامے ہوئے ہے۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائیں۔ اور اللہ نے تمہارے لئے تمہارے گھروں کو مقام سکون بنایا اور تمہارے لئے جانوروں کی کھال کے گھر بنائے جن کو تم اپنے کوچ کے دن اور قیام کے دن ہلکا پاتے ہو۔ اور ان کی اون اور ان کے رویں اور ان کے بالوں سے گھر کا سامان اور فائدے کی چیزیں ایک مدت تک کے لئے بنائیں۔ ۸۰ - ۷۹

پرندوں کا فضا میں اڑنا قدرت کی ایک عظیم منصوبہ بندی کے تحت ممکن ہوتا ہے۔ پرواز کے مقصد کے لئے پرندوں کی نہایت موزوں بناوٹ، جس کی مشینی نقل ہوائی جہاز کی صورت میں کی گئی ہے۔ زمین کے اوپر ہوا جو پرندوں کے لئے ایسی ہی ہے جیسے کشتی کے لئے سمندر۔ زمینی کشش کی وجہ سے ہوا کا مسلسل زمین کے اوپر قائم رہنا وغیرہ۔ یہ اعلیٰ انتظامات اگر نہ ہوں تو فضا میں پرندوں کا اڑنا ممکن نہ ہو سکے۔

اس واقعہ کو گہری نظر سے دیکھا جائے تو آدمی کو ایسا معلوم ہوگا کہ گویا وہ خدا کو اپنی کائنات میں عمل کرتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ وہ تخلیقی نظام کے اندر اس کے خالق کو پا جائے گا۔ وہ مصنوعات کے درمیان صانع کا جلوہ دیکھ لے گا۔

یہی معاملہ خود انسان کا ہے۔ گھر آدمی کے لئے سکون کا مقام ہے۔ لیکن گھر کیسے بنتا ہے۔ خدا کے بہت سے انتظامات ہیں جن کی وجہ سے زمین پر ایک گھر کا قیام ممکن ہوتا ہے۔ وہ تمام تعمیری اجزا جن کے ذریعہ ایک مکان بنتا ہے، پیشگی طور پر ہماری دنیا میں رکھ دئے گئے ہیں۔ زمین میں نہایت مناسب مقدار میں قوت کشش ہے جس کی وجہ سے مکانات زمین کی سطح پر جمے کھڑے ہوتے ہیں۔ ایسا نہ ہو تو ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑتی ہوئی زمین کے اوپر مکانات اڑ جائیں۔ اسی طرح وہ چیزیں جن سے آدمی ہلکے پھلکے خیمے بناتا ہے اور وہ چیزیں جن میں یہ صلاحیت ہے کہ انسان کے لباس کی صورت میں ڈھل جائیں اور اس کی زینت کا اور موسموں میں اس کی جسمانی حفاظت کا کام دیں۔

اس طرح کی تمام چیزیں اس لئے ہیں کہ آدمی کے اندر اپنے رب کی نعمتوں پر شکر کا جذبہ بیدار ہو، وہ اس کی عظمت وقدرت کے احساس سے اس کے آگے گر پڑے۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ﴿۸۱﴾

اور اللہ نے تمہارے لئے اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں کے سائے بنائے اور تمہارے لئے پہاڑوں میں چھپنے کی جگہ بنائی اور تمہارے لئے ایسے لباس بنائے جو تم کو گرمی سے بچاتے ہیں اور ایسے لباس بنائے جو لڑائی میں تم کو بچاتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تم پر اپنی نعمتیں پوری کرتا ہے تاکہ تم فرماں بردار بنو۔ ۸۱

چھت کا اور دوسری چیزوں کا سایہ کتنی اہمیت رکھتا ہے، اس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب آدمی اپنے آپ کو کسی ایسے صحرا میں پائے جہاں کسی قسم کا کوئی سایہ نہ ہو۔ سورج کی حد درجہ حسابی حرارت کا یہ نتیجہ ہے کہ ایک معمولی آڑ بھی ہمیں سایہ دے دیتا ہے۔ حالانکہ اگر سورج کی حرارت موجودہ حرارت سے زیادہ ہوتی، جو یقینی طور پر ممکن تھی، تو ہمارے تمام سایہ دار گھر آگ کی بھٹی میں تبدیل ہوجاتے۔ پہاڑ جیسی سخت چٹانوں میں ایسے شگاف ہونا جہاں آدمی اپنی پناہ گاہیں بنا سکے۔ دنیا

میں ایسی چیزیں موجود ہونا جو باریک ریشوں میں ڈھل کر آدمی کو اس کے جسم کے بچاؤ کے لئے لباس دیں۔ اس قسم کی چیزیں آدمی جیسی مخلوق کے لئے اتنی اہم ہیں کہ اگر وہ نہ ہوتیں تو زمین پر نہ انسان کا وجود ہوتا اور نہ کسی انسانی تہذیب کا۔

یہ معرفت بیک وقت آدمی کے اندر دو چیزیں پیدا کرتی ہے۔ ایک، خدا کے لئے احسان مندی کا جذبہ، کیوں کہ وہی ہے جس نے آدمی کو ایسی قیمتی نعمتیں دیں، دوسرے، اندیشہ کا جذبہ، کیوں کہ خدا اگر اپنی نعمتوں کو واپس لے لے تو اس کے بعد آدمی کے پاس ان کی تلافی کی کوئی صورت نہیں۔ یہ احساسات جب آدمی کے اندرون کو اس طرح جگا دیں کہ وہ اپنے رب کے سامنے گر پڑے تو اسی کا نام عبادت ہے۔

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۸۲﴾ يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَأَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۳﴾ ع ۱۷

پس اگر وہ اعراض کریں تو تمہارے اوپر صرف صاف صاف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔ وہ لوگ خدا کی نعمت کو پہچانتے ہیں پھر وہ اس کے منکر ہو جاتے ہیں اور ان میں اکثر ناشکر ہیں۔ ۸۳-۸۲

جو شخص بھی کائنات کا مطالعہ کرتا ہے، خواہ وہ ایک عام آدمی ہو یا ایک سائنس داں ہو، اس پر ایسے لمحات گذرتے ہیں، جب کہ مخلوقات پر غور کرتے ہوئے اس کا ذہن خالق کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اس کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ حیرت ناک چیزیں نہ تو اپنے آپ بن گئی ہیں اور نہ مفروضہ معبودوں نے ان کو بنایا ہے۔ ان کا بنانے والا یقیناً خدائے بزرگ و برتر ہے۔

مگر خدا کو ماننا لازمی طور پر آدمی کی اپنی زندگی میں تبدیلی کا تقاضا کرتا ہے۔ وہ آدمی سے اس کی آزادی چھین لیتا ہے۔ اس لئے آدمی پر جب یہ تجربہ گزرتا ہے تو وقتی تاثر کے بعد وہ اپنے ذہن کو اس طرف سے ہٹا دیتا ہے۔ وہ خدا کو پاکر بھی خدا کو چھوڑ دیتا ہے۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيْدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَإِذَا رَأَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۵﴾

اور جس دن ہم ہر امت میں ایک گواہ اٹھائیں گے۔ پھر انکار کرنے والوں کو ہدایت نہ دی جائے گی۔ اور نہ ان سے توبہ لی جائے گی۔ اور جب ظالم لوگ عذاب کو دیکھیں گے تو وہ عذاب نہ ان سے ہلکا کیا جائے گا اور نہ انھیں مہلت دی جائے گی۔ ۸۴ - ۸۵

پیغمبر اور پیغمبر کے سچے پیروؤں کا قوموں کے سامنے حق کا داعی بن کر اٹھنا بظاہر ایک معمولی واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ دنیا نے عام طور پر ان واقعات کو اتنا کم اہم سمجھا ہے کہ ایک پیغمبر آخر الزمان کو چھوڑ کر کوئی بھی دوسرا پیغمبر نہیں جس کا کام اس کی معاصر تاریخوں میں قابل ذکر قرار پایا ہو۔

مگر یہ کام اس وقت بے حد اہم اور بے حد سنگین بن جاتا ہے جب کہ اس کو آخرت سے جوڑ کر دیکھا جائے۔ کیونکہ آخرت کی عظیم عدالت میں یہی پیغمبر اور داعی خدا کے گواہ ہوں گے اور انھیں کی گواہی پر لوگوں کے ابدی مستقبل کا فیصلہ کیا جائے گا۔ جن افراد کے بارہ میں گواہ یہ کہیں گے کہ انھوں نے حق کو مانا اور اپنے آپ کو اس کی اطاعت میں دیا وہ وہاں کی ابدی دنیا میں جنتی قرار پائیں گے۔ اور جن کے بارہ میں خدا کے یہ گواہ بتائیں گے کہ انھوں نے حق کا انکار کیا اور اس کی اطاعت پر راضی نہیں ہوئے وہ ابدی جہنم میں ڈال دیے جائیں گے۔

کسی قوم میں خدا کے سچے داعی اٹھیں اور وہ قوم ان کی بات نہ مانے تو یہ اس کے مجرم ہونے کا قطعی ثبوت ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ قوم یہ کہنے کا حق کھو دیتی ہے کہ ہم کو قیامت اور جنت دوزخ کی خبر نہ تھی، اس لئے ہم کو آج کے دن کی سزا سے معاف رکھا جائے۔

وَإِذَا رَأَى الَّذِينَ أَشْرَكُوا شُرَكَاءَهُمْ قَالُوا رَبَّنَا هَٰؤُلَاءِ شُرَكَاؤُنَا الَّذِينَ كُنَّا نَدْعُوا مِنْ دُونِكَ ۖ فَأَلْقَوْا إِلَيْهِمُ الْقَوْلَ إِنَّكُمْ لَكَاذِبُونَ ﴿٨٦﴾ وَأَلْقَوْا إِلَى اللَّهِ يَوْمَئِذٍ السَّلَمَ ۖ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٨٧﴾ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ زِدْنَاهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوا يُفْسِدُونَ ﴿٨٨﴾

اور جب مشرک لوگ اپنے شریکوں کو دیکھیں گے تو کہیں گے کہ اے ہمارے رب، یہی ہمارے وہ شرکاء ہیں جن کو ہم تجھے چھوڑ کر پکارتے تھے۔ تب وہ بات ان کے اوپر ڈال دیں گے کہ تم جھوٹے ہو۔ اور اس دن وہ اللہ کے آگے جھک جائیں گے اور ان کی افترا پردازیاں ان سے گم ہو جائیں گی۔ جنھوں نے انکار کیا اور لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکا، ہم ان کے عذاب پر عذاب کا اضافہ کریں گے بوجہ اس فساد کے جو وہ

کرتے تھے۔ ۸۸-۸۶

قیامت میں یہ حقیقت آخری حد تک کھل جائے گی کہ اس کائنات میں ایک خدا کے سوا کسی کے پاس کوئی طاقت نہیں۔ اس وقت جب پوجنے والے اپنے ان معبودوں کو دیکھیں گے جن کو وہ پوجتے تھے تو وہ ایسی باتیں کہیں گے جن سے ان کی برأت ثابت ہوتی ہو۔ گویا کہ یہ جھوٹے معبود دھوکا دے کر ان سے غیر خدا کی پرستش کراتے رہے۔ مگر وہ معبود فوراً اس کی تردید کریں گے اور کہیں گے کہ یہ تمہاری اپنی سرکشی تھی۔ تم نے خدا کی تابع داری سے بچنے کے لئے بطور خود جھوٹے معبود گھڑے اور ان کے نام پر اپنے خواہش پرستانہ مذہب کو جائز ثابت کرتے رہے۔

ایک وہ شخص ہے جو حق کی دعوت کو قبول نہیں کرتا۔ دوسرا وہ ہے جو اسی کے ساتھ دوسروں کو بھی طرح طرح سے روکنے کی کوشش کرتا ہے۔ پہلی روش اگر گمراہی ہے تو دوسری روش گمراہی کی قیادت۔ گمراہ لوگوں کو جو عذاب ہوگا، اس کا دگنا عذاب ان لوگوں کو ملے گا جو دنیا میں گمراہی کی قیادت کرتے رہے۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِي كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا عَلَيْهِم مِّنْ أَنفُسِهِمْ ۖ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيدًا عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ ۚ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ ﴿٨٩﴾

ع ۱۲ / ۱۸

اور جس دن ہم ہر امت میں ایک گواہ انھیں میں سے ان پر اٹھائیں گے اور تم کو ان لوگوں پر گواہ بنا کر لائیں گے اور ہم نے تم پر کتاب اتاری ہے ہر چیز کو کھول دینے کے لئے۔ وہ ہدایت اور رحمت اور بشارت ہے فرماں برداروں کے لئے۔ ۸۹

اللہ تعالیٰ کا طریقہ یہ ہے کہ کسی قوم پر انذار و تبشیر کا کام خود اس قوم کے کسی منتخب فرد کے ذریعہ انجام دلاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی قوم میں جو پیغمبر آئے وہ خود اسی قوم کے ایک فرد تھے۔ اب امت مسلمہ کو قیامت تک اسی طرح ہر قوم کے اندر دعوت و شہادت کی ذمہ داری انجام دینا ہے۔

یہ دنیا میں قوموں کو دعوت دینے والے آخرت میں قوموں کے اوپر خدا کے گواہ ہوں گے۔ انھیں کی گواہی پر قوم کے ہر فرد کے لئے ثواب یا عذاب کا فیصلہ کیا جائے گا۔

قرآن میں ہر چیز کا بیان ہے ــــ اس کا مطلب یہ نہیں کہ دوسری آسمانی کتابوں میں ہر چیز کا بیان نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر آسمانی کتاب جو خدا کی طرف سے آئی اس میں ہر چیز کا بیان موجود

تھا۔ تاہم اس ہر چیز کا تعلق دنیا کے علوم و فنون سے نہیں ہے بلکہ آخرت کی کامیابی اور ناکامی کے علم سے ہے۔ وہ تمام چیزیں جو آخرت میں کسی کو کامیاب یا ناکام بنانے والی ہیں وہ سب اصولی طور پر قرآن میں بیان کر دی گئی ہیں۔ اب جو لوگ اس سے ہدایت لیں گے، ان کے لئے وہ ایک عظیم نعمت بن جائے گی۔ اور جو لوگ اس سے ہدایت نہ لیں ان کے حصہ میں صرف یہ آئے گا کہ اس کا انکار کرکے اپنی ہلاکت کے لئے وجہ جواز فراہم کریں۔

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿٩٠﴾

بے شک اللہ حکم دیتا ہے عدل کا اور احسان کا اور قرابت داروں کو دینے کا۔ اور اللہ روکتا ہے فحشا ر سے اور منکر سے اور سرکشی سے۔ اللہ تم کو نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاددہانی حاصل کرو۔ ۹۰

دنیا میں کوئی اللہ کا بندہ کس طرح رہے، اس کا واضح بیان اس آیت میں موجود ہے۔ اس کی اسی اہمیت کی بنا پر خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبد العزیز نے اس آیت کو جمعہ کے ہفتہ وار خطبہ میں شامل کیا تھا۔

پہلی چیز جس کا ایک شخص کو اہتمام کرنا ہے وہ عدل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص کا جو حق دوسرے پر آتا ہے وہ اس کو پوری طرح ادا کرے، خواہ صاحب حق کمزور ہو یا طاقت ور، اور خواہ وہ پسندیدہ شخص ہو یا ناپسندیدہ۔ حقوق کی ادائیگی میں صرف حق کا لحاظ کیا جائے نہ کہ دوسرے اعتبارات کا۔

دوسری چیز احسان ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ حقوق کی ادائیگی میں عالی ظرفی کا طریقہ اپنایا جائے۔ انصاف کے ساتھ مروت کو جمع کیا جائے۔ قانونی دائرہ سے آگے بڑھ کر لوگوں کے ساتھ فیاضی اور ہمدردی کا رویہ اختیار کیا جائے۔ آدمی کے اندر یہ حوصلہ ہو کہ حتی الامکان وہ اپنے لئے اپنے حق سے کم پر راضی ہو جائے، اور دوسرے کو اس کے حق سے زیادہ دینے کی کوشش کرے۔

تیسری چیز ایتاء ذی القربیٰ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جس طرح اپنے بیوی بچوں کی ضرورت کو دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے اور اس کو پورا کرتا ہے، اسی طرح وہ دوسرے قریبی لوگوں کی ضرورت کے بارے میں بھی حساس ہو۔ ہر صاحب استعداد شخص اپنے مال پر صرف اپنا اور اپنے گھر والوں ہی کا حق نہ سمجھے بلکہ اپنے رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کو بھی وہ اپنی ذمہ داری میں شامل کرے۔

اس کے بعد آیت میں تین چیزوں سے منع فرمایا گیا ہے۔

پہلی چیز فحشا ہے۔ اس سے مراد کھلی ہوئی اخلاقی برائیاں ہیں۔ یعنی وہ برائیاں جن کا برا ہونا خود اپنے ضمیر کے تحت ہر آدمی کو معلوم ہوتا ہے۔ اور لوگ عام طور پر اس کو شرمناک سمجھتے ہیں۔

دوسری چیز منکر ہے۔ منکر معروف کا الٹا ہے۔ معروف ان اچھی باتوں کو کہتے ہیں جن کو ہر معاشرے میں اچھا سمجھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس منکر سے مراد وہ نامعقول کام ہیں جو عام اخلاقی معیار کے خلاف ہیں۔ اس میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جن کو انسان عام طور پر برا جانتے ہیں اور جن کو قبول کرنے سے انسان کی فطرت انکار کرتی ہے۔

تیسری چیز بغی ہے۔ اس کے معنی ہیں حد سے تجاوز کرنا۔ اس میں ہر وہ سرکشی داخل ہے جب کہ آدمی اپنی واقعی حد سے گذر کر دوسرے شخص پر دست درازی کرے۔ وہ کسی کی جان یا مال یا آبرو لینے کے لئے اس کے اوپر ناحق کارروائیاں کرے۔ وہ اپنے زور واثر کو ناجائز فائدہ اٹھانے کے لئے استعمال کرنے لگے۔

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۹۱﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ۭ تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِىَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ۭ اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ۭ وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۲﴾

اور تم اللہ کے عہد کو پورا کرو جب کہ تم آپس میں عہد کرلو۔ اور قسموں کو پکا کرنے کے بعد نہ توڑو۔ اور تم اللہ کو ضامن بھی بنا چکے ہو۔ بے شک اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ اور تم اس عورت کی مانند نہ ہو جس نے اپنا محنت سے کاتا ہوا سوت ٹکڑے ٹکڑے کرکے توڑ دیا۔ تم اپنی قسموں کو آپس میں فساد ڈالنے کا ذریعہ بناتے ہو محض اس وجہ سے کہ ایک گروہ دوسرے گروہ سے بڑھ جائے۔ اللہ اس کے ذریعہ سے تمہاری آزمائش کرتا ہے اور وہ قیامت کے دن اس چیز کو اچھی طرح تم پر ظاہر کردے گا جس میں تم اختلاف کر رہے ہو۔ ۹۲—۹۱

سوت کاتنا محنت کے ذریعہ بکھرے ہوئے ریشوں کا یکجا کرنا ہے۔ ایسا اس لئے کیا جاتا ہے

تاکہ انسان کے لئے کارآمد چیزیں تیار ہوں۔ اب اگر کوئی مرد یا عورت دن بھر محنت کرکے سوت کاتے اور پھر شام کے وقت اپنے کاتے ہوئے سوت کو پارہ پارہ کردے تو اس کی ساری محنت بے نتیجہ ہوکر رہ جائے گی۔

یہی معاملہ ان لوگوں کا ہے جو آپس میں ایک معاہدہ کریں اور پھر ایک یا دوسرا فریق کسی معقول سبب کے بغیر اس کو توڑ ڈالے۔ کاتے ہوئے سوت کو خوامخواہ بکھیرنا اپنی محنت کو اکارت کرنا ہے۔ اسی طرح کئے ہوئے معاہدے کو توڑ ڈالنا اس پورے عمل کو باطل کرنا ہے جس کے نتیجے میں باہمی اتفاق کا ایک معاملہ وجود میں آیا تھا۔

موجودہ دنیا میں ایک آدمی دوسرے آدمیوں کے ساتھ مل کر زندگی گذارتا ہے۔ ہر آدمی کو اپنا کام دوسرے بہت سے آدمیوں کے درمیان کرنا ہوتا ہے۔ اس بنا پر اجتماعی زندگی میں باہمی اعتماد کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ اسی اجتماعی زندگی کو قائم کرنے کی خاطر بار بار ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان معاہدے اور قول وقرار وجود میں آتے ہیں، کبھی قسم کھاکر اور کبھی قسم کے بغیر۔ اب اگر لوگ ایسا کریں کہ معاہدوں کو حقیقی جواز کے بغیر توڑ ڈالیں تو اجتماعی زندگی میں فساد پھیل جائے اور کسی قسم کی تعمیر ممکن نہ رہے۔

خدا کے نام پر معاہدہ کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ باقاعدہ قسم کے الفاظ ادا کرکے کسی سے کوئی عہد کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ قسم کے الفاظ نہ بولے جائیں تاہم جو معاہدہ کیا گیا ہے اس میں خدا کا حوالہ بھی کسی پہلو سے شامل ہو۔ ایسی تمام صورتوں میں عہد کرنے والے گویا خدا کو اس معاملہ کا گواہ یا ضامن بناتے ہیں۔ ایسے معاہدے جن میں خدا کا نام بھی شامل کیا گیا ہو ان کو توڑنا اور بھی زیادہ برا ہے کیوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب آدمی کو دوسروں کے اوپر اپنا اعتبار قائم کرنا تھا تو اس نے خدا کے نام کو استعمال کیا اور جب اس پر نفس یا مفاد کے تقاضے غالب آئے تو اس نے خدا کو نظر انداز کردیا۔

افراد یا قوموں کے درمیان جو معاہدے ہوتے ہیں ان کی دو صورتیں۔ ایک یہ کہ وہ اصولوں کے تابع ہوں۔ دوسرے یہ کہ وہ مفادات کے تابع ہوں۔ قدیم زمانے میں اور آج بھی عام حالت یہ ہے کہ جب معاہدہ کرنے میں کوئی فائدہ نظر آیا تو معاہدہ کرلیا۔ اور جب توڑنا مفید معلوم ہوا تو اس کو توڑ دیا۔ اس کے برعکس اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ معاہدات کو شرعی اور اخلاقی اصولوں کے تابع رکھا جائے۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ

مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَلَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾

اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا لیکن وہ بے راہ کر دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ہدایت دے دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ضرور تم سے تمہارے اعمال کی پوچھ ہوگی۔ ۹۳

دنیا میں اختلافات ہیں۔ حق اور ناحق ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتے۔ اس کی وجہ خدا کا وہ منصوبہ ہے جس کے تحت اس نے موجودہ دنیا کو بنایا ہے۔ اور وہ منصوبہ امتحان ہے۔

موجودہ دنیا میں انسان کو جانچ کی غرض سے رکھا گیا ہے۔ یہ مقصد اس کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا تھا کہ ہر آدمی کو ماننے اور نہ ماننے کی آزادی ہو۔ حتی کہ اسے یہ بھی آزادی ہو وہ حق کو ناحق ثابت کرے اور ناحق کو حق کے روپ میں پیش کرے۔ اگر یہ مصلحت نہ ہوتی تو خدا تمام انسانوں کو اسی طرح اپنے حکم کا پابند بنا دیتا جس طرح وہ بقیہ کائنات کو اپنے حکم کا پابند بنائے ہوئے ہے۔

یہ صورت حال قیامت تک کے لیے ہے۔ قیامت کے دن کھل جائے گا کہ کس نے اپنی سمجھ کو صحیح طور پر استعمال کیا اور کس نے اپنے مفاد کی خاطر سچائی کو نظر انداز کیا۔ اس وقت خدا ہر ایک کے ساتھ وہ معاملہ کرے گا جس کا اس نے موجودہ امتحانی مرحلہ میں اپنے کو اہل ثابت کیا تھا۔

وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًاۢ بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا وَتَذُوْقُوا السُّوْٓءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۹۴﴾ وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ اِنَّمَا عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۹۵﴾

اور تم اپنی قسموں کو آپس میں فریب کا ذریعہ نہ بناؤ کہ کوئی قدم جمنے کے بعد پھسل جائے اور تم اس بات کی سزا چکھو کہ تم نے اللہ کی راہ سے روکا اور تمہارے لئے ایک بڑا عذاب ہے۔ اور اللہ کے عہد کو تھوڑے فائدے کے لئے نہ بیچو۔ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو۔ ۹۴-۹۵

قسم کھا کر معاہدہ کرنا پختہ معاہدہ کی آخری صورت ہے۔ اس اعتبار سے اس آیت کے تحت تمام معاہدے آجاتے ہیں۔

اگر مسلمان ایسا کریں کہ وہ دوسروں سے معاہداتی معاملے کریں اور پھر کسی حقیقی سبب کے بغیر محض مفاد کی خاطر ان کو توڑ دیں تو اس سے ماحول میں مسلمانوں کی اخلاقی ساکھ ختم ہو جائے گی۔ اور نتیجۃً ان کا یہ عمل لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکنے کا ذریعہ بن جائے گا۔ مفسر ابن کثیر لکھتے ہیں کہ جب منکر اسلام دیکھے گا کہ مسلمان نے معاہدہ کیا اور پھر اس نے اس سے بے وفائی کی تو اس کو دین اسلام پر اعتماد باقی نہ رہے گا اور اس کی وجہ سے وہ خدا کے دین میں داخل ہونے سے رک جائے گا (لان الکافر اذا رأی ان المومن قد عاهده ثم غدر به لم یبق له وثوق بالدین فانصد بسببه عن الدخول فی الاسلام)

عہد کو غیر شرعی طور پر توڑنے کا واقعہ ہمیشہ اس لئے پیش آتا ہے کہ آدمی کو یہ نظر آنے لگتا ہے کہ اگر وہ معاہدہ کو توڑ دے تو اس کو فلاں دنیوی فائدہ حاصل ہو جائے گا۔ مگر مومن کی نظر آخرت پسندانہ نظر ہوتی ہے۔ جب بھی اس کا نفس اس قسم کی تحریک کرتا ہے تو وہ اپنے نفس کو یہ کہہ کر دبا دیتا ہے کہ معاہدہ توڑنے میں اگر دنیا کا فائدہ ہے تو معاہدہ نہ توڑنے میں آخرت کا فائدہ۔ اور دنیا کے فائدہ کے مقابلہ میں آخرت کا فائدہ یقیناً زیادہ بڑا ہے۔

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ۗ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۷﴾

جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے۔ اور جو لوگ صبر کریں گے ہم ان کے اچھے کاموں کا اجر ان کو ضرور دیں گے۔ جو شخص کوئی نیک کام کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ہم اس کو زندگی دیں گے، ایک اچھی زندگی۔ اور جو کچھ وہ کرتے رہے اس کا ہم ان کو بہترین بدلہ دیں گے۔ ۹۷-۹۶

خدا کے داعی کا ساتھ دینا رواج یافتہ مذہبی نظام کو چھوڑ کر غیر رواجی مذہب کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کرنا ہے۔ اس طرح کا اقدام ہمیشہ آدمی کے لئے مشکل ترین ہوتا ہے۔ اس میں اس فائدہ کو نظر انداز کرنا ہوتا ہے جو انسانوں سے مل رہا ہے۔ اور اس فائدہ کی طرف بڑھنا ہوتا ہے جو خدا سے ملنے والا ہے۔

اس قسم کا فیصلہ کرنے کے لئے واحد چیز جو درکار ہے وہ "صبر" ہے۔ یعنی یہ برداشت

کہ آدمی کل کے فائدہ کی خاطر آج کا نقصان گوارا کر سکے۔ یہ صلاحیت کہ آدمی نظر آنے والی چیز کے مقابلہ میں اس کو زیادہ اہمیت دے سکے جو نظر نہیں آتی۔ یہ حوصلہ کہ آدمی قربانی کی قیمت پر کسی چیز کو اختیار کرے نہ کہ محض فوری نفع کی قیمت پر۔ خدا کے جو بندے اس اولوالعزمی کا ثبوت دیں یقیناً وہ اس قابل ہیں کہ خدا ان کو اپنی اعلیٰ ترین نعمتوں سے نوازے۔

جو افراد بے آمیز حق کا ساتھ دینے کی وجہ سے مروجہ نظام میں نقصان اٹھاتے ہیں۔ ان کو لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ برباد ہوگئے۔ مگر خدا کا وعدہ ہے کہ وہ ان کو ان کی قربانیوں کا بھرپور معاوضہ دے گا۔ موت کے بعد کی ابدی دنیا میں وہ انھیں نہایت بہتر زندگی سے نوازے گا۔ جن چیزوں کو انھوں نے وقتی طور پر کھویا ہے، ان کو وہ زیادہ بہتر شکل میں ابدی طور پر دے دے گا۔

خدا کا یہ وعدہ عورتوں کے لئے بھی اسی طرح ہے جس طرح وہ مردوں کے لئے ہے۔ خدا کے یہاں جزا کے معاملہ میں عورت اور مرد کی کوئی تقسیم نہیں۔

فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ﴿٩٨﴾ إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿٩٩﴾ إِنَّمَا سُلْطَانُهُ عَلَى الَّذِينَ يَتَوَلَّوْنَهُ وَالَّذِينَ هُمْ بِهِ مُشْرِكُونَ ﴿١٠٠﴾ ع ۱۳ ۱۹

پس جب تم قرآن کو پڑھو تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگو۔ اس کا زور ان لوگوں پر نہیں چلتا جو ایمان والے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ اس کا زور صرف ان لوگوں پر چلتا ہے جو اس سے تعلق رکھتے ہیں، اور جو اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔ ۱۰۰-۹۸

قرآن کو پڑھنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک، اپنی نصیحت کے لئے پڑھنا۔ دوسرے، دعوت کی خاطر دوسروں کے سامنے پیش کرنا، خواہ قرآن کے الفاظ دہرائے جائیں یا اس کے مطالب بیان کئے جائیں۔ دونوں صورتوں میں ضروری ہے کہ آدمی شیطان کے مقابلہ میں خدا کی پناہ مانگے۔ تعوذ کا مطلب صرف کچھ مقررہ الفاظ کی تکرار نہیں بلکہ اپنے آپ کو شعوری طور پر مسلح کرنا ہے تاکہ شیطان کا حملہ بے اثر ہو کر رہ جائے۔

شیطان ہر وقت آدمی کی گھات میں ہے۔ وہ قرآن کے الفاظ کے مفہوم کو اس کے قاری کے ذہن میں بدل دیتا ہے۔ اور جو چیز متن میں نہ ہو اس کو تفسیر میں شامل کرا دیتا ہے۔ اسی طرح شیطان داعی اور مدعو کے درمیان ایسے فتنے ابھارتا ہے جس کے نتیجے میں دعوت کا عمل رک جائے۔

تاہم شیطان کو خدا نے صرف بہکانے اور ورغلانے کی آزادی دی ہے۔ اس کو یہ طاقت نہیں دی کہ وہ کسی کو بزور گمراہی کے راستہ پر ڈال دے۔ جو لوگ خدا سے اپنا ذہنی ربط قائم کئے ہوئے ہوں ان پر اس کا کچھ بس نہیں چلتا۔ البتہ جو لوگ خدا سے غافل ہوں اور شیطان کی باتوں پر دھیان دیں ان کے اوپر شیطان مسلط ہو جاتا ہے اور پھر جدھر چاہتا ہے ادھر انھیں لے جاتا ہے۔

وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ۝

اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت بدلتے ہیں، اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ اتارتا ہے، تو وہ کہتے ہیں کہ تم گھڑ لائے ہو۔ بلکہ ان میں اکثر لوگ علم نہیں رکھتے۔ کہو کہ اس کو روح القدس نے تمہارے رب کی طرف سے حق کے ساتھ اتارا ہے تاکہ وہ ایمان والوں کو ثابت قدم رکھے اور وہ ہدایت اور خوش خبری ہو فرماں برداروں کے لئے۔ ۱۰۱-۱۰۲

قرآن ایک دعوتی کتاب ہے۔ اس کے مختلف حصے ۲۳ سال کے عرصہ میں تھوڑا تھوڑا کر کے اترتے رہے۔ دعوت و تربیت کے مصالح کے تحت بعض احکام میں تدریج کا طریقہ بھی اختیار کیا گیا (مثلاً پہلے یہ حکم آیا کہ مخالفوں کے مقابلہ میں صبر کرو۔ اس کے بعد یہ حکم آیا کہ ان سے جنگ کرو)

اس قسم کی "تبدیلیوں" کو لے کر مخالفین یہ کہتے کہ قرآن خدا کی کتاب نہیں۔ یہ محمد کی اپنی تصنیف ہے جس کو انھوں نے خدا کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ اگر وہ خدا کی طرف سے ہوتی تو اس میں کبھی اس قسم کی تبدیلیاں نہ ہوتیں۔

مخالفین اگر قرآن کے معاملہ میں سنجیدہ ہوتے اور تبدیلی کے واقعہ کو صحیح رخ سے دیکھتے تو اس میں انھیں تدریج فی الاحکام کی حکمت نظر آتی۔ مگر جب انھوں نے اس کو غلط رخ سے دیکھا تو تبدیلی کا واقعہ انھیں انسانی علم کی کمی کا نتیجہ نظر آیا۔ جس چیز میں ان کے لئے تصدیق کا سامان چھپا ہوا تھا اس کو انھوں نے اپنے لئے افترا کا ذریعہ بنا لیا۔

قرآن کو حق کے ساتھ اتارا گیا ہے ــــ یہاں حق سے مراد خدا کا خالص اور بے آمیز دین ہے۔ جو لوگ سچائی کے طالب ہوں اور ملاوٹی دینوں میں اطمینان نہ پاتے ہوں، ان کے لئے قرآنی دین میں اپنی تلاش کا جواب بھی ہے اور ان کی تسکین قلب کا سامان بھی۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۙ لَا يَهْدِيْهِمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ اِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ۝

اور ہم کو معلوم ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس کو تو ایک آدمی سکھاتا ہے۔ جس شخص کی طرف وہ منسوب کرتے ہیں۔ اس کی زبان عجمی ہے اور یہ قرآن صاف عربی زبان ہے۔ بے شک جو لوگ اللہ کی آیتوں پر ایمان نہیں لاتے، اللہ ان کو کبھی راہ نہیں دکھائے گا اور ان کے لئے دردناک سزا ہے۔ جھوٹ تو وہ لوگ گھڑتے ہیں جو اللہ کی آیتوں پر ایمان نہیں رکھتے اور یہی لوگ جھوٹے ہیں۔ ۱۰۳ - ۱۰۵

مکہ میں کچھ عجمی غلام تھے۔ ان کے نام تفسیر کی کتابوں میں جبر، یسار، عائش، یعیش وغیرہ آئے ہیں۔ اسی ضمن میں سلمان فارسی کا نام بھی لیا گیا ہے جو بعد کو مسلمان ہوگئے۔ یہ غلام یا یہودی تھے یا نصرانی۔ اس بنا پر وہ قدیم آسمانی مذاہب، یہودیت اور نصرانیت کے بارہ میں معلومات رکھتے تھے۔ ان میں سے کسی کی کبھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ اس طرح کی ملاقاتوں کو بنیاد بنا کر قریش کے لیڈروں نے کہا کہ "یہی عجمی لوگ محمد کو کچھ باتیں بتا دیتے ہیں اور وہ ان کو خدائی کلام بتا کر لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں"

یہ مضحکہ خیز بات انھوں نے کیوں کہی۔ اس کی وجہ وہی عام برائی ہے جو ہر زمانہ میں اور ہمیشہ دنیا میں پائی گئی ہے۔ وہ ہے ـــــ اپنے ہم عصر کی قیمت کو نہ پہچاننا۔ قریش کے لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک معاصر شخصیت تھے، اس لئے وہ آپ کو پہچاننے اور آپ کی قدر کرنے میں ناکام رہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ معاصرانہ نفسیات کے فتنہ میں مبتلا ہوں وہ کبھی حق کو قبول کرنے کی توفیق نہیں پاتے۔ وہ حق کو مان لینے کے بجائے یہ کرتے ہیں کہ حق کے علم بردار کے خلاف جھوٹی باتیں گھڑتے رہتے ہیں۔ وہ بڑی بڑی حقیقتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر داعی کی شخصیت کو بدنام کرتے ہیں وہ اسی میں مشغول رہتے ہیں، یہاں تک کہ مرکر خدا کی پکڑ کے مستحق بن جاتے ہیں۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ ۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ

لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ سَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝

جو شخص ایمان لانے کے بعد اللہ سے منکر ہوگا، سوا اس کے جس پر زبردستی کی گئی ہو بشرطیکہ اس کا دل ایمان پر جما ہوا ہو، لیکن جو شخص دل کھول کر منکر ہو جائے تو ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب ہوگا اور ان کو بڑی سزا ہوگی۔ یہ اس واسطے کہ انھوں نے آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی کو پسند کیا اور اللہ منکروں کو راستہ نہیں دکھاتا۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر مہر کر دی۔ اور یہ لوگ بالکل غافل ہیں۔ لازمی بات ہے کہ آخرت میں یہ لوگ گھاٹے میں رہیں گے۔ ۱۰۶-۱۰۹

خدا کے یہاں حقیقت کا اعتبار کیا جاتا ہے نہ کہ محض ظاہر کا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں انسان کے ساتھ بہت رعایت کی گئی ہے۔ اگر کوئی شخص دل سے خدا کا سچا وفادار ہو۔ مگر سخت مجبوری کی حالت میں اپنی جان بچانے کے لئے وقتی طور پر کوئی خلاف ایمان کلمہ کہہ دے تو خدا کے یہاں اس پر اس کی پکڑ نہیں ہوگی۔ مگر وہ لوگ خدا کے یہاں ناقابل معافی ہیں جو اندر سے بدل چکے ہوں۔ جو شیطانی شبہات یا حالات کے دباؤ سے متاثر ہو کر دل کی رضامندی سے کسی اور راستہ پر چل پڑیں۔

جب آدمی ایمان کے بجائے غیر ایمان کی روش اختیار کرتا ہے تو اس کی وجہ ہمیشہ دنیا پرستی ہوتی ہے۔ وہ دنیوی مفاد کو خطرہ میں دیکھ کر غیر مومنانہ روش پر چل پڑتا ہے۔ اگر وہ آخرت کی قدر وقیمت کو سمجھتا تو دنیا کا مفاد اس کو اتنا حقیر نظر آتا کہ اس کو یہ بات بالکل لغو معلوم ہوتی کہ دنیا کی خاطر وہ آخرت کو چھوڑ دے۔

آخرت کے مقابلہ میں دنیا کے فائدے اگر کسی کے نزدیک اہم تر بن جائیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ معاملات کو آخرت کے نقطۂ نظر سے سوچ نہیں پاتا۔ وہ دیکھتا اور سنتا ہے مگر دنیا کی طرف جھکاؤ کی وجہ سے چیزوں کا اخروی پہلو اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ وہ اسی پہلو کو دیکھ پاتا ہے جو دنیوی مصالح سے تعلق رکھتے ہوں۔ جو لوگ غفلت کے اس مرتبہ کو پہنچ جائیں ان کے حصہ میں ابدی نقصان کے سوا اور کچھ نہیں۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ يَوْمَ تَاْتِيْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ

نَفْسِهَا وَتُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿١١١﴾

پھر تیرا رب ان لوگوں کے لئے جنھوں نے آزمائش میں ڈالے جانے کے بعد ہجرت کی، پھر جہاد کیا اور قائم رہے تو ان باتوں کے بعد بے شک تیرا رب بخشنے والا مہربان ہے۔ جس دن ہر شخص اپنی ہی طرف داری میں بولتا ہوا آئے گا۔ اور ہر شخص کو اس کے کئے کا پورا بدلہ ملے گا اور ان پر ظلم نہ کیا جائے گا۔ ۱۱۱-۱۱۰

ماحول پر ناحق کا غلبہ ہو، اس وقت کوئی شخص حق کو قبول کرے تو وہ سخت آزمائش میں پڑجاتا ہے۔ چاروں طرف سے ماحول کا دباؤ زور کرتا ہے کہ آدمی دوبارہ رواجی دین کی طرف لوٹ جائے۔ ایسی حالت میں اگر وہ حق پر قائم رہے، وہ ہر چیز حتیٰ کہ جائداد اور وطن کو چھوڑ دے مگر حق کو نہ چھوڑے تو وہ مہاجر اور مجاہد ہے۔ اور اللہ کی نظر میں بہت بڑے ثواب کا مستحق ہے۔

دنیا کی آزمائش میں جو چیز حق پر ثابت قدم رکھنے والی ہے وہ صرف آخرت کی یاد ہے۔ ہر آدمی پر بہت جلد ایک ہولناک دن آنے والا ہے۔ وہ دن ایسا سخت ہوگا کہ آدمی اپنے دوستوں اور رشتہ داروں تک کو بھول جائے گا۔ وہاں نہ کوئی شخص کسی کی طرف سے بول سکے گا اور نہ کوئی شخص کسی کا سفارشی بن کر کھڑا ہوگا۔ اگر آدمی کو اس آنے والے دن کا احساس ہو تو اس کا یہی حال ہوگا کہ وہ ہر قسم کا نقصان گوارا کرلے گا مگر حق کو کبھی نہ چھوڑے گا۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿١١٢﴾ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿١١٣﴾

اور اللہ ایک بستی والوں کی مثال بیان کرتا ہے کہ وہ امن و اطمینان میں تھے۔ ان کو ان کا رزق فراغت کے ساتھ ہر طرف سے پہنچ رہا تھا۔ پھر انھوں نے خدا کی نعمتوں کی ناشکری کی تو اللہ نے ان کو ان کے اعمال کے سبب سے بھوک اور خوف کا مزا چکھایا۔ اور ان کے پاس ایک رسول انھیں میں سے آیا تو اس کو انھوں نے جھوٹا بتایا پھر ان کو عذاب نے پکڑ لیا اور وہ ظالم تھے۔ ۱۱۳-۱۱۲

انسانوں کی کوئی آبادی اطمینان کی حالت میں ہو اور اس کے درمیان رزق کی فراوانی ہو۔ پھر خدا

اپنے کسی بندے کو ان کے درمیان کھڑا کرے جو ان کو حق کی طرف بلائے تو ایسی حالت میں ہمیشہ دو میں سے کوئی ایک صورت پیش آتی ہے۔ یا تو یہ آبادی حق کو قبول کر کے مزید خدائی انعامات کی مستحق بنے اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو پھر یہ ہوتا ہے کہ اس پر طرح طرح کے حادثات گزرتے ہیں۔ یہ حادثات اس کے حق میں خدائی عذاب نہیں ہوتے بلکہ خدائی تنبیہات ہوتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ چونکنے ہو جائیں۔ ان کی حساسیت جاگے اور وہ خدا کے داعی کی پکار پر لبیک کہنے کے لئے تیار ہو جائیں۔

اگر اس قسم کی تنبیہات کارگر نہ ہوں تو دعوت کی تکمیل کے بعد دوسرا مرحلہ یہ آتا ہے کہ اس قوم کو ہلاک کر دیا جائے تاکہ وہ آخرت کے عالم میں پہنچ کر اپنے ابدی انجام کو بھگتے۔

فَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ حَلَالًا طَيِّبًا وَاشْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ﴿١١٤﴾ إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ ۖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١١٥﴾

سو جو چیزیں اللہ نے تم کو حلال اور پاک دی ہیں ان میں سے کھاؤ اور اللہ کی نعمت کا شکر کرو۔ اگر تم اس کی عبادت کرتے ہو۔ اس نے تو تم پر صرف مُردار کو حرام کیا ہے اور خون کو اور سور کے گوشت کو اور جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ پھر جو شخص مجبور ہو جائے بشرطیکہ وہ نہ طالب ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا، تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ ۱۱۵-۱۱۴

اس آیت کا تعلق روزمرہ کھانے والی چیزوں سے ہے۔ خدا نے جو قابل خوراک چیزیں پیدا کی ہیں، ان میں چند متعین چیزوں کو چھوڑ کر بقیہ سب انسان کے لئے حلال ہیں۔ تاہم قدیم مشرک انسان نے یہ کیا کہ خدا کی حلال کی ہوئی بہت سی غذاؤں کو بطور خود اپنے لئے حرام کر لیا۔ جدید ملحد انسان نے اس کے برعکس یہ کیا ہے کہ خدا کی حرام کی ہوئی بہت سی غذاؤں کو بطور خود اپنے لئے حلال ٹھہرا لیا۔ یہ دونوں چیزیں اس روح کی قاتل ہیں جس کو غذائی نعمتوں کے ذریعہ انسان کے اندر پیدا کرنا مقصود ہے۔

غذا انسان کی تمام ضرورتوں میں سب سے زیادہ اہم ضرورت ہے جس کا ہر انسان کو صبح و شام تجربہ ہوتا ہے۔ خدا کو یہ مطلوب ہے کہ آدمی جب غذا کا استعمال کرے تو وہ اس کو خدا کا عطیہ سمجھ کر کھائے اور اس پر خدا کا شکر ادا کرے۔ مگر انسان نے پورے معاملہ کو الٹ دیا۔

قدیم مشرکانہ دور میں اس نے ان غذاؤں کو دیوتاؤں کے ساتھ منسوب کیا اور اس طرح ان کو خدا کے بجائے دیوتاؤں کی یاد کا ذریعہ بنا دیا۔ جدید ملحدانہ زمانہ میں یہ ہوا ہے کہ انسان نے سارے معاملہ کو اپنی لذت نفس کے تابع کر دیا۔ اس نے خدا کی حرام غذاؤں کو بھی اپنے لئے حلال ٹھہرا لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خدا کی پیدا کی ہوئی چیزیں اس کے لئے صرف اپنی لذت کا دسترخوان بن کر رہ گئیں۔

مجبوری کی حالت میں اگر کوئی شخص خدا کے غذائی قانون کو بدلے تو وہ ندامت کے جذبہ کے تحت ایسا کرے گا نہ کہ سرکشی کے جذبہ کے تحت۔ اس لئے اس سے نفسیات انسانی میں کوئی خرابی پیدا ہونے کا اندیشہ نہیں۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَٰذَا حَلَالٌ وَهَٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ ﴿۱۱۶﴾ مَتَاعٌ قَلِيلٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۱۷﴾

اور اپنی زبانوں کے گھڑے ہوئے جھوٹ کی بنا پر یہ نہ کہو کہ یہ حلال ہے، اور یہ حرام ہے کہ تم اللہ پر جھوٹی تہمت لگاؤ۔ جو لوگ اللہ پر جھوٹی تہمت لگائیں گے وہ فلاح نہیں پائیں گے۔ وہ تھوڑا سا فائدہ اٹھالیں، اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ ۱۱۷-۱۱۶

اس آیت کا تعلق عام قانون سازی سے نہیں ہے بلکہ غذائی چیزوں میں حرام و حلال مقرر کرنے سے ہے۔ انسان ہمیشہ یہ کرتا رہا ہے کہ وہ کھانے کی چیزوں میں بعض کو جائز اور بعض کو ناجائز ٹھہراتا ہے۔ ایسا یا تو توہمات کے تحت ہوتا ہے یا خواہشات کے تحت۔ مگر اس کو کرنے والے اس کو مذہب کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔

مذکورہ قسم کی تحریم و تحلیل کا یہ نقصان ہے کہ اس سے لوگوں میں توہم پرستی اور خواہش پرستی کا مزاج پیدا ہوتا ہے۔ جب کہ آدمی کے لئے صحیح بات یہ ہے کہ وہ دنیا میں خدا پرست بن کر رہے۔

موجودہ زندگی میں امتحان کی وجہ سے انسان کو آزادی حاصل ہے۔ توہمات اور خواہشات کو اپنا دین بنانے کا موقع ملنے کی وجہ یہی آزادی ہے۔ جب امتحان کی مدت ختم ہوگی تو اچانک انسان پائے گا کہ اس کے لئے ایک ہی ممکن راستہ تھا۔ یعنی خدا پرستی کو اپنا دین بنانا۔ اس کے علاوہ جن چیزوں کو اس نے اپنایا وہ صرف امتحانی آزادی کا غلط استعمال تھا نہ کہ اس کا کوئی جائز حق۔ اس وقت اس کو وہی سزا بھگتنی پڑے گی جو امتحان میں ناکام ہونے والوں کے لئے مقدر ہے۔

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

اور یہودیوں پر ہم نے وہ چیزیں حرام کردی تھیں جو ہم اس سے پہلے تم کو بتا چکے ہیں کہ ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے رہے۔ ۱۱۸

یہود کی مذہبی کتابوں میں بعض ایسی کھانے کی چیزیں حرام ہیں جو اسلام کی شریعت میں حرام نہیں کی گئی ہیں (النساء ۱۶۰) اس کی وجہ یہ نہیں کہ خود خدا نے دو قسم کے احکام دئے ہیں۔ یہود پر بھی اصلاً وہی غذائی چیزیں حرام ٹھہرائی گئی تھیں جو یہاں (النحل، آیت ۱۱۵) میں مذکور ہیں۔ مگر بعد کو یہود نے خود ساختہ تصورات کے تحت کچھ جائز چیزوں کو اپنے اوپر حرام کرلیا۔ پیغمبروں کی نہائش کے باوجود وہ اپنے اس خود ساختہ دین کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہوئے۔

مزید یہ کہ اولاً انھوں نے خدا کے حلال کو حرام کیا اور اس طرح اپنے آپ کو ناحق مصیبتوں میں ڈالا۔ اور پھر جب وہ اس حرام پر قائم نہ رہ سکے تو عقیدۃً اس کو حرام سمجھتے ہوئے عملاً اس کو اپنے لئے جائز بنا لیا۔ اس طرح وہ ڈہرا مجرم بن گئے۔

آدمی اگر کسی خود ساختہ نظریہ کے تحت ایک جائز چیز کو اپنے لئے ناجائز بنالے اور اس کی خاطر قربانیاں دینا شروع کرے، تو یہ محض اپنی جان پر ظلم کرنا ہوگا نہ کہ خدا کے راستے میں قربانی پیش کرنا۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْٓا اِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۹﴾

ع ۱۵ ۲۱

پھر تمہارا رب ان لوگوں کے لئے جنھوں نے جہالت سے برائی کرلی، اس کے بعد توبہ کیا اور اپنی اصلاح کی تو تمہارا رب اس کے بعد بخشنے والا مہربان ہے۔ ۱۱۹

جب برائی کے ساتھ سرکشی اور تعصب کے جذبات اکٹھا ہو جائیں تو آدمی اس سے ہٹنے کے لئے تیار نہیں ہوتا، خواہ اس کے عمل کو غلط ثابت کرنے کے لئے کتنے ہی دلائل دئے جائیں۔ مگر برائی کی دوسری قسم وہ ہے جو محض نادانی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ آدمی بے خبری میں یا نفس سے مغلوب ہو کر کوئی غلطی کر بیٹھتا ہے۔ ایسے آدمی کے اندر عام طور پر ڈھٹائی نہیں ہوتی۔ جب دلیل سے اس پر اس کی غلطی واضح

ہو جائے تو وہ فوراً پلٹ آتا ہے اور دوبارہ اپنے کو صحیح رویہ پر قائم کر لیتا ہے۔

پہلی قسم کے لوگوں کے لئے معافی کا کوئی سوال نہیں۔ مگر دوسری قسم کے لوگوں کے لئے یہ بشارت ہے کہ خدا انھیں اپنی رحمتوں کے سایہ میں لے لے گا کیوں کہ وہ اپنے بندوں پر بہت زیادہ مہربان ہے۔

إِنَّ إِبْرٰهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيفًا ۖ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۱۲۰﴾ شَاكِرًا لِّأَنْعُمِهِ ۚ اجْتَبٰهُ وَهَدٰهُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿۱۲۱﴾ وَاٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۖ وَإِنَّهُ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِينَ ﴿۱۲۲﴾ ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرٰهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۱۲۳﴾

بے شک ابراہیم ایک الگ امت تھا، اللہ کا فرماں بردار، اور اس کی طرف یکسو، اور وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا۔ وہ اس کی نعمتوں کا شکر کرنے والا تھا۔ خدا نے اس کو چن لیا۔ اور سیدھے راستے کی طرف اس کی رہنمائی کی۔ اور ہم نے اس کو دنیا میں بھی بھلائی دی اور آخرت میں بھی۔ وہ اچھے لوگوں میں سے ہوگا۔ پھر ہم نے تمھاری طرف وحی کی کہ ابراہیم کے طریقہ کی پیروی کرو جو یکسو تھا اور وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا۔ ۱۲۰ - ۱۲۳

حضرت ابراہیم کو قرآن میں خدا کے مطلوب انسان کے نمونہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ وہ نمونہ کے انسان کیوں بنے۔ اس لئے کہ وہ ماحول کے بگاڑ کے علی الرغم تنہا ایمان پر قائم ہونے والے انسان تھے۔ وہ اکیلے خدا کے لئے کھڑے ہوئے جب کہ اس راہ میں کوئی ان کا ساتھ دینے والا نہ تھا۔

حضرت ابراہیم پوری طرح اپنے آپ کو خدا کی پابندی میں دئے ہوئے تھے۔ انھوں نے عالم گیر مشرکانہ ماحول میں اپنے آپ کو توحید کے لئے یکسو کر لیا تھا۔ وہ تمام چیزوں کو خدا کی طرف سے ملی ہوئی چیز سمجھتے تھے اور ان کے لئے ان کا دل خدا کے شکر کے جذبہ سے بھرا رہتا تھا۔ حضرت ابراہیم کے اس کمال ایمان کی وجہ سے خدا نے ان پر اپنی ہدایت کی راہیں کھول دیں اور ان کو پیغمبری کے لئے چن لیا تاکہ وہ دنیا والوں کو خدا کے دین سے آگاہ کریں۔

حضرت ابراہیم کو دنیا کا حسنہ (بہتری) دی گئی اور آخرت کی بہتری بھی۔ یہ معلوم ہے کہ دنیا میں حضرت ابراہیم کو نہ عوام کی بھیڑ ملی، نہ اقتدار کا تخت، اور نہ اور کوئی دنیوی رونق کی چیز۔ اس کے باوجود قرآن کی یہ گواہی ہے کہ ان کو خدا کی طرف سے دنیا کی بہتری ملی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ خدا کی نظر میں دنیا کی بہتری نہ عوامی

مقبولیت کا نام ہے اور نہ دولت وحکومت کا۔ بلکہ دنیا کی بہتری خدا کی نظر میں اصلاً وہی چیزیں ہیں جن کو یہاں حضرت ابراہیم کی خصوصیات کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

إِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ ۚ وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿١٢٤﴾

سبت انھیں لوگوں پر عائد کیا گیا تھا جنھوں نے اس میں اختلاف کیا تھا۔ اور بے شک تمہارا رب قیامت کے دن ان کے درمیان فیصلہ کردے گا جس بات میں وہ اختلاف کررہے تھے ۔ ۱۲۴

ہفتہ کا ایک دن تمام شریعتوں میں اجتماعی عبادت کا دن رہا ہے۔ یہود اس کو سنیچر (سبت) کے دن مناتے ہیں۔ عیسائی اتوار کے دن۔ اور مسلمانوں کو حکم ہے کہ وہ جمعہ کے دن اس کا اہتمام کریں۔

یہود کے بزرگوں نے موشگافیاں کرکے بطور خود سبت (Sabbath) کے لئے نئے نئے ضوابط بنائے اور اپنے آپ کو مصنوعی پابندیوں میں جکڑ لیا۔ پھر جب ان پابندیوں پر عمل کرنا ان کو ناممکن معلوم ہوا تو اپنے بزرگوں کے تقدس کی وجہ سے وہ ان کو رد نہ کرسکے۔ البتہ عملی طور پر انھوں نے ان کے خلاف چلنا شروع کردیا۔

خدا کے دین میں بعد کے عالموں اور بزرگوں نے اپنی تشریحات سے جو اختلافات پیدا کئے ان کا فیصلہ دنیا میں ہونے والا نہیں۔ مگر جب قیامت آئے گی تو خدا بتادے گا کہ اصل آسمانی دین کیا تھا اور وہ کیا چیزیں تھیں جو لوگوں نے اپنی طرف سے اضافہ کرکے دین میں شامل کردیں۔

ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ۖ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ ۖ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿١٢٥﴾

اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلاؤ اور ان سے اچھے طریقے سے بحث کرو۔ بے شک تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور وہ ان کو بھی خوب جانتا ہے جو راہ پر چلنے والے ہیں ۔ ۱۲۵

دعوت کا عمل ایک ایسا عمل ہے جو انتہائی سنجیدگی اور خیر خواہی کے جذبہ کے تحت ابھرتا ہے۔ خدا کے سامنے جوابدہی کا احساس آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ وہ خدا کے بندوں کے سامنے داعی بن کر کھڑا ہو۔ وہ دوسروں کو

اس لیے پکارتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے اگر میں نے ایسا نہ کیا تو میں قیامت کے دن پکڑا جاؤں گا۔ اس نفسیات کا قدرتی نتیجہ ہے کہ آدمی کا دعوتی عمل وہ انداز اختیار کر لیتا ہے جس کو حکمت، موعظت حسنہ اور جدال احسن کہا گیا ہے۔

حکمت سے مراد دلیل و برہان ہے۔ کوئی دعوتی عمل اسی وقت حقیقی دعوتی عمل ہے جب کہ وہ ایسے دلائل کے ساتھ ہو جس میں مخاطب کے ذہن کی پوری رعایت شامل ہو۔ مخاطب کے نزدیک، کسی چیز کے ثابت شدہ چیز ہونے کی جو شرائط ہیں، ان شرائط کی تکمیل کے ساتھ جو کلام کیا جائے اسی کو یہاں حکمت کا کلام کہا گیا ہے۔ جس کلام میں مخاطب کی ذہنی و فکری رعایت شامل نہ ہو وہ غیر حکیمانہ کلام ہے۔ اور ایسا کلام کسی کو داعی کا مرتبہ نہیں دے سکتا۔

موعظتِ حسنہ اس خصوصیت کا نام ہے جو دردمندی اور خیر خواہی کی نفسیات سے کسی کے کلام میں پیدا ہوتی ہے۔ جس داعی کا یہ حال ہو کہ خدا کے عظمت و جلال کے احساس سے اس کی شخصیت کے اندر بھونچال آگیا ہو جب وہ خدا کے بارے میں بولے گا تو یقینی طور پر اس کے کلام میں عظمت خداوندی کی بجلیاں چمک اٹھیں گی جو داعی جنت اور جہنم کو دیکھ کر دوسروں کو اسے دکھانے کے لیے اٹھے۔ اس کے کلام میں یقینی طور پر جنت کی بہاریں اور جہنم کی ہولناکیاں گونجتی ہوئی نظر آئیں گی۔ ان چیزوں کی آمیزش داعی کے کلام کو ایسا بنا دے گی جو دلوں کو پگھلا دے اور آنکھوں کو اشکبار کر دے۔

دعوتی کلام کی ایجابی خصوصیات یہی دو ہیں ــــــ حکمت اور موعظت حسنہ۔ تاہم ہمیشہ دنیا میں کچھ ایسے لوگ موجود رہتے ہیں جو غیر ضروری بحثیں کرتے ہیں۔ جن کا مقصد الجھانا ہوتا ہے نہ کہ سمجھنا سمجھانا۔ ایسے لوگوں کے بارے میں مذکورہ قسم کا داعی جو انداز اختیار کرتا ہے، اسی کا نام جدال بالتی ہی احسن ہے۔ وہ ٹیڑھی بات کا جواب سیدھی بات سے دیتا ہے، وہ سخت الفاظ سن کر بھی اپنی زبان سے نرم الفاظ نکالتا ہے۔ وہ الزام تراشی کے مقابلہ میں استدلال اور تجزیہ کا انداز اختیار کرتا ہے۔ وہ اشتعال کے اسلوب کے جواب میں صبر کا اسلوب اختیار کرتا ہے۔

داعیٔ حق کی نظر سامنے کے انسان کی طرف نہیں ہوتی۔ بلکہ اس خدا کی طرف ہوتی ہے جو سب کے اوپر ہے۔ اس لئے وہ وہی بات کہتا ہے جو خدا کی میزان میں حقیقی بات ٹھہرے نہ کہ انسان کی میزان میں۔

وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ ۖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ ﴿١٢٦﴾ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ ۚ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِمَّا يَمْكُرُونَ ﴿١٢٧﴾ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَالَّذِينَ هُمْ مُحْسِنُونَ ﴿١٢٨﴾ ع ۱۶ ۲۲

اور اگر تم بدلہ لو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنا تمہارے ساتھ کیا گیا ہے اور اگر تم صبر کرو تو وہ صبر کرنے والوں کے لئے

بہت بہتر ہے اور صبر کرو اور تمہارا صبر خدا ہی کی توفیق سے ہے اور تم ان پر غم نہ کرو اور جو کچھ تدبیریں وہ کر رہے ہیں اس سے تنگ دل نہ ہو۔ بے شک اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو پرہیزگار ہیں اور جو نیکی کرنے والے ہیں۔ ۱۲۶-۱۲۸

یہاں داعی کا وہ کردار بتایا گیا ہے جو مخالفین کے مقابلہ میں اس کو اختیار کرنا ہے۔ فرمایا کہ اگر مخالفین کی طرف سے ایسی تکلیف پہنچے جس کو تم برداشت نہ کر سکو تو تم کو اتنا ہی کرنے کی اجازت ہے جتنا تمہارے ساتھ کیا گیا ہے۔ تاہم یہ اجازت صرف انسان کی کمزوری کو دیکھتے ہوئے بطور رعایت ہے۔ ورنہ داعی کا اصل کردار تو یہ ہونا چاہئے کہ وہ مدعو کی طرف سے پیش آنے والی ہر تکلیف پر صبر کرے۔ وہ مدعو سے حساب چکانے کے بجائے ایسے تمام معاملات کو خدا کے خانہ میں ڈال دے۔

مخاطب اگر حق کو نہ مانے۔ وہ اس کو مٹانے کے درپے ہو جائے تو اس وقت داعی کو سب سے بڑی تدبیر جو کرنی ہے وہ صبر ہے۔ یعنی ردعمل کی نفسیات یا جوابی کارروائیوں سے بچتے ہوئے مثبت طور پر حق کا پیغام پہنچاتے رہنا۔ داعی کو اصلاً جو ثبوت دینا ہے وہ یہ کہ وہ فی الواقع اللہ سے ڈرنے والا ہے۔ اس کے اندر وہ کردار پیدا ہو چکا ہے جو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ آدمی دنیا کے پردوں سے گذر کر خدا کو اس کی چھپی ہوئی عظمتوں کے ساتھ دیکھ لے۔ اگر داعی یہ ثبوت دے دے تو اس کے بعد بقیہ امور میں خدا اس کی طرف سے کافی ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد دعوت کے مخالفین کی کوئی تدبیر داعی کو نقصان نہیں پہنچا سکتی، خواہ وہ تدبیر کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو۔

دنیا میں دو قسم کے انسان ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کی نگاہیں انسانوں میں اٹکی ہوئی ہوں۔ جن کو بس انسانوں کی کارروائیاں دکھائی دیتی ہوں۔ دوسرے وہ لوگ جن کی نگاہیں خدا میں اٹکی ہوئی ہوں۔ جو خدا کی طاقتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ پہلی قسم کے لوگ کبھی صبر پر قادر نہیں ہو سکتے۔ یہ صرف دوسری قسم کے انسان ہیں جن کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ شکایتوں اور تلخیوں کو سہہ لیں۔ اور جو کچھ خدا کی طرف سے ملنے والا ہے اس کی خاطر اس کو نظر انداز کر دیں جو انسان کی طرف سے مل رہا ہے۔

داعی کو جس طرح جوابی نفسیات سے پرہیز کرنا ہے اسی طرح اس کو جوابی کارروائی سے بھی اپنے آپ کو بچانا ہے۔ مخالفین کی سازشیں اور تدبیریں بظاہر ڈراتی ہیں کہ کہیں وہ دعوت اور داعی کو تہس نہس نہ کر ڈالیں۔ مگر داعی کو ہر حال میں خدا پر بھروسہ رکھنا ہے۔ اس کو یہ یقین رکھنا ہے کہ خدا سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ اور وہ یقیناً دعوت حق کا ساتھ دے کر باطل پرستوں کو ناکام بنا دے گا۔

سورۃ بنی اسرآئیل مکیۃ وھی مائۃ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ احدی عشرۃ آیۃ وفیہا اثنا عشر رکوعا

سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ①

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے دور کی اس مسجد تک جس کے ماحول کو ہم نے بابرکت بنایا ہے تاکہ ہم اس کو اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ بیشک وہ سننے والا، دیکھنے والا ہے۔ ۱

ہجرت سے ایک سال پہلے مکہ کے حالات بے حد سخت تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلام کی تاریخ بننے سے پہلے ختم ہو جائے گی۔ عین اس وقت اللہ نے پیغمبر اسلام کو ایک عظیم نشانی دکھائی۔ یہ نشانی اس حقیقت کا محسوس مظاہرہ تھا کہ اسلام کی تاریخ نہ صرف یہ کہ اپنی تکمیل تک پہنچے گی۔ بلکہ اس کے گرد ایسے علمی حالات جمع کئے جائیں گے کہ وہ ابدی طور پر زندہ اور محفوظ رہے۔ کیوں کہ اب اسی کو قیامت تک تمام قوموں کے لئے خدا کے دین کا مستند ماخذ قرار پانا ہے۔

اللہ اپنے خصوصی اہتمام کے تحت پیغمبر اسلام کو مکہ سے فلسطین (بیت المقدس) لے گیا۔ یہ جسمانی یا روحانی سفر آپ کے سفر معراج کی پہلی منزل تھی۔ یہاں بیت المقدس میں پچھلے تمام پیغمبر بھی جمع تھے۔ ان سب نے مل کر باجماعت نماز ادا کی اور پیغمبر اسلام نے آگے کھڑے ہو کر ان سب کی امامت فرمائی۔ آپ کی امامت کا یہ واقعہ گویا اس خدائی فیصلہ کی ایک علامت تھا کہ پچھلی تمام نبوتیں اب ہدایت الٰہی کے مستند ماخذ کی حیثیت سے منسوخ کر دی گئیں۔ اب خدائی ہدایت کو جاننے کے لئے تمام قوموں کو پیغمبر اسلام کے لائے ہوئے دین کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔

اس اہم تقریب کو انجام دینے کے لئے فلسطین موزوں ترین جگہ تھی۔ فلسطین پچھلے اکثر انبیاء کا مرکز دعوت رہا ہے۔ اس لئے خدا نے اپنے اس فیصلہ کے اظہار کے لئے اسی خاص علاقہ کا انتخاب فرمایا۔

وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ②ۭ ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ③

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس کو بنی اسرائیل کے لئے ہدایت بنایا کہ میرے سوا کسی کو اپنا کارساز نہ بناؤ۔

تم ان لوگوں کی اولاد ہو جن کو ہم نے نوح کے ساتھ سوار کیا تھا، بے شک وہ ایک شکر گزار بندہ تھا۔ ۲-۳

اسراء کے مذکورہ واقعہ کا مطلب یہ تھا کہ بنو اسرائیل (یہود) کو حامل کتاب کے مقام سے معزول کر دیا گیا اور ان کی جگہ بنو اسماعیل کو کتاب الٰہی کا حامل بنا دیا گیا۔ یہ واقعہ خدا کی سنت کے تحت عمل میں آیا۔ خدا اس دنیا میں حق کے اعلان کے لئے کسی متعین گروہ کو منتخب کرتا ہے۔ یہ سب سے بڑا اعزاز ہے جو اس دنیا میں کسی کو ملتا ہے۔

تاہم یہ انتخاب نسل یا قوم کی بنیاد پر نہیں ہے۔ اس کا استحقاق کسی گروہ کے لئے صرف اس وقت ثابت ہوتا ہے جب کہ وہ اس کے لئے ضروری اہلیت کا ثبوت دے۔ اہلیت کے ختم ہوتے ہی اس کا استحقاق بھی ختم ہو جاتا ہے۔ امتِ آدم، امتِ نوح، امتِ موسیٰ، امتِ مسیح، ہر ایک کے ساتھ یہ واقعہ ہو چکا ہے۔ آئندہ امت کے لئے بھی خدا کا قانون یہی ہے، اس میں کسی کا کوئی استثنا نہیں۔

اس منصب کے لئے جو اہلیت درکار ہے وہ یہ کہ خدا کے سوا کسی کو وکیل (کارساز) نہ بنایا جائے۔ صرف ایک خدا پر سارا بھروسہ کرکے اپنے تمام معاملات اس کے حوالے کر دئے جائیں۔

خدا کو جب آدمی اس کی تمام عظمتوں اور قدرتوں کے ساتھ پاتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کو اپنا وکیل بنا لیتا ہے۔ جس شخص کو خدا کی حقیقی معرفت ہو جائے۔ اس کا حال یہی ہوگا کہ وہ اس دنیا میں خدا کو اپنا سب کچھ بنا لے گا۔ جو لوگ اس طرح خدا کو پالیں وہی موجودہ دنیا میں مومنانہ زندگی گزار سکتے ہیں۔ مومنانہ زندگی گزارنے کے لئے آدمی کو تمام مخلوقات سے اوپر اٹھنا پڑتا ہے۔ اور تمام مخلوقات سے وہی شخص اوپر اٹھ سکتا ہے جو سب سے بڑی چیز —— مخلوقات کے خالق و مالک کو پالے۔

دعوت حق کی ذمہ داری بھی وہی لوگ صحیح طور پر ادا کر سکتے ہیں جن کو خدا کی معرفت کا یہ درجہ حاصل ہو جائے۔ دعوت حق کے لئے کامل بے غرضی اور کامل یکسوئی لازمی طور پر ضروری ہے۔ اور کامل بے غرضی اور کامل یکسوئی اس کے بغیر کسی کے اندر پیدا نہیں ہو سکتی کہ اس کے تمام امیدیں اور اندیشے خدا سے وابستہ ہو چکے ہوں، خدا ہی اس کا سب کچھ بن چکا ہو۔

وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَاءِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا ﴿٤﴾ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ أُولَاهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَا أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ فَجَاسُوا خِلَالَ الدِّيَارِ ۚ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُولًا ﴿٥﴾ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَأَمْدَدْنَاكُم بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَجَعَلْنَاكُمْ أَكْثَرَ نَفِيرًا ﴿٦﴾

اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں بتا دیا تھا کہ تم دو مرتبہ زمین (شام) میں خرابی کروگے اور بڑی سرکشی دکھاؤگے۔ پھر جب ان میں سے پہلا وعدہ آیا تو ہم نے تم پر اپنے بندے بھیجے، نہایت زور والے۔ وہ گھروں میں گھس پڑے اور وعدہ پورا ہو کر رہا۔ پھر ہم نے تمھاری باری ان پر لوٹا دی اور مال اور اولاد سے تمھاری مدد کی اور تم کو زیادہ بڑی جماعت بنا دیا۔ ۶-۴

یہاں فساد سے مراد دینی بگاڑ ہے۔ جو حضرت موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کے درمیان ظاہر ہوا۔ اس کے دو دور ہیں۔ پہلے دور کے بگاڑ کی تفصیلات پرانے عہد نامہ میں زبور، یسعیاہ، یرمیاہ اور حزقی ایل کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔ اور دوسرے دور کے بگاڑ کی تفصیل حضرت مسیح کی زبان سے ہے جو نئے عہد نامہ میں متی اور لوقا کی انجیلوں میں موجود ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے اٹھا کر بیت المقدس لے جایا گیا تاکہ "آپ کو خدا کی نشانیاں دکھائی جائیں"۔ ان نشانیوں میں سے ایک نشانی وہ تاریخ بھی ہے جو بیت المقدس سے وابستہ ہے۔

یہ تاریخ دراصل خدا کے ایک قانون کا ظہور ہے۔ وہ قانون یہ ہے کہ آسمانی کتب کی حامل قوم اگر کتاب الٰہی کے حقوق ادا کرے تو اس کو (آخرت کی کامیابی کے علاوہ) دنیا میں سرفرازی دی جائے۔ اور اگر وہ کتاب کے حقوق ادا نہ کرے تو اس کو دنیا کی جابر قوموں کے حوالے کر دیا جائے جو اس کو اپنے ظلم واستغلال کا نشانہ بنائیں۔ یہ گویا ایک علامت ہے جو اسی دنیا میں بتا دیتی ہے کہ خدا اس قوم سے خوش ہے یا ناخوش۔

اس قانون کا ظہور سابق حاملین کتاب (یہود) پر بار بار ہوا ہے جن میں سے دو نمایاں واقعات کا یہاں بطور نصیحت حوالہ دیا گیا ہے۔

بنی اسرائیل پر اولاً خدا نے یہ انعام کیا کہ ان کو فرعون کے ظلم سے نجات دلائی اور پھر حضرت موسیٰ کے بعد ان کے لئے ایسے حالات پیدا کئے کہ وہ فلسطین پر قبضہ کر کے اپنی سلطنت قائم کرسکیں۔ مگر بعد کو یہود کے اندر بگاڑ آگیا۔ ایک طرف وہ مشرک قوموں پر داعی بننے کے بجائے خود ان کے مدعو بن گئے اور ان کے اثر سے مشرکانہ اعمال میں مبتلا ہو گئے۔ دوسری طرف وہ آپس کے اختلاف کا شکار ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔

خدا کی نافرمانی کے نتیجہ میں بنی اسرائیل پر جو کچھ گذرا اس میں سے ایک نمایاں واقعہ بابل (عراق) کے بادشاہ بنوکد نضر کا ہے۔ یہود کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر بنوکد نضر نے فلسطین پر اپنی بالادستی قائم کر لی۔ اس کے بعد اس نے خود یہود کے شاہی خاندان میں سے ایک شخص کو اپنا نائندہ بنا دیا کہ وہ اس کی طرف سے ان کے اوپر حکومت کرے۔ مگر یہود نے اس "آتی" کو اپنے قومی فخر کے خلاف سمجھا اور اس کے خلاف بغاوت کے درپے ہو گئے۔ ان کے اندر ایسے شاعر اور مقرر پیدا ہوئے جنھوں نے پرجوش انداز میں یہود کو ابھارنا شروع کیا۔ یہود کے پیغمبر یرمیاہ نے متنبہ کیا کہ یہ سب جھوٹے لیڈر ہیں۔ تم ان کے فریب میں نہ آؤ۔ تم اپنی

موجودہ کمزوریوں کے ساتھ شاہ بابل کے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔ اس کے بجائے تم ایسا کرو کہ شاہ بابل کی سیاسی بالادستی کو تسلیم کرتے ہوئے اپنی دینی اصلاح اور تعمیری جدوجہد میں لگ جاؤ یہاں تک کہ اللہ آئندہ تمہارے لئے مزید راہیں پیدا کر دے۔ مگر یہود نے یرمیاہ نبی کی نصیحت کو نہیں مانا۔ خوش فہم لیڈروں کی باتوں میں آکر انھوں نے شاہ بابل کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس کے بعد شاہ بابل سخت غضب ناک ہوگیا۔ اس نے دوبارہ ۵۸۶ ق م میں اپنی پوری طاقت سے فلسطین پر حملہ کیا۔ یہود کو مکمل شکست ہوئی۔ شاہ بابل نے نہ صرف یہود کو زبردست دنیوی نقصانات پہنچائے بلکہ یروشلم میں یہود کے عبادت خانہ کو مکمل طور پر ڈھا دیا جو یہود کی عظمت کا آخری نشان تھا۔

إِنْ أَحْسَنتُمْ أَحْسَنتُمْ لِأَنفُسِكُمْ ۖ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا ۚ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ لِيَسُوءُوا وُجُوهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَلِيُتَبِّرُوا مَا عَلَوْا تَتْبِيرًا ۝ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَن يَرْحَمَكُمْ ۚ وَإِنْ عُدتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ حَصِيرًا ۝

اگر تم اچھا کام کرو گے تو تم اپنے لئے اچھا کرو گے اور اگر تم برا کام کرو گے تب بھی اپنے لئے برا کرو گے۔ پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا تو ہم نے اور بندے بھیجے کہ وہ تمہارے چہرے کو بگاڑ دیں اور مسجد (بیت المقدس) میں گھس جائیں جس طرح اس میں پہلی بار گھسے تھے اور جس چیز پر ان کا زور چلے اس کو برباد کر دیں۔ بعید نہیں کہ تمہارا رب تمہارے اوپر رحم کرے۔ اور اگر تم پھر وہی کرو گے تو ہم بھی وہی کریں گے اور ہم نے جہنم کو منکرین کے لئے قید خانہ بنا دیا ہے۔ ۸-۷

حوادث کے نتیجے میں بنی اسرائیل کے اندر رجوع الی اللہ کی کیفیت پیدا ہوئی تو خدا نے دوبارہ ان کی مدد کی۔ اس بار خدا نے شاہ ایران سائرس (خسرو) کو اٹھایا۔ اس نے ۵۳۹ ق م میں بابل پر حملہ کیا، اور اس کی حکومت کو شکست دے کر اس کے اوپر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اس نے یہود پر یہ مہربانی کی کہ ان کو دوبارہ بابل سے ان کے وطن فلسطین جانے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ وہ واپس آئے اور ایک عرصہ کے بعد دوبارہ اپنا عبادت خانہ تعمیر کیا۔

تاہم یہود کی نئی نسل میں دوبارہ وہی بگاڑ پیدا ہونے لگا جو ان کی پچھلی نسل میں پیدا ہوا تھا۔ اس درمیان میں ان کے اندر مختلف انبیاء آئے۔ یہاں تک کہ ان کے درمیان حضرت یحییٰ اور حضرت مسیح اٹھے۔ ان پیغمبروں نے یہود کی روش پر تنقیدیں کیں۔ ان کی اس بے لاگ تنقید کو کھولا جو وہ دین کے نام پر کر رہے تھے۔ مگر یہود اس

تنقید وتجزیہ کا اثر قبول کرنے کے بجائے بگڑ گئے۔ حتی کہ انھوں نے حضرت یحیٰی کو قتل کر دیا اور حضرت مسیح کو سولی پر چڑھانے کے لئے تیار ہوگئے۔

اب دوبارہ ان پر خدا کا غضب بھڑکا۔ ۷۰ء میں رومی بادشاہ ٹیٹس (Titus) اٹھا اور اس نے یروشلم پر حملہ کر کے اس کو بالکل تباہ وبرباد کر ڈالا۔

یہود کی تاریخ کے یہ واقعات خود یہود کے نزدیک بھی مسلم ہیں۔ مگر یہود جب ان تاریخی واقعات کا ذکر کرتے ہیں تو وہ ان کو ظالموں کے خانہ میں ڈال دیتے ہیں۔ مگر قرآن واضح طور پر ان کو خود یہود کے خانہ میں ڈال رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سیاسی حالات ہمیشہ اخلاقی حالات کے تابع ہوتے ہیں۔ کوئی ظالم کسی کے اوپر ظلم نہیں کرتا۔ بلکہ قوم کی دینی اور اخلاقی حالت کا بگاڑ لوگوں کو یہ موقع دے دیتا ہے کہ وہ اس کو اپنے ظلم واستغلال کا نشانہ بنائیں۔

إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا كَبِيرًا ۝ وَأَنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۝ ع

بلاشبہ یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو بالکل سیدھی ہے اور وہ بشارت دیتا ہے ایمان والوں کو جو اچھے عمل کرتے ہیں کہ ان کے لئے بڑا اجر ہے۔ اور یہ کہ جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے ان کے لئے ہم نے ایک دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۹-۱۰

قرآن تمام انسانوں کو توحید کی طرف بلاتا ہے۔ یعنی ایک خدا کو مان کر اپنے آپ کو اسی کی اطاعت میں دے دینا۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس سے زیادہ صحیح، جس سے زیادہ معقول اور جس سے زیادہ مطابق فطرت بات کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ توحید بلاشبہ سب سے بڑی حقیقت ہے اور اسی کے ساتھ سب سے بڑی صداقت۔

توحید کی اس حیثیت کا تقاضا ہے کہ یہی تمام انسانوں کے لئے جانچ کا معیار ہو۔ اسی کی بنیاد پر کسی کو صحیح قرار دیا جائے اور کسی کو غلط۔ کوئی کامیاب ٹھہرے اور کوئی ناکام۔

موجودہ دنیا میں بظاہر یہ معیار سامنے نہیں آتا اور اس کی بنیاد پر انسانوں کی عملی تقسیم نہیں کی جاتی۔ مگر یہ صرف خدا کے قانون امتحان کی وجہ سے ہے۔ انفرادی طور پر موت اور اجتماعی طور پر قیامت اس مدت امتحان کی آخری حد ہے۔ یہ حد آتے ہی انسان دو گروہوں کی صورت میں الگ الگ کر دئے جائیں گے۔ توحید کے

راستہ کو اختیار کرنے والے اپنے آپ کو جنت میں پائیں گے اور اس کو اختیار نہ کرنے والے اپنے آپ کو جہنم میں۔

وَيَدْعُ الْإِنسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ ۖ وَكَانَ الْإِنسَانُ عَجُولًا ﴿١١﴾ وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ آيَتَيْنِ ۖ فَمَحَوْنَا آيَةَ اللَّيْلِ وَجَعَلْنَا آيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوا فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ ۚ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنَاهُ تَفْصِيلًا ﴿١٢﴾

اور انسان برائی مانگتا ہے جس طرح اس کو بھلائی مانگنا چاہئے اور انسان بڑا جلد باز ہے۔ اور ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا، پھر ہم نے رات کی نشانی کو مٹا دیا اور دن کی نشانی کو ہم نے روشن کر دیا تاکہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو اور تاکہ تم برسوں کی گنتی اور حساب معلوم کرو۔ اور ہم نے ہر چیز کو خوب کھول کر بیان کیا ہے۔ ۱۲-۱۱

رات اور دن کا نظام بتاتا ہے کہ خدا کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے تاریکی ہو اور اس کے بعد روشنی آئے۔ خدائی نقشہ میں دونوں یکساں طور پر ضروری ہیں۔ جس طرح روشنی میں فائدے ہیں اسی طرح تاریکی میں بھی فائدے ہیں۔ دنیا میں اگر رات اور دن کا فرق نہ ہو تو آدمی اپنے اوقات کی تقسیم کس طرح کرے۔ وہ اپنے کام اور آرام کا نظام کس طرح بنائے۔

آدمی کو ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ وہ "تاریکی" سے گھبرائے اور صرف "روشنی" کا طالب بن جائے کیونکہ خدا کی دنیا میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔ جو آدمی ایسا چاہتا ہو اس کو خدا کی دنیا چھوڑ کر اپنے لئے دوسری دنیا تلاش کرنی پڑے گی۔

مگر عجیب بات ہے کہ یہی انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ وہ ہمیشہ یہ چاہتا ہے کہ اس کو تاریکی کا مرحلہ پیش نہ آئے اور فوراً ہی اس کو روشنی حاصل ہو جائے۔ اسی کمزوری کا نتیجہ وہ چیز ہے جس کو عجلت کہا جاتا ہے۔ عجلت در اصل خداوندی منصوبہ پر راضی نہ ہونے کا دوسرا نام ہے۔ اور خداوندی منصوبہ پر راضی نہ ہونا ہی تمام انسانی بربادیوں کا اصل سبب ہے۔

خدا چاہتا ہے کہ انسان دنیا کی فوری لذتوں پر صبر کرے تاکہ وہ آخرت کی طرف اپنے سفر کو جاری رکھ سکے۔ مگر انسان اپنی عجلت کی وجہ سے دنیا کی وقتی لذتوں پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ وہ آگے کی طرف اپنا سفر طے نہیں کر پاتا۔ آدمی کی عاجلہ پسندی اس کو آخرت کی نعمتوں سے محروم کرنے کا سب سے بڑا سبب ہے۔

یہی دنیا کا معاملہ بھی ہے۔ دنیا میں بھی حقیقی کامیابی صبر سے ملتی ہے نہ کہ جلد بازی سے۔

یہود کو ان کے پیغمبر یرمیاہ نے نصیحت کی کہ تم بابل کے حکمران کے سیاسی غلبہ کو فی الحال تسلیم کر لو اور ابتدائی مرحلہ میں اپنی کوششوں کو صرف دعوتی اور تعمیری میدان میں لگاؤ۔ اس کے بعد وہ وقت بھی آئے گا جب کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے غلبہ اور اقتدار کی راہیں کھول دے۔ مگر یہود کی عجلت پسندی اس پر راضی نہیں ہوئی۔ انھوں نے چاہا کہ "تاریکی" کے مرحلہ سے گزرے بغیر "روشنی" کے مرحلہ میں داخل ہو جائیں۔ انھوں نے فوراً شاہ بابل کے خلاف سیاسی لڑائی شروع کر دی۔ چونکہ خدا کے نظام میں ایسا ہونا ممکن نہیں تھا، ان کے حصہ میں ذلت اور رسوائی کے سوا اور کچھ نہ آیا۔

وَكُلَّ إِنسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ ۖ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنشُورًا ﴿١٣﴾ اقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا ﴿١٤﴾ مَّنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ ۖ وَمَن ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۗ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا ﴿١٥﴾

اور ہم نے ہر انسان کی قسمت اس کے گلے کے ساتھ باندھ دی ہے۔ اور ہم قیامت کے دن اس کے لئے ایک کتاب نکالیں گے جس کو وہ کھلا ہوا پائے گا ــــــ پڑھ اپنی کتاب۔ آج اپنا حساب لینے کے لئے تو خود ہی کافی ہے۔ جو شخص ہدایت کی راہ چلتا ہے تو وہ اپنے ہی لئے چلتا ہے۔ اور جو شخص بے راہی کرتا ہے وہ بھی اپنے ہی نقصان کے لئے بے راہ ہوتا ہے۔ اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ اور ہم کبھی سزا نہیں دیتے جب تک ہم کسی رسول کو نہ بھیجیں۔ ۱۵-۱۳

قدیم زمانہ میں توہم پرست لوگ اکثر چڑیوں کے اڑنے سے یا تاروں کی گردش سے یا طرح طرح کے فال سے اپنی قسمت کا حال معلوم کرتے تھے۔ موجودہ زمانہ میں جو لوگ اس قسم کے توہمات پر یقین نہیں رکھتے وہ بھی اپنی قسمت کے معاملہ کو کسی نہ کسی پر اسرار سبب کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ کوئی نہ کوئی خارجی عامل ہے جو اس سلسلے میں اصل موثر حیثیت رکھتا ہے۔

فرمایا کہ تمہاری قسمت نہ چڑیوں اور ستاروں کے ساتھ وابستہ ہے اور نہ کسی دوسری خارجی چیز سے اس کا تعلق ہے۔ ہر آدمی کی قسمت کا معاملہ تمام تر اس کے اپنے عمل پر منحصر ہے۔ ہر آدمی جو کچھ سوچتا یا کرتا ہے وہ اس کے اپنے وجود کے ساتھ نقش ہو رہا ہے۔ آدمی اس کو قیامت کے دن ایک ایسی ڈائری کی صورت میں لکھا ہوا پائے گا جس میں ہر چھوٹی اور بڑی چیز درج ہو۔

خدا نے قوموں کے درمیان رسول کھڑے کئے اور کتاب اتاری۔ اس نے ایسا اس لئے کیا تاکہ لوگوں

کو آنے والے سخت دن سے پہلے اس کی خبر ہو جائے۔ اب یہ ہر آدمی کے اپنے فیصلہ کرنے کی بات ہے کہ زندگی کے اگلے مستقل مرحلہ میں وہ اپنا کیا انجام دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ ہدایت کے طریقہ پر چل کر جنت میں پہنچنا چاہتا ہے یا ہدایت کے طریقہ کو چھوڑ کر جہنم میں گرنے کا سامان کر رہا ہے۔

وَإِذَآ أَرَدْنَآ أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا۟ فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَٰهَا تَدْمِيرًا ﴿١٦﴾ وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُونِ مِنۢ بَعْدِ نُوحٍ ۗ وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ بِذُنُوبِ عِبَادِهِۦ خَبِيرًۢا بَصِيرًا ﴿١٧﴾

اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے خوش عیش لوگوں کو حکم دیتے ہیں، پھر وہ اس میں نافرمانی کرتے ہیں۔ تب ان پر بات ثابت ہو جاتی ہے۔ پھر ہم اس بستی کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ اور نوح کے بعد ہم نے کتنی ہی قومیں ہلاک کر دیں۔ اور تیرا رب کافی ہے اپنے بندوں کے گناہوں کو جاننے کے لئے اور ان کو دیکھنے کے لئے۔ ۱۷-۱۶

کسی قوم کی اصلاح یا کسی قوم کے بگاڑ کا معیار اس قوم کا سربرآوردہ طبقہ ہوتا ہے۔ یہی طبقہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کا مالک ہوتا ہے۔ یہی طبقہ اپنے وسائل کے ذریعے لوگوں پر اثر انداز ہونے کی طاقت رکھتا ہے۔ یہی طبقہ اس قابل ہوتا ہے کہ وہ کسی گروہ کے اوپر قائد بننے کی قیمت ادا کر سکے۔

یہی وجہ ہے کہ کسی قوم کے سربرآوردہ طبقہ کی اصلاح پوری قوم کی اصلاح ہے اور کسی قوم کے سربرآوردہ طبقہ کا بگاڑ پوری قوم کا بگاڑ۔ حضرت نوح کے زمانہ سے لے کر اب تک کی قوموں کا جائزہ لیا جائے تو ہر ایک کی تاریخ اس عام اصول کی صحت کی تصدیق کرے گی۔

اسی عام حکم میں قوم کے ان "بڑوں" کا معاملہ بھی شامل ہے جو قوم کو اپنی قیادت کی شکارگاہ بناتے ہیں اور اس طرح اس کی غلط رہنمائی کرکے اس کی ہلاکت کا سامان کرتے ہیں۔ وہ قوم کو حقیقت پسندی کے بجائے جذباتیت کا درس دیتے ہیں۔ اس کو معانی کے بجائے الفاظ کے طلسم میں گم کرتے ہیں۔ اس کو سنجیدگی کے بجائے تخیلات کی فضا میں اڑاتے ہیں۔ وہ اس کو حقائق کا اعتراف کرنے کے بجائے خوش خیالوں میں جینا سکھاتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ وہ قوم کو خدا کے بجائے غیر خدا کی طرف متوجہ کر دیتے ہیں۔

جب کسی قوم پر اس قسم کے رہنما چھا جائیں تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ خدا کے یہاں سے اس قوم کی ہلاکت کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اس قسم کا ہر واقعہ خدا کی اجازت کے تحت ہوتا ہے۔ اور کسی شخص یا قوم کا کوئی عمل خدا سے چھپا ہوا نہیں ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مَذْمُومًا مَدْحُورًا ۝ وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا ۝

جوشخص عاجلہ کو چاہتا ہو، اس کو ہم اس میں سے دے دیتے ہیں، جتنا بھی ہم جس کو دینا چاہیں۔ پھر ہم نے اس کے لئے جہنم ٹھہرا دی ہے، وہ اس میں داخل ہوگا بدحال اور راندہ ہو کر۔ اور جس نے آخرت کو چاہا اور اس کے لئے دوڑ کی جو کہ اس کی دوڑ ہے اور وہ مومن ہو تو ایسے لوگوں کی کوشش مقبول ہوگی۔ ۱۹-۱۸

موجودہ دنیا میں آدمی دو راستوں کے درمیان ہے۔ ایک کا فائدہ نقد ملتا ہے اور دوسرے کا فائدہ ادھار۔ جوشخص پہلے راستہ پر چلا اس نے عاجلہ کو پسند کیا۔ اور جوشخص دوسرے راستہ کو اختیار کرے اس نے آخرت کو پسند کیا۔

ایک طرف آدمی کے سامنے مصلحت پرستی کا طریقہ ہے جس کو اختیار کرنے سے فوری طور پر عزت اور دولت ملتی ہے۔ دوسری طرف بے لاگ حق پرستی کا طریقہ ہے جس کا کریڈٹ آدمی کو موت کے بعد کی زندگی میں ملے گا۔ کسی سے شکایت پیدا ہو جائے تو ایک صورت یہ ہے کہ اس کے بارہ میں اپنے دل کے اندر انتقام کی نفسیات پیدا کر لی جائے اور اس کے خلاف وہ سب کچھ کیا جائے جو اپنے بس میں ہے۔ اس کے برعکس دوسری صورت یہ ہے کہ اس کو معاف کر دیا جائے۔ اور اس کے لئے اچھی دعائیں کرتے ہوئے سارے معاملہ کو اللہ کے حوالے کر دیا جائے۔ اسی طرح آدمی کے پاس جو مال ہے اس کے خرچ کی ایک شکل یہ ہے کہ اس کو اپنے شوق کی تکمیل اور اپنی عزت کو بڑھانے کی راہوں میں لگایا جائے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ اس کو خدا کے دین کی مدوں میں خرچ کیا جائے۔

اسی طرح تمام معاملات میں آدمی کے سامنے دو مختلف طریقے ہوتے ہیں۔ ایک خواہش پرستی کا طریقہ اور دوسرا خدا پرستی کا طریقہ۔ ایک سامنے کی چیزوں کو اہمیت دینا اور دوسرا غیب کی حقیقتوں کو اہمیت دینا۔ ایک مصلحت پرستی کا انداز اور دوسرا اصول پرستی کا انداز۔ ایک بے صبری کے تحت کر گزرنا اور دوسرا صبر کے ساتھ وہ کرنا جو کرنا چاہئے۔

پہلے طریقہ میں وقتی فائدہ ہے اور اس کے بعد ہمیشہ کی محرومی۔ دوسرے طریقہ میں وقتی نقصان ہے اور اس کے بعد ہمیشہ کی عزت اور کامیابی۔

كُلًّا نُمِدُّ هَٰؤُلَاءِ وَهَٰؤُلَاءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا ۝

انْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ﴿۲۱﴾

ہم ہر ایک کو تیرے رب کی بخشش میں سے پہنچاتے ہیں، ان کو بھی اور ان کو بھی۔ اور تیرے رب کی بخشش کسی کے اوپر بند نہیں۔ دیکھو ہم نے ان کے ایک کو دوسرے پر کس طرح فوقیت دی ہے۔ اور یقیناً آخرت اور بھی زیادہ بڑی ہے درجہ کے اعتبار سے اور فضیلت کے اعتبار سے۔ ۲۱-۲۰

دنیا کی کامیابی ہو یا آخرت کی کامیابی، دونوں ہی اللہ کے فراہم کئے ہوئے مواقع اور انتظامات کو استعمال کرنے کا دوسرا نام ہیں۔ جو شخص دنیا کی کامیابی حاصل کرتا ہے وہ بھی خدا کے انتظامات سے فائدہ اٹھا کر ایسا کرتا ہے۔ اسی طرح جو شخص آخرت کو اپنا مقصود بنائے اس کے لئے بھی خدا نے ایسے انتظامات کر رکھے ہیں جو اس کے آخرت کے سفر کو آسان بنانے والے ہیں۔

دنیا میں کوئی آدمی آگے نظر آتا ہے اور کوئی پیچھے۔ کسی کے پاس زیادہ ہے اور کسی کے پاس کم۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ خدا کی دنیا میں مواقع کی کوئی حد نہیں۔ دنیا میں جو شخص جتنا زیادہ عمل کرتا ہے وہ اتنا زیادہ اس کا پھل پاتا ہے۔ اسی طرح آخرت کے لئے جو شخص جتنا زیادہ عمل کا ثبوت دے گا وہ اتنا ہی زیادہ انعام وہاں پائے گا۔ مزید یہ کہ آخرت میں ملنے والی چیز ابدی ہوگی جب کہ دنیا میں ملنے والی چیز صرف وقتی ہوتی ہے۔

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ﴿۲۲﴾ ع وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ﴿۲۳﴾ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴿۲۴﴾ ؕ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ﴿۲۵﴾

تو اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود نہ بنا ورنہ تو مذموم اور بے کس ہو کر رہ جائے گا۔ اور تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اگر وہ تیرے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں، ان میں سے ایک یا دونوں، تو ان کو اُف نہ کہو اور نہ ان کو جھڑکو، اور ان سے احترام کے ساتھ بات

کرو۔ اور ان کے سامنے نرمی سے عجز کے بازو جھکا دو۔ اور کہو کہ اے رب ان دونوں پر رحم فرما جیسا کہ انھوں نے مجھے بچپن میں پالا۔ تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ تمہارے دلوں میں کیا ہے۔ اگر تم نیک رہو گے تو وہ توبہ کرنے والوں کو معاف کر دینے والا ہے۔ ۲۵-۲۲

خدا انسان کا سب کچھ ہے۔ وہ اس کا خالق بھی ہے اور مالک بھی اور رازق بھی۔ مگر خدا غیب میں ہے۔ وہ اپنے آپ کو منوانے کے لئے انسان کے سامنے نہیں آتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی جب خدا کی بڑائی اور اس کے مقابلہ میں اپنے عجز کا اقرار کرتا ہے تو وہ محض اپنے ارادہ کے تحت ایسا کرتا ہے نہ کہ کسی ظاہری دباؤ کے تحت۔

اس اعتبار سے بوڑھے ماں باپ کا معاملہ بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے خدا کے معاملہ جیسا ہے۔ کیونکہ بوڑھے ماں باپ کا اپنی اولاد کے اوپر کوئی مادی زور نہیں ہوتا۔ اولاد جب اپنے بوڑھے ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرتی ہے تو وہ اپنے آزادانہ ذہنی فیصلہ کے تحت ایسا کرتی ہے نہ کہ مادی دباؤ کے تحت۔

موجودہ دنیا میں آدمی کا اصل امتحان یہی ہے یہاں اس کو حق اور انصاف کے راستہ پر چلنا ہے بغیر اس کے کہ اس کو اس کے لئے مجبور کیا گیا ہو۔ اس کو خود اپنے ارادہ کے تحت وہ کرنا ہے جو وہ اس وقت کرتا جب کہ خدا اس کے سامنے اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ ظاہر ہو جائے۔

یہ اختیارانہ عمل انسان کے لئے بڑا سخت امتحان ہے۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت خاص سے اس کو انسان کے لئے آسان کر دیا ہے۔ وہ انسان کو خوردہ گیر حاکم کی طرح سختی سے نہیں جانچتا۔ آدمی اگر بنیادی طور پر خدا کا وفادار ہے تو اس کی چھوٹی چھوٹی خطاؤں کو وہ نظر انداز کر دیتا ہے۔ انسان اگر غلطی کر کے پلٹ آئے تو وہ اس کو معاف کر دیتا ہے خواہ اس نے بظاہر کتنا بڑا جرم کر دیا ہو۔

وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا ﴿٢٦﴾ إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ ۖ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا ﴿٢٧﴾ وَإِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَاءَ رَحْمَةٍ مِّن رَّبِّكَ تَرْجُوهَا فَقُل لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُورًا ﴿٢٨﴾

اور رشتہ دار کو اس کا حق دو اور مسکین کو اور مسافر کو۔ اور فضول خرچی نہ کرو۔ بے شک فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں، اور شیطان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے۔ اور اگر تم کو اپنے رب کے فضل کے انتظار میں جس کی تمہیں امید ہے، ان سے اعراض کرنا پڑے تو تم ان سے نرمی کی بات کہو۔ ۲۸-۲۶

ہر آدمی جو کچھ اپنی محنت سے کماتا ہے اس کو وہ اپنے اوپر خرچ کرنے کا حق رکھتا ہے۔ تاہم شریعت کا حکم ہے کہ وہ فضول خرچی سے بچے۔ وہ اپنے مال کو اپنی واقعی ضرورتوں میں خرچ کرے نہ کہ فخر اور نمائش کے لئے۔

دوسری بات یہ کہ ہر آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنی کمائی میں دوسرے ضرورت مندوں کا بھی حق سمجھے۔ خواہ وہ رشتہ دار ہوں یا اس کے پڑوسی ہوں۔ مسافر ہوں یا اور کسی قسم کے حاجت مند ہوں۔

بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی محتاج کو دینے کے قابل نہیں ہوتا۔ تاہم اس وقت کے لئے یہ بھی حکم ہے کہ اگر تم مال دینے کے قابل نہیں ہو تو اپنے ضرورت مند بھائی کو نرم بات دو اور اس سے معافی کا کلمہ کہو۔ کیوں کہ وہ تم کو ایک نیکی کا موقع دینے آیا تھا مگر تم اس موقع کو اپنے لئے استعمال نہ کر سکے۔

اپنے کمائے ہوئے مال کو خدا کی مرضی کے مطابق خرچ کرنے میں وہی شخص کامیاب ہو سکتا ہے جو اپنے مال کو بے فائدہ مدوں میں ضائع ہونے سے بچائے۔ ورنہ اس کے پاس مال ہی نہ ہوگا جس کو وہ خدا کے راستوں میں دے۔ حقیقت یہ ہے کہ فضول خرچی شیطان کا ایک حربہ ہے جس کے ذریعہ سے وہ صاحب مال کو اس قابل نہیں رکھتا کہ وہ دوسرے ضرورت مندوں کے سلسلے میں اپنی ذمہ داریوں کو ادا کر سکے۔

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا ﴿٢٩﴾ إِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ إِنَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيرًا ﴿٣٠﴾

اور نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ لو اور نہ اس کو بالکل کھلا چھوڑ دو کہ تم ملامت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ۔ بے شک تیرا رب جس کو چاہتا ہے زیادہ رزق دیتا ہے۔ اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ بے شک وہ اپنے بندوں کو جاننے والا، دیکھنے والا ہے۔ ۳۰-۲۹

اسلام ہر معاملہ میں اعتدال کو پسند کرتا ہے۔ زیادتی اور کمی سے بچ کر جو درمیانی راستہ ہے وہی اسلام کے نزدیک بہترین راستہ ہے (خیر الامور اوسطہا) چنانچہ یہی تعلیم خرچ کے معاملہ میں بھی دی گئی ہے کہ آدمی نہ تو ایسا کرے کہ اتنا بخیل ہو کہ وہ لوگوں کی نظروں سے گر جائے۔ اور نہ اتنا زیادہ خرچ کرے کہ اس کے بعد بالکل خالی ہاتھ ہو کر بیٹھ رہے۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ جس نے میانہ روی اختیار کی وہ محتاج نہیں ہوا (ما عال من اقتصد)

مال کے سلسلہ میں بے اعتدالی کا ذہن اکثر اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ آدمی کی نظر سے یہ حقیقت اوجھل ہو جاتی ہے کہ دینے والا خدا ہے۔ وہی اپنے مصالح کے تحت کسی کو کم دیتا ہے اور کسی کو زیادہ۔ حدیث قدسی میں آیا ہے

کہ میرے بندوں میں کوئی ایسا ہے جس کے لئے صرف محتاجی مناسب ہے۔ اگر میں اس کو غنی کر دوں تو اس کے دین میں بگاڑ آجائے۔ اور میرے بندوں میں کوئی ایسا ہے جس کے لئے صرف امیری مناسب ہے۔ اگر میں اس کو فقیر بنا دوں تو اس کے دین میں بگاڑ آجائے (ان من عبادی لمن لا یصلحه الا الفقر ولو اغنیته لأفسدت علیه دینه. وان من عبادی لمن لا یصلحه الا الغنی ولو افقرته لأفسدت علیه دینه)

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا ۝

اور اپنی اولاد کو مفلسی کے اندیشے سے قتل نہ کرو، ہم ان کو بھی رزق دیتے ہیں اور تم کو بھی۔ بے شک ان کو قتل کرنا بڑا گناہ ہے۔ اور زنا کے قریب نہ جاؤ، وہ بے حیائی ہے اور برا راستہ ہے۔ ۳۲-۳۱

خدا ہی نے تمام جانداروں کو پیدا کیا ہے۔ وہی ان کے رزق کا انتظام کرتا ہے۔ ایسی حالت میں کسی انسان کا کسی کو رزق کی تنگی کا نام لے کر ہلاک کرنا ایک ایسا کام کرنا ہے جس کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ جب رزق کا انتظام خدا کی طرف سے ہو رہا ہے تو کسی کو کیا حق ہے کہ وہ کسی جان کو اس اندیشہ سے ہلاک کرے کہ وہ کھائے گی کیا۔

"ہم ان کو بھی رزق دیں گے اور تم کو بھی" ان الفاظ کے ذریعہ انسان کے ذہن کو اس معاملہ میں تخریب کے بجائے تعمیر کی طرف موڑا گیا ہے۔ غور کیجئے کہ جو انسان موجود ہیں وہ اپنا رزق کس طرح حاصل کر رہے ہیں۔ وہ اس کو خدا کے فراہم کردہ پیداواری وسائل پر عمل کرکے حاصل کر رہے ہیں۔ یہی طریقہ آئندہ آنے والی نسل کے لئے بھی درست ہے۔ تم کو چاہئے کہ مزید پیدا ہونے والوں کو خدا کے پیداواری وسائل میں مزید عمل کرنے پر لگاؤ نہ کہ خود پیدا ہونے والوں کی آمد کو روکنے لگو۔

خدا انسانوں کے درمیان جن اعمال کو مکمل طور پر ختم کرنا چاہتا ہے ان میں سے ایک زنا ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ "زنا کے قریب نہ جاؤ" یعنی زنا اتنی بڑی برائی اور ایسی بے حیائی ہے کہ اس کے مقدمات سے بھی تم کو پرہیز کرنا چاہئے۔ یہاں اس سلسلہ میں صرف اصولی حکم دیا گیا ہے۔ اس کے تفصیلی احکام آگے سورۂ نور میں بیان کئے گئے ہیں۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ۝

اور جس جان کو خدا نے محترم ٹھہرایا ہے اس کو قتل مت کرو مگر حق پر۔ اور جو شخص ناحق قتل کیا جائے تو ہم

نے اس کے وارث کو اختیار دیا ہے۔ پس وہ قتل میں حد سے نہ گزرے، اس کی مدد کی جائے گی۔ ۳۳

حق شرعی کے بغیر کسی کو قتل کرنا سراسر حرام ہے۔ جو شخص شرعی جواز کے بغیر قتل کیا جائے وہ مظلومانہ قتل ہوا۔ ایسی حالت میں مقتول کے اولیاء کو قاتل کے اوپر پورا اختیار رہے۔ وہ چاہیں تو اس سے قصاص لیں۔ چاہیں تو خوں بہا لے کر چھوڑ دیں۔ اور چاہیں تو سرے سے معاف کر دیں۔ اسلامی قانون کے مطابق قتل کے معاملہ میں اصل مدعی مقتول کے اولیاء ہیں نہ کہ حکومت۔ حکومت کا کام صرف یہ ہے کہ وہ مقتول کے اولیاء کی مرضی کو نافذ کرنے میں ان کی مدد کرے۔

قتل اتنا بھیانک جرم ہے کہ حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ ساری دنیا کا چلا جانا اللہ کے نزدیک اس سے اہون ہے کہ ایک مومن کو ناحق قتل کر دیا جائے (لزوال الدنیا عند اللہ اھون من قتل مسلم) اس کے باوجود مقتول کے اولیاء کو یہ حق نہیں کہ وہ قاتل سے بدلہ لیتے ہوئے اس کے ساتھ زیادتی کریں۔ مثلاً وہ قاتل کا مثلہ کریں یا قاتل کے بدلے اس کے کسی ساتھی کو قتل کر دیں، وغیرہ۔ مقتول کے ورثاء اگر بدلہ لینے میں زیادتی کریں تو یہاں حکومت اسی طرح ان کی مزاحم ہو جائے گی جس طرح وہ ان کے حق قصاص کے معاملہ میں ان کی مددگار ہوئی تھی۔

اس سے اسلامی شریعت کی یہ روح معلوم ہوتی ہے کہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی زیادہ مظلوم ہو، اگر وہ ظالم سے بدلہ لینا چاہتا ہے تو وہ صرف ظلم کے بقدر بدلہ لے سکتا ہے۔ اس سے زیادہ کوئی کارروائی کرنے کی اجازت اسے ہرگز حاصل نہیں۔

وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ ۚ وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ ۖ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا ۝ وَأَوْفُوا الْكَيْلَ إِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ۝

اور تم یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ مگر جس طرح کہ بہتر ہو۔ یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کی عمر کو پہنچ جائے۔ اور عہد کو پورا کرو۔ بے شک عہد کی پوچھ ہوگی۔ اور جب ناپ کر دو تو پورا ناپو اور ٹھیک ترازو سے تول کر دو۔ یہ بہتر طریقہ ہے اور اس کا انجام بھی اچھا ہے۔ ۳۵-۳۴

نابالغ یتیم کے سرپرست اس کے قریبی رشتہ دار ہوتے ہیں۔ مگر یتیم کا مال ان اولیاء کے ہاتھ میں اس وقت تک کے لئے بطور امانت ہے جب تک کہ یتیم عاقل و بالغ نہ ہو جائے۔ اولیاء کو چاہئے کہ وہ یتیم کے

مال کو ہاتھ نہ لگائیں۔ وہ صرف اس وقت اس میں تصرف کر سکتے ہیں جب کہ خود یتیم کی خیر خواہی اور ترقی کا تقاضا ہو۔ اور یتیم جیسے ہی اپنے نفع نقصان کو سمجھنے کے قابل ہو اس کا مال پوری طرح اس کے حوالے کر دیا جائے۔

عہد کو پورا کرنا انسانی کردار کی اہم ترین صفت ہے۔ جو آدمی ایک عہد کرے اور پھر اس کو پورا نہ کرے وہ بالکل بے قیمت انسان ہے، بندوں کے نزدیک بھی اور خدا کے نزدیک بھی۔

"عہد اللہ کے نزدیک قابل پرسش ہے" یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ جب ایک آدمی کسی دوسرے آدمی سے عہد کرتا ہے تو یہ صرف دو انسانوں کا باہمی معاملہ نہیں ہوتا بلکہ اس میں خدا بھی تیسرے فریق کی حیثیت سے شریک ہوتا ہے۔ آدمی کو عہد توڑتے ہوئے ڈرنا چاہئے کہ عہد کا دوسرا فریق صرف ایک کمزور انسان نہیں ہے بلکہ وہ خدا ہے جس کی پکڑ سے بچنا کسی طرح ممکن نہیں۔

دنیا میں ہر قسم کا کاروبار ناپ تول کی بنیاد پر قائم ہے۔ اس سلسلہ میں حکم دیا گیا کہ ناپ تول بالکل ٹھیک رکھا جائے اور جو چیز دی جائے پورے ناپ تول کے ساتھ دی جائے۔

یہ طریقہ بیک وقت اپنے اندر دو پہلو رکھتا ہے۔ ایک طرف وہ انسانی عظمت کے مطابق ہے۔ ناپ تول میں فرق کرنا کردار کی پستی ہے۔ اور ناپ تول میں پورا دینا کردار کی بلندی۔ اس کا دوسرا عظیم فائدہ یہ ہے کہ اس سے کاروبار کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ کیوں کہ کاروبار کی ترقی کی بنیاد تمام تر اعتماد پر ہے اور ناپ تول صحیح دینا وہ چیز ہے جس سے کسی شخص کا کاروباری اعتماد لوگوں کے درمیان قائم ہوتا ہے۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۚ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ﴿٣٦﴾ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۖ إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا ﴿٣٧﴾ كُلُّ ذَٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهُ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوهًا ﴿٣٨﴾

اور ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کی تم کو خبر نہیں۔ بے شک کان اور آنکھ اور دل سب کی آدمی سے پوچھ ہوگی۔ اور زمین میں اکڑ کر نہ چلو۔ تم زمین کو پھاڑ نہیں سکتے اور نہ تم پہاڑوں کی لمبائی کو پہنچ سکتے ہو۔ یہ سارے برے کام تیرے رب کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں۔ ۳۸-۳۶

قتادہ نے کہا ہے کہ "میں نے دیکھا" مت کہو جب کہ تم نے دیکھا نہ ہو۔ "میں نے سنا" مت کہو جب کہ تم نے سنا نہ ہو۔ "میں نے جانا" مت کہو جب کہ تم نے جانا نہ ہو (لا تقل رأیتُ ولم ترَ وسمعتُ ولم تسمع وعلمتُ ولم تعلم)

جس آدمی کو اس بات کا ڈر ہو کہ خدا کے یہاں ہر بات کی پوچھ ہوگی وہ کبھی بے تحقیق بات اپنی زبان سے نہیں نکالے گا اور نہ آنکھ بند کرکے بے تحقیق بات کی پیروی کرے گا۔ انسان کو چاہئے کہ وہ کان اور آنکھ اور دماغ سے وہ کام لے جس کے لئے وہ بنائے گئے ہیں اور وہی بات منھ سے نکالے یا عمل میں لائے جو پوری طرح ثابت ہو چکی ہو۔ اس حکم میں تمام بے بنیاد چیزیں آگئیں۔ مثلاً جھوٹی گواہی دینا، غلط تہمت لگانا، سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر کسی کے درپے ہو جانا، محض تعصب کی بنا پر ناحق بات کی حمایت کرنا، ایسی چیزوں کے پیچھے پڑنا جن کو اپنی محدودیت کی بنا پر انسان جان نہیں سکتا ـــــ سمع و بصر و فواد بظاہر انسان کے قبضہ میں ہیں۔ مگر یہ انسان کے پاس بطور امانت ہیں۔ انسان پر لازم ہے کہ وہ ان چیزوں کو خدا کی منشا کے مطابق استعمال کرے۔ ورنہ ان کی بابت اس سے سخت بازپرس ہوگی۔

انسان ایک ایسی زمین پر ہے جس کو وہ پھاڑ نہیں سکتا، وہ ایک ایسے ماحول میں ہے جہاں اونچے اونچے پہاڑ اس کی ہر بلندی کی نفی کر رہے ہیں۔ یہ خدا کے مقابلہ میں انسان کی حیثیت کا ایک تمثیلی اعلان ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ آدمی دنیا میں متکبر بن کر نہ رہے۔ وہ عجز اور تواضع کا طریقہ اختیار کرے نہ کہ اکڑنے اور سرکشی کرنے کا۔

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِيْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۳۹﴾

یہ وہ باتیں ہیں جو تمہارے رب نے حکمت میں سے تمہاری طرف وحی کی ہیں۔ اور اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود نہ بنانا، ورنہ تم جہنم میں ڈال دئے جاؤ گے، ملامت زدہ اور راندہ ہو کر۔ ۳۹

اوپر کی آیتوں میں جو احکام دئے گئے ان کو یہاں حکمت کہا گیا ہے۔ حکمت کا مطلب ہے ٹھوس حقیقت، دانائی کی بات۔ یہ باتیں جو یہاں بتائی گئی ہیں یہ زندگی کے محکم حقائق ہیں۔ ان کی بنیاد پر درست زندگی کی تعمیر ہوتی ہے۔ اور جو انسانی معاشرہ ان سے خالی ہو اس کے لئے خدا کی دنیا میں ہلاکت کے سوا اور کوئی چیز مقدر نہیں۔ آج بھی اور آج کے بعد کی زندگی میں بھی۔

مذکورہ بالا نصیحتوں کا بیان توحید سے شروع ہوا تھا۔ (آیت نمبر ۲۲) اب ان کا خاتمہ بھی توحید پر کیا گیا ہے (آیت نمبر ۳۹) یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ تمام بھلائیوں کی بنیاد یہ ہے کہ آدمی ایک خدا کو اپنا خدا بنائے۔ وہ اسی سے ڈرے اور اسی سے محبت کرے۔ خدا سے درست تعلق ہی میں زندگی کی درستی کا راز چھپا ہوا ہے۔ اگر خدا سے تعلق درست نہ ہو تو کوئی بھی دوسری چیز انسانی زندگی کے نظام کو درست نہیں کر سکتی۔ خدا انسان کا آغاز ہے اور وہی اس کا اختتام بھی۔

أَفَأَصْفَاكُمْ رَبُّكُم بِالْبَنِينَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلَائِكَةِ إِنَاثًا ۚ إِنَّكُمْ لَتَقُولُونَ قَوْلًا عَظِيمًا ﴿٤٠﴾ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ لِيَذَّكَّرُوا وَمَا يَزِيدُهُمْ إِلَّا نُفُورًا ﴿٤١﴾ قُل لَّوْ كَانَ مَعَهُ آلِهَةٌ كَمَا يَقُولُونَ إِذًا لَّابْتَغَوْا إِلَىٰ ذِي الْعَرْشِ سَبِيلًا ﴿٤٢﴾ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يَقُولُونَ عُلُوًّا كَبِيرًا ﴿٤٣﴾ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمَاوَاتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَن فِيهِنَّ ۚ وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَٰكِن لَّا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ ۗ إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا ﴿٤٤﴾

کیا تمہارے رب نے تم کو بیٹے چن کر دئے اور اپنے لئے فرشتوں میں سے بیٹیاں بنالیں۔ بے شک تم بڑی سخت بات کہتے ہو۔ اور ہم نے اس قرآن میں طرح طرح سے بیان کیا ہے تاکہ وہ یاددہانی حاصل کریں۔ لیکن ان کی بیزاری بڑھتی ہی جاتی ہے۔ کہو کہ اگر اللہ کے ساتھ اور بھی معبود ہوتے جیساکہ یہ لوگ کہتے ہیں تو وہ عرش والے کی طرف ضرور راستہ نکالتے۔ اللہ پاک اور برتر ہے اس سے جو یہ لوگ کہتے ہیں۔ ساتوں آسمان اور زمین اور جو ان میں ہیں سب اس کی پاکی بیان کرتے ہیں۔ اور کوئی چیز ایسی نہیں جو تعریف کے ساتھ اس کی پاکی بیان نہ کرتی ہو۔ مگر تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔ بلاشبہ وہ حلم والا، بخشنے والا ہے۔ ۴۴-۴۰

حقیقت اتنی کامل اور مکمل ہے کہ جو بھی خلاف واقعہ بات اس کے ساتھ منسوب کی جائے وہ فوراً بے جوڑ ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کی ایک مثال خدا کے ساتھ شریک ٹھہرانے کا معاملہ ہے۔

مشرک لوگ اپنے مفروضہ شرکاء کو خدا کی اولاد کہتے ہیں مگر یہ بات خود ہی اپنے دعوے کی تردید ہے۔ اگر ان شرکاء کو مؤنث قرار دے کر خدا کی بیٹیاں کہا جائے تو فوراً یہ اعتراض واقع ہوتا ہے کہ بیٹیاں خود مشرکین کے اعتراف کے مطابق، کمزور صنف سے تعلق رکھتی ہیں۔ پھر خدا نے کمزور صنف کو اپنا شریک بنانا کیوں پسند کیا۔ کیسی عجیب بات ہوگی کہ خدا انسانوں کو ان کی محبوب اولاد کی حیثیت سے بیٹا دے اور خود اپنے لئے بیٹیوں کا انتخاب کرے۔

اس کے برعکس اگر ان شرکاء کو بیٹا فرض کیا جائے جو انسانی تجربات کے مطابق قوت وطاقت کی علامت ہے تب بھی یہ بات ناقابل فہم ہے۔ کیوں کہ اقتدار ایک ناقابل تقسیم چیز ہے۔ جب بھی کسی نظام میں ایک سے زیادہ صاحب طاقت اور صاحب اقتدار ہوں تو ان کے درمیان لازماً کش مکش شروع ہو جاتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ اس کو مطلق اقتدار مل جائے۔ اب اگر کائنات میں ایک سے زیادہ طاقت ور ہستیاں

ہوتیں تو ان کے درمیان ضرور اقتدار کی جنگ برپا ہو جاتی اور کائنات کے سارے نظام میں اختلال و انتشار پیدا ہو جاتا۔ مگر چوں کہ کائنات میں کوئی اختلال و انتشار نہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ یہاں دوسری ایسی ہستیاں بھی موجود نہیں جو خدا کے ساتھ اس کی طاقت میں حصہ دار ہوں۔

شرکاء کو اگر بیٹے کہا جائے تب بھی وہ صورت واقعہ سے ٹکراتا ہے اور بیٹیاں کہا جائے تب بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ ایسے ہر تصور کو قبول کرنے سے انکار کرتی ہے جس میں خدا کی خدائی میں کسی اور کو شریک کیا گیا ہو۔

وَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُورًا ﴿٤٥﴾ وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَن يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ۚ وَإِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْآنِ وَحْدَهُ وَلَّوْا عَلَىٰ أَدْبَارِهِمْ نُفُورًا ﴿٤٦﴾

اور جب تم قرآن پڑھتے ہو تو ہم تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان ایک چھپا ہوا پردہ حائل کر دیتے ہیں جو آخرت کو نہیں مانتے۔ اور ہم ان کے دلوں پر پردہ رکھ دیتے ہیں کہ وہ اس کو نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دیتے ہیں اور جب تم قرآن میں تنہا اپنے رب کا ذکر کرتے ہو تو وہ نفرت کے ساتھ پیٹھ پھیر لیتے ہیں۔ ۴۵ - ۴۶

یہاں جس چیز کو "چھپا ہوا پردہ" کہا گیا ہے وہ دراصل نفسیاتی پردہ ہے۔ اس سے مراد وہ صورت حال ہے جب کہ آدمی بطور خود اپنے ذہن میں کسی غیر صداقت کو صداقت کا مقام دے دے۔ ایسے شخص کے سامنے جب ایک ایسا حق آتا ہے جس کے مطابق اس کی مفروضہ صداقتوں کی نفی ہو رہی ہو تو ایسی بے آمیز دعوت اس کے لئے ناقابل فہم بن جاتی ہے۔ اپنی مخصوص نفسیات کی بنا پر اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی دعوت بھی کچی دعوت ہو سکتی ہے جس کو ماننے کی صورت میں وہ چیز باطل قرار پائے جس کو اب تک وہ مسلّمہ صداقت سمجھے ہوئے تھا۔ وہ نئی دعوت کے دلائل کا توڑ نہیں کر پاتا۔ تاہم اپنے مخصوص ذہن کی بنا پر یہ ماننے کے لئے بھی تیار نہیں ہوتا کہ یہی وہ مطلق صداقت ہے جس کو اسے دوسری تمام چیزوں کو چھوڑ کر مان لینا چاہئے۔

بے آمیز صداقت کا اعلان ہمیشہ دوسری مفروضہ صداقتوں کی نفی کے ہم معنی ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو سن کر وہ لوگ بھڑ اٹھتے ہیں جو اس کے سوا دوسری چیزوں یا شخصیتوں کو بھی عظمت اور تقدس کا مقام دئے ہوئے ہوں۔ ان کے اندر آخرت کی جواب دہی کا یقین نہ ہونا انھیں غیر سنجیدہ بنا دیتا ہے اور غیر سنجیدہ ذہن کے ساتھ کوئی بات سمجھی نہیں جا سکتی۔

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖٓ اِذْ يَسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ وَاِذْ هُمْ نَجْوٰٓى اِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴿۴۷﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ﴿۴۸﴾

اور ہم جانتے ہیں کہ جب وہ تمہاری طرف کان لگاتے ہیں تو وہ کس لئے سنتے ہیں اور جب کہ وہ آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں۔ یہ ظالم کہتے ہیں کہ تم لوگ تو بس ایک سحر زدہ آدمی کے پیچھے چل رہے ہو دیکھو تمہارے اوپر وہ کیسی کیسی مثالیں چسپت کر رہے ہیں۔ یہ لوگ کھوئے گئے، وہ راستہ نہیں پا سکتے۔ ۴۸ - ۴۷

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں دلائل کا زور اتنا زیادہ تھا کہ عرب کے عام لوگ اس سے مرعوب ہونے لگے۔ یہ دیکھ کر وہاں کے سرداروں کو خطرہ محسوس ہوا کہ اگر ان لوگوں نے بڑی تعداد میں نئے دین کو قبول کر لیا تو ہماری سرداری ختم ہو جائے گی۔ انھوں نے لوگوں کو اس سے پھیرنے کے لئے ایک تدبیر کی۔ انھوں نے کہا کہ اس شخص کے کلام میں تم جو زور دیکھ رہے ہو وہ دراصل ساحرانہ کلام کا زور ہے۔ یہ "ادب" کا معاملہ ہے نہ کہ حقیقۃً صداقت کا معاملہ۔ اس طرح انھوں نے یہ کیا کہ جس کلام کی عظمت میں لوگ صداقت کی جھلک دیکھ رہے تھے اس کو لوگوں کی نظر میں "قلم کے جادو" کے ہم معنی بنا دیا۔

جو لوگ کسی دعوت کو اس کے جوہر کی بنیاد پر نہ دیکھیں بلکہ اس اعتبار سے دیکھیں کہ وہ ان کی حیثیت کی تصدیق کرتی ہے یا تردید، ایسے لوگ کبھی صداقت کو پانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿۴۹﴾ قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ﴿۵۰﴾ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ۭ قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ ۭ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا ﴿۵۱﴾ يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۵۲﴾

اور وہ کہتے ہیں کہ کیا جب ہم ہڈی اور ریزہ ہو جائیں گے تو کیا ہم از سر نو اٹھائے جائیں گے۔ کہو کہ تم پتھر یا لوہا ہو جاؤ یا اور کوئی چیز جو تمہارے خیال میں ان سے بھی زیادہ مشکل ہو۔ پھر وہ کہیں

گے کہ وہ کون ہے جو ہم کو دوبارہ زندہ کرے گا۔ تم کہو کہ وہی جس نے تم کو پہلی بار پیدا کیا ہے۔ پھر وہ تمہارے آگے اپنا سر ہلائیں گے اور کہیں گے کہ یہ کب ہوگا، کہو کہ عجب نہیں کہ اس کا وقت قریب آپہنچا ہو، جس دن خدا تم کو پکارے گا تو تم اس کی حمد کرتے ہوئے اس کی پکار پر چلے آؤ گے اور تم یہ خیال کروگے کہ تم بہت تھوڑی مدت رہے۔ ۴۹ - ۵۲

انسان کا وجود اول واضح طور پر اس کے وجود ثانی کو ممکن ثابت کرتا ہے۔ جو شخص انسان کی پہلی پیدائش کو بطور واقعہ مانتا ہو، اس کے پاس کوئی حقیقی دلیل نہیں جس سے وہ انسان کی دوسری پیدائش کے امکان کو نہ مانے۔

پھر یہ کہ انسان کی پیدائش ثانی، کم از کم ان لوگوں کے لئے ہرگز مستبعد نہیں جو انسان کو پتھر اور لوہا (بالفاظ دیگر مادی اشیاء کا مجموعہ) سمجھتے ہیں کیوں کہ جسم کے خلایا (Cells) کے ٹوٹنے کے ساتھ اسی معلوم دنیا میں یہ واقعہ ہو رہا ہے کہ آدمی کا مادی وجود مسلسل ختم ہوتا ہے اور پھر دوبارہ بنتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حشر ونشر اسی واقعہ کو موت کے بعد ماننا ہے جس کا موت سے پہلے ہم بار بار تجربہ کر رہے ہیں۔

قیامت دراصل اسی دن کا نام ہے جب کہ غیب کا پردہ پھٹ جائے اور خدا اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ بالکل سامنے آجائے۔ جب ایسا ہوگا تو منکر بھی وہی کرنے پر مجبور ہوگا جو آج صرف سچا مومن کر پاتا ہے۔ اس وقت تمام لوگ خدا کے کمالات کا اقرار کرتے ہوئے اس کی طرف دوڑ پڑیں گے۔

وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَهُمْ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا ۝

اور میرے بندوں سے کہو کہ وہی بات کہیں جو بہتر ہو۔ شیطان ان کے درمیان فساد ڈالتا ہے بے شک شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے۔ ۵۳

یہ آیت داعی اور مدعو کے نازک رشتہ کے بارہ میں ہے۔ حکم دیا گیا ہے کہ مدعو کی طرف سے خواہ کتنی ہی سخت بات کہی جائے اور کتنا ہی اشتعال انگیز معاملہ کیا جائے، داعی کو ہر حال میں قول احسن کا پابند رہنا ہے۔ کیوں کہ داعی اگر جوابی ذہن کے تحت کارروائی کرے تو مدعو کے اندر مزید نفرت اور ضد کی نفسیات ابھرے گی۔ اور داعی اور مدعو کے درمیان ایسی کشمکش پیدا ہوگی کہ لوگ داعی کی بات کو ٹھنڈے ذہن کے ساتھ سننے کے قابل ہی نہ رہیں۔

داعی اور مدعو کے اندر ضد اور نفرت کی فضا پیدا ہونا سراسر شیطان کی موافقت میں ہے تاکہ وہ حق کے

پیغام کو لوگوں کے لئے ناقابل قبول بنا دے۔ اس لئے اگر داعی اپنے کسی فعل سے مدعو کے اندر ضد اور نفرت کی نفسیات جگانے لگے تو گویا کہ اس نے شیطان کا کام کیا، اس نے اپنے دشمن کا کام خود اپنے ہاتھ سے انجام دے دیا۔

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ ۗ اِنْ يَّشَاْ يَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ يَّشَاْ يُعَذِّبْكُمْ ۗ وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ﴿۵۴﴾ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۵۵﴾

تمہارا رب تم کو خوب جانتا ہے، اگر وہ چاہے تو تم پر رحم کرے یا اگر وہ چاہے تو تم کو عذاب دے۔ اور ہم نے تم کو ان کا ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا۔ اور تمہارا رب خوب جانتا ہے ان کو جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت دی ہے اور ہم نے داؤد کو زبور دی۔ ۵۵-۵۴

ایک شخص سچے دین کی دعوت دے اور دوسرا شخص اس کو نہ مانے تو داعی کے اندر جھنجھلاہٹ پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ شخص کیسا ہے کہ کھلی ہوئی صداقت کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ کبھی بات اور آگے بڑھتی ہے اور وہ اعلان کر بیٹھتا ہے کہ یہ شخص جہنمی ہے۔ اس قسم کا کلام داعی کے لئے کسی حال میں جائز نہیں۔

ایک ہے حق کا پیغام پہنچانا۔ اور ایک ہے پیغام کے ردعمل کے مطابق ہر ایک کو اس کا بدلہ دینا۔ پہلا کام داعی کا ہے اور دوسرا کام خدا کا۔ داعی کو کبھی یہ غلطی نہیں کرنا چاہئے کہ وہ اپنے دائرہ سے گزر کر خدا کے دائرہ میں داخل ہو جائے۔

اسی طرح کبھی ایسا ہوتا ہے کہ داعی اور مدعو کے درمیان اپنے اپنے مقتداؤں کی فضیلت کی بحث اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ ہر ایک اپنے پیشوا کو دوسرے سے اعلیٰ اور افضل ثابت کرنے میں لگ جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو بحث اصول کے دائرہ میں رہنی چاہئے وہ شخصیت کے دائرہ میں چلی جاتی ہے اور تعصبات کو جگا کر قبول حق کی راہ میں مزید رکاوٹ کھڑی کرنے کا سبب بنتی ہے۔ اس سلسلہ میں کہا گیا کہ یہ خدا کا معاملہ ہے کہ وہ کس کو کیا درجہ دیتا ہے۔ تم کو چاہئے کہ اس قسم کی بحث سے اعراض کرتے ہوئے اصل پیغام کو پہنچانے میں لگے رہو۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ﴿۵۶﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ۗ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ﴿۵۷﴾

کہو کہ ان کو پکارو جن کو تم نے خدا کے سوا معبود سمجھ رکھا ہے۔ وہ نہ تم سے کسی مصیبت کو دور کرنے کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ اس کو بدل سکتے ہیں۔ جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ خود اپنے رب کا قرب ڈھونڈتے ہیں کہ ان میں سے کون سب سے زیادہ قریب ہو جائے۔ اور وہ اپنے رب کی رحمت کے امیدوار ہیں۔ اور وہ اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ واقعی تمہارے رب کا عذاب ڈرنے ہی کی چیز ہے۔ ۵۶-۵۷

انسان جن ہستیوں کو اللہ کے سوا اپنا معبود بناتا ہے وہ سب وہی ہیں جو اللہ کی مخلوق ہیں۔ مثلاً بزرگ یا فرشتے وغیرہ۔ غور سے دیکھئے تو یہ معبودیت سراسر یک طرفہ ہوتی ہے۔ ان ہستیوں نے خود اپنے خدا ہونے کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ یہ صرف دوسرے لوگ ہیں جو ان کو معبود فرض کرکے ان کی تقدیس و تعظیم میں لگے ہوئے ہیں۔

اگر کسی کو حاضر سے غائب تک دیکھنے کی نظر حاصل ہو اور وہ پوری صورت حال پر نظر کرے تو وہ عجیب مضحکہ خیز منظر دیکھے گا۔ وہ دیکھے گا کہ انسان کچھ ہستیوں کو بطور خود معبود کا درجہ دے کر ان کی پرستش کر رہا ہے۔ اور ان سے مرادیں مانگ رہا ہے جب کہ عین اسی وقت خود ان ہستیوں کا یہ حال ہے کہ وہ اللہ کی عظمت کے احساس سے سہمے ہوئے ہیں اور اس کی رحمت و قربت کی تلاش میں ہمہ تن سرگرم ہیں۔

وَإِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ إِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ أَوْ مُعَذِّبُوهَا عَذَابًا شَدِيدًا ۚ كَانَ ذَٰلِكَ فِي الْكِتَابِ مَسْطُورًا ﴿٥٨﴾

اور کوئی بستی ایسی نہیں جس کو ہم قیامت سے پہلے ہلاک نہ کریں یا سخت عذاب نہ دیں۔ یہ بات کتاب میں لکھی ہوئی ہے۔ ۵۸

افراد کے لئے جس طرح فنا کا قانون ہے اسی طرح قوموں اور بستیوں کے لئے بھی فنا کا قانون ہے۔ کوئی بستی چاہے وہ کتنی ہی مضبوط اور پُر رونق ہو، بہرحال وہ ایک دن ختم ہو کر رہے گی۔ خواہ اس کی صورت یہ ہو کہ وہ اپنے گناہ اور سرکشی کی وجہ سے پہلے ہلاک کر دی جائے۔ یا وہ باقی رہے یہاں تک کہ جب آخرت قائم ہونے کا وقت آئے تو زمین کی تمام آبادیوں کے ساتھ اس کو اکٹھے مٹا دیا جائے۔

وَمَا مَنَعَنَا أَنْ نُرْسِلَ بِالْآيَاتِ إِلَّا أَنْ كَذَّبَ بِهَا الْأَوَّلُونَ ۚ وَآتَيْنَا ثَمُودَ

النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوا بِهَا ۚ وَمَا نُرْسِلُ بِالْآيَاتِ إِلَّا تَخْوِيفًا ﴿٥٩﴾

اور ہم کو نشانیاں بھیجنے سے نہیں روکا مگر اس چیز نے کہ اگلوں نے ان کو جھٹلایا۔ اور ہم نے ثمود کو اونٹنی دی ان کو سمجھانے کے لئے۔ پھر انھوں نے اس پر ظلم کیا۔ اور نشانیاں ہم صرف ڈرانے کے لئے بھیجتے ہیں۔ ۵۹

پیغمبروں کے ساتھ جو غیر معمولی واقعات پیش آتے ہیں وہ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو پیغمبر اور آپ کے ساتھیوں کی عمومی نصرت کے لئے ہوتے ہیں۔ ان کو تائید کہا جا سکتا ہے۔ دوسرے وہ ہیں جو مشرکین کے مطالبہ کے طور پر ظاہر کئے جاتے ہیں۔ ان کا اصطلاحی نام معجزہ ہے۔ پیغمبر آخر الزماں اور آپ کے اصحاب کے ساتھ تائید الٰہی کے بے شمار واقعات پیش آئے۔ مگر جہاں تک فرمائشی نشانی (معجزہ) کا تعلق ہے۔ آپ کے لئے ان کو بھیجنا موقوف کر دیا گیا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر چیز کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ جو لوگ غیر معمولی نشانی کا مطالبہ کریں، ان کے اوپر غیر معمولی ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ چنانچہ خدا کا یہ قانون ہے کہ جو لوگ غیر معمولی نشانی (معجزہ) دیکھنے کے باوجود ایمان نہ لائیں ان کو سخت عذاب بھیج کر نیست و نابود کر دیا جائے۔ اب چونکہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر نبوت کا سلسلہ ختم ہونے والا تھا اس لئے آپ کی مخاطب قوم کے ساتھ ایسا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ بالکلیہ تباہی کی صورت میں قوم مٹ جاتی۔ پھر پیغمبر کے بعد پیغمبر کی نمائندگی کے لئے دنیا میں کون باقی رہتا۔

پیغمبر آخر الزماں کے مخاطبین کے ساتھ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت تھی کہ ان کے مطالبہ کے باوجود ان کو محسوس معجزات نہیں دکھائے گئے۔ اگر ایسا کیا جاتا تو اندیشہ تھا کہ ان کا بھی وہی سخت انجام ہو جو اس سے پہلے قوم ثمود کا ہوا۔

وَإِذْ قُلْنَا لَكَ إِنَّ رَبَّكَ أَحَاطَ بِالنَّاسِ ۚ وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ إِلَّا فِتْنَةً لِلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُونَةَ فِي الْقُرْآنِ ۚ وَنُخَوِّفُهُمْ فَمَا يَزِيدُهُمْ إِلَّا طُغْيَانًا كَبِيرًا ﴿٦٠﴾

اور جب ہم نے تم سے کہا کہ تمہارے رب نے لوگوں کو گھیرے میں لے لیا ہے۔ اور وہ رویا جو ہم نے تم کو دکھایا وہ صرف لوگوں کی جانچ کے لئے تھا، اور اس درخت کو بھی جس کی قرآن میں مذمت کی گئی ہے۔ اور ہم ان کو ڈراتے ہیں، لیکن ان کی غایت سرکشی بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ ۶۰

لوگ خدا کے داعی سے اکثر اپنے تجویز کردہ معجزہ کا مطالبہ کرتے ہیں۔ حالاں کہ اگر وہ کھلے ذہن کے ساتھ دیکھیں تو داعی کی خصوصی نصرت کی شکل میں وہ معجزہ انھیں دکھایا جا چکا ہوتا ہے جس کو وہ اس کی صداقت کو جانچنے کے لئے دیکھنا چاہتے ہیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مخاطبین آپ سے حسی معجزات مانگ رہے تھے۔ فرمایا کہ کیا یہ معجزہ تمہاری آنکھ کھولنے کے لئے کافی نہیں کہ دعوت کے ابتدائی دور میں جب اس کی بظاہر کوئی طاقت نہیں تھی، یہ اعلان کیا گیا کہ خدا تمھیں گھیرے میں لئے ہوئے ہے (واللہ من ورائہم محیط) یہ پیشین گوئی قبائل عرب میں اسلام کی توسیع سے پوری ہوگئی۔ پھر اس کی تکمیل بدر کی فتح اور صلح حدیبیہ کے بعد مکہ کی فتح کی صورت میں ہوئی۔

اسی طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ نے معراج کی صبح کو جب یہ اعلان کیا کہ آج رات میں بیت الحرام سے بیت المقدس تک گیا تو لوگوں کو یقین نہیں آیا۔ اس کے بعد ایسے افراد بلائے گئے جو بیت المقدس کو دیکھے ہوئے تھے اور ان کے سامنے آپ نے بیت المقدس کی عمارت کی پوری تفصیل بیان کردی۔

مگر ان واقعات کو لوگوں نے مذاق میں ٹال دیا حالاں کہ وہ آپ کی صداقت کا معجزاتی ثبوت تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اصل مسئلہ حسی معجزہ دکھانے کا نہیں ہے بلکہ دعوت پر سنجیدہ غور و فکر کا ہے۔ اگر لوگ دعوت کے بارہ میں سنجیدہ نہ ہوں تو ہر چیز کو مذاق اور استہزاء کی نذر کر دیں گے۔ خواہ وہ بات بذات خود کتنی ہی قابل لحاظ کیوں نہ ہو۔

قرآن میں جب ڈرایا گیا کہ جہنم میں زقوم کا کھانا ہوگا (الصافات ۶۲) تو روایات میں آتا ہے کہ ابوجہل نے کہا کہ ہمارے لئے کھجور اور مکھن لے آؤ جب وہ لایا گیا تو وہ دونوں کو ملا کر کھانے لگا اور کہا کہ تم لوگ بھی کھاؤ یہی زقوم ہے (قال ابوجهل هاتوا لنا تمرا وزبدا وجعل يأكل من هذا بهذا ويقول تزقموا فلا نعلم الزقوم غير هذا، تفسیر ابن کثیر)

اسی طرح قرآن میں شجرۂ ملعونہ (بنی اسرائیل ۶۰) کا ذکر ہے جو جہنمیوں کا کھانا ہوگا۔ جب قرآن میں یہ آیت اتری تو قریش کے ایک سردار نے کہا: ابوکبشہ کے لڑکے کو دیکھو۔ وہ ہم سے ایسی آگ کا وعدہ کرتا ہے جو پتھر تک کو جلا دے گی۔ پھر اس کا گمان ہے کہ اس کے اندر ایک درخت اگتا ہے حالاں کہ معلوم ہے کہ آگ جلانے والی چیز ہے (ان ابن ابی کبشة یوعدکم بنار تحرق الحجارة ثم یزعم انها تنبت فيها شجرة وتعلمون ان النار تحرق الشجرة، التفسیر المظهری)

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ﴿٦١﴾ قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِیْ كَرَّمْتَ عَلَیَّ ؗ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ

لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۶۲﴾

اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہیں کیا۔ اس نے کہا کیا میں ایسے شخص کو سجدہ کروں جس کو تو نے مٹی سے بنایا ہے۔ اس نے کہا، ذرا دیکھ، یہ شخص جس کو تو نے مجھ پر عزت دی ہے اگر تو مجھ کو قیامت کے دن تک مہلت دے تو میں تھوڑے لوگوں کے سوا اس کی تمام اولاد کو کھا جاؤں گا۔ ۶۲ - ۶۱

فرشتے اور ابلیس کا قصہ بتاتا ہے کہ ماننے والے کیسے ہوتے ہیں اور نہ ماننے والے کیسے۔ ماننے والے لوگ حق کو حق کے لحاظ سے دیکھتے ہیں چنانچہ اس کو سمجھنے میں انھیں دیر نہیں لگتی۔ وہ فوراً اس کو سمجھ کر اسے مان لیتے ہیں۔ جیسا کہ آدم کی پیدائش کے وقت فرشتوں نے کیا۔

دوسرے لوگ وہ ہیں جو حق کو اپنی ذات کی نسبت سے دیکھتے ہیں۔ شیطان نے یہی کیا۔ اس نے حق کو اپنی ذات کی نسبت سے دیکھا۔ چونکہ سجدۂ آدم کا حکم آدم کو بظاہر بڑا بنا رہا تھا اور اس کو چھوٹا، اس نے ایسے حق کو ماننے سے انکار کر دیا جس کو ماننے کے بعد اس کی اپنی ذات چھوٹی ہو جائے۔

شیطان نے خدا کو جو چیلنج دیا تھا اس کو سامنے رکھ کر دیکھئے تو ہر وہ شخص شیطان کا شکار نظر آئے گا جو حق کو اس لئے نظر انداز کر دے کہ اس کو ماننے کی صورت میں اس کی اپنی ذات دوسرے کے مقابلہ میں چھوٹی ہو جاتی ہے۔

قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ﴿۶۳﴾ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ۚ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۶۴﴾ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ۚ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ﴿۶۵﴾

خدا نے کہا کہ جا ان میں سے جو بھی تیرا ساتھی بنا تو جہنم تم سب کا پورا پورا بدلہ ہے۔ اور ان میں سے جس پر تیرا بس چلے، تو اپنی آواز سے ان کا قدم اکھاڑ دے اور ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا لا اور ان کے مال اور اولاد میں ان کا ساجھی بن جا اور ان سے وعدہ کر۔ اور شیطان کا وعدہ ایک دھوکہ کے سوا اور کچھ نہیں۔ بیشک جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا زور نہیں چلے گا اور تیرا رب کارسازی کے لئے کافی ہے۔ ۶۵-۶۳

" انسانوں میں سے جو شخص شیطان کی راہ چلے گا " یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ موجودہ دنیا میں انسان کو آزادی حاصل ہے کہ وہ خواہ شیطان کے راستہ پر چلے یا خدا کے بتائے ہوئے راستہ پر۔ اسی آزادی کے استعمال میں انسان کا اصل امتحان ہے۔ یہیں کامیاب ہو کر وہ یا تو خدا کا انعام پاتا ہے یا ناکام ہو کر شیطان کے انجام کا مستحق بن جاتا ہے۔

شیطان کو اس دنیا میں آزادی حاصل ہے کہ وہ انسان کو اپنا ساتھی بنائے۔ وہ اس کے اوپر اپنی ساری کوشش استعمال کرے۔ وہ اس کے اندر گھس کر اس کے مال و اولاد میں شامل ہو جائے۔ مگر شیطان کو کسی بھی درجہ میں انسان کے اوپر کوئی اختیار نہیں دیا گیا ہے۔ شیطان کے بس میں صرف یہ ہے کہ وہ آواز اور الفاظ کے ذریعے لوگوں کو بہکائے۔ وہ بے حقیقت چیزوں کو خوشنما بنا کر انھیں عظیم حقیقت کے روپ میں پیش کرے

آیت میں لیس لک علیھم سلطان کے الفاظ بتاتے ہیں کہ شیطان امکانی طور پر انسان کے مقابلہ میں زیادہ طاقت ور ہے۔ پھر ایک ایسی دنیا جہاں شیطان اپنے تمام " سوار اور پیادے " کے ذریعہ انسان کے اوپر حملہ آور ہو وہاں اس سے بچنے کا راستہ کیا ہے۔ اس کا راستہ صرف یہ ہے کہ انسان خدا کو حقیقی معنوں میں اپنا کارساز بنائے۔ جو شخص ایسا کرے گا خدا اس کو اس طرح اپنی حفاظت میں لے لے گا کہ شیطان اس کے مقابلہ میں اپنی تمام طاقتوں کے باوجود عاجز ہو کر رہ جائے۔

رَبُّكُمُ الَّذِي يُزْجِي لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ ۚ إِنَّهُ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ﴿٦٦﴾ وَإِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُونَ إِلَّا إِيَّاهُ ۖ فَلَمَّا نَجَّاكُمْ إِلَى الْبَرِّ أَعْرَضْتُمْ ۚ وَكَانَ الْإِنْسَانُ كَفُورًا ﴿٦٧﴾

تمہارا رب وہ ہے جو تمہارے لئے سمندر میں کشتی چلاتا ہے تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو۔ بے شک وہ تمہارے اوپر مہربان ہے۔ اور جب سمندر میں تم پر کوئی آفت آتی ہے تو تم ان معبودوں کو بھول جاتے ہو جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے تھے۔ پھر جب وہ تم کو خشکی کی طرف بچا لاتا ہے تو تم دوبارہ پھر جاتے ہو، اور انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔ ۶۷ - ۶۶

خدا نے موجودہ دنیا کو خاص قوانین کا پابند بنا رکھا ہے، اس بنا پر انسان کے لئے یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ سمندر میں اپنا جہاز چلائے اور ہواؤں میں اپنی سواریاں دوڑائے۔ یہ سب اس لئے تھا کہ انسان اپنے حق میں اپنے خدا کی رحمتوں کو پہچانے اور اس کا شکر گزار بنے۔ مگر انسان کا حال یہ ہے کہ وہ جو کچھ ہوتے ہوئے دیکھتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ اس کو بس ایسا ہی ہونا ہے۔ وہ ایک ارادی واقعہ کو اپنے آپ ہونے

والا واقعہ فرض کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان واقعات کو دیکھ کر اس کے اندر کوئی خدائی احساس نہیں جاگتا۔

خدا کی معرفت اتنی حقیقی ہے کہ وہ انسان کی فطرت کے اندر آخری گہرائی تک پیوست ہے۔ اس کا ایک مظاہرہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ اس پر کوئی آفت آپڑے جس کے مقابلہ میں وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کرے۔ مثلاً اتھاہ سمندر میں طوفان کا آنا اور جہاز کا اس کے اندر پھنس جانا۔ اس طرح کے لمحات میں انسان کے اوپر سے اس کے تمام مصنوعی پردے ہٹ جاتے ہیں وہ ایک خدا کو پہچان کر اسے پکارنے لگتا ہے۔

یہ وقتی تجربہ انسان کو اس لئے کرایا جاتا ہے تاکہ وہ اپنی پوری زندگی کو اس پر ڈھال لے۔ وہ وقتی اعتراف کو اپنا مستقل ایمان بنالے۔ مگر انسان کا یہ حال ہے کہ سمندر کے طوفان میں وہ جس حقیقت کو یاد کرتا ہے، خشکی کے ماحول میں پہنچتے ہی وہ اسے بھول جاتا ہے۔

خدا کی خدائی کو ماننے کا نام توحید ہے اور خدا کی خدائی کو نہ ماننے کا نام شرک۔ اس اعتبار سے توحید کی اصل حقیقت اعتراف ہے اور شرک کی اصل حقیقت عدم اعتراف۔ انسان سے اس کے خدا کو اصلاً جو چیز مطلوب ہے وہ یہی اعتراف ہے۔ مگر انسان اتنا ظالم ہے کہ وہ اعتراف کے بقدر بھی خدا کا حق دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

أَفَأَمِنْتُمْ أَن يَخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ أَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوا لَكُمْ وَكِيلًا ﴿٦٨﴾ أَمْ أَمِنْتُمْ أَن يُعِيدَكُمْ فِيهِ تَارَةً أُخْرَىٰ فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيحِ فَيُغْرِقَكُم بِمَا كَفَرْتُمْ ۙ ثُمَّ لَا تَجِدُوا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهِ تَبِيعًا ﴿٦٩﴾

کیا تم اس سے بے ڈر ہو گئے کہ خدا تم کو خشکی کی طرف لا کر زمین میں دھنسا دے یا تم پر پتھر برسانے والی آندھی بھیج دے، پھر تم کسی کو اپنا کارساز نہ پاؤ۔ یا تم اس سے بے ڈر ہو گئے کہ وہ تم کو دوبارہ سمندر میں لے جائے پھر تم پر ہوا کا سخت طوفان بھیج دے اور تم کو تمہارے انکار کے سبب سے غرق کر دے۔ پھر تم اس پر کوئی ہمارا پیچھا کرنے والا نہ پاؤ۔ ۶۸-۶۹

خدا انسان کو اس کی سرکشی کے باوجود فوراً نہیں پکڑتا۔ بلکہ اس پر وقتی آفت بھیج کر اس کو خبردار کرتا ہے۔ مگر انسان کا حال یہ ہے کہ جب آفت آتی ہے تو وقتی طور پر اس کے اندر احساس جاگتا ہے مگر آفت کے رخصت ہوتے ہی اس کا احساس بھی رخصت ہو جاتا ہے۔ حالانکہ بعد کو بھی وہ اتنا ہی خدا کے

قبضہ میں ہوتا ہے جتنا کہ وہ پہلے تھا۔

سمندر کے سفر سے اگر ایک بار وہ سلامتی کے ساتھ واپس آگیا ہے تو یہ بھی ممکن ہے کہ اس کو دوبارہ سمندر کا سفر پیش آئے اور وہ دوبارہ اسی آفت میں گھر جائے جس میں وہ پہلے گھرا تھا۔ مزید یہ کہ خشکی کے خطرات سمندر کے خطرات سے کم نہیں ہیں۔ سمندر میں جو چیز طوفان ہے خشکی پر وہی چیز زلزلہ بن جاتی ہے۔ پھر وہ کونسا مقام ہے جہاں آدمی کوئی ایسی چیز پالے جو خدا کے مقابلہ میں اس کی طرف سے روک بن سکے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝۷۰ؑ

اور ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی اور ہم نے ان کو خشکی اور تری میں سوار کیا اور ان کو پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا اور ہم نے ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر فوقیت دی۔ ۷۰

دنیا کی تمام مخلوقات میں انسان کو خصوصی فضیلت حاصل ہے۔ چاند اور ستارے بے شعور مخلوق ہیں جب کہ انسان شعور اور ارادہ کا مالک ہے۔ درخت پر دوسرے جس طرح چاہتے ہیں تصرف کرتے ہیں مگر انسان خود دوسری چیزوں کے اوپر تصرف کرتا ہے۔ جانور صرف اپنے اعضاء کے ذریعہ عمل کرتے ہیں مگر انسان اوزار اور مشین بنا کر ان کے ذریعہ اپنا مقصد حاصل کرتا ہے۔ دریا کے لئے صرف یہ ممکن ہے کہ وہ نشیب کے رخ پر بہے مگر انسان بلندیوں پر چڑھتا ہے اور بہاؤ کے الٹے رخ پر سفر کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔

انسان کے لئے اس دنیا میں رزق کا شاہانہ انتظام کیا گیا ہے۔ درخت کے پتے شمسی انرجی کو کیمیائی انرجی میں تبدیل کرتے ہیں تاکہ اس سے انسان کی غذا تیار ہو۔ جانور گھاس کھاتے ہیں تاکہ اس کو انسان کے لئے دودھ اور گوشت کی شکل میں لوٹائیں۔ مکھیاں رات دن سرگرم رہتی ہیں تاکہ وہ دنیا بھر کے پھولوں کا رس چوس کر انسان کے لئے شہد کا ذخیرہ جمع کریں، وغیرہ وغیرہ۔

اس انعام کا تقاضا تھا کہ انسان خدا کا شکر گزار بنے۔ مگر تمام مخلوقات میں انسان ہی وہ مخلوق ہے جو سب سے کم خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔

يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۢ بِاِمَامِهِمْ ۚ فَمَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ يَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝ وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي

الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ وَأَضَلُّ سَبِيلًا ﴿٧٢﴾

جس دن ہم ہر گروہ کو اس کے رہنما کے ساتھ بلائیں گے۔ پس جس کا اعمال نامہ اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ لوگ اپنا اعمال نامہ پڑھیں گے اور ان کے ساتھ ذرا بھی ناانصافی نہیں کی جائے گی۔ اور جو شخص اس دنیا میں اندھا رہا وہ آخرت میں بھی اندھا رہے گا اور بہت دور پڑا ہوگا راستے سے۔ ۷۲-۷۱

دنیا میں ہر انسانی گروہ اپنے رہنماؤں کے ساتھ ہوتا ہے۔ چنانچہ آخرت میں بھی ہر گروہ اپنے اپنے رہنما کے ساتھ بلایا جائے گا۔ اچھے لوگ اپنے رہنما کے ساتھ اور برے لوگ اپنے رہنما کے ساتھ۔

اس کے بعد ہر ایک کو اس کی زندگی کا اعمال نامہ دیا جائے گا۔ نیک لوگوں کا اعمال نامہ ان کے دائیں ہاتھ میں اور برے لوگوں کا اعمال نامہ ان کے بائیں ہاتھ میں۔ یہ گویا ایک محسوس علامت ہوگی کہ پہلا گروہ خدا کا مقبول گروہ ہے اور دوسرا گروہ اس کا نامقبول گروہ۔

آخرت میں اچھے اور برے کی جو تقسیم ہوگی وہ اس بنیاد پر ہوگی کہ کون دنیا میں اندھا بن کر رہا اور کون بینا بن کر۔ دنیا میں چوں کہ خدا خود براہ راست انسان سے ہم کلام نہیں ہوتا۔ اس لئے دنیا کی زندگی میں خدا کی باتوں کو کائنات کی خاموش نشانیوں اور داعیان حق کے الفاظ سے جاننا پڑتا ہے۔ جو لوگ اس بالواسطہ کلام سے معرفت حاصل کریں وہ خدا کی نظر میں "بینا" لوگ ہیں۔ اور جو لوگ بالواسطہ کلام کی زبان نہ سمجھیں اور اس وقت کے منتظر ہوں جب خدا ظاہر ہو کر خود کلام فرمائے گا وہ خدا کی نظر میں "اندھے" لوگ ہیں۔ ایسے لوگوں کا براہ راست کلام کو سننا کچھ بھی کام نہ آئے گا۔ وہ اس وقت بھی حقیقت سے بہت دور رہیں گے جیسا کہ آج اس سے دور پڑے ہوئے ہیں۔

وَإِنْ كَادُوا لَيَفْتِنُونَكَ عَنِ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهُ ۖ وَإِذًا لَاتَّخَذُوكَ خَلِيلًا ﴿٧٣﴾ وَلَوْلَا أَنْ ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ كِدْتَ تَرْكَنُ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا ﴿٧٤﴾ إِذًا لَأَذَقْنَاكَ ضِعْفَ الْحَيَاةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيرًا ﴿٧٥﴾

اور قریب تھا کہ یہ لوگ فتنہ میں ڈال کر تم کو اس سے ہٹا دیں جو ہم نے تم پر وحی کی ہے تاکہ تم اس کے سوا ہماری طرف غلط بات منسوب کرو اور تب وہ تم کو اپنا دوست بنا لیتے۔ اور اگر ہم نے تم کو جمائے نہ رکھا ہوتا تو قریب تھا کہ تم ان کی طرف کچھ جھک پڑو۔ پھر ہم تم کو زندگی اور موت دونوں کا دُہرا (عذاب) چکھاتے۔ اس کے بعد تم ہمارے مقابلہ میں اپنا کوئی مددگار نہ پاتے۔ ۷۵-۷۳

مکہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا اصل نکتہ یہ تھا کہ خدا صرف ایک ہے اور اس کے سوا جن بتوں کو تم پوجتے ہو وہ سب باطل ہیں۔ اہل مکہ اگرچہ ایک بڑے خدا کا اقرار کرتے تھے مگر اسی کے ساتھ وہ دوسرے خداؤں کو بھی مانتے تھے۔

یہ دوسرے خدا کون تھے۔ یہ ان کے بزرگ اور اکابر تھے جن کو وہ مقدس سمجھتے تھے اور ان کی سنگی تصویریں بنا کر ان کے سامنے جھکنا شروع کر دیا تھا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی دعوت توحید سے بزرگوں کے اس عقیدہ پر زد پڑتی تھی۔ چنانچہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اس مصالحت کے لئے کہتے تھے کہ ہم آپ کے معبود کو مانیں گے، شرط یہ ہے کہ آپ ہمارے معبودوں کو برا کہنا چھوڑ دیں (مساومتهم له ان يعبدوا الهه مقابل ان يترك التنديد بالهتهم وما كان عليه آباؤهم، صفوة التفاسير)

اس دنیا میں وہ شخص فوراً لوگوں کی نظر میں مبغوض ہو جاتا ہے جو ایسی بات کہے جس کی زد لوگوں کے بڑوں پر پڑتی ہو۔ اس کے برعکس لوگوں کے درمیان محبوب بننے کا سب سے زیادہ آسان طریقہ یہ ہے کہ ایسی بات کہو جس میں سب لوگ اپنے اپنے بزرگوں کی تصدیق پا رہے ہوں۔ مگر پیغمبر کا طریقہ یہ ہے کہ سچائی کا کھلا اعلان کیا جائے۔ اس کی پروا نہ کی جائے کہ کس بزرگ پر اس کی زد پڑتی ہے اور کس پر نہیں پڑتی۔

دعوتی عمل سے اصل مقصود حقیقت کا کامل اعلان ہے۔ اسی لئے اعلان کے معاملہ میں کسی کی یا رعایت کی اجازت نہیں ہے۔ پیغمبر یا غیر پیغمبر، جو بھی دعوت حق کے لئے اٹھے اس کو حقیقت کا واشگاف اعلان کرنا ہے، خواہ اس کی یہ قیمت دینی پڑے کہ دنیا میں اس کا کوئی دوست باقی نہ رہے۔

وَإِنْ كَادُوا لَيَسْتَفِزُّونَكَ مِنَ الْأَرْضِ لِيُخْرِجُوكَ مِنْهَا وَإِذًا لَا يَلْبَثُونَ خِلَافَكَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٧٦﴾ سُنَّةَ مَنْ قَدْ أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلًا ﴿٧٧﴾

اور یہ لوگ اس سرزمین سے تمہارے قدم اکھاڑنے لگے تھے تاکہ تم کو اس سے نکال دیں۔ اور اگر ایسا ہوتا تو تمہارے بعد یہ بھی بہت کم ٹھہرنے پاتے۔ جیسا کہ ان رسولوں کے بارے میں ہمارا طریقہ رہا ہے جن کو ہم نے تم سے پہلے بھیجا تھا اور تم ہمارے طریقے میں تبدیلی نہ پاؤ گے۔ ۷۶-۷۷

جب بھی کسی گروہ میں سچے دین کی دعوت اٹھتی ہے تو صورت حال یہ ہوتی ہے کہ ایک طرف وہ لوگ ہوتے ہیں جو مذہب کے نام پر قائم شدہ گدیوں کے مالک ہوتے ہیں۔ دوسری طرف حق کا داعی ہوتا ہے جو بے آمیز دین کا نمائندہ ہونے کی وجہ سے وقت کے ماحول میں تنہا اور بے زور دکھائی دیتا ہے۔ یہ فرق لوگوں کو غلط فہمی میں

ڈال دیتا ہے۔ وہ داعیٔ حق کو بالکل بے قیمت سمجھ لیتے ہیں۔ حتیٰ کہ یہ چاہتے ہیں کہ اس کو اپنی بستی سے نکال دیں۔

ایسے لوگ بھول جاتے ہیں کہ یہ زمین خدا کی زمین ہے۔ یہاں کسی بندۂ خدا کے خلاف تخریب کا منصوبہ بنانا خود اپنے آپ کو خدا کی نظر میں مجرم ثابت کرنا ہے۔ خدا کے داعی کو کسی بستی سے نکالنا ایسا ہی ہے جیسے کسی شہر سے اس شخص کو نکال دیا جائے جس کو وہاں حکومت وقت کے نمائندہ کی حیثیت حاصل ہو۔ ایسے شخص کو بستی میں نہ رہنے دینے کا نتیجہ بالآخر یہ ہوتا ہے کہ بستی والے خود وہاں نہ رہنے پائیں۔

آدمی دوسرے کو نکالتا ہے حالاں کہ وہ خود اپنے آپ کو نکال رہا ہوتا ہے۔ آدمی دوسرے کو چھوٹا کرنا چاہتا ہے حالاں کہ وہ خود اپنے آپ کو اس مالک حقیقی کی نظر میں چھوٹا کر رہا ہوتا ہے جس کو حقیقۃً یہ اختیار ہے کہ وہ جس کو چاہے چھوٹا کرے اور جس کو چاہے بڑا کر دے۔

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ﴿۷۸﴾

نماز قائم کرو سورج ڈھلنے کے بعد سے رات کے اندھیرے تک۔ اور خاص کر فجر کی قرأت۔ بے شک فجر کی قرأت مشہود ہوتی ہے۔ ۷۸

آیت کا لفظی ترجمہ یہ ہے: "قائم رکھو نماز کو سورج ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک" ان الفاظ سے بظاہر یہ نکلتا ہے کہ دوپہر بعد سے لے کر رات کا اندھیرا چھانے تک مسلسل نماز پڑھی جاتی رہے۔ اس میں شک نہیں کہ خدا کی عظمت اور اس کے احسانات کا تقاضا یہی ہے کہ بندے ہر وقت اس کی عبادت کرتے رہیں۔ مگر حدیث کی تشریح نے اس عام حکم کو خاص کر دیا۔ حدیث نے اس مشکل حکم کو اس طرح آسان کر دیا کہ اس نے قرار دیا کہ عام اوقات میں لوگ صرف ذکر (یاد) کی حد تک خدا سے اپنا تعلق وابستہ رکھیں اور دوپہر سے رات تک کے اوقات میں چار بار (ظہر، عصر، مغرب، عشا) اس کی عبادت کر لیا کریں۔

اسی طرح آیت کے دوسرے ٹکڑے کا لفظی ترجمہ یہ ہے "اور قرآن پڑھنا فجر کا"۔ اس کو بھی اگر اس کے ظاہری مفہوم میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ نکلے گا کہ روزانہ صبح کے تمام اوقات میں قرآن پڑھا جاتا رہے۔ مگر یہاں حدیث کی تشریح نے ہمارے لئے آسانی پیدا کر دی۔ حدیث کے مطابق اس حکم کا متعین مطلب یہ ہے کہ صبح کے وقت بھی ایک نماز ادا کی جائے اور اس (پانچویں) نماز کا نمایاں پہلو یہ ہو کہ اس میں قرآن

کی لمبی تلاوت کی جائے۔

وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴿۷۹﴾

اور رات کو تہجد پڑھو، یہ نفل ہے تمہارے لئے۔ امید ہے کہ تمہارا رب تم کو مقام محمود پر کھڑا کرے۔ ۷۹

تہجد کی نماز کی روح اللہ کو اپنی مخصوص تنہائیوں میں یاد کرنا ہے۔ تہجد کے لفظی معنی رات کی بیداری کے ہیں۔ رات کا وقت تنہائی اور سکون کا وقت ہوتا ہے۔ رات کو آدمی جب ایک نیند پوری کرکے اٹھتا ہے تو وہ اس کے تمام اوقات میں سب سے بہتر وقت ہوتا ہے۔ ان لمحات میں آدمی جب خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور نماز کی صورت میں ہاتھ باندھ کر خدا کے کلام کو پڑھتا ہے تو گویا وہ اپنی عبدیت کی آخری تصویر بنا رہا ہوتا ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب کہ اس کا دل بھی اس کا ساتھ دے رہا ہو اور اس کی شخصیت اس طرح پگھل اٹھی ہو کہ وہ بے قرار ہو کر آنکھوں کے راستہ سے بہہ پڑے۔

مقام محمود کے لفظی معنی ہیں تعریف کیا ہوا مقام۔ اس محمودیت کا ایک دنیوی پہلو ہے اور ایک اس کا اخروی پہلو۔ اخروی پہلو وہ ہے جس کو مفسرین شفاعت کبریٰ کہتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے، قیامت کے دن تمام انبیاء اپنے مومنین کی شفاعت کریں گے۔ یہ شفاعت گویا ان کے مومن ہونے کی تصدیق ہوگی جس کے بعد ان لوگوں کو جنت میں داخل کیا جائے گا جن کو خدا جنت میں داخل کرنا چاہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سب سے بڑی ہوگی۔ کیوں کہ اپنے امتیوں کی تعداد سب سے زیادہ ہونے کی وجہ سے آپ سب سے بڑی تعداد کی شفاعت فرمائیں گے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی محمودیت کا دنیوی پہلو یہ ہے کہ آپ کے ساتھ ایسی تاریخ جمع ہوجائے کہ آپ تمام اقوام عالم کی نظر میں مسلمہ طور پر قابل ستائش اور لائق اعتراف بن جائیں۔ خدا کا یہ منصوبہ آپ کے حق میں مکمل طور پر پورا ہوا۔ آج دنیا کے تمام لوگ آپ کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں۔ آپ کی نبوت ایک مسلّم نبوت بن چکی ہے نہ کہ نزاعی نبوت جیسا کہ وہ آپ کے ظہور کے ابتدائی سالوں میں تھی۔

محمودی نبوت، دنیوی اعتبار سے مسلمہ (Established) نبوت کا دوسرا نام ہے۔ یعنی ایسی نبوت جس کے حق میں تاریخی شہادتیں اتنی زیادہ کامل طور پر موجود ہوں کہ آپ کی شخصیت اور آپ کی تعلیمات کے بارہ میں کسی کے لئے شبہہ کی گنجائش نہ رہے۔ انسان، خود اپنے مسلمہ علمی معیار کے مطابق آپ کی حیثیت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوجائے۔ اقرار واعتراف کی آخری صورت تعریف ہے اس لئے اس کو "مقام محمود" کہا گیا۔

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا ﴿۸۰﴾ وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴿۸۱﴾

اور کہو کہ اے میرے رب مجھ کو داخل کر سچا داخل کرنا اور مجھ کو نکال سچا نکالنا۔ اور مجھ کو اپنے پاس سے مددگار قوت عطا کر اور کہہ کہ حق آیا اور باطل مٹ گیا۔ بیشک باطل مٹنے ہی والا تھا۔ ۸۰ ـ ۸۱

پیغمبر اسلام کو عرب کے سردار "مذموم" بنا دینا چاہتے تھے۔ مگر اللہ کا فیصلہ تھا کہ آپ کو "محمود" کے مقام تک پہنچایا جائے۔ اس کے لئے کہ اللہ کا منصوبہ یہ تھا کہ مدینہ میں آپ کے لئے موافق حالات پیدا کئے جائیں اور مکہ سے نکال کر آپ کو مدینہ لے جایا جائے۔ مدینہ میں اسلام کا اقتدار قائم ہو تبلیغی کوشش کے ذریعہ مسلمانوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ بڑھائی جائے۔ یہاں تک کہ وہ لوگ مکہ فتح کرلیں اور بالآخر سارا عرب مسخر ہو جائے۔ اس طرح توحید کی پشت پر وہ طاقت جمع ہو جو مسلسل عمل کے ذریعہ ساری دنیا سے شرک کا غلبہ ختم کر دے۔

یہی وہ خدائی منصوبہ تھا جس کو یہاں دعا کی صورت میں پیغمبر اسلام کو تلقین کیا گیا۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۙ وَلَا یَزِیْدُ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴿۸۲﴾

اور ہم قرآن میں سے اتارتے ہیں جس میں شفا اور رحمت ہے ایمان والوں کے لئے، اور ظالموں کے لئے اس سے نقصان کے سوا اور کچھ نہیں بڑھتا۔ ۸۲

قرآن خالص سچائی کا اعلان ہے۔ خالص سچائی جب پیش کی جاتی ہے تو ان تمام لوگوں پر اس کی زد پڑتی ہے جو یا تو سچائی سے خالی ہوں یا ملاوٹی سچائی لئے ہوئے ہوں۔ اب جو لوگ حقیقت پسند ہیں ان کے سامنے جب خالص سچائی آتی ہے تو وہ سچائی کو معیار بناتے ہیں نہ کہ اپنی ذات کو۔ وہ اپنے آپ کو سچائی پر ڈھال لیتے ہیں نہ یہ کہ خود سچائی کو اپنے اوپر ڈھالنے لگیں۔ اس طرح ان کی سنجیدگی اور حقیقت پسندی ان کے قرآن کو ان کے لئے رحمت بنا دیتی ہے۔

دوسرے لوگ وہ ہیں جن کے اندر اپنی بڑائی کا احساس چھپا ہوا ہوتا ہے۔ ان کے سامنے جب بے آمیز سچائی آتی ہے تو اپنی مخصوص نفسیات کی بنا پر ان کا ذہن الٹے رخ پر چل پڑتا ہے۔ وہ یہ نہیں سوچ پاتے کہ "اگر میں سچائی کو اختیار کر لوں تو میں سچا بن جاؤں گا" اس کے بجائے کہ وہ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ "اگر میں نے سچائی کو مانا تو میں چھوٹا ہو جاؤں گا"۔ وہ جانے والی چیز کی حفاظت میں رہنے والی چیز کو کھو دیتے ہیں۔ وہ اپنی بڑائی کو قائم رکھنے کی خاطر سچائی کو چھوٹا کرنے پر راضی ہو جاتے ہیں۔

وَإِذَآ أَنْعَمْنَا عَلَى الْإِنسَانِ أَعْرَضَ وَنَأَىٰ بِجَانِبِهِۦ ۖ وَإِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوسًا ۝ قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلَىٰ شَاكِلَتِهِۦ فَرَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ أَهْدَىٰ سَبِيلًا ۝ ع

اور آدمی پر جب ہم انعام کرتے ہیں تو وہ اعراض کرتا ہے اور پیٹھ موڑ لیتا ہے۔ اور جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو وہ ناامید ہو جاتا ہے۔ کہو کہ ہر ایک اپنے طریقہ پر عمل کر رہا ہے۔ اب تمھارا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ کون زیادہ ٹھیک راستہ پر ہے۔ ۸۴-۸۳

ہر انسان پر یہ حالات گزرتے ہیں کہ جب اس کو راحت اور فراوانی حاصل ہوتی ہے تو وہ زبردست خود اعتمادی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ کسی بات کو ماننے کے لئے وہ اتنا کڑا بن جاتا ہے جیسے کہ وہ ایسا لوہا ہے جو جھکنا نہیں جانتا۔ مگر جب اس کے اسباب چھن جاتے ہیں اور اس کو عجز کا تجربہ ہوتا ہے تو اچانک وہ بے ہمت ہو جاتا ہے۔ وہ مایوسی سے نڈھال ہو جاتا ہے۔

موجودہ دنیا میں ہر آدمی اپنے بارہ میں اس تجربہ سے گزرتا ہے۔ مگر کوئی ایسا نہیں جو اس تجربہ میں اپنی دریافت کر لے۔ وہ یہ سوچے کہ دنیا میں جبکہ اسے آزادی حاصل ہے وہ حق کے مقابلہ میں اتنی سرکشی دکھا رہا ہے۔ مگر اس وقت اس کا کیا حال ہوگا جب کہ قیامت آئے گی اور اس سے اس کا سارا اختیار چھین لے گی۔ آدمی کتنا زیادہ کمزور ہے مگر وہ کتنا زیادہ اپنے کو طاقت ور سمجھتا ہے۔

شاکلہ سے مراد ذہنی سانچہ ہے۔ ہر آدمی کے حالات اور رجحانات کے تحت دھیرے دھیرے اس کا ایک خاص ذہنی سانچہ بن جاتا ہے۔ وہ اسی کے زیر اثر سوچتا ہے اور اسی کے مطابق اس کا نقطۂ نظر بنتا ہے۔ مگر صحیح نقطۂ نظر وہ ہے جو علم الٰہی کے مطابق صحیح ہو اور غلط وہ ہے جو علم الٰہی کے مطابق غلط ہو۔

یہی وہ مقام ہے جہاں آدمی کا امتحان ہے۔ آدمی کو یہ کرنا ہے کہ اس کے شاکلہ نے اس کا جو ذہنی خول بنا دیا ہے وہ اس خول کو توڑے۔ تاکہ وہ چیزوں کو ویسا ہی دیکھ سکے جیسی کہ وہ ہیں —

بالفاظ دیگر وہ چیزوں کو ربانی نگاہ سے دیکھنے لگے — جو لوگ اپنے ذہنی خول میں گم ہوں، وہ بھٹکے ہوئے لوگ ہیں۔ اور جو لوگ اپنے ذہنی خول سے نکل کر خدائی نقطۂ نظر کو پالیں وہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت پائی۔

وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ ۖ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَآ أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٨٥﴾

اور وہ تم سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہو کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے۔ اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔ ۸۵

یہاں روح سے مراد وحی الٰہی ہے۔ عرب کے جن لوگوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا، وہ وحی والہام کے منکر نہ تھے۔ اس سوال کا رخ ان کے نزدیک رسول اللہ کی بے خبری کی طرف تھا نہ کہ حقیقۃً اپنی بے خبری کی طرف۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ رسول اللہ کے گرد عظمت کی تاریخ نہیں بنی تھی۔ لوگوں کو آپ محض ایک عام انسان نظر آتے تھے۔ چونکہ انھیں یقین نہیں تھا کہ خدا کا فرشتہ آپ کے پاس خدا کی وحی لے کر آتا ہے۔ اس لئے انھوں نے آپ کا مذاق اڑانے کے لئے یہ سوال کیا۔

تاہم اس سوال کے جواب میں قرآن میں ایک اہم اصولی بات بتادی گئی۔ وہ یہ کہ انسان کو صرف "علم قلیل" دیا گیا ہے۔ وہ "علم کثیر" کا مالک نہیں ہے۔ اس لئے حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ان سوالات میں نہ الجھے جن کو وہ اپنی پیدائشی کم علمی کی بنا پر جان نہیں سکتا۔

قدیم زمانہ میں انسان صرف آنکھ کے ذریعہ چیزوں کو دیکھ سکتا تھا۔ تاہم بصری مطالعہ نے بتایا کہ آنکھ صرف ایک حد تک کام کرتی ہے۔ اس لئے وہ کلی مطالعہ کے لئے کافی نہیں۔ مثلاً ایک چیز جو دور سے دیکھنے میں ایک نظر آتی ہے، قریب سے جاکر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ دو تھی۔

موجودہ زمانہ میں آلاتی مطالعہ وجود میں آیا تو انسان نے سمجھا کہ آلات اس کی محدودیت کا بدل ہیں۔ آلاتی مطالعہ کے ذریعے چیزوں کو ان کی آخری حد تک دیکھا جاسکتا ہے۔ مگر بیسویں صدی میں پہنچ کر اس خوش خیالی کا خاتمہ ہوگیا۔ اب معلوم ہوا کہ چیزیں اس سے زیادہ پیچیدہ اور اس سے زیادہ پر اسرار ہیں کہ آلات کی مدد سے ان کو پوری طرح دیکھا جاسکے۔

ایسی حالت میں اجمالی علم پر قانع ہونا انسان کے لئے حقیقت پسندی کا تقاضا بن گیا ہے نہ کہ محض عقیدہ کا تقاضا۔ ہماری صلاحیتیں محدود ہیں اور ہم سے ماورا جو عالم ہے وہ لامحدود، پھر محدود کے لئے کس

طرح ممکن ہے کہ وہ لامحدود کا احاطہ کرسکے۔ انسان کی محدودیت کا تقاضا ہے کہ وہ بالواسطہ علم پر قناعت کرے اور براہ راست علم پر اصرار کرنا چھوڑ دے۔ بالفاظ دیگر قرینہ سے حاصل شدہ علم کو بھی اسی طرح معقول (Valid) مان لے جس طرح وہ مشاہدہ سے حاصل شدہ علم کو معقول مانتا ہے۔

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ﴿۸۶﴾ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۭ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا ﴿۸۷﴾ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓي اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴿۸۸﴾

اور اگر ہم چاہیں تو وہ سب کچھ تم سے چھین لیں جو ہم نے وحی کے ذریعہ تم کو دیا ہے، پھر تم اس کے لئے ہمارے مقابلہ میں کوئی حمایتی نہ پاؤ، مگر یہ صرف تمہارے رب کی رحمت ہے، بے شک تمہارے اوپر اس کا بڑا فضل ہے۔ کہو کہ اگر تمام انسان اور جنات جمع ہو جائیں کہ ایسا قرآن بنا لائیں تب بھی وہ اس کے جیسا نہ لاسکیں گے۔ اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں۔ ۸۶ - ۸۸

قرآن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر خاص خاص اوقات میں اترتا تھا۔ ان مخصوص اوقات کے علاوہ آپ خود بھی اس پر قادر نہ تھے کہ قرآن جیسا کلام وضع کرسکیں۔ دوسرے وقتوں میں آپ کی زبان سے جو کلام نکلتا تھا وہ ہمیشہ قرآن کے کلام سے مختلف ہوتا تھا۔ جب کبھی لمبی مدت کے لئے وحی رکتی تو آپ بے حد پریشان ہو جاتے۔ مگر آپ کے لئے یہ ممکن نہ ہوسکا کہ خود یا کسی کی مدد سے قرآن جیسا کلام بنالیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن کی زبان اور آپ کی اپنی زبان میں بے حد نمایاں فرق ہوتا تھا۔ یہ فرق آج بھی ہر عربی داں قرآن اور حدیث کی زبان کا تقابل کر کے دیکھ سکتا ہے۔

یہ واقعہ اس بات کا ایک واضح ثبوت ہے کہ قرآن محمد کا کلام نہیں۔ وہ محمد کے سوا ایک اور برتر ذہن سے نکلا ہوا کلام ہے۔

جو لوگ قرآن کو انسانی کلام کہتے تھے ان سے کہا گیا کہ اگر تمہارا خیال صحیح ہے تو بحیثیت انسان کے تمہیں بھی اس کی قدرت ہونی چاہئے۔ تم تنہا یا دوسرے انسانوں کو لے کر قرآن جیسا کلام بنا کر لاؤ۔ مگر اس وقت کے لوگوں میں سے کسی کے لئے ممکن نہ ہوسکا کہ وہ اس چیلنج کا جواب دے۔ بعد کے زمانہ میں بھی کوئی ادیب یا عالم قرآن جیسے کلام کا نمونہ پیش نہ کرسکا۔ واقعات بتاتے ہیں کہ بہت سے لوگوں نے کوشش کی مگر وہ سراسر ناکام

رہے۔ وہ قرآن جیسی ایک سورۃ بھی نہ بنا سکے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ فَأَبَىٰ أَكْثَرُ النَّاسِ إِلَّا كُفُورًا ﴿٨٩﴾ وَقَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنْبُوعًا ﴿٩٠﴾ أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِنْ نَخِيلٍ وَعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْأَنْهَارَ خِلَالَهَا تَفْجِيرًا ﴿٩١﴾ أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا أَوْ تَأْتِيَ بِاللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ قَبِيلًا ﴿٩٢﴾ أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِنْ زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقَىٰ فِي السَّمَاءِ وَلَنْ نُؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّىٰ تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَقْرَؤُهُ ۗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَسُولًا ﴿٩٣﴾

اور ہم نے لوگوں کے لئے اس قرآن میں ہر قسم کا مضمون طرح طرح سے بیان کیا ہے، پھر بھی اکثر لوگ انکار ہی پر جمے رہے اور وہ کہتے ہیں کہ ہم ہرگز تم پر ایمان نہ لائیں گے جب تک تم ہمارے لئے زمین سے کوئی چشمہ جاری نہ کر دو یا تمہارے پاس کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ ہو جائے، پھر تم اس باغ کے بیچ میں بہت سی نہریں جاری کر دو۔ یا جیسا کہ تم کہتے ہو، ہمارے اوپر آسمان سے ٹکڑے گرا دو یا اللہ اور فرشتوں کو لا کر ہمارے سامنے کھڑا کر دو یا تمہارے پاس سونے کا کوئی گھر ہو جائے یا تم آسمان پر چڑھ جاؤ اور ہم تمہارے چڑھنے کو بھی نہ مانیں گے جب تک تم وہاں سے ہم پر کوئی کتاب نہ اتار دو جسے ہم پڑھیں —— کہو کہ میرا رب پاک ہے، میں تو صرف ایک بشر ہوں، اللہ کا رسول۔ ۹۳-۸۹

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حق کا پیغام پیش کیا تو آپ کے معاصرین نے کہا کہ ہم تم کو اس وقت مانیں گے جب کہ تم خارق عادت کرشمے دکھاؤ۔ مگر اس قسم کے مطالبات خدا کے منصوبۂ تخلیق کے خلاف ہیں۔ انسان کو خدا نے باشعور وجود کے طور پر پیدا کیا ہے۔ یہ ساری کائنات میں ایک انتہائی نادر عطیہ ہے جو اس لئے دیا گیا ہے کہ انسان ذاتی شعور کے ذریعہ حق کو پہچانے نہ کہ مسحور کن کرشموں کے ذریعہ۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں انسان کا امتحان "دلیل" کی سطح پر ہو رہا ہے۔ یہاں ہر آدمی کو دلیل کی زبان میں حق کو پہچاننا اور اس کو اختیار کرنا ہے۔ جو لوگ دلیل کی سطح پر حق کو نہ پہچانیں وہی وہ لوگ ہیں جو بالآخر ناکام و نامراد رہیں گے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَنْ يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ إِلَّا أَنْ قَالُوا أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا

رَسُوْلًا ﴿۹۴﴾ قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰۗىِٕكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَىِٕنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَاۗءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴿۹۵﴾ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ﴿۹۶﴾

اور جب ان کے پاس ہدایت آگئی تو ان کو ایمان لانے سے اس کے سوا اور کوئی چیز مانع نہیں ہوئی کہ انھوں نے کہا کہ کیا اللہ نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔ کہو کہ اگر زمین میں فرشتے ہوتے کہ اس میں چلتے پھرتے تو البتہ ہم ان پر آسمان سے فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتے۔ کہو کہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان گواہی کے لئے کافی ہے۔ بے شک وہ اپنے بندوں کو جاننے والا، دیکھنے والا ہے۔ ۹۴-۹۶

اس طرح کی آیات کو آج جب ایک آدمی پڑھتا ہے تو اس کو تعجب ہوتا ہے کہ وہ کیسے ہٹ دھرم لوگ تھے جنھوں نے پیغمبر اعظم (محمد صلے اللہ علیہ وسلم) کا انکار کیا۔ اس تعجب کی وجہ دراصل یہ ہے کہ آج کا ایک آدمی منکرین کا تقابل "پیغمبر اعظم" سے کرتا ہے۔ جب کہ دور اول کے منکرین کے سامنے جو شخص تھا وہ ایک ایسا شخص تھا جو ابھی تک صرف "محمد بن عبد اللہ" تھا۔ وہ ساری تاریخ اس وقت مستقبل کے پردہ میں چھپی ہوئی تھی جس کے بعد دنیا نے آپ کو پیغمبر اعظم کی حیثیت سے تسلیم کیا۔

پیغمبر اپنے زمانہ کے لوگوں کو صرف ایک "بشر" نظر آتا ہے۔ بعد کو جب تاریخی تصدیقات جمع ہو جاتی ہیں تو لوگوں کو نظر آتا ہے کہ یہ واقعی پیغمبر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر پیغمبر کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا کہ اس کے ہم زمانہ مخاطبین نے اس کا انکار کیا اور بعد کے لوگ اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے۔

موجودہ دنیا میں آدمی حالت امتحان میں ہے۔ اس لئے یہ ممکن نہیں کہ فرشتوں کے ذریعہ اس کو حق سے باخبر کیا جائے۔ فرشتوں کے ذریعہ حق سے باخبر کرنے کا مطلب حقیقت کو آخری حد تک بے نقاب کر دینا ہے۔ جب حقیقت کو آخری حد تک بے نقاب کر دیا جائے تو اس کے بعد آدمی کا امتحان کس چیز میں ہوگا۔

وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِهٖ ۭ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰي وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ۭ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ﴿۹۷﴾ ذٰلِكَ جَزَاۗؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿۹۸﴾

اللہ جس کو راہ دکھائے وہی راہ پانے والا ہے۔ اور جس کو وہ بے راہ کر دے تو تم ان کے لئے اللہ کے سوا کسی کو مددگار نہ پاؤ گے۔ اور ہم قیامت کے دن ان کو ان کے منھ کے بل اندھے اور گونگے اور بہرے اکٹھا کریں گے ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔ جب جب اس کی آگ دھیمی ہوگی ہم اس کو مزید بھڑکا دیں گے۔ یہ ہے ان کا بدلہ اس سبب سے کہ انھوں نے ہماری نشانیوں کا انکار کیا۔ اور کہا کہ جب ہم ہڈی اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا ہم از سر نو پیدا کرکے اٹھائے جائیں گے۔ ۹۸-۹۷

دنیا میں آدمی اپنی حیثیت مادی کے مطابق جیتا ہے، آخرت میں وہ اپنی حیثیت روحانی کے مطابق نظر آئے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ دنیا میں راہ سے بے راہ ہوئے وہ قیامت میں اٹھیں گے تو اپنے آپ کو اندھا، بہرا، گونگا پائیں گے۔ ان کا راہ سے بے راہ ہونا اس لئے تھا کہ انھوں نے آنکھ اور کان اور زبان کو اس مقصد میں استعمال نہیں کیا جس کے لئے وہ انھیں دئے گئے تھے۔ انھوں نے خدا کی نشانیوں کو نہیں دیکھا۔ انھوں نے خدا کے دلائل کو نہیں سنا۔ ان کی زبان حق کی حمایت میں نہیں کھلی۔ وہ آنکھ، کان اور زبان رکھتے ہوئے حق کی نسبت سے بے آنکھ، بے کان اور بے زبان ہو گئے۔ موت کے بعد جب وہ عالم حقیقی میں پہنچیں گے تو وہاں وہ اپنے آپ کو اپنی اصلی صورت میں پائیں گے نہ کہ اس مصنوعی صورت میں جو حالت امتحان میں ہونے کی وجہ سے وقتی طور پر انھیں موجودہ دنیا میں حاصل تھی۔

"جب ہم ریزہ ریزہ ہو جائیں گے" کہنے والے ایک وہ ہیں جو زبان قال سے یہ جملہ دہرائیں۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو زبان حال سے اس کو کہیں۔ یہ دوسرے لوگ وہ ہیں جو آنکھ اور کان اور زبان کو اس کے مقصد تخلیق کے خلاف استعمال کریں اور یہ گمان رکھیں کہ ان کا یہ عمل بس اسی دنیا میں گم ہو کر رہ جائے گا، وہ آخرت میں پہنچنے والا نہیں۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ قَادِرٌ عَلَىٰ أَنْ يَخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَجَعَلَ لَهُمْ أَجَلًا لَا رَيْبَ فِيهِ فَأَبَى الظَّالِمُونَ إِلَّا كُفُورًا ﴿٩٩﴾

کیا ان لوگوں نے نہیں دیکھا کہ جس اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا وہ اس پر قادر ہے کہ ان کے مانند دوبارہ پیدا کر دے اور اس نے ان کے لئے ایک مدت مقرر کر رکھی ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔ اس پر بھی ظالم لوگ بے انکار کئے نہ رہے۔ ۹۹

زمین و آسمان ہمارے سامنے ایک حقیقت کے طور پر موجود ہیں۔ ہم ان کا انکار نہیں کر سکتے۔ یہ

موجودگی ثابت کرتی ہے کہ یہاں کوئی زندہ ہستی ہے جو یہ طاقت رکھتی ہے کہ وہ پہلی بار تخلیق کرے۔ وہ نہیں ہے کو وجود میں لائے۔ پھر جب پہلی تخلیق ممکن ہے تو دوسری تخلیق کیوں ممکن نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پہلی تخلیق کو ماننے کے بعد دوسری تخلیق کو ماننے میں کوئی علمی وعقلی دلیل مانع نہیں رہتی۔

اتنے کھلے ہوئے قرینہ کے باوجود جو شخص تخلیق ثانی کو نہ مانے وہ ظالم ہے۔ وہ ہٹ دھرمی کی زمین پر کھڑا ہوا ہے نہ کہ دلیل اور معقولیت کی زمین پر۔

قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ۝۱۰۰

ع ۱۱

کہو کہ اگر تم لوگ میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے مالک ہوتے تو اس صورت میں تم خرچ ہو جانے کے اندیشے سے ضرور ہاتھ روک لیتے اور انسان بڑا ہی تنگ دل ہے۔ ۱۰۰

انسان تنگ ظرف واقع ہوا ہے۔ وہ ہر قسم کے شرف کو اپنے لئے یا اپنے گروہ کے لئے جمع کر لینا چاہتا ہے۔ اگر نعمتوں کی تقسیم انسان کے ہاتھ میں ہوتی تو جن لوگوں کے پاس دولت وعظمت آگئی تھی وہی نبوت کو بھی اپنے پاس جمع کر لیتے۔ وہ اس کو دوسروں کے پاس جانے نہ دیتے۔

مگر خدا معاملات کو جوہر کے اعتبار سے دیکھتا ہے نہ کہ گروہی تعصبات کی نظر سے۔ وہ تمام انسانوں پر نظر ڈالتا ہے۔ اور پوری نسل میں جو سب سے بہتر انسان ہوتا ہے اس کو نبوت کے لئے چن لیتا ہے۔ نبوت کا انتخاب اگر انسان کرنے لگیں تو یہاں بھی وہی کیفیت پیدا ہو جائے جو انسانی اداروں میں جانب داری کی وجہ سے نا اہل انسانوں کی بھیڑ کی صورت میں نظر آتی ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّىْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا ۝۱۰۱ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَاۗءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَاۗئِرَ ۚ وَاِنِّىْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ۝۱۰۲ فَاَرَادَ اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِيْعًا ۝۱۰۳ۙ وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا ۝۱۰۴ۭ

اور ہم نے موسیٰ کو نو نشانیاں کھلی ہوئی دیں۔ تو بنی اسرائیل سے پوچھ لو جب کہ وہ ان کے پاس آیا تو فرعون نے اس سے کہا کہ اے موسیٰ، میرے خیال میں تو ضرور تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔ موسیٰ نے کہا کہ تو خوب جانتا ہے کہ ان کو آسمانوں اور زمین کے رب ہی نے اتارا ہے، آنکھیں کھول دینے کے لئے اور میرا خیال ہے کہ اے فرعون، تو ضرور شامت زدہ آدمی ہے۔ پھر فرعون نے چاہا کہ ان کو اس سرزمین سے اکھاڑ دے۔ پس ہم نے اس کو اور جو اس کے ساتھ تھے سب کو غرق کر دیا۔ اور ہم نے بنی اسرائیل سے کہا کہ تم زمین میں رہو۔ پھر جب آخرت کا وعدہ آجائے گا تو ہم تم سب کو اکٹھا کر کے لائیں گے۔ ۱۰۴-۱۰۱

فرعون کے سامنے کھلی ہوئی نشانیاں پیش کی گئیں تو اس نے کہا کہ یہ "جادو" ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ داعی کی طرف سے خواہ کتنی ہی طاقت ور دلیل اور کتنی ہی بڑی نشانی پیش کر دی جائے، انسان کے لئے یہ دروازہ بند نہیں ہوتا کہ وہ کچھ الفاظ بول کر اس کو رد کر دے ـــــ وہ خدائی نشانی کو انسانی جادو کہہ دے۔ وہ علمی دلیل کو ناقص مطالعہ کہہ کر ٹال دے۔ وہ واضح قرآن کو غیر معقول کہہ کر نظر انداز کر دے۔

حق کے مخالفین جب لفظی مخالفت سے حق کی آواز دبانے میں کامیاب نہیں ہوتے تو وہ جارحانہ کارروائیوں پر اتر آتے ہیں۔ مگر وہ بھول جاتے ہیں کہ یہ کسی انسان کا معاملہ نہیں۔ بلکہ خدا کا معاملہ ہے اور کون ہے جو خدا کے ساتھ جارحیت کر کے کامیاب ہو۔

وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ۭ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَي النَّاسِ عَلٰي مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ۝

اور ہم نے قرآن کو حق کے ساتھ اتارا ہے اور وہ حق ہی کے ساتھ اترا ہے۔ اور ہم نے تم کو صرف خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور ہم نے قرآن کو تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا تاکہ تم اس کو لوگوں کے سامنے ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔ اور اس کو ہم نے بتدریج اتارا ہے۔ ۱۰۶-۱۰۵

قرآن بے آمیز سچائی کا اعلان ہے۔ مگر بے آمیز سچائی ہمیشہ لوگوں کے لئے سب سے کم قابل قبول چیز ہوتی ہے۔ اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے داعی پر یہ ذمہ داری نہیں ڈالی کہ وہ لوگوں کو ضرور منوا لے۔ داعی کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ کامل طور پر سچائی کا اعلان کر دے۔

قرآن میں مخاطب کی آخری حد تک رعایت کی گئی ہے۔ اسی مصلحت کی بنا پر قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر اتارا گیا ہے۔ تاکہ جو لوگ سمجھنا چاہتے ہیں وہ اس کو خوب سمجھتے جائیں۔ وہ آہستہ آہستہ ان کے فکر و عمل کا جزء بنتا

چلا جائے۔

قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖۤ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ اِذَا یُتْلٰی عَلَیْهِمْ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ۝ وَّ یَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ۝ وَ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ یَبْكُوْنَ وَ یَزِیْدُهُمْ خُشُوْعًا ۝

کہو کہ تم اس پر ایمان لاؤ یا ایمان نہ لاؤ، وہ لوگ جن کو اس سے پہلے علم دیا گیا تھا جب وہ ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدہ میں گر پڑتے ہیں۔ اور وہ کہتے ہیں کہ ہمارا رب پاک ہے۔ بے شک ہمارے رب کا وعدہ ضرور پورا ہوتا ہے۔ اور وہ ٹھوڑیوں کے بل روتے ہوئے گرتے ہیں اور قرآن ان کا خشوع بڑھا دیتا ہے۔ ۱۰۷ - ۱۰۹

خدا کا کلام انسان سے عجز و تواضع کا تقاضا کرتا ہے۔ مگر موجودہ دنیا میں خدا اپنا کلام خود سنانے نہیں آتا۔ وہ ایک "انسان" کی زبان سے اپنا کلام جاری کراتا ہے۔ اب جو لوگ اپنے اندر کبر کی نفسیات لئے ہوتے ہیں، وہ اس کے آگے جھکنے کو ایک انسان کے آگے جھکنے کے ہم معنی بنا لیتے ہیں اور اس بنا پر اس کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔

اس کے برعکس جو لوگ کبر کی نفسیات سے خالی ہوں وہ خدا کے کلام کو عین خدا کے کلام کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ ان کو انسان کی زبان سے جاری ہونے والے کلام میں خدا کی جھلکیاں نظر آجاتی ہیں۔ وہ اس کے ذریعہ خدا سے مربوط ہو جاتے ہیں۔ وہ خدا کی بڑائی کے مقابلہ میں اپنے عجز کو اور اپنے عجز کے مقابلہ میں خدا کی بڑائی کو پالیتے ہیں۔ یہ احساس ان کے سینہ کو پگھلا دیتا ہے۔ وہ روتے ہوئے اس کے آگے سجدہ میں گر پڑتے ہیں۔

پہلی قسم کے آدمیوں کی مثال قریش کے سرداروں کی ہے۔ اور دوسری قسم کے آدمیوں کی مثال اہل کتاب کے ان مومنین کی جو دور اول میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے۔

اس آیت میں بظاہر صالحین اہل کتاب کا ذکر ہے۔ انھوں نے قدیم آسمانی صحیفوں میں پڑھا تھا کہ ایک آخری پیغمبر آنے والے ہیں۔ جو لوگ ان پر ایمان لائیں گے اور ان کا ساتھ دیں گے وہ خدا کی خصوصی رحمت کے مستحق قرار پائیں گے۔ اس بنا پر وہ اس آخری نبی کا پہلے سے انتظار کر رہے تھے۔ یہ انتظار اتنا شدید تھا کہ جب وہ پیغمبر آیا تو انھوں نے فوراً اس کو پہچان لیا۔ ان کا یہ حال ہوا کہ اس پیغمبر کی لائی ہوئی کتاب (قرآن) کو جب وہ پڑھتے تو شدت احساس سے ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے اور وہ روتے ہوئے خدا کے آگے سجدہ میں گر جاتے۔

تاہم یہ صرف اہل کتاب کے ایک گروہ کا معاملہ نہیں ہے بلکہ وہ سارے انسانوں کا معاملہ ہے۔ ہر انسان کے اندر خدا نے پیشگی طور پر حق کی معرفت رکھ دی ہے گویا کہ ہر انسان پہلے ہی سے خدائی سچائی کا منتظر ہے۔ اب جو لوگ اپنی اس فطرت کو زندہ رکھیں ان کا وہی حال ہوگا جو سابق اہل کتاب کا ہوا۔ وہ اپنی فطرت کے زندہ شعور کی بنا پر خدائی سچائی کو پہچان لیں گے اور دل کی پوری آمادگی کے ساتھ اس کی طرف بے تابانہ دوڑ پڑیں گے۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۱۰﴾ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ﴿۱۱۱﴾

ع ۱۲ / ۱۲

کہو کہ خواہ اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر پکارو، اس کے لئے سب اچھے نام ہیں۔ اور تم اپنی نماز نہ بہت پکار کر پڑھو اور نہ بالکل چپکے چپکے پڑھو۔ اور دونوں کے درمیان کا طریقہ اختیار کرو۔ اور کہو کہ تمام خوبیاں اس اللہ کے لئے ہیں جو نہ اولاد رکھتا ہے اور نہ بادشاہی میں کوئی اس کا شریک ہے۔ اور نہ کمزوری کی وجہ سے اس کا کوئی مددگار ہے۔ اور تم اس کی خوب بڑائی بیان کرو۔ ۱۱۱ — ۱۱۰

جو لوگ سچائی کو گہرائی کے ساتھ پائے ہوئے نہیں ہوتے۔ وہ ہمیشہ ظاہری چیزوں میں الجھے رہتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ خدا کو اس لفظ سے پکارنا افضل ہے اور کوئی کہتا ہے کہ اُس لفظ سے۔ کوئی کہتا ہے کہ فلاں عبادتی فعل زور سے ادا کرنا چاہئے اور کوئی کہتا ہے کہ دھیرے سے۔

عرب میں بھی اس قسم کی بحثیں مختلف انداز سے جاری تھیں۔ فرمایا کہ خدا کو جس بہتر نام سے پکارو وہ اسی کا نام ہے۔ اسی طرح عبادت کے بارہ میں فرمایا کہ خدا کی عبادت کی ادائگی کا انحصار نہ زور سے بولنے پر ہے اور نہ دھیرے بولنے پر۔ تم عبادت کی اصل روح اپنے اندر پیدا کرو اور اس کی ادائگی میں اعتدال سے کام لو۔

عبادت کی روح یہ ہے کہ اللہ کی بڑائی کا کامل احساس آدمی کے اندر پیدا ہو جائے۔ اللہ پر ایمان اس کے لئے ایسی کامل اور عظیم ہستی کی دریافت کے ہم معنی بن جائے جس کو کسی سے مدد لینے کی ضرورت نہ ہو۔ جس کا کوئی شریک اور برابر نہ ہو۔ جس پر کبھی کوئی ایسا حادثہ نہ گزرتا ہو جب کہ وہ کسی کی مدد کا محتاج ہو۔ یہ یافت جب لفظوں کی صورت میں ڈھل کر زبان سے نکلنے لگے تو اسی کا نام تکبیر ہے۔

سُوْرَةُ الْكَهْفِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ مِائَةٌ وَعَشْرُ آيَاتٍ وَاثْنَا عَشَرَ رُكُوعًا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۝ قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۝ مَّاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا ۝ وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۝ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ ۭ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۭ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۝

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

تعریف اللہ کے لئے ہے جس نے اپنے بندہ پر کتاب اتاری۔ اور اس میں کوئی کجی نہیں رکھی۔ بالکل ٹھیک، تاکہ وہ اللہ کی طرف سے ایک سخت عذاب سے آگاہ کردے۔ اور ایمان والوں کو خوشخبری دے دے جو نیک اعمال کرتے ہیں کہ ان کے لئے اچھا بدلہ ہے۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور ان لوگوں کو ڈرادے جو کہتے ہیں کہ اللہ نے بیٹا بنایا ہے۔ ان کو اس بات کا کوئی علم نہیں اور نہ ان کے باپ دادا کو۔ یہ بڑی بھاری بات ہے جو ان کے منہ سے نکل رہی ہے، وہ صرف جھوٹ کہتے ہیں۔ ۵-۱

قرآن پچھلی آسمانی کتابوں کا تصحیح شدہ اڈیشن ہے۔ پچھلی کتابوں میں یہ ہوا کہ بعد کے لوگوں نے موشگافیاں کرکے خدائی تعلیمات کو پُرپیچ بنادیا۔ دوسرے یہ کہ خودساختہ تشریحات کے ذریعہ ابتدائی تعلیم میں انحراف پیدا کیا گیا اور اس طرح اس کے رخ کو بدل دیا گیا۔ قرآن ان دونوں قسم کی انسانی آمیزشوں سے پاک ہے۔ اس میں ایک طرف اصل دین اپنی فطری سادگی کے ساتھ موجود ہے۔ دوسری طرف اس کا رخ سیدھا خدا کی طرف ہے، جیسا کہ باعتبار واقعہ ہونا چاہئے۔

خدا نے یہ اہتمام کیوں کیا کہ وہ دنیا والوں کے پاس اپنی کتاب بھیجے۔ اس کا مقصد لوگوں کو خدا کی اسکیم سے آگاہ کرنا ہے۔ خدا نے انسان کو اس دنیا میں امتحان کی غرض سے آباد کیا ہے۔ اس کے بعد وہ ہر ایک کا حساب لے گا۔ اور ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق یا تو جہنم میں ڈالے گا یا

جنت کے ابدی باغوں میں بسائے گا۔ خدا چاہتا ہے کہ ہر آدمی موت سے پہلے اس مسئلہ سے باخبر ہوجائے تاکہ کسی کے لئے کوئی عذر باقی نہ رہے۔

دنیا میں انسان کی گمراہی کا ایک سبب یہ ہے کہ وہ خدا کے سوا کسی اور کو اپنا سہارا بنالیتا ہے۔ اسی کی ایک قبیح صورت کسی کو خدا کا بیٹا فرض کرلینا ہے۔ مگر اس قسم کا ہر عقیدہ صرف ایک جھوٹ ہے۔ کیوں کہ زمین وآسمان میں خدا کے سوا کوئی نہیں جس کو کسی قسم کا کوئی اختیار حاصل ہو۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَىٰٓ اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۝ اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝ وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا ۝

شاید تم ان کے پیچھے غم سے اپنے کو ہلاک کر ڈالوگے، اگر وہ اس بات پر ایمان نہ لائے۔ جو کچھ زمین پر ہے اس کو ہم نے زمین کی رونق بنایا ہے تاکہ ہم لوگوں کو جانچیں کہ ان میں کون اچھا عمل کرنے والا ہے اور ہم زمین کی تمام چیزوں کو ایک صاف میدان بنا دیں گے۔ ۸ - ۶

شاید تم اپنے کو ہلاک کر ڈالوگے ــــــ یہ جملہ بتاتا ہے کہ داعی اگر دعوت کے معاملہ میں سنجیدہ ہو تو شدت احساس سے اس کا کیا حال ہوجاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دعوت حق کا انمام اس انتہا پر پہنچ کر ہوتا ہے جب یہ کہا جانے لگے کہ داعی شاید اس غم میں اپنے کو ہلاک کر لے گا کہ لوگ حق کی دعوت کو قبول نہیں کر رہے ہیں۔

ایک دعوت جو دلیل کے اعتبار سے انتہائی واضح ہو، جس کو پیش کرنے والا دردمندی کی آخری حد پر پہنچ کر اس کو لوگوں کے لئے سنجیدہ غور وفکر کا موضوع بنا دے، اس کے باوجود لوگ اسے نہ مانیں تو اس نہ ماننے کی وجہ کیا ہوتی ہے۔ اس کی وجہ دنیا کی دل فریبیاں ہیں۔ موجودہ دنیا اتنی پُرکشش ہے کہ آدمی اس سے اوپر اٹھ نہیں پاتا۔ اس لئے وہ ایسی دعوت کی اہمیت کو سمجھ نہیں پاتا جو اس کی توجہات کو سامنے کی دنیا سے ہٹا کر اس دنیا کی طرف لے جارہی ہے جس کی رونقیں بظاہر دکھائی نہیں دیتیں۔

مگر زمین کی دل فریبیاں انتہائی عارضی ہیں۔ وہ امتحان کی ایک مقرر مدت تک ہیں۔ اس کے بعد زمین کی یہ حیثیت ختم کر دی جائے گی۔ یہاں تک کہ وہ صحرا کی طرح بس ایک خشک میدان

ہو کر رہ جائے گی۔

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ ۙ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۝ اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ۝ فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِى الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ۝ ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا ۝

کیا تم خیال کرتے ہو کہ کہف اور رقیم والے ہماری نشانیوں میں سے بہت عجیب نشانی تھے۔ جب ان نوجوانوں نے غار میں پناہ لی، پھر انھوں نے کہا کہ اے ہمارے رب ہم کو اپنے پاس سے رحمت دے اور ہمارے معاملے کو درست کر دے۔ پس ہم نے غار میں ان کے کانوں پر سالہا سال کے لئے (نیند کا پردہ) ڈال دیا۔ پھر ہم نے ان کو اٹھایا تاکہ ہم معلوم کریں کہ دونوں گروہوں میں سے کون مدت قیام کا زیادہ ٹھیک شمار کرتا ہے۔ ۱۲-۹

اصحاب کہف کا واقعہ ایک علامتی واقعہ ہے جو بتاتا ہے کہ سچے اہل ایمان کی زندگی میں کس قسم کے مراحل پیش آتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل ایمان بعض اوقات حالات کی شدت کی بنا پر کسی "غار" میں پناہ لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ مگر یہ غار جو بظاہر حالات ان کے لئے ایک قبر تھا، وہاں سے زندگی اور حرکت کا ایک نیا سیلاب پھوٹ پڑتا ہے۔ ان کے مخالفین نے جہاں ان کی تاریخ ختم کر دینی چاہی تھی وہیں سے دوبارہ ان کے لئے ایک نئی تاریخ شروع ہو جاتی ہے۔

کہف والے اگر وہی ہیں جو مسیحی تاریخ میں سات سونے والے (Seven Sleepers) کہے جاتے ہیں تو یہ قصہ شہر افیسس (Ephesus) سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ قدیم زمانہ کا ایک مشہور شہر ہے۔ جو ترکی کے مغربی ساحل پر واقع تھا اور جس کے پُرعظمت کھنڈر آج بھی وہاں پائے جاتے ہیں۔ ۲۵۱-۲۴۹ میں اس علاقے میں رومی حکمراں ڈیسیس (Desius) کی حکومت تھی۔ یہاں بت پرستی کا زور تھا۔ اور چاند کو معبود قرار دے کر اسے پوجا جاتا تھا۔ اس زمانہ میں حضرت مسیح کے ابتدائی پیروؤں کے ذریعہ یہاں توحید کی دعوت پہنچی اور پھیلنے لگی۔ رومی حکمراں جو خود بھی بت پرست تھا، مذہب توحید کی اشاعت کو برداشت نہ کر سکا اور حضرت مسیح کے پیروؤں پر سختیاں کرنے لگا۔ مذکورہ اصحاب کہف افیسس کے

اعلیٰ گھرانوں کے سات نوجوان تھے جنھوں نے غالباً ۲۵۰ء میں مذہب توحید کو قبول کرلیا۔ اور اس کے مبلغ بن گئے۔ حکومت کی طرف سے ان کی دارو گیر ہوئی تو وہ شہر سے نکل کر قریب کے ایک پہاڑ کی طرف چلے گئے اور وہاں ایک بڑے غار میں چھپ گئے۔

اصحاب رقیم غالباً انھیں اصحاب کہف کا دوسرا نام ہے۔ رقیم کے معنی مرقوم کے ہیں۔ یعنی لکھی ہوئی چیز۔ کہا جاتا ہے کہ اعلیٰ خاندانوں کے مذکورہ سات نوجوان جب لاپتہ ہوگئے تو بادشاہ کے حکم سے ان کے نام اور حالات ایک سیسہ کی تختی پر لکھ کر شاہی خزانہ میں رکھ دیے گئے۔ اس بنا پر ان کا دوسرا نام اصحاب رقیم (تختی والے) پڑگیا (تفسیر ابن کثیر، جزء ثالث صفحہ ۷۳)

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ﴿۱۳﴾ وَّرَبَطْنَا عَلٰي قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا۟ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰـهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا ﴿۱۴﴾ هٰٓؤُلَاۗءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ۭ لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۢ بَيِّنٍ ۭ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰي عَلَي اللّٰهِ كَذِبًا ﴿۱۵﴾

ہم تم کو ان کا اصل قصہ سناتے ہیں۔ وہ کچھ نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے اور ہم نے ان کی ہدایت میں مزید ترقی دی اور ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط کر دیا جب کہ وہ اٹھے اور کہا کہ ہمارا رب وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ ہم اس کے سوا کسی دوسرے معبود کو نہ پکاریں گے۔ اگر ہم ایسا کریں تو ہم بہت بے جا بات کریں گے۔ یہ ہماری قوم کے لوگوں نے اس کے سوا دوسرے معبود بنا رکھے ہیں۔ یہ ان کے حق میں واضح دلیل کیوں نہیں لاتے۔ پھر اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے ۔ ۱۵-۱۳

"یہ لوگ واضح دلیل کیوں نہیں لاتے" اس جملے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایمان لانے کے بعد ان نوجوانوں اور قوم کے بڑے لوگوں کے درمیان ایک مدت تک بحث و گفتگو رہی۔ مگر اس درمیان میں ان بڑوں کی طرف سے جو باتیں کہی گئیں ان میں شرک کے حق میں کوئی واضح دلیل نہ تھی۔ اس تجربے نے ان توحید پرست نوجوانوں کے یقین کو اور زیادہ بڑھا دیا۔ ان کے لئے

ناممکن ہو گیا کہ غیر ثابت شدہ چیز کی خاطر ثابت شدہ چیز کو ترک کر دیں۔

مذکورہ مخالفت کے بعد اگر وہ بڑوں کی بڑائی کو اہمیت دیتے تو وہ بے یقینی اور تذبذب کا شکار ہو جاتے۔ مگر جب انھوں نے دلیل اور برہان کو اہمیت دی تو اس نے ان کے یقین میں اور اضافہ کر دیا۔ کیوں دلیل اور برہان کے اعتبار سے یہ بڑے انھیں بالکل چھوٹے نظر آتے۔ اپنی تمام ظاہری عظمتوں کے باوجود وہ لوگ جھوٹ کی زمین پر کھڑے ہوئے ملے نہ کہ سچ کی زمین پر۔

وَإِذِ اعْتَزَلْتُمُوهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ فَأْوُوا إِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِنْ رَحْمَتِهِ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِنْ أَمْرِكُمْ مِرْفَقًا ﴿١٦﴾

اور جب تم ان لوگوں سے الگ ہو گئے ہو اور ان کے معبودوں سے جن کی وہ خدا کے سوا عبادت کرتے ہیں تو اب چل کر غار میں پناہ لو، تمہارا رب تمہارے اوپر اپنی رحمت پھیلائے گا۔ اور تمہارے کام کے لئے سروسامان مہیا کرے گا۔ ۱۶

بندہ جب حق کی خاطر انسانوں سے کٹتا ہے تو عین اسی وقت وہ خدا سے جڑ جاتا ہے۔ حتی کہ وہ اپنے رب سے اتنا قریب ہو جاتا ہے کہ اس سے اس کی سرگوشیاں شروع ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے رب سے کلام کرتا ہے اور اس سے اس کا جواب پاتا ہے۔

اصحاب کہف کا نو مسلمانہ یقین، ان کی بے خوف تبلیغ، ان کا سب کچھ چھوڑنے پر راضی ہو جانا مگر حق کو نہ چھوڑنا، ان چیزوں نے ان کو قربت خداوندی کا اعلیٰ مقام عطا کر دیا تھا۔ وہ بظاہر جو کچھ کھو رہے تھے، اس سے زیادہ بڑی چیز ان کے لئے وہ تھی جس کو انھوں نے پایا تھا۔ یہی یافت کا وہ احساس تھا جس نے انھیں آمادہ کیا کہ وہ ہر دوسری چیز کی محرومی گوارا کر لیں مگر حق سے محرومی کو گوارا نہ کریں۔ وہ اس پر راضی ہو گئے کہ وہ اپنے گھر اور شہر کو چھوڑ کر غار میں چلے جائیں اور پھر بھی ان کی یہ امید باقی رہے کہ ان کا خدا ضرور ان کی مدد کرے گا اور ان کے حالات کو درست کر دے گا۔

ابن جریر نے عطا کا قول نقل کیا ہے کہ ان کی تعداد سات تھی۔ وہ غار میں داخل ہو کر عبادت کرتے رہتے اور روتے اور اللہ سے مدد مانگتے (تفسیر ابن کثیر) یہاں تک کہ بالآخر خدا نے ان پر لمبی نیند طاری کر دی۔

وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَت تَّزَاوَرُ عَن كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَإِذَا غَرَبَت تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِي فَجْوَةٍ مِّنْهُ ذَٰلِكَ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ مَن يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَمَن يُضْلِلْ فَلَن تَجِدَ لَهُ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ﴿١٧﴾ ع

اور تم سورج کو دیکھتے کہ جب وہ طلوع ہوتا ہے تو ان کے غار سے دائیں جانب کو بچا رہتا ہے اور جب ڈوبتا ہے تو ان سے بائیں طرف کو کتراجاتا ہے اور وہ غار کے اندر ایک وسیع جگہ میں ہیں۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے جس کو اللہ ہدایت دے وہی ہدایت پانے والا ہے اور جس کو اللہ بے راہ کر دے تو تم اس کے لئے کوئی مددگار راہ بتانے والا نہ پاؤ گے۔ ۱۷

دعوتی دور میں جب اصحاب کہف اور ان کی قوم کے لوگوں کے درمیان کش مکش بڑھی، اسی دوران میں غالباً انھوں نے امکانی اندیشہ کے پیش نظر ایک مخصوص غار کا انتخاب کرلیا تھا۔ یہ غار اتنا وسیع تھا کہ سات آدمی بآسانی اس کے اندر قیام کرسکیں۔ مزید یہ کہ غالباً وہ شمال رُویہ تھا۔ اس بنا پر سورج کی روشنی صبح یا شام کسی وقت بھی براہ راست اس کے اندر نہیں پہنچتی تھی اور ادھر سے گزرنے والا کوئی شخص باہر سے دیکھ کر یہ نہیں جان سکتا تھا کہ اس کے اندر کچھ انسان موجود ہیں۔

جب آدمی ایسا کرے کہ حق کے معاملہ میں مصلحت کا رویہ نہ اختیار کرے۔ مشکل ترین حالات میں بھی وہ صبر وشکر کے ساتھ خدا کی طرف متوجہ رہے تو خدا اس کو ایسے راستوں کی طرف رہنمائی فرماتا ہے جس میں اس کا ایمان بھی محفوظ رہے اور وہ اپنے دعوتی مشن کو بھی نہ کھوئے۔ یہ نصرت اصحاب کہف کو ان کے مخصوص حالات کے اعتبار سے پوری طرح حاصل ہوئی۔

مزید یہ کہ خدا نے ان کو اپنے خاص کام کے لئے چُن لیا۔ انھوں نے جس روحانی بلندی کا ثبوت دیا تھا۔ اس کے بعد وہ خدا کی نظر میں اس قابل ہوگئے کہ ان کو زندگی بعد موت کا حسی ثبوت بنادیا جائے ـــــ اصحاب کہف کا دوسو سال تک سوکر دوبارہ اٹھنا اسی نوعیت کا ایک واقعہ ہے۔

وَتَحْسَبُهُمْ أَيْقَاظًا وَهُمْ رُقُودٌ وَنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَذَاتَ الشِّمَالِ

وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيدِ ۚ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ﴿١٨﴾

اور تم انھیں دیکھ کر یہ سمجھتے کہ وہ جاگ رہے ہیں، حالانکہ وہ سو رہے تھے۔ ہم ان کو دائیں اور بائیں کروٹ بدلواتے رہتے تھے۔ اور ان کا کُتا غار کے دہانے پر دونوں ہاتھ پھیلائے بیٹھا تھا۔ اگر تم ان کو جھانک کر دیکھتے تو ان سے پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوتے اور تمہارے اندر ان کی دہشت بیٹھ جاتی۔ ۱۸

اللہ تعالیٰ نے ایک طرف یہ کیا کہ اصحاب کہف پر مسلسل نیند طاری کر دی۔ اسی کے ساتھ ان کی حفاظت کے لئے مختلف انتظامات فرما دیے۔ مثلاً وہ برابر کروٹیں لیتے رہتے تھے۔ کیونکہ حضرت ابن عباس کے الفاظ میں، اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کا جسم زمین کھا جاتی۔ ان کے غار کے دہانہ پر ایک کُتا مسلسل بیٹھا رہا۔ یہ غالباً اس لئے تھا کہ کوئی انسان یا جانور اندر داخل نہ ہو سکے۔ مزید یہ کہ غار کے اندر خدا نے ایسا پُر ہیبت ماحول بنا دیا تھا کہ کوئی شخص اگر جھانکنے کی کوشش کرے تو پہلی ہی نظر میں دہشت زدہ ہو کر بھاگ جائے۔

وَكَذَٰلِكَ بَعَثْنَاهُمْ لِيَتَسَاءَلُوا بَيْنَهُمْ ۚ قَالَ قَائِلٌ مِنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ۖ قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۚ قَالُوا رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ فَابْعَثُوا أَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هَٰذِهِ إِلَى الْمَدِينَةِ فَلْيَنْظُرْ أَيُّهَا أَزْكَىٰ طَعَامًا فَلْيَأْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ أَحَدًا ﴿١٩﴾ إِنَّهُمْ إِنْ يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوكُمْ أَوْ يُعِيدُوكُمْ فِي مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوا إِذًا أَبَدًا ﴿٢٠﴾

اور اسی طرح ہم نے ان کو جگایا تاکہ وہ آپس میں پوچھ گچھ کریں۔ ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا، تم کتنی دیر یہاں ٹھہرے۔ انھوں نے کہا کہ ہم ایک دن یا ایک دن سے بھی کم ٹھہرے ہوں گے۔ وہ بولے کہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ تم کتنی دیر یہاں رہے۔ پس اپنے میں سے کسی کو یہ چاندی کا سکہ دے کر شہر بھیجو، پس وہ دیکھے کہ پاکیزہ کھانا کہاں ملتا ہے، اور تمہارے لئے اس میں

سے کچھ کھانا لائے۔ اور وہ نرمی سے جائے اور کسی کو تمہاری خبر نہ ہونے دے۔ اگر وہ تمہاری خبر پا جائیں گے تو تم کو پتھروں سے مار ڈالیں گے یا تم کو اپنے دین میں لوٹا لیں گے اور پھر تم کبھی فلاح نہ پاؤ گے۔ ۱۹-۲۰

اصحاب کہف جب سو کر اٹھے تو قدرتی طور پر وہ آپس میں ذکر کرنے لگے کہ وہ کتنی مدت تک سوئے ہوں گے۔ مگر زمانہ خدا کے حکم کے تحت ان کے لئے ٹھہر گیا تھا۔ اس لئے جو مدت دوسروں کے لئے صدیوں میں پھیلی ہوئی تھی وہ اصحاب کہف کو بس ایک دن کے برابر معلوم ہوئی۔

سو کر اٹھنے کے بعد انہیں بھوک کا احساس ہوا۔ ان کے پاس کچھ چاندی کے سکے تھے۔ انھوں نے اپنے میں سے ایک شخص کو ایک سکہ لے کر بھیجا۔ غالباً ان کا خیال ہو گا کہ شہر کے جن حصوں میں عیسائی بستے ہوں گے وہاں حلال کھانا مل سکے گا اس لئے انھوں نے کہا کہ تلاش کر کے پاکیزہ کھانا لے آنا۔ نیز انھوں نے تاکید کی کہ سارا معاملہ نہایت خوش تدبیری سے انجام دینا۔ کیوں کہ سابقہ تجربہ کی بنا پر انھیں اندیشہ تھا کہ اگر وہ لوگ ہم سے باخبر ہو جائیں گے تو وہ ہمیں دوبارہ بت پرست بنانے کی کوشش کریں گے۔ اور جب ہم راضی نہ ہوں گے تو وہ ہم کو مار ڈالیں گے۔

وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا ۚ اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ۭ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓي اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ﴿۲۱﴾

اور اس طرح ہم نے ان پر لوگوں کو مطلع کر دیا تاکہ لوگ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور یہ کہ قیامت میں کوئی شک نہیں۔ جب لوگ آپس میں ان کے معاملے میں جھگڑ رہے تھے۔ پھر کہنے لگے کہ ان کے غار پر ایک عمارت بنا دو۔ ان کا رب ان کو خوب جانتا ہے۔ جو لوگ ان کے معاملہ میں غالب آئے انھوں نے کہا کہ ہم ان کے غار پر ایک عبادت گاہ بنائیں گے۔ ۲۱

انسان سو سال یا اس سے بھی کم مدت موجودہ زمین پر زندگی گزار کر مر جاتا ہے۔ بظاہر

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ مر کر باقی رہتا ہے اور دوبارہ ایک نئی دنیا میں اٹھتا ہے جہاں اس کے لئے یا ابدی راحت ہے یا ابدی عذاب۔

یہ انسان کا سب سے زیادہ سنگین مسئلہ ہے اور اس پر لوگوں کے درمیان ہمیشہ بحث جاری رہی ہے۔ اس کی اسی اہمیت کی بنا پر خدا نے ایسا کیا کہ عقلی دلیل کے ساتھ اس کے حق میں حسی دلیل کا بھی انتظام فرمایا تاکہ "زندگی بعد موت" کے معاملہ میں کسی کے لئے اس کی گنجائش باقی نہ رہے۔ مختلف زمانوں میں یہ حسی دلیل مختلف انداز سے دکھائی جاتی رہی ہے۔ پانچویں صدی عیسوی میں اصحاب کہف کا "موت" کے بعد دوبارہ غار سے نکلنا اسی قسم کا ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ موجودہ زمانہ میں مافوق سائنس (Meta Science) کی تحقیقات بھی غالباً اسی نوعیت کی مثال ہیں جن سے زندگی بعد موت کا نظریہ حسی معیار استدلال پر ثابت ہوتا ہے۔

اصحاب کہف دو سو سال یا اس سے زیادہ مدت کے بعد جب غار سے نکلے تو ان کے شہر کی دنیا بالکل بدل چکی تھی۔ غالباً ۲۵۰ء میں وہ اپنے شہر افیسس سے نکل کر غار میں گئے تھے۔ اس وقت اس علاقہ میں بت پرست حکمراں ڈیسیس کی حکومت تھی۔ اس درمیان میں مسیحی مبلغین کی کوششوں سے رومی بادشاہ قسطنطین (۲۷۲-۳۳۷ء) عیسائی ہوگیا اور اس کے بعد سارے رومی علاقہ میں عیسائی مذہب پھیل گیا۔ ۴۴۷ء میں جب اصحاب کہف دوبارہ اپنے شہر میں واپس آئے تو ان کے شہر میں عیسائیت کا غلبہ ہو چکا تھا۔

جب یہ ساتوں نوجوان غار سے باہر آئے اور شاہی خزانہ میں محفوظ ان کے نام کی تختی، نیز دوسرے قرائن سے تصدیق ہوگئی کہ یہ وہی نوجوان ہیں جو بت پرستی کے دور میں اپنے مسیحی عقائد کی خاطر شہر چھوڑ کر چلے گئے تھے تو وہ فوراً لوگوں کی عقیدت کا مرکز بن گئے۔ نیا رومی حکمراں تھیوڈوسیس خود ان سے ملنے اور ان کی برکت لینے کے لئے پیدل چل کر ان کے پاس آیا۔ اور جب ان نوجوانوں کا انتقال ہوا تو ان کی یادگار میں ان کے غار کے اوپر عبادت خانہ تعمیر کیا گیا۔

سَيَقُولُونَ ثَلَاثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ وَيَقُولُونَ سَبْعَةٌ وَثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ قُل رَّبِّي أَعْلَمُ بِعِدَّتِهِم مَّا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا قَلِيلٌ ۚ فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ إِلَّا مِرَاءً ظَاهِرًا وَلَا تَسْتَفْتِ فِيهِم مِّنْهُمْ أَحَدًا ﴿٢٢﴾

کچھ لوگ کہیں گے کہ وہ تین تھے، اور چوتھا ان کا کتا تھا۔ اور کچھ لوگ کہیں گے وہ پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا، یہ لوگ بے تحقیق بات کہہ رہے ہیں، اور کچھ لوگ کہیں گے کہ وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔ کہو کہ میرا رب بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنے تھے۔ تھوڑے ہی لوگ ان کو جانتے ہیں۔ پس تم سرسری بات سے زیادہ ان کے معاملہ میں بحث نہ کرو اور نہ ان کے بارے میں ان میں سے کسی سے پوچھو۔ ۲۲

اصحاب کہف کے بارہ میں کچھ لوگ غیر ضروری بحثوں میں مبتلا تھے۔ کسی نے کہا کہ ان کی تعداد تین تھی اور چوتھا ان کا کتا تھا۔ کسی نے کہا کہ وہ پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا۔ کسی نے کہا کہ وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔

مگر اس قسم کی بحثیں مزاج کی خرابی کی علامت ہیں۔ جب دینی روح زندہ ہو تو سارا زور اصل حقیقت پر دیا جاتا ہے۔ اور جب قوم پر زوال آتا ہے تو اصل روح پس پشت چلی جاتی ہے اور ظاہری تفصیلات بحث و مناظرہ کا موضوع بن جاتی ہیں۔ سچے خدا پرست کو چاہئے کہ وہ ان بحثوں میں نہ پڑے بلکہ اگر کوئی دوسرا شخص اس قسم کے سوالات کرے تو اس کو اجمالی جواب دے کر گزر جائے۔

وَلَا تَقُولَنَّ لِشَايْءٍ إِنِّي فَاعِلٌ ذَٰلِكَ غَدًا ﴿٢٣﴾ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ ۚ وَاذْكُر رَّبَّكَ إِذَا نَسِيتَ وَقُلْ عَسَىٰ أَن يَهْدِيَنِ رَبِّي لِأَقْرَبَ مِنْ هَٰذَا رَشَدًا ﴿٢٤﴾

اور تم کسی کام کی نسبت یوں نہ کہو کہ میں اس کو کل کر دوں گا، مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ اور جب تم بھول جاؤ تو اپنے رب کو یاد کرو۔ اور کہو کہ امید ہے کہ میرا رب مجھ کو بھلائی کی اس سے زیادہ قریب راہ دکھا دے۔ ۲۴-۲۳

قریش نے نضر بن حارث اور عقبہ بن معیط کو مدینہ بھیجا کہ وہ یہود سے مل کر محمدؐ کے بارہ میں پوچھیں۔ کیوں کہ وہ لوگ نبیوں کا علم رکھتے ہیں۔ دونوں مدینہ آئے اور علماء یہود سے کہا کہ ہم کو ہمارے آدمی کے بارہ میں بتاؤ۔ انھوں نے کہا کہ تم لوگ ان سے تین چیزوں کے بارہ میں پوچھو۔ اگر وہ تم کو ان کی بابت بتا دیں تو وہ پیغمبر ہیں۔ ورنہ وہ متقول (باتیں

بنانے والے) ہیں۔ ان میں سے ایک سوال اصحاب کہف کے نوجوانوں کے بارہ میں تھا۔ دوسرا ذو القرنین کے بارہ میں اور تیسرا روح کے بارہ میں۔

پریس کے دور سے پہلے عام لوگوں کو اصحاب کہف کی بابت کچھ معلوم نہ تھا۔ یہ قصہ بعض سُریانی مخطوطات میں درج تھا جس کی خبر صرف چند خاص علماء کو تھی۔ آپ کے سامنے یہ سوال آیا تو آپ نے فرمایا کہ تم نے جو بات پوچھی ہے اس کا جواب میں کل دوں گا (اخبرکم غداً عما سألتم عنه) آپ کو امید تھی کہ کل تک جبریل آجائیں گے اور میں ان سے معلوم کرکے جواب دے دوں گا۔ مگر جبریل کے آنے میں تاخیر ہوئی۔ یہاں تک کہ وہ پندرہ دن کے بعد سورہ کہف لے کر آئے۔

وحی میں اس تاخیر سے مکہ کے مخالفین کو موقع مل گیا۔ انھوں نے اس کو بنیاد بناکر لوگوں کو آپ سے بدظن کرنا شروع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم ایک معمولی بات کو شوشہ بناکر جس شخص کی صداقت سے لوگوں کو مشتبہ کرنا چاہتے ہو اس کی صداقت پر اس سے زیادہ یقینی اور اس سے زیادہ بڑی دلیلیں جمع ہونے والی ہیں۔ (ان الله سيؤتيه من الحجج على صحة نبوته ما هو ادلّ من قصة اصحاب الكهف، التفسير المظهري جلد ۶، صفحہ ۲۷)

یہ بات آج واقعہ بن چکی ہے۔ آج پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ صداقت پر اتنے دلائل جمع ہو چکے ہیں کہ کوئی ہوش مند آدمی اس سے انکار کی جرأت نہیں کر سکتا۔ آپ کی نبوت آج ایک ثابت شدہ نبوت ہے۔ نہ کہ محض مدعیانہ نبوت۔

وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِينَ وَازْدَادُوا تِسْعًا ﴿۲۵﴾ قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوا لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۶﴾

اور وہ لوگ اپنے غار میں تین سو سال رہے (کچھ لوگ مدت کے شمار میں) ۹ سال اور بڑھ گئے ہیں، کہو کہ اللہ ان کے رہنے کی مدت کو زیادہ جانتا ہے۔ آسمانوں اور زمین کا غیب اس کے علم میں ہے، کیا خوب ہے وہ دیکھنے والا اور سننے والا۔ خدا کے سوا ان کا کوئی مددگار نہیں اور نہ اللہ کسی کو اپنے اختیار میں شریک کرتا ہے۔

۲۶-۲۵

قتادہ اور مطرف بن عبداللہ کی تفسیر کے مطابق یہاں ۳۰۰ سال یا ۳۰۹ سال لوگوں کے قول کی حکایت ہے نہ کہ خدا کی طرف سے خبر۔ عبداللہ بن مسعود کی قرأت سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ اس زمانہ کے اہل کتاب غیر مستند قصوں کی بنیاد پر یہ سمجھتے تھے کہ غار میں اصحاف کہف کے قیام کی مدت شمسی کیلنڈر کے لحاظ سے ۳۰۰ سال ہے اور قمری کیلنڈر کے لحاظ سے ۳۰۹ سال (تفسیر ابن کثیر، جزء ثالث، صفحہ ۷۹) قرآن نے لوگوں کے اس خیال کو نقل کیا۔ مگر اسی کے ساتھ یہ کہہ کر اس کو بے بنیاد قرار دے دیا کہ قل اللہ اعلم بما لبثوا (کہو کہ اللہ زیادہ جانتا ہے کہ وہ غار میں کتنا ٹھہرے)

موجودہ زمانہ کے محققین نے دریافت کیا ہے کہ یہ مدت شمسی کیلنڈر کے لحاظ سے ۱۹۶ سال تھی۔ یہ تحقیق اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن خدا کی کتاب ہے جو تمام اگلی پچھلی باتوں سے باخبر ہے۔ اور اسی علم کی بنا پر اس نے مذکورہ قول کو قبول نہیں کیا۔ قرآن اگر کوئی انسانی کلام ہوتا تو یقیناً وہ اپنے زمانہ کے مشہور قول کو لے لیتا جو بالآخر بعد کی تحقیق سے ٹکرا جاتا۔

وَاتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿۲۷﴾ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾

النصف

اور تمہارے رب کی جو کتاب تم پر وحی کی جارہی ہے اس کو سناؤ، خدا کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں۔ اور اس کے سوا تم کوئی پناہ نہیں پاسکتے۔ اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ جمائے رکھو جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں، وہ اس کی رضا کے طالب ہیں۔ اور تمہاری آنکھیں حیات دنیا کی رونق کی خاطر ان سے ہٹنے نہ پائیں۔ اور تم ایسے شخص کا کہنا نہ مانو جس کے قلب کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا۔ اور وہ اپنی خواہش پر چلتا ہے۔ اور اس کا معاملہ حد سے گزر گیا ہے۔ ۲۸ - ۲۷

قدیم مکہ میں جن لوگوں نے پیغمبر کا ساتھ دے کر بے آمیز دین کو اپنا دین بنایا تھا ان کے لئے یہ اقدام کوئی سادہ چیز نہ تھی۔ یہ مفادات سے وابستہ نظام کو چھوڑ کر ایک ایسے عقیدہ کا ساتھ دینا تھا جس سے بظاہر کوئی مفاد وابستہ نہ تھا۔ پہلا گروہ نئے دین کو اختیار کرتے ہی وقت کے جمے ہوئے نظام سے کٹ گیا تھا

جب کہ دوسرا گروہ پوری طرح وقت کے جمے ہوئے نظام کے زور پر کھڑا ہوا تھا۔ پہلے گروہ کے پاس صرف خدا کی باتیں تھیں جس کی اہمیت آخرت میں ظاہر ہوگی جب کہ دوسرا گروہ ان چیزوں کا مالک بنا ہوا تھا جس کی قیمت اسی دنیا کے بازار میں ہوتی ہے۔

یہ ظاہری فرق اگر داعی کو متأثر کر دے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دین کی بے آمیز دعوت کی اہمیت اس کی نظر میں کم ہو جائے گی۔ اور آمیزش والا دین اس کی نظر میں اہمیت اختیار کر لے گا جس کے علم بردار بن کر لوگ دنیا کی رونقیں حاصل کئے ہوئے ہیں۔

مگر یہ بہت بڑی بھول ہے۔ کیوں کہ یہ اس اصل مشن سے ہٹنا ہے جو خدا کو سب سے زیادہ مطلوب ہے۔ داعی اگر ایسا کرے تو وہ خدا کی مدد سے محروم ہو جائے گا۔ وہ خدا کی دنیا میں ایسا ہو جائے گا کہ کوئی درخت اس کو سایہ نہ دے اور کوئی پانی اس کی پیاس نہ بجھائے۔ چنانچہ ابن جریر نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ اللہ فرماتا ہے کہ اے محمد، اگر تم نے لوگوں کو قرآن نہ سنایا تو خدا کے مقابلہ میں تمہارے لئے کوئی جائے پناہ نہ ہوگی (یقول ان انت یا محمد لم تتل ما اوحی الیک من کتاب ربک فانہ لا ملجأ لک من اللہ کما قال تعالیٰ: یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ واللہ یعصمک من الناس)

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۚ إِنَّآ أَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا أَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ۚ وَإِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ ۚ بِئْسَ الشَّرَابُ ۗ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا ﴿٢٩﴾

اور کہو کہ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے، پس جو شخص چاہے اسے مانے اور جو شخص چاہے نہ مانے۔ ہم نے ظالموں کے لئے ایسی آگ تیار کر رکھی ہے جس کی قناتیں ان کو اپنے گھیرے میں لے لیں گی۔ اور اگر وہ پانی کے لئے فریاد کریں گے تو ان کی فریاد رسی ایسے پانی سے کی جائے گی جو تیل کی تلچھٹ کی طرح ہوگا۔ وہ چہروں کو بھون ڈالے گا۔ کیا برا پانی ہوگا اور کیسا برا ٹھکانا۔ ۲۹

جو حق خدا کی طرف سے آتا ہے وہ آخری حد تک صداقت ہوتا ہے۔ اس لئے لوگوں کی رعایت سے اس میں کسی قسم کی ترمیم نہیں کی جا سکتی۔ خدائی حق میں ترمیم کرنا گویا اس معیار کو تبدیل کرنا ہے

جس پر جانچ کر ہر شخص کی حیثیت متعین کی جانے والی ہے۔

جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ خدائی حق میں ایسی ترمیم کی جائے کہ اس سے ان کی غلط روش کا جواز نکل آئے وہ گمراہی پر سرکشی کا اضافہ کر رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اپنے لئے صرف سخت ترین سزا کا انتظار کرنا چاہئے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ إِنَّا لَا نُضِيعُ أَجْرَ مَنْ أَحْسَنَ عَمَلًا ﴿٣٠﴾ أُولَٰئِكَ لَهُمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَيَلْبَسُونَ ثِيَابًا خُضْرًا مِنْ سُنْدُسٍ وَإِسْتَبْرَقٍ مُتَّكِئِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرَائِكِ ۚ نِعْمَ الثَّوَابُ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ﴿٣١﴾

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کئے تو ہم ایسے لوگوں کا اجر ضائع نہیں کریں گے جو اچھی طرح کام کریں۔ ان کے لئے ہمیشہ رہنے والے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی وہاں ان کو سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے۔ اور وہ باریک اور دبیز ریشم کے سبز کپڑے پہنیں گے، تختوں پر ٹیک لگائے ہوئے۔ کیسا اچھا بدلہ ہے اور کیسی اچھی جگہ۔ ۳۱ - ۳۰

جو لوگ گھمنڈ، مصلحت اور ظاہر پرستی سے خالی ہوتے ہیں، ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب خدائی صداقت ان کے سامنے ظاہر ہوتی ہے تو وہ اس کو فوراً پہچان لیتے ہیں۔ خواہ وہ صداقت ان کے جیسے ایک انسان کی زبان سے کیوں نہ ظاہر ہوئی ہو۔

وہ اپنے آپ کو حق کے آگے ڈال دیتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کو اس کے مطابق ڈھالنا شروع کر دیتے ہیں نہ کہ خود صداقت کو اپنی زندگی کے مطابق ڈھالنے لگیں۔ جو لوگ اس طرح حق پرستی کا ثبوت دیں وہ خدا کے محبوب بندے ہیں۔ ان کو آخرت میں شاہانہ انعامات سے نوازا جائے گا۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا رَجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَابٍ وَحَفَفْنَاهُمَا بِنَخْلٍ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ﴿٣٢﴾ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ آتَتْ أُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِنْهُ

شَيْـًٔا ۙ وَّ فَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ۙ﴿۳۳﴾ وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا ﴿۳۴﴾ وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَاۤ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا ۙ﴿۳۵﴾ وَّمَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّ لَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّىْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ﴿۳۶﴾

تم ان کے سامنے ایک مثال پیش کرو۔ دو شخص تھے۔ ان میں سے ایک کو ہم نے انگوروں کے دو باغ دئے۔ اور ان کے گرد کھجور کے درختوں کا احاطہ بنایا اور دونوں کے درمیان کھیتی رکھ دی۔ دونوں باغ اپنا پورا پھل لائے، ان میں کچھ کمی نہیں کی۔ اور دونوں باغوں کے بیچ ہم نے نہر جاری کر دی اور اس کو خوب پھل ملا تو اس نے اپنے ساتھی سے بات کرتے ہوئے کہا کہ میں تجھ سے مال میں زیادہ ہوں اور تعداد میں بھی زیادہ طاقت ور ہوں۔ وہ اپنے باغ میں داخل ہوا اور وہ اپنے آپ پر ظلم کر رہا تھا۔ اس نے کہا کہ میں نہیں سمجھتا کہ یہ کبھی برباد ہو جائے گا۔ اور میں نہیں سمجھتا کہ قیامت کبھی آئے گی۔ اور اگر میں اپنے رب کی طرف لوٹا دیا گیا تو ضرور اس سے زیادہ اچھی جگہ مجھ کو ملے گی۔ ۳۲-۳۶

ایک باغ جو خوب ہرا بھرا ہو، پھر قدرتی آفت سے اچانک ختم ہو جائے، وہ اس شخص کی تمثیل ہے جو دنیا میں دولت اور عزت پا کر گھمنڈ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ دنیا میں کسی انسان کو دولت یا عزت کا جو حصہ ملتا ہے وہ خدا کی طرف سے بطور انعام ہوتا ہے۔ مگر ظالم انسان اکثر اس کو اپنے لئے انعام یا اپنی قوت بازو کا حاصل سمجھ لیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر سرکشی کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ ان لوگوں کو حقیر سمجھنے لگتا ہے جن کے پاس، دولت اور عزت میں کم حصہ ملا ہو۔ اس کی نفسیات ایسی ہو جاتی ہے گویا اس کی دنیا کبھی ختم ہونے والی نہیں۔ اور اگر یہ دنیا ختم ہو کر دوسری دنیا بنی تو کوئی وجہ نہیں کہ وہاں بھی اس کا حال اچھا نہ ہو جس طرح یہاں اس کا حال اچھا ہے۔

یہ امتحان کی حالت پر انعام کی حالت کو قیاس کرنا ہے۔ حالاں کہ دونوں میں کوئی نسبت نہیں۔

قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَكَفَرْتَ بِالَّذِىْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ؕ﴿۳۷﴾ لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّىْ وَلَاۤ اُشْرِكُ بِرَبِّىْۤ اَحَدًا ﴿۳۸﴾ وَلَوْلَاۤ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا ۚ﴿۳۹﴾ فَعَسٰى

رَبِّيْٓ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَاۗءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا ۝ اَوْ يُصْبِحَ مَاۗؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا ۝

اس کے ساتھی نے بات کرتے ہوئے کہا کیا تم اس ذات سے انکار کررہے ہو جس نے تم کو مٹی سے بنایا، پھر پانی کی ایک بوند سے۔ پھر تم کو پورا آدمی بنا دیا۔ لیکن میرا رب تو وہی اللہ ہے اور میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا۔ اور جب تم اپنے باغ میں داخل ہوئے تو تم نے کیوں نہ کہا کہ جو اللہ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے، اللہ کے بغیر کسی میں کوئی قوت نہیں۔ اگر تم دیکھتے ہو کہ میں مال اور اولاد میں تم سے کم ہوں تو امید ہے کہ میرا رب مجھ کو تمہارے باغ سے بہتر باغ دے دے۔ اور تمہارے باغ پر آسمان سے کوئی آفت بھیج دے جس سے وہ باغ صاف میدان ہو کر رہ جائے یا اس کا پانی خشک ہو جائے، پھر تم اس کو کسی طرح نہ پاسکو۔ ۳۷ - ۴۱

خدا کسی انسان کو دولت دے تو اس کو خدا کا شکر گزار بندہ بن کر رہنا چاہئے۔ لیکن اگر ذہن صحیح نہ ہو تو دولت مندی آدمی کے لئے سرکشی کا سبب بن جاتی ہے۔ اس کے برعکس اگر ذہن صحیح ہے تو مفلسی میں بھی آدمی خدا کو نہیں بھولتا۔ جو کچھ ملا ہے اس پر قانع رہ کر وہ امید رکھتا ہے کہ اس کا خدا اس کو مزید دے گا۔

آدمی اگر آنکھ کھول کر دنیا میں رہے تو کبھی وہ سرکشی میں مبتلا نہ ہو۔ انسان ایک حقیر وجود کی حیثیت سے پرورش پاتا ہے۔ اس کو حادثات پیش آتے ہیں۔ اس کو بیماری اور بڑھاپا لاحق ہوتا ہے۔ پانی اور دوسری چیزیں جن کے ذریعے وہ اس دنیا میں اپنا "باغ" اگاتا ہے ان میں سے کوئی چیز بھی اس کے ذاتی قبضہ میں نہیں۔

یہ سب اس لئے ہے کہ آدمی متواضع بن کر دنیا میں رہے۔ مگر ظالم انسان کسی چیز سے سبق نہیں لیتا۔ اس کو اس وقت تک ہوش نہیں آتا جب تک وہ ہر چیز سے محروم ہو کر اپنی آنکھوں سے دیکھ نہ لے کہ اس کے پاس عجز کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰي مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا وَهِىَ خَاوِيَةٌ عَلٰي عُرُوْشِهَا وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ۝ وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ

اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا ۝ هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ۚ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا ۝

اور اس کے پھل پر آفت آئی تو جو کچھ اس نے اس پر خرچ کیا تھا اس پر وہ ہاتھ ملتا رہ گیا۔ اور وہ باغ اپنی ٹٹیوں پر گرا ہوا پڑا تھا۔ اور وہ کہنے لگا کہ اے کاش میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا۔ اور اس کے پاس کوئی جتھا نہ تھا جو خدا کے سوا اس کی مدد کرتا اور نہ وہ خود بدلہ لینے والا بن سکا۔ یہاں سارا اختیار صرف خدائے برحق کا ہے۔ وہ بہترین اجر اور بہترین انجام والا ہے۔ ۴۴ - ۴۲

آدمی ایک کام میں اپنی پونجی لگاتا ہے اور اپنی قابلیت صرف کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میری قابلیت اور میری پونجی کامیاب نتیجہ کے ساتھ میری طرف لوٹے گی۔ مگر مختلف قسم کے حادثات آتے ہیں اور اس کی امیدوں کو تہس نہس کر دیتے ہیں۔ آدمی کی کوئی بھی تدبیر یا اس کی کوئی بھی قابلیت اس کو بچانے والی ثابت نہیں ہوتی۔

خدا موجودہ دنیا میں بار بار اس طرح کے نمونے دکھاتا ہے تاکہ انسان اس سے سبق لے۔ تاکہ وہ خدا کے سوا کسی دوسری چیز کو اہمیت دینے کی غلطی نہ کرے۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ۝ اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا ۝

اور ان کو دنیا کی زندگی کی مثال سناؤ۔ جیسے کہ پانی جس کو ہم نے آسمان سے اتارا۔ پھر اس سے زمین کی نباتات خوب گھنی ہو گئیں۔ پھر وہ ریزہ ریزہ ہو گئیں جس کو ہوائیں اڑاتی پھرتی ہیں۔ اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ مال اور اولاد دنیوی زندگی کی رونق ہیں۔ اور باقی رہنے والی نیکیاں تمہارے رب کے نزدیک ثواب کے اعتبار سے بہتر ہیں۔ ۴۶ - ۴۵

دنیا آخرت کی تمثیل ہے۔ پانی پاکر زمین جب سرسبز ہو جاتی ہے تو بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ

ہمیشہ اسی طرح رہے گی، مگر اس کے بعد موسم بدلتا ہے اور سارا سبزہ سوکھ کر ختم ہو جاتا ہے۔

یہی حال دنیا کی رونق کا ہے۔ موجودہ دنیا کی رونقیں آدمی کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ مگر یہ تمام رونقیں انتہائی عارضی ہیں۔ قیامت بہت جلد ان کو اس طرح ختم کر دے گی کہ ایسا معلوم ہوگا جیسے ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

دنیا کی رونقیں باقی نہیں رہتیں مگر یہاں ایک اور چیز ہے جو ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔ اور وہ انسان کے نیک اعمال ہیں۔ جس طرح زمین میں بیج ڈالنے سے باغ اگتا ہے اسی طرح اللہ کی یاد اور اللہ کی فرماں برداری سے بھی ایک باغ اگتا ہے۔ اس باغ پر کبھی خزاں نہیں آتی۔ مگر دنیوی باغ کے برعکس یہ دوسرا باغ آخرت میں اگتا ہے اور وہیں وہ اپنے اگانے والے کو ملے گا۔

وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْأَرْضَ بَارِزَةً ۙ وَحَشَرْنَاهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ أَحَدًا ﴿٤٧﴾ وَعُرِضُوا عَلَىٰ رَبِّكَ صَفًّا لَّقَدْ جِئْتُمُونَا كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ بَلْ زَعَمْتُمْ أَلَّن نَّجْعَلَ لَكُم مَّوْعِدًا ﴿٤٨﴾

اور جس دن ہم پہاڑوں کو چلائیں گے۔ اور تم دیکھو گے زمین کو بالکل کھلی ہوئی۔ اور ہم ان سب کو جمع کریں گے۔ پھر ہم ان میں سے کسی کو نہ چھوڑیں گے۔ اور سب لوگ تیرے رب کے سامنے صف باندھ کر پیش کئے جائیں گے۔ تم ہمارے پاس آ گئے جس طرح ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا، بلکہ تم نے یہ گمان کیا کہ ہم تمہارے لئے کوئی وعدہ کا وقت مقرر نہیں کریں گے۔ ۴۸ - ۴۷

موجودہ دنیا میں جو حالات جمع کئے گئے ہیں وہ محض امتحان کے لئے ہیں۔ امتحان کی مقررہ مدت پوری ہونے کے بعد یہ حالات باقی نہیں رہیں گے۔ اس کے بعد زمین کی ساری زندگی بخش خصوصیات ختم کر دی جائیں گی۔ وہ ایسی خالی جگہ ہو جائے گی جہاں نہ کسی کے لئے اکڑنے کا سامان ہوگا اور نہ فخر کرنے کا۔

دنیا میں امتحان کی وجہ سے انسان اپنے آپ کو اختیار کی فضا میں پا رہا ہے۔ مگر قیامت اس فضا کو یکسر ختم کر دے گی۔ اس دن لوگ بے یار و مددگار فضا میں اپنے رب کے پاس جمع کئے جائیں گے۔ تمام لوگ اپنے مالک کے سامنے اس کا فیصلہ سننے کے لئے کھڑے ہوں گے۔ خدا کے پاس ہر شخص کی زندگی کا انتہائی مکمل ریکارڈ ہوگا۔ اس کے مطابق وہ کسی کو انعام دے گا اور کسی کے لئے سزا کا حکم

سنائے گا۔

موجودہ دنیا میں انسان کی بیک وقت دو حالتیں ہیں۔ ایک اعتبار سے وہ عاجز ہے اور دوسرے اعتبار سے آزاد۔ آدمی اگر اپنے عجز کو دیکھے تو اس کے اندر خدا کی طرف رجوع کا جذبہ پیدا ہوگا۔ مگر انسان صرف اپنی آزادی کی حالت کو دیکھتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ غافل اور سرکش بن کر رہ جاتا ہے۔

وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۭ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ۝

ع ۸

اور رجسٹر رکھا جائے گا تو تم مجرموں کو دیکھو گے کہ اس میں جو کچھ ہے وہ اس سے ڈرتے ہوں گے اور کہیں گے کہ ہائے خرابی۔ کیسی ہے یہ کتاب کہ اس نے نہ کوئی چھوٹی بات درج کرنے سے چھوڑی ہے اور نہ کوئی بڑی بات۔ اور جو کچھ انھوں نے کیا ہے وہ سب سامنے پائیں گے۔ اور تیرا رب کسی کے اوپر ظلم نہ کرے گا۔ ۴۹

انسان جو کچھ کرتا ہے وہ سب خدا کے انتظام کے تحت ریکارڈ ہو رہا ہے۔ آدمی کی نیت، اس کا قول اور اس کا عمل سب کائناتی پردہ پر نقش ہو رہے ہیں۔ تاہم یہ انتظام آج دکھائی نہیں دیتا۔ قیامت میں یہ اوٹ ہٹا دی جائے گی۔ اس وقت انسان یہ دیکھ کر دہشت زدہ رہ جائے گا کہ دنیا میں جو کچھ وہ یہ سمجھ کر کر رہا تھا کہ کوئی اس کو جاننے والا نہیں وہ اتنے کامل طور پر یہاں مندرج ہے کہ اس کی فہرست سے نہ کوئی چھوٹی چیز بچی ہے اور نہ کوئی بڑی چیز۔

قیامت کے دن انسان کے ساتھ جو معاملہ کیا جائے گا اس کی ہر چیز اتنی ثابت شدہ ہوگی کہ آدمی جب اپنے عمل کا بدلہ پائے گا تو اس کو یقین ہوگا کہ اس کے ساتھ وہی کیا جا رہا ہے جس کا وہ فی الواقع مستحق تھا، نہ اس سے کم نہ اس سے زیادہ۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰۗىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ۭ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ۭ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ۝

اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہ کیا، وہ جنوں میں سے تھا۔ پس اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔ اب کیا تم اس کو اور اس کی اولاد کو میرے سوا اپنا دوست بناتے ہو حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں۔ یہ ظالموں کے لئے بہت برا بدل ہے۔ ۵۰

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس ایک عبادت گزار جن تھا۔ وہ بظاہر عابد وزاہد بنا ہوا تھا۔ مگر جب خدا نے آدم کے سامنے جھکنے کا حکم دیا تو وہ گھمنڈ کی بنا پر جھکنے کے لئے تیار نہ ہوا۔ اب جو لوگ گھمنڈ کے جذبہ کے تحت حق کے سامنے جھکنے سے انکار کریں وہ سب ابلیس کی ذریت ہیں۔ خواہ وہ بظاہر عبادت گزار ہی کیوں نہ دکھائی دیتے ہوں۔

خدا کے سامنے جھکنا دراصل خدا کے مقابلہ میں اپنے عجز کا اقرار کرنا ہے۔ اگر کوئی شخص حقیقی معنوں میں خدا کے سامنے جھکنے والا ہو تو جہاں کہیں بھی اس کا سامنا حق سے ہوگا وہ فوراً جھک جائے گا۔ اس کے برعکس جو شخص ظاہری طور پر سجدہ گزار ہو مگر اپنے اندر گھمنڈ کی نفسیات لئے ہوئے ہو وہ ایسے موقع پر بآسانی سجدہ کرلے گا جہاں اس کی انا کو ٹھیس نہ لگتی ہو۔ مگر جہاں انا کو جھکانے کی قیمت پر اپنے آپ کو جھکانا پڑے وہاں اچانک وہ سرکش بن جائے گا اور جھکنے سے انکار کر دے گا۔

جب حق کی پکار اٹھے اور کچھ لوگ ابلیس اور اس کی ذریت کے اثر میں آکر اس کو قبول نہ کریں تو گویا وہ ابلیس اور اس کی ذریت کو خدا کا بدل بنا رہے ہیں۔ جہاں انھیں خدا کے ڈر سے حق کے آگے جھک جانا چاہئے تھا وہاں وہ جھوٹے معبودوں کے ڈر سے اس کے آگے جھکنے سے انکار کر رہے ہیں۔ ایسے لوگ بدترین ظالم ہیں۔ بہت جلد انھیں معلوم ہو جائے گا کہ خدا کو چھوڑ کر انھوں نے جن کے اوپر بھروسہ کیا تھا وہ ان کے کچھ کام آنے والے نہیں۔

مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۖ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا ﴿٥١﴾

میں نے ان کو نہ آسمانوں اور زمین پیدا کرنے کے وقت بلایا۔ اور نہ خود ان کے پیدا کرنے کے وقت بلایا۔ اور میں ایسا نہیں کہ گمراہ کرنے والوں کو اپنا مددگار بناؤں۔ ۵۱

لوگ اپنے جن بڑوں کو دنیا کی زندگی میں قابل بھروسہ سمجھ لیتے ہیں۔ وہ اس قدر کمزور

ہیں کہ نہ کائنات کے وجود میں ان کا کوئی دخل ہے اور نہ خود اپنے وجود میں۔ مزید یہ کہ یہ لوگ حق کی دعوت کے مقابلہ میں مضل (گمراہ کرنے والے) کا کردار ادا کرکے ثابت کر رہے ہیں کہ وہ قطعاً قابل بھروسہ نہیں۔ ایک ایسی دنیا جہاں ہر طرف حق کی کارفرمائی ہو، وہاں ایسی شخصیتیں کس طرح دخیل ہوسکتی ہیں جن کا واحد سرمایہ لوگوں کو حق سے دور کرنا ہے۔

وَيَوْمَ يَقُولُ نَادُوا شُرَكَاءِيَ الَّذِينَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُمْ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَوْبِقًا ﴿۵۲﴾ وَرَأَى الْمُجْرِمُونَ النَّارَ فَظَنُّوا أَنَّهُمْ مُوَاقِعُوهَا وَلَمْ يَجِدُوا عَنْهَا مَصْرِفًا ﴿۵۳﴾

ع ۷ / ۱۹

اور جس دن خدا کہے گا کہ جن کو تم میرا شریک سمجھتے تھے ان کو پکارو۔ پس وہ ان کو پکاریں گے مگر وہ ان کو کوئی جواب نہ دیں گے۔ اور ہم ان کے درمیان (عداوت کی) آڑ کر دیں گے۔ اور مجرم لوگ آگ کو دیکھیں گے اور سمجھ لیں گے کہ وہ اس میں گرنے والے ہیں اور وہ اس سے بچنے کی کوئی راہ نہ پائیں گے۔ ۵۳-۵۲

دنیا میں جن شخصیتوں کے بل پر آدمی حق کا انکار کرتا ہے، قیامت میں وہ اس کے کچھ کام نہ آئیں گی۔ آج وہ ایک دوسرے کے ساتھی ہیں مگر جب حقائق کھلیں گے تو دونوں ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگیں گے۔ ایسا معلوم ہوگا گویا دونوں کے درمیان ہلاکت خیز رکاوٹ قائم ہوگئی ہے۔ موجودہ دنیا میں وہ اپنے آپ کو مامون ومحفوظ سمجھتے ہیں۔ مگر قیامت میں ان کا انجام صرف یہ ہونے والا ہے کہ وہ اپنے آپ کو جہنم کے دروازے پر کھڑا ہوا پائیں اور اس سے بھاگنے کی کوئی تدبیر نہ کرسکیں۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۚ وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ﴿۵۴﴾ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَنْ يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ وَيَسْتَغْفِرُوا رَبَّهُمْ إِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْأَوَّلِينَ أَوْ يَأْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ﴿۵۵﴾

اور ہم نے اس قرآن میں لوگوں کی ہدایت کے لئے ہر قسم کی مثال بیان کی ہے اور انسان سب سے زیادہ جھگڑالو ہے۔ اور لوگوں کو بعد اس کے کہ ان کو ہدایت پہنچ چکی، ایمان لانے سے اور اپنے رب سے بخشش مانگنے سے نہیں روکا مگر اس چیز نے کہ اگلوں کا معاملہ ان کے لئے بھی ظاہر ہو جائے، یا

عذاب ان کے سامنے آکھڑا ہو۔ ۵۵-۵۴

موجودہ دنیا میں امتحان کی آزادی ہے۔ اس بنا پر یہاں آدمی حق کا اعتراف نہ کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی عذر پالیتا ہے۔ ہر بات کو رد کرنے کے لئے اس کو کچھ نہ کچھ الفاظ مل جاتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ ایک کھلی ہوئی دلیل کو بے معنی بحثوں سے کاٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی وہ ایسا کرتا ہے کہ جو دلیل دی گئی ہے اس کو نظر انداز کر کے ایک اور چیز کا تقاضا کرتا ہے جو کسی وجہ سے ابھی پیش نہیں کی گئی۔

اس آخری صورت کی ایک مثال یہ ہے کہ پیغمبر نے اپنے مخاطبین کے سامنے واضح دلائل کے ساتھ اپنا پیغام پیش کیا تو انھوں نے اس پر دھیان نہیں دیا بلکہ اس سے قطع نظر کرتے ہوئے یہ کہا کہ انکار کی صورت میں تم ہم کو جس عذاب کی خبر دے رہے ہو وہ کہاں ہے، اس کو لا کر ہمیں دکھاؤ۔

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ وَيُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَمَآ اُنْذِرُوْا هُزُوًا ﴿٥٦﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ ۭ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰي قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿٥٧﴾

اور رسولوں کو ہم صرف خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجتے ہیں۔ اور منکر لوگ ناحق کی باتیں لے کر جھوٹا جھگڑا کرتے ہیں تاکہ اس کے ذریعہ سے حق کو نیچا کر دیں اور انھوں نے میری نشانیوں کو اور جو ڈر سنائے گئے ان کو مذاق بنا دیا۔ اس سے بڑا ظالم کون ہوگا جس کو اس کے رب کی آیات کے ذریعہ یاد دہانی کی جائے تو وہ اس سے منھ پھیر لے اور اپنے ہاتھوں کے عمل کو بھول جائے۔ ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دئے ہیں کہ وہ اس کو نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں ڈاٹ ہے۔ اور اگر تم ان کو ہدایت کی طرف بلاؤ تو وہ کبھی راہ پر آنے والے نہیں ہیں۔ ۵۷-۵۶

خدا کی بات سب سے زیادہ سچی بات ہے۔ تمام بہترین دلائل اس کی موافقت کرتے ہیں۔ چنانچہ جو لوگ اس کو ماننا نہیں چاہتے وہ کوئی حقیقی دلیل نہیں پاتے جس کے ذریعہ وہ اسے رد کر سکیں۔ ان کے پاس ہمیشہ صرف بے اصل باتیں ہوتی ہیں جن کے ذریعہ وہ اس کو زیر کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔

وہ ٹھوس دلائل کا مقابلہ جھوٹے اعتراضات سے کرتے ہیں۔ وہ سنجیدہ کام کو مذاق میں گم کر دینا چاہتے ہیں۔
یہ سب وہ اس لئے کرتے ہیں کہ داعی کو عوام کی نظر میں بے اعتبار ثابت کرسکیں۔ مگر وہ بھول جاتے ہیں کہ ایسا کرکے وہ خود اپنے آپ کو خدا کی نظر میں بے اعتبار ثابت کر رہے ہیں۔

آدمی کو سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت اس لئے دی گئی ہے کہ وہ حق اور ناحق میں تمیز کرسکے۔ مگر جب وہ اپنی سوجھ بوجھ کو غلط رخ پر استعمال کرتا ہے تو اس کا ذہن اسی غلط رخ پر چل پڑتا ہے جس رخ پر اس نے اس کو چلایا ہے۔ اس کے بعد اس کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے کہ کسی بات کو اس کے صحیح رخ سے دیکھے۔ اور اس کی واقعی اہمیت کو سمجھ سکے۔ وہ آنکھ رکھتے ہوئے بے آنکھ ہو جاتا ہے۔ وہ کان رکھتے ہوئے بے کان بن جاتا ہے۔

وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ۭ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ۭ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْىِٕلًا ۝ وَتِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ۝

اور تمہارا رب بخشنے والا، رحمت والا ہے۔ اگر وہ ان کے کئے پر انہیں پکڑے تو فوراً ان پر عذاب بھیج دے، مگر ان کے لئے ایک مقرر وقت ہے اور وہ اس کے مقابلہ میں کوئی پناہ کی جگہ نہ پائیں گے۔ اور یہ بستیاں ہیں جن کو ہم نے ہلاک کر دیا جب کہ وہ ظالم ہو گئے۔ اور ہم نے ان کی ہلاکت کا ایک وقت مقرر کیا تھا۔ ۵۸-۵۹

آدمی حق کے مقابلہ میں سرکشی کرتا ہے تو اس کو فوراً اس کی سزا نہیں ملتی۔ اس سے غلط فہمی میں پڑ کر وہ اپنے کو آزاد سمجھ لیتا ہے اور مزید سرکشی کرنے لگتا ہے۔ حالانکہ یہ نہ پکڑا جانا، امتحان کی مہلت کی بنا پر ہے نہ کہ آزادی اور خود مختاری کی بنا پر۔

آدمی سبق لینا چاہے تو ماضی کا انجام اس کے سامنے موجود ہے جس سے وہ حال کے لئے سبق لے سکتا ہے۔ سطح زمین پر بار بار مختلف قومیں اور تہذیبیں ابھری ہیں اور تباہ کر دی گئی ہیں۔ جب پچھلی نسلوں کے ساتھ ایسا ہوا کہ انھیں ان کی سرکشی کی سزا ملی تو اگلی نسلوں کے ساتھ یہی واقعہ کیوں نہیں ہوگا۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا ۝ فَلَمَّا بَلَغَا

مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ﴿۶۱﴾ فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ﴿۶۲﴾

اور جب موسیٰ نے اپنے شاگرد سے کہا کہ میں چلتا رہوں گا یہاں تک کہ یا تو دو دریاؤں کے ملنے کی جگہ پر پہنچ جاؤں یا اسی طرح برسوں تک چلتا رہوں۔ پس جب وہ دریاؤں کے ملنے کی جگہ پہنچے تو وہ اپنی مچھلی کو بھول گئے۔ اور مچھلی نے دریا میں اپنی راہ لی۔ پھر جب وہ آگے بڑھے تو موسیٰ نے اپنے شاگرد سے کہا کہ ہمارا کھانا لاؤ، ہمارے اس سفر سے ہم کو بڑی تکان ہو گئی۔ ۶۰ - ۶۲

خدا فرشتوں کے ذریعہ مسلسل دنیا کا انتظام کر رہا ہے۔ انسان چونکہ اس انتظام کو نہیں دیکھتا، وہ اس کے بھیدوں کو پوری طرح سمجھ نہیں پاتا۔ وہ کمتر واقفیت کی بنا پر طرح طرح کے شبہات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اس کے علاج کے لئے خدا نے بالواسطہ مشاہدہ کا انتظام کیا۔ اس نے اپنے چنے ہوئے بندوں کو مخفی دنیا کا مشاہدہ کرایا تاکہ وہ اس کی حکمتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور دوسرے انسانوں کو اس سے باخبر کر دیں۔

یہاں حضرت موسیٰ کے جس واقعہ کا ذکر ہے وہ اسی قسم کا ایک استثنائی واقعہ ہے جس کے ذریعے ان کو خدا کے چھپے ہوئے نظام کی ایک جھلک دکھائی گئی۔

حضرت موسیٰ نے یہ سفر غالباً مصر و سوڈان کے درمیان اپنے ایک نوجوان شاگرد (یوشع بن نون) کے ساتھ کیا تھا۔ خدا نے بطور علامت انھیں بتایا تھا کہ تم چلتے رہو۔ یہاں تک کہ جب تم اس جگہ پہنچو جہاں دو دریا باہم ملتے ہوں تو وہاں تم کو ہمارا ایک بندہ (غالباً فرشتہ بہ شکل انسان) ملے گا۔ تم اس کے ساتھ ہو لینا۔

قَالَ اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَآ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ وَمَآ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ عَجَبًا ﴿۶۳﴾ قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ﴿۶۴﴾ فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴿۶۵﴾

شاگرد نے کہا، کیا آپ نے دیکھا، جب ہم اس پتھر کے پاس ٹھہرے تھے تو میں مچھلی کو بھول گیا۔ اور مجھ کو

شیطان نے بھلا دیا کہ میں اس کا ذکر کرتا۔ اور مچھلی عجیب طریقے سے نکل کر دریا میں چلی گئی۔ موسیٰ نے کہا، اسی موقع کی تو ہمیں تلاش تھی۔ پس دونوں اپنے قدموں کے نشان دیکھتے ہوئے واپس لوٹے۔ تو انھوں نے وہاں ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو پایا جس کو ہم نے اپنے پاس سے رحمت دی تھی اور جس کو اپنے پاس سے ایک علم سکھایا تھا۔ ۶۵ - ۶۳

حضرت موسیٰ کو مزید علامت یہ بتائی گئی تھی کہ تم جب مطلوبہ مقام پر پہنچو گے تو تمہارے ناشتہ کی مچھلی عجیب طریقے سے پانی میں چلی جائے گی۔ یہ واقعہ ایک مقام پر ہوا۔ مگر مچھلی شاگرد کے ساتھ تھی اور شاگرد کسی وجہ سے حضرت موسیٰ کو بتا نہ سکا کہ ایسا واقعہ ہوا ہے۔ کچھ آگے بڑھنے کے بعد جب حضرت موسیٰ کو معلوم ہوا تو وہ فوراً واپس ہوئے اور مذکورہ مقام پر اس بندہ (خضر) کو پا لیا جس سے ملنے کے لئے انھوں نے یہ لمبا سفر کیا تھا۔

قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ۝ قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ۝ قَالَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَآ اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا ۝ قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِيْ فَلَا تَسْـَٔلْنِيْ عَنْ شَيْءٍ حَتّٰٓى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ۝

موسیٰ نے اس سے کہا، کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں تاکہ آپ مجھے اس علم میں سے سکھا دیں جو آپ کو سکھایا گیا ہے۔ اس نے کہا کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے اور تم اس چیز پر کیسے صبر کر سکتے ہو جو تمہاری واقفیت کے دائرے سے باہر ہے۔ موسیٰ نے کہا، انشاء اللہ آپ مجھ کو صبر کرنے والا پائیں گے اور میں کسی بات میں آپ کی نافرمانی نہیں کروں گا۔ اس نے کہا کہ اگر تم میرے ساتھ چلتے ہو تو مجھ سے کوئی بات نہ پوچھنا جب تک کہ میں خود تم سے اس کا ذکر نہ کروں۔ ۷۰ - ۶۶

اس بندہ (خضر) کو خدا نے خصوصی علم اور طاقت عطا کی تھی تاکہ اس کے مطابق وہ دنیا کے معاملات میں غیر معمولی تصرف کر سکیں۔ اس علم کے تحت وہ اکثر اوقات عام ضابطہ کے خلاف عمل کرتے تھے۔ اس لئے حضرت موسیٰ کی فرمائش پر انھوں نے کہا کہ تم اس کی برداشت نہیں لا سکتے۔

فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰٓى اِذَا رَكِبَا فِى السَّفِيْنَةِ خَرَقَهَا ؕ قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا اِمْرًا ﴿۷۱﴾ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِىَ صَبْرًا ﴿۷۲﴾ قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِىْ بِمَا نَسِيْتُ وَلَا تُرْهِقْنِىْ مِنْ اَمْرِىْ عُسْرًا ﴿۷۳﴾ فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰٓى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ ۙ قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ؕ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا نُّكْرًا ﴿۷۴﴾

پھر دونوں چلے۔ یہاں تک کہ جب وہ کشتی میں سوار ہوئے تو اس شخص نے کشتی میں چھید کر دیا۔ موسیٰ نے کہا، کیا آپ نے اس کشتی میں اس لئے چھید کیا ہے کہ کشتی والوں کو غرق کر دیں۔ یہ تو آپ نے بڑی سخت چیز کر ڈالی۔ اس نے کہا، میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے۔ موسیٰ نے کہا، میری بھول پر مجھ کو نہ پکڑیئے اور میرے معاملہ میں سختی سے کام نہ لیجئے۔ پھر وہ دونوں چلے یہاں تک کہ وہ ایک لڑکے سے ملے تو اس شخص نے اس کو مار ڈالا۔ موسیٰ نے کہا، کیا آپ نے ایک معصوم جان کو مار ڈالا حالاں کہ اس نے کسی کا خون نہیں کیا تھا۔ یہ تو آپ نے ایک نامعقول بات کی۔ ۷۴ - ۷۱

اچھی کشتی کو عیب دار بنانا اور چھوٹے بچہ کو ہلاک کرنا بظاہر ایسے کام ہیں جو صحیح نہیں۔ مگر جیسا کہ آگے کی آیات بتاتی ہیں، اس میں نہایت گہری مصلحت چھپی ہوئی تھی۔ یہ بظاہر غلط کام حقیقت کے اعتبار سے بالکل صحیح اور مفید کام تھے۔

اس میں اس مسئلہ کا بھی ایک جواب ہے جس کو عام طور پر خرابی کا مسئلہ (Problem of evil) کہا جاتا ہے۔ انسانی دنیا کی بہت سی چیزیں جن کو دیکھ کر یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ دنیا کے نظام میں خرابیاں ہیں، وہ گہری مصلحت پر مبنی ہوتی ہیں۔ موجودہ زندگی میں یقیناً اس مصلحت پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ مگر آخرت میں یہ پردہ باقی نہ رہے گا۔ اس وقت آدمی جان لے گا کہ جو کچھ ہوا وہی ہونا بھی چاہئے تھا۔

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِىَ صَبْرًا ﴿۷۵﴾ قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَىْءٍۢ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِىْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّىْ عُذْرًا ﴿۷۶﴾ فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰٓى اِذَآ اَتَيَآ اَهْلَ قَرْيَةِ ِۨاسْتَطْعَمَآ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ؕ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ﴿۷۷﴾

الجزء السادس عشر ۱۶

قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ ۚ سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ۝

اس شخص نے کہا کہ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے۔ موسیٰ نے کہا کہ اس کے بعد اگر میں آپ سے کسی چیز کے متعلق پوچھوں تو آپ مجھ کو ساتھ نہ رکھیں۔ آپ میری طرف سے عذر کی حد کو پہنچ گئے۔ پھر دونوں چلے۔ یہاں تک کہ جب وہ ایک بستی والوں کے پاس پہنچے تو وہاں والوں سے کھانے کو مانگا۔ انھوں نے ان کی میزبانی سے انکار کر دیا۔ پھر ان کو وہاں ایک دیوار ملی جو گرا چاہتی تھی تو اس نے اس کو سیدھا کر دیا۔ موسیٰ نے کہا اگر آپ چاہتے تو اس پر کچھ اجرت لے لیتے۔ اس نے کہا کہ اب یہ میرے اور تمہارے درمیان جدائی ہے۔ میں تم کو ان چیزوں کی حقیقت بتاؤں گا جن پر تم صبر نہ کر سکے۔ ۷۵ - ۷۸

حضرت موسیٰ اور حضرت خضر جیسے مقربین خدا ایک بستی میں پہنچتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ بستی والے مہمان سمجھ کر ان کو کھانا کھلائیں۔ مگر بستی والے کھانا کھلانے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی کا صادق اور مقرب ہونا کافی نہیں ہے کہ وہ دیکھنے والوں کو بھی صادق اور مقرب نظر آئے۔ اگر بستی والوں نے ان کو پہچانا ہوتا تو ضرور وہ ان کو اپنا خصوصی مہمان بناتے اور ان سے برکت حاصل کرتے، مگر ان کے معمولی ظاہری حلیہ کی بنا پر انھوں نے ان کو نظر انداز کر دیا۔ وہ ان کی اندرونی حقیقت کے اعتبار سے ان کو نہ دیکھ سکے۔

اس ناخوشگوار سلوک کے باوجود حضرت خضر نے بستی والوں کی ایک گرتی ہوئی دیوار سیدھی کر دی۔ خدا کے سچے بندوں کا دوسروں سے سلوک جوابی سلوک نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر حال میں وہی ہوتا ہے جو ازروئے حق ان کے لئے درست ہے۔

اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا ۝

کشتی کا معاملہ یہ ہے کہ وہ چند مسکینوں کی تھی جو دریا میں محنت کرتے تھے۔ تو میں نے چاہا کہ اس کو عیب دار کر دوں، اور ان کے آگے ایک بادشاہ تھا جو ہر کشتی کو زبردستی چھین کر

لے لیتا تھا ۷۹

حضرت خضر نے کشتی کو بیکار نہیں کیا تھا بلکہ وقتی طور پر اس کو عیب دار بنا دیا۔ اس کی مصلحت یہ تھی کہ کشتی جس طرف جا رہی تھی اس طرف آگے ایک بادشاہ تھا جو غالباً اپنی کسی جنگی مہم کے لئے اچھی کشتیوں کو زبردستی اپنے قبضہ میں لے رہا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس کو ایسا بنا دیا کہ بادشاہ کے کارندے اس کو دیکھیں تو اس کو ناقابل توجہ سمجھ کر اسے چھوڑ دیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں کسی کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آئے تو اس کو چاہئے کہ وہ بددل نہ ہو۔ وہ یہ سوچ کر اس پر راضی ہو جائے کہ خدا نے جو کچھ کیا ہے اس میں اس کے لئے کوئی فائدہ چھپا ہوگا، اگرچہ وہ ابھی اس سے پوری طرح باخبر نہیں۔

وَأَمَّا الْغُلَامُ فَكَانَ أَبَوَاهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِينَا أَنْ يُرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَكُفْرًا ﴿٨٠﴾ فَأَرَدْنَا أَنْ يُبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِنْهُ زَكَاةً وَأَقْرَبَ رُحْمًا ﴿٨١﴾

اور لڑکے کا معاملہ یہ ہے کہ اس کے ماں باپ ایمان دار تھے۔ ہم کو اندیشہ ہوا کہ وہ بڑا ہو کر اپنی سرکشی اور کفر سے ان کو تنگ کرے گا۔ پس ہم نے چاہا کہ ان کا رب ان کو اس کی جگہ ایسی اولاد دے جو پاکیزگی میں اس سے بہتر ہو اور شفقت کرنے والی ہو۔ ۸۱-۸۰

لڑکے کی یہ مثال بتاتی ہے کہ خدا اپنے بندوں کی مدد کہاں کہاں کرتا ہے۔ حتی کہ وہ ایسے معاملہ میں بھی ان کی مدد کرتا ہے جس کا انھیں علم تک نہیں ہوتا کہ وہ اس کے لئے اپنے رب سے درخواست کرسکیں۔ انسان کو چاہئے کہ وہ ہمیشہ صبر و شکر کا رویہ اختیار کرے۔ وہ ہر حال میں خدا سے خیر کی امید رکھے۔ خدا کلی علم رکھتا ہے، اس لئے وہ کسی بندے کی بھلائی کو اس سے زیادہ جانتا ہے جتنا انسان جزئی علم کی بنا پر نہیں جان سکتا۔

وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيمَيْنِ فِي الْمَدِينَةِ وَكَانَ تَحْتَهُ كَنْزٌ لَهُمَا وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا فَأَرَادَ رَبُّكَ أَنْ يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِنْ رَبِّكَ ۚ وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي ۚ ذَٰلِكَ تَأْوِيلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا ﴿٨٢﴾

اور دیوار کا معاملہ یہ ہے کہ وہ شہر کے دو یتیم لڑکوں کی تھی۔ اور اس دیوار کے نیچے ان کا ایک خزانہ دفن تھا اور ان کا باپ ایک نیک آدمی تھا پس تمہارے رب نے چاہا کہ وہ دونوں اپنی جوانی کی عمر کو پہنچیں اور اپنا خزانہ نکالیں۔ یہ تمہارے رب کی رحمت سے ہوا۔ اور میں نے اس کو اپنی رائے سے نہیں کیا۔ یہ ہے حقیقت ان باتوں کی جن پر تم صبر نہ کر سکے۔ ۸۲

ان مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ خدا ہر وقت موجودہ دنیا کی نگرانی کر رہا ہے۔ اس نے اگرچہ امتحان کی مصلحت کی بنا پر اس دنیا کا نظام اسباب وعلل کے تحت قائم کر رکھا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ وہ اس نظام میں بار بار مداخلت کرتا رہتا ہے۔ خدا کہیں تعمیر کا طریقہ اختیار کرتا ہے اور کہیں بظاہر تخریب کا۔ مگر وسیع تر مصلحت کے اعتبار سے سب اس کی رحمت ہوتی ہے۔ اور اس بات کا تیقن حاصل کرنا ہوتا ہے کہ اسباب کی آزادانہ گردش میں تخلیق کے اصل مقاصد فوت نہ ہونے پائیں۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ۭ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ۝ اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ۝

اور وہ تم سے ذوالقرنین کا حال پوچھتے ہیں۔ کہو کہ میں اس کا کچھ حال تمہارے سامنے بیان کروں گا۔ ہم نے اس کو زمین میں اقتدار دیا تھا۔ اور ہم نے اس کو ہر چیز کا سامان دیا تھا۔ ۸۴-۸۳

ذوالقرنین کے لفظی معنی ہیں دو سینگوں والا۔ یعنی وہ بادشاہ جس کی فتوحات کا سلسلہ دنیا کے دونوں کناروں (مشرق ومغرب) تک پہنچا ہوا تھا۔ یہاں ذوالقرنین سے مراد غالباً قدیم ایرانی بادشاہ خسرو (Cyrus) ہے۔ اس کا زمانہ پانچویں صدی قبل مسیح ہے۔ اس نے قدیم آباد دنیا کا بڑا حصہ فتح کر ڈالا تھا۔ اور بالآخر ایک جنگ میں مارا گیا۔ وہ نہایت منصف اور عادل بادشاہ تھا۔

فَاَتْبَعَ سَبَبًا ۝ حَتّٰٓي اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ڛ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا ۝ قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ

فَيُعَذِّبُهُ عَذَابًا نُّكْرًا ۝ وَأَمَّا مَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُ جَزَاءً الْحُسْنَىٰ ۖ وَسَنَقُولُ لَهُ مِنْ أَمْرِنَا يُسْرًا ۝

پھر ذوالقرنین ایک راہ کے پیچھے چلا۔ یہاں تک کہ وہ سورج کے غروب ہونے کے مقام تک پہنچ گیا۔ اس نے سورج کو دیکھا کہ وہ ایک کالے پانی میں ڈوب رہا ہے اور وہاں اس کو ایک قوم ملی۔ ہم نے کہا کہ اے ذوالقرنین تم چاہو تو ان کو سزا دو اور چاہو تو ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اس نے کہا کہ جو ان میں سے ظلم کرے گا ہم اس کو سزا دیں گے۔ پھر وہ اپنے رب کے پاس پہنچایا جائے گا، پھر وہ اس کو سخت سزا دے گا۔ اور جو شخص ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا اس کے لئے اچھی جزا ہے اور ہم بھی اس کے ساتھ آسان معاملہ کریں گے۔ ۸۸ - ۸۵

ذوالقرنین غالباً ایران کے مغرب میں فتوحات کرتا ہوا ایشیا مائنر تک پہنچ گیا جہاں ایجین سمندر (Aegean Sea) کا "سیاہ پانی" خشکی کی حد بندی کر رہا ہے۔ یہاں ایک شخص ساحل کے کنارے کھڑا ہو کر سمندر کی طرف دیکھے تو شام کے وقت اس کو نظر آئے گا گویا کہ سورج کا گولا پانی میں داخل ہو کر اس کے اندر ڈوب رہا ہے۔ یہ محاکاتی زبان میں اس حد کا بیان ہے جہاں تک ذوالقرنین پہنچا تھا۔

ذوالقرنین سمندر کے اس کنارے تک بطور سیاح نہیں آیا تھا بلکہ بطور فاتح آیا تھا۔ یہاں اس وقت جو قوم آباد تھی اس کے اوپر اس کو پورا اختیار مل گیا۔ اس کے اوپر اس کی حکومت قائم ہوگئی۔ بحیثیت حکمراں اس کو کامل اختیار حاصل تھا کہ اس کے ساتھ جو چاہے کرے۔ تاہم ذوالقرنین ایک عادل بادشاہ تھا۔ اس نے کسی پر کوئی ظلم نہیں کیا۔ اس نے عام اعلان کر دیا کہ ہم صرف اس شخص کے ساتھ سختی کریں گے جو برائی کرتا ہوا پایا جائے۔ جو لوگ امن و نظم کے ساتھ رہیں گے ان کے اوپر کوئی زیادتی نہیں کی جائے گی۔

ثُمَّ أَتْبَعَ سَبَبًا ۝ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلَىٰ قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَل لَّهُم مِّن دُونِهَا سِتْرًا ۝ كَذَٰلِكَ وَقَدْ أَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ۝

پھر وہ ایک راہ پر چلا۔ یہاں تک کہ جب وہ سورج نکلنے کی جگہ پہنچا تو اس نے سورج کو ایک ایسی قوم پر طلوع ہوتے ہوئے پایا جن کے لئے ہم نے آفتاب کے اوپر کوئی آڑ نہیں رکھی تھی۔ یہ اسی طرح ہے۔ اور ہم ذوالقرنین کے احوال سے باخبر ہیں۔ ۹۱ - ۸۹

ذوالقرنین کی دوسری مہم ایران کے مشرق کی طرف تھی۔ وہ فتوحات کرتا ہوا آگے بڑھا۔ یہاں تک کہ وہ ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں بالکل غیر متمدن لوگ بستے تھے "ان کے اور آفتاب کے درمیان آڑ نہیں تھی" کا مطلب غالباً یہ ہے کہ وہ خانہ بدوش تھے اور تعمیر شدہ مکانات میں رہنے کے بجائے کھلے میدانوں میں زندگی گزارتے تھے۔

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۝ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ۝ قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰٓى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ۝

پھر وہ ایک راہ پر چلا۔ یہاں تک کہ جب وہ دو پہاڑوں کے درمیان پہنچا تو ان کے پاس اس نے ایک قوم کو پایا جو کوئی بات سمجھ نہیں پاتی تھی۔ انھوں نے کہا کہ اے ذوالقرنین، یاجوج اور ماجوج ہمارے ملک میں فساد پھیلاتے ہیں تو کیا ہم تم کو کوئی محصول اس کے لئے مقرر کر دیں کہ تم ہمارے اور ان کے درمیان کوئی روک بنا دو۔ ۹۲-۹۴

ذوالقرنین کی تیسری مہم غالباً ایران کے شمال مشرق کی جانب تھی۔ وہ ایسے علاقہ میں پہنچا جہاں بالکل وحشی قسم کے لوگ آباد تھے۔ دوسری قوموں سے ان کا میل جول نہیں ہو سکا تھا چنانچہ وہ کوئی اور زبان مشکل ہی سے سمجھ پاتے تھے۔

یہ غالباً بحر کیسپین اور بحر اسود کے درمیان کے پہاڑ تھے۔ یہاں وحشی قبائل دوسری طرف سے آکر غارت گری کرتے اور پھر پہاڑی درہ کے راستے سے بھاگ جاتے۔ ذوالقرنین نے یہاں دونوں پہاڑوں کے درمیان آہنی دیوار کھڑی کر دی۔

قَالَ مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ۝ اٰتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ ۭ حَتّٰٓى اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوْا ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِيْٓ اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ۝ فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَ

مَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ﴿۹۷﴾ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ ۚ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا ﴿۹۸﴾

ذوالقرنین نے جواب دیا کہ جو کچھ میرے رب نے مجھے دیا ہے وہ بہت ہے تم محنت سے میری مدد کرو۔ میں تمہارے اور ان کے درمیان ایک دیوار بنادوں گا تم لوہے کے تختے لاکر مجھے دو۔ یہاں تک کہ جب اس نے دونوں کے درمیانی خلا کو بھر دیا تو لوگوں سے کہا کہ آگ دہکاؤ یہاں تک کہ جب اس کو آگ کر دیا تو کہا کہ لاؤ اب میں اس پر پگھلا ہوا تانبا ڈال دوں پس یا جوج و ماجوج نہ اس پر چڑھ سکتے تھے اور نہ اس میں سوراخ کر سکتے تھے۔ ذوالقرنین نے کہا کہ یہ میرے رب کی رحمت ہے۔ پھر جب میرے رب کا وعدہ آئے گا تو وہ اس کو ڈھا کر برابر کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ سچا ہے۔ ۹۸ - ۹۵

موجودہ اشتراکی روس کے علاقہ میں قفقاز پہاڑ (Caucasus Mountains) واقع ہیں۔ ان کا سلسلہ کیسپین سمندر اور بلیک سمندر کے درمیان پھیلا ہوا ہے۔ یہ اونچے اونچے پہاڑ ہیں جو یورپ اور ایشیا کے درمیان قدرتی دیوار کا کام دیتے ہیں۔ اس کوہستانی سلسلہ میں بعض مقامات پر درے تھے جن سے جنوب کے علاقہ سے یاجوج ماجوج کے وحشی قبائل شمال کی طرف آجاتے اور ایرانی مملکت کے حصہ میں غارت گری کرتے۔ یہاں پر آج بھی ایک قدیم دیوار کے آثار موجود ہیں۔ اغلب ہے کہ یہی وہ دیوار ہے جو ذوالقرنین نے حفاظتی مقصد کے تحت تعمیر کی تھی۔

دشمن کے مقابلہ میں "لوہے کی دیوار" کھڑی کرنا ایک ایسا کارنامہ ہے جس پر عام طور پر لوگوں میں فخر اور گھمنڈ کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر ذوالقرنین نے ایسی ناقابل تسخیر دیوار کھڑی کرنے کے بعد بھی اپنی تواضع نہیں کھوئی اس کی نظر اپنی مصنوعات پر نہیں تھی بلکہ خدا کے اختیارات پر تھی اور خدا کے مقابلہ میں کسی انسان کو کوئی زور حاصل نہیں۔

وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ﴿۹۹﴾ وَّعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضًا ﴿۱۰۰﴾ الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا ﴿۱۰۱﴾

اور اس دن ہم لوگوں کو چھوڑ دیں گے، وہ موجوں کی طرح ایک دوسرے میں گھسیں گے۔ اور صور پھونکا جائے گا پس ہم سب کو ایک ساتھ جمع کریں گے اور اس دن ہم جہنم کو منکروں کے سامنے لائیں گے، جن کی آنکھوں پر ہماری یاددہانی سے پردہ پڑا رہا اور وہ کچھ سننے کے لیے تیار نہ تھے۔ ۹۹-۱۰۱

قیامت آنے کے بعد موجودہ دنیا ایک اور دنیا بن جائے گی۔ اس وقت غالباً ایسا ہوگا کہ دریاؤں اور پہاڑوں کی موجودہ حد بندیاں توڑ کر ختم کر دی جائیں گی۔ انسانوں کا ایک ہجوم ہوگا جو ایک دوسرے سے اس طرح ٹکراتے گا جس طرح سمندر میں موجیں ٹکراتی ہیں۔

آج لوگوں کو عقل کی آنکھ سے جہنم دکھائی جا رہی ہے تو وہ ان کو نظر نہیں آتی۔ قیامت میں لوگوں کو پیشانی کی آنکھ سے جہنم دکھائی جائے گی۔ اس وقت ہر آدمی دیکھ لے گا۔ مگر یہ دیکھنا کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔ کیونکہ نصیحت کے ذریعہ جس نے اپنی آنکھ کا پردہ ہٹایا وہی پردہ ہٹانے والا ہے۔ ورنہ قیامت کے دن یہ پردہ ہٹایا جانا تو صرف اس لئے ہوگا کہ سرکشی کرنے والوں کو ان کے آخری انجام تک پہنچا دیا جائے۔

أَفَحَسِبَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنْ يَتَّخِذُوا عِبَادِي مِنْ دُونِي أَوْلِيَاءَ ۚ إِنَّا أَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ نُزُلًا ۝

کیا انکار کرنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ میرے سوا میرے بندوں کو اپنا کارساز بنائیں۔ ہم نے کافروں کی مہمانی کے لیے جہنم تیار کر رکھی ہے۔ ۱۰۲

حق کو ماننا خدا کو ماننا ہے اور حق کو نہ ماننا خدا کو نہ ماننا۔ جب بھی آدمی حق کو نہ مانے تو وہ کسی نہ کسی چیز یا شخصیت کے بل پر ایسا کرتا ہے۔ ایسا ہر بھروسہ جھوٹا بھروسہ ہے۔ کیونکہ اس دنیا میں خدا کے سوا کسی کو کوئی اختیار حاصل نہیں۔ فیصلہ کے دن ایسے لوگوں کو بچانے والا کوئی نہ ہوگا۔ کیونکہ بچانے والا تو صرف خدا تھا اور اس کی حمایت کو انھوں نے پہلے ہی سرکشی کرکے کھو دیا۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۝ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا ۝ ذَٰلِكَ

جَزَآؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوا وَاتَّخَذُوا آيَاتِي وَرُسُلِي هُزُوًا

کہو کیا میں تم کو بتا دوں کہ اپنے اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ گھاٹے میں کون لوگ ہیں۔ وہ لوگ جن کی کوشش دنیا کی زندگی میں اکارت ہو گئی اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی نشانیوں کا اور اس سے ملنے کا انکار کیا۔ پس ان کا کیا ہوا برباد ہو گیا۔ پھر قیامت کے دن ہم ان کو کوئی وزن نہ دیں گے۔ یہ جہنم ان کا بدلہ ہے اس لئے کہ انھوں نے انکار کیا اور میری نشانیوں اور میرے رسولوں کا مذاق اڑایا۔ ۱۰۳-۱۰۶

آدمی دنیا میں عمل کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس کے عمل کا نتیجہ عزت اور دولت کی صورت میں اس کو مل رہا ہے۔ اپنا کوئی کام اس کو بگڑتا ہوا نظر نہیں آتا۔ وہ سمجھ لیتا ہے کہ میں کامیاب ہوں۔

مگر یہ سراسر نادانی ہے۔ خدا کے نقشہ میں زندگی کی کامیابی کا معیار آخرت ہے۔ ایسی حالت میں دنیا کی ترقی کو ترقی سمجھنا خدا کے نقشہ کے خلاف اپنا نقشہ بنانا ہے۔ یہ آخرت کو حذف کر کے زندگی کے مسئلہ کو دیکھنا ہے ظاہر ہے کہ ایسے لوگ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

خدا اپنی نشانیاں ظاہر کرتا ہے۔ مگر جو لوگ اپنے ذہن کو دنیا میں لگائے ہوئے ہوں وہ آخرت کی نشانیوں سے متأثر نہیں ہوتے۔ خدا اپنے دلائل کھولتا ہے مگر جو لوگ دنیا کی باتوں میں گم ہوں ان کو آخرت کی دلیلیں اپیل نہیں کرتیں۔ ایسے لوگ ہدایت کے کنارے کھڑے ہو کر بھی ہدایت کو قبول کرنے سے محروم رہتے ہیں۔ انھوں نے خدا کی باتوں کو کوئی وزن نہیں دیا۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ خدا ان کو اپنے یہاں کسی وزن کا مستحق سمجھے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ۞ خَالِدِينَ فِيهَا لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حِوَلًا ۞

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیا ان کے لئے فردوس کے باغوں کی مہمانی ہے۔ اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ وہاں سے کبھی نکلنا نہ چاہیں گے۔ ۱۰۷-۱۰۸

موجودہ دنیا میں ایمان اور عمل صالح کی زندگی اختیار کرنا زبردست قربانی کا ثبوت دینا ہے۔ یہ چھپی ہوئی جنت کی خاطر نظر آنے والی جنت کو چھوڑنا ہے۔ یہ اس مشکل ترین امتحان میں پورا اترنا ہے جب کہ آدمی مجرد دلیل کی سطح پر حق کو پہچانتا ہے اور اپنی زندگی اس کے راستہ پر ڈال دیتا ہے، حالانکہ ایسا کرنے کے لئے وہاں کوئی

دباؤ نہیں ہوتا۔

جو لوگ اس معرفت اور اس کارکردگی کا ثبوت دیں ان کا انعام یہی ہے کہ ان کو ابدی راحت و آرام کے باغوں میں داخل کر دیا جائے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ۝

کہو کہ اگر سمندر میرے رب کی نشانیوں کو لکھنے کے لئے روشنائی ہو جائے تو سمندر ختم ہو جائے گا اس سے پہلے کہ میرے رب کی باتیں ختم ہوں، اگرچہ ہم اس کے ساتھ اسی کے مانند اور سمندر ملا دیں ۔ ۱۰۹

جو لوگ خدا کے پیغام کو نہیں مانتے وہ ایسی چیز کو نہیں مانتے جو تمام ثابت شدہ چیزوں سے زیادہ ثابت شدہ ہے۔ وہ اتنی مسلم ہے جس کو لکھنے کے لئے دنیا کے تمام درختوں کے قلم بھی ناکافی ثابت ہوں۔ تمام سمندروں کی سیاہی بھی خشک ہو جائے اس سے پہلے کہ اس کی فہرست ختم ہو۔

مگر انسان کیسا ظالم ہے کہ اس کے باوجود وہ حق کو نہیں پہچانتا۔ اس کے باوجود وہ اپنی زندگی کو حق کے مطابق نہیں ڈھالتا۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۝

ع ۱۲

کہو کہ میں تمہاری ہی طرح ایک آدمی ہوں۔ مجھ پر وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود صرف ایک ہی معبود ہے۔ پس جس کو اپنے رب سے ملنے کی امید ہو اس کو چاہئے کہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے ۔ ۱۱۰

پیغمبر خدا یا فرشتہ نہیں ہوتا۔ وہ انسانوں کی طرح ایک انسان ہوتا ہے۔ اس کی مزید خصوصیت صرف یہ ہوتی ہے کہ اس پر غیر مرئی ذریعہ سے خدا کی وحی آتی ہے۔ گویا پیغمبر ایک ایسی ہستی ہے جو اپنے ظاہر کے اعتبار سے ایک انسان ہے اور اپنی اندرونی حقیقت کے اعتبار سے نمائندہ خدا۔

یہی وجہ ہے کہ حق کو پانے کے لئے جو ہر شناسی کی صلاحیت درکار ہوتی ہے۔ حق کو پانا صرف اس شخص کے لئے ممکن ہوتا ہے جو حقیقت کو اس کے غیبی روپ میں دیکھ سکے۔ جو "انسان" کی سطح پر "پیغمبر" کو پہچاننے کا ثبوت دے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

كٓهٰيٰعٓصٓ ۟ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ۖ ۟اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ۟

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

کٓھٰیٰعٓصٓ۔ یہ اس رحمت کا ذکر ہے جو تیرے رب نے اپنے بندے زکریا پر کی۔ جب اس نے اپنے رب کو چھپی آواز سے پکارا۔ ۳-۱

حضرت زکریا حضرت مریم کے بہنوئی تھے۔ حضرت مریم کے والد کا نام عمران تھا۔ حضرت مریم ابھی صرف چند سال کی تھیں کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ وہ ہیکل کے ناظم اعلیٰ تھے۔ ان کے بعد حضرت زکریا ہیکل کے ناظم اعلیٰ (کاہنوں کے سردار) مقرر ہوئے۔ اس زمانہ میں حضرت مریم اپنی والدہ کی نذر کے مطابق ہیکل کی خدمت میں دے دی گئی تھیں۔ حضرت زکریا چوں کہ حضرت مریم کے قریبی عزیز تھے اور ہیکل کے سردار بھی اس لئے وہی حضرت مریم کی تربیت کے ذمہ دار قرار پائے۔

حضرت زکریا علیہ السلام نے "چھپی آواز" میں خدا سے دعا کی۔ یہ دعا حیرت انگیز طور پر پوری ہوئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سچی دعا کیا ہے۔ سچی دعا دراصل اس یقین کا بے تابانہ اظہار ہے کہ سارا اختیار صرف خدا کے پاس ہے۔ اسی کے دینے سے آدمی کو ملے گا اور وہ نہ دے تو کبھی کسی کو کچھ نہیں مل سکتا۔ سچی دعا کا سارا رخ صرف ایک خدا کی طرف ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سچی دعا سب سے زیادہ اس وقت ابلتی ہے جب کہ آدمی تنہائی میں ہو۔ جہاں اس کے اور خدا کے سوا کوئی تیسرا نہ پایا جائے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَاۗىِٕكَ رَبِّ شَقِيًّا ۟ وَاِنِّىْ خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَّرَاۗءِيْ وَكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۟ يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ڰ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ۟

زکریا نے کہا، اے میرے رب، میری ہڈیاں کمزور ہوگئی ہیں۔ اور سر میں بالوں کی سفیدی پھیل گئی ہے اور اے میرے رب، تجھ سے مانگ کر میں کبھی محروم نہیں رہا۔ اور میں اپنے بعد رشتہ داروں کی طرف سے اندیشہ رکھتا ہوں۔ اور میری بیوی بانجھ ہے، پس مجھ کو اپنے پاس سے ایک وارث دے جو میری جگہ

لے اور آل یعقوب کی بھی۔ اور اے میرے رب اس کو اپنا پسندیدہ بنا۔ ۴-۶

یہ اس بندہ کی زبان سے نکلی ہوئی دعا ہے جو دین کا مشن چلاتے ہوئے بالکل بوڑھا ہو گیا تھا۔ اور اہل خاندان میں کوئی شخص اس کو نظر نہیں آتا تھا جو اس کے بعد اس کے مشن کو جاری رکھے۔ ایک طرف اپنا عجز اور دوسری طرف مشن کی اہمیت، یہ دونوں احساسات اس کی زبان پر اس دعا کی صورت میں ڈھل گئے جو مذکورہ آیات میں نظر آتے ہیں۔ گویا یہ عام معنوں میں محض ایک بیٹے کی دعا نہ تھی۔ بلکہ اس بات کی دعا تھی کہ مجھے ایک ایسا لائق شخص حاصل ہو جائے جو میرے بعد میرے پیغمبرانہ مشن کو جاری رکھے۔

يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ۨاسْمُهٗ يَحْيٰى ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ۝۷ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ۝۸

اے زکریا، ہم تم کو ایک لڑکے کی بشارت دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہوگا۔ ہم نے اس سے پہلے اس نام کا کوئی آدمی نہیں بنایا۔ اس نے کہا، اے میرے رب، میرے یہاں لڑکا کیسے ہوگا جب کہ میری بیوی بانجھ ہے۔ اور میں بڑھاپے کے انتہائی درجہ کو پہنچ چکا ہوں۔ ۷-۸

یہ دعا بیٹے کی صورت میں قبول ہوئی۔ ایک ایسا بیٹا جیسا بیٹا عام طور پر لوگوں کے یہاں پیدا نہیں ہوتا۔ ایک شخص جو آخری حد تک بوڑھا ہو چکا ہو اور جس کی بیوی پوری عمر تک بانجھ رہی ہو۔ اس کے یہاں بچہ پیدا ہونا یقیناً ایک انتہائی غیر معمولی بات ہے۔ اس بنا پر حضرت زکریا کو اس خبر پر خوشی کے ساتھ تعجب بھی ہوا۔ ملنے والی نعمت کے غیر متوقع ہونے کا احساس ان کی زبان سے ان الفاظ میں نکل پڑا کہ میرے یہاں کیسے بچہ پیدا ہوگا جب کہ میں اور میری بیوی دونوں اس اعتبار سے از کار رفتہ ہو چکے ہیں۔

قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْـًٔا ۝۹ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ۝۱۰ فَخَرَجَ

عَلٰی قَوۡمِہٖ مِنَ الۡمِحۡرَابِ فَاَوۡحٰۤی اِلَیۡہِمۡ اَنۡ سَبِّحُوۡا بُکۡرَۃً وَّ عَشِیًّا ﴿۱۱﴾

جواب ملا کہ ایسا ہی ہوگا۔ تیرا رب فرماتا ہے کہ یہ میرے لئے آسان ہے۔ میں نے اس سے پہلے تم کو پیدا کیا، حالانکہ تم کچھ بھی نہ تھے۔ زکریا نے کہا کہ اے میرے رب، میرے لئے کوئی نشانی مقرر کردے۔ فرمایا کہ تمہاری نشانی یہ ہے کہ تم تین شب و روز لوگوں سے بات نہ کرسکو گے حالانکہ تم تندرست ہوگے۔ پھر زکریا محراب عبادت سے نکل کر لوگوں کے پاس آیا اور ان سے اشارے سے کہا کہ تم صبح و شام خدا کی پاکی بیان کرو۔ ۱۱-۹

پہلے انسان کا باپ اور ماں کے بغیر پیدا ہونا جس طرح ایک خدائی معجزہ ہے اسی طرح باپ اور ماں کے ذریعہ بچہ کا پیدا ہونا بھی ایک خدائی معجزہ ہے۔ خواہ یہ ماں باپ بوڑھے ہوں یا جوان۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ خدا ہے جو انسان کو پیدا کرتا ہے۔ اسی نے پہلے پیدا کیا اور وہی آج بھی پیدا کرنے والا ہے۔ دوسری ہر چیز محض ایک ظاہری بہانہ ہے نہ کہ حقیقی وجہ۔

حضرت زکریا نے رحمت خداوندی کے ملنے کی علامت دریافت کی۔ بتایا گیا کہ تندرست ہونے کے باوجود جب کامل تین رات دن تک لوگوں سے زبان کے ذریعہ بات نہ کرسکو، اس وقت سمجھ لینا کہ حمل قرار پاگیا ہے۔ چنانچہ جب وہ وقت آیا تو زبان بات چیت سے رک گئی۔ حضرت زکریا اپنے عبادت خانہ سے باہر نکلے اور لوگوں سے اشارہ کے ساتھ کہا کہ صبح و شام اللہ کو یاد کرو اور اس کی عبادت واطاعت میں مشغول رہو۔

حضرت زکریا کا غالباً یہ معمول تھا کہ وہ روزانہ لوگوں کو وعظ ونصیحت فرماتے تھے۔ جب زبان بولنے سے رک گئی تب بھی آپ مقام اجتماع پر آئے اور لوگوں کو نصیحت کی۔ البتہ چونکہ زبان چل نہیں رہی تھی، آپ نے اشارہ کے ساتھ لوگوں کو تلقین فرمائی۔

یٰیَحۡیٰی خُذِ الۡکِتٰبَ بِقُوَّۃٍ ؕ وَ اٰتَیۡنٰہُ الۡحُکۡمَ صَبِیًّا ﴿۱۲﴾ وَّ حَنَانًا مِّنۡ لَّدُنَّا وَ زَکٰوۃً ؕ وَ کَانَ تَقِیًّا ﴿۱۳﴾ وَّ بَرًّۢا بِوَالِدَیۡہِ وَ لَمۡ یَکُنۡ جَبَّارًا عَصِیًّا ﴿۱۴﴾ وَ سَلٰمٌ عَلَیۡہِ یَوۡمَ وُلِدَ وَ یَوۡمَ یَمُوۡتُ وَ یَوۡمَ یُبۡعَثُ حَیًّا ﴿۱۵﴾ ع

وقف لازم

اے یحییٰ کتاب کو مضبوطی سے پکڑو۔ اور ہم نے اس کو بچپن ہی میں دین کی سمجھ عطا کی۔ اور اپنی طرف سے اس کو نرم دلی اور پاکیزگی عطا کی۔ اور وہ پرہیزگار اور اپنے والدین کا خدمت گزار تھا۔ اور وہ سرکش اور نافرمان نہ تھا۔ اور اس پر سلامتی ہے جس دن وہ پیدا ہوا اور جس دن وہ مرے گا اور جس دن وہ زندہ کرکے اٹھایا جائے گا۔ ۱۵-۱۲

کہا جاتا ہے کہ حضرت یحییٰ جب چھوٹے تھے تو لڑکوں نے ایک بار انھیں کھیلنے کے لئے بلایا۔ انھوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ "ہم اس لئے نہیں بنائے گئے ہیں" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو بچپن سے یہ شعور حاصل تھا کہ زندگی کو بامقصد ہونا چاہیے۔ اسی طرح ان کے اندر پیدائشی طور پر سوز وگداز موجود تھا وہ نفسیاتی گرہوں سے آزاد تھے۔ وہ اپنے والدین کے حقوق ادا کرنے والے تھے۔ وہ سرکشی اور نافرمانی سے بالکل خالی تھے۔

یہی وہ اوصاف ہیں جو آدمی کو اس قابل بناتے ہیں کہ وہ کسی حال میں خدا کی کتاب سے نہ ہٹے۔ اور انھیں اوصاف والا آدمی وہ ہے جس پر دنیا میں بھی خدا کی رحمت نازل ہوتی ہے اور آخرت میں بھی خدا کی رحمت۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ۝ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۫ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۝ قَالَتْ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ۝ قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ۝ قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا ۝ قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ۝

اور کتاب میں مریم کا ذکر کرو جب کہ وہ اپنے لوگوں سے الگ ہو کر شرقی مکان میں چلی گئی۔ پھر اس نے اپنے آپ کو ان سے پردے میں کر لیا۔ پھر ہم نے اس کے پاس اپنا فرشتہ بھیجا جو اس کے سامنے ایک پورا آدمی بن کر ظاہر ہوا۔ مریم نے کہا، میں تجھ سے خدائے رحمان کی پناہ مانگتی ہوں اگر تو خدا سے ڈرنے والا

ہے۔ اس نے کہا، میں تمہارے رب کا بھیجا ہوا ہوں تاکہ تم کو ایک پاکیزہ لڑکا دوں۔ مریم نے کہا میرے یہاں کیسے لڑکا ہوگا، جب کہ مجھ کو کسی آدمی نے نہیں چھوا اور نہ میں بدکار ہوں۔ فرشتے نے کہا کہ ایسا ہی ہوگا۔ تیرا رب فرماتا ہے کہ یہ میرے لئے آسان ہے۔ اور تاکہ ہم اس کو لوگوں کے لئے نشانی بنا دیں اور اپنی جانب سے ایک رحمت۔ اور یہ ایک طے شدہ بات ہے۔ ۲۱-۱۶

حضرت مریم اپنی والدہ کی نذر کے مطابق ہیکل (بیت المقدس) کی خدمت کے لئے دیدی گئی تھیں۔ قدیم ہیکل کا مشرقی حصہ عورتوں کے لئے خاص تھا۔ وہ اس حصہ میں ایک طرف پردہ ڈال کر معتکف ہوگئیں۔ اس کے بعد اچانک ایک روز ایسا ہوا کہ انھوں نے دیکھا کہ ایک تندرست و توانا آدمی ان کے سامنے کھڑا ہوا ہے۔ اس منظر سے ان کا گھبرا اٹھنا بالکل فطری تھا۔ مگر آدمی نے بتایا کہ وہ فرشتہ ہے۔ اور خدا کی طرف سے اس لئے آیا ہے کہ حضرت مریم کو معجزاتی طور پر ایک بچہ عطا کرے۔

حضرت مسیح علیہ السلام کا اس طرح معجزاتی طور پر پیدا ہونا خدا کی ایک عظیم نشانی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ یہود آپ کے فرستادۂ خدا ہونے پر شک نہ کریں اور آپ خدا کی طرف سے جو باتیں بتائیں ان کو مان لیں۔ مگر اتنی کھلی ہوئی نشانی کے باوجود انھوں نے حضرت مسیح کا انکار کر دیا۔

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهِ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿٢٢﴾ فَأَجَاءَهَا الْمَخَاضُ إِلَىٰ جِذْعِ النَّخْلَةِ قَالَتْ يَا لَيْتَنِي مِتُّ قَبْلَ هَٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَنْسِيًّا ﴿٢٣﴾

پس مریم نے اس کا حمل اٹھا لیا اور وہ اس کو لے کر ایک دور کی جگہ چلی گئی۔ پھر دردِ زہ اس کو کھجور کے درخت کی طرف لے گیا۔ اس نے کہا، کاش میں اس سے پہلے مر جاتی اور بھولی بسری چیز ہو جاتی۔ ۲۳-۲۲

حضرت مریم ایک معزز مذہبی گھرانے کی غیر شادی شدہ خاتون تھیں۔ ایسی ایک خاتون کا حاملہ ہونا اس کے لئے ایک ایسی آزمائش ہے جس سے بڑی کوئی آزمائش نہیں۔ اس پریشانی میں مبتلا ہونے کے بعد وہ خاموشی کے ساتھ ہیکل سے نکلیں اور دور کے ایک مقام (بیت لحم) چلی گئیں۔ جب وقت پورا ہوا اور دردِ زہ کی کیفیت پیدا ہوئی تو وہ بستی سے باہر ایک کھجور کے نیچے بیٹھ گئیں۔ ایک پاکباز غیر شادی شدہ خاتون پر ایسے وقت میں جو کیفیت گزرے گی اس کی تصویر ان الفاظ میں ملتی ہے —— کاش میں اس سے پہلے ختم ہو جاتی اور لوگوں کے حافظہ میں میرا کوئی وجود نہ ہوتا۔

فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِىْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ۝ وَهُزِّىْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ۝ فَكُلِىْ وَاشْرَبِىْ وَقَرِّىْ عَيْنًا ۚ فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِىْٓ اِنِّىْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا ۝

پھر مریم کو اس نے اس کے نیچے سے آواز دی کہ غمگین نہ ہو۔ تیرے رب نے تیرے نیچے ایک چشمہ جاری کردیا ہے اور تم کھجور کے تنے کو اپنی طرف ہلاؤ۔ اس سے تمہارے اوپر پکی کھجوریں گریں گی۔ پس کھاؤ اور پیو اور آنکھیں ٹھنڈی کرو۔ پھر اگر تم کوئی آدمی دیکھو تو اس سے کہہ دو کہ میں نے رحمان کا روزہ مان رکھا ہے تو آج میں کسی انسان سے نہیں بولوں گی۔ ۲۶ ۔ ۲۴

اتنی نازک آزمائش میں مبتلا ہونے کے بعد حضرت مریم کے لئے تسکین کا صرف ایک ہی ذریعہ ہو سکتا تھا۔ وہ یہ کہ خدا کا فرشتہ ظاہر ہو کر انھیں یقین دلائے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ عین اس وقت فرشتے نے آکر آواز دی کہ گھبراؤ مت۔ یہ سب جو ہو رہا ہے یہ خدا کے منصوبہ کے تحت ہو رہا ہے۔ تمہارے قریب صاف پانی کا چشمہ رواں کر دیا گیا ہے۔ اور کھجور کا یہ درخت تم کو ہر وقت تازہ پھل دینا کرے گا۔ اس سے کھاؤ اور پیو۔

بچہ کے سلسلہ میں فرشتہ نے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ خدا کے معجزہ سے پیدا ہونے والا یہ خود تمہارے دفاع کے لئے کافی ہے۔ تم بنی اسرائیل کے رواج کے مطابق چپ کا روزہ رکھ لو۔ اور جب کسی آدمی سے تمہارا سامنا ہو اور وہ تم سے پوچھے تو تم بچہ کی طرف اشارہ کر دو۔ وہ خود جواب دے کر تم کو بری الذمہ کر دے گا۔

فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ۭ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـــًٔا فَرِيًّا ۝ يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ۝

پھر وہ اس کو گود میں لئے ہوئے اپنی قوم کے پاس آئی۔ لوگوں نے کہا، اے مریم تم نے بڑا طوفان کر ڈالا۔ اے ہارون کی بہن، نہ تمہارا باپ کوئی برا آدمی تھا اور نہ تمہاری ماں بدکار تھی۔ ۲۸ ۔ ۲۷

فرشتہ کی بات سننے کے بعد حضرت مریم کے اندر اعتماد پیدا ہوگیا۔ وہ بچہ کو لے کر اپنے خاندان والوں میں واپس آئیں۔ ان کو اس حال میں دیکھ کر یہود کے تمام لوگ انھیں ملامت کرنے لگے۔ حضرت مریم نے وہی کیا جو فرشتہ نے انھیں بتایا تھا۔ انھوں نے خود خاموش رہتے ہوئے بچہ کی طرف اشارہ کردیا۔ مطلب یہ تھا کہ یہ لڑکا کوئی عام قسم کا لڑکا نہیں ہے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ تم اس سے کلام کرو، وہ گود کا بچہ ہونے کے باوجود تمہارے کلام کو سمجھے گا اور صاف زبان میں تمہارا جواب دے گا۔

فَأَشَارَتْ إِلَيْهِ ۖ قَالُوا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ﴿٢٩﴾ قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ آتَانِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا ﴿٣٠﴾ وَجَعَلَنِي مُبَارَكًا أَيْنَ مَا كُنْتُ وَأَوْصَانِي بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ﴿٣١﴾ وَبَرًّا بِوَالِدَتِي وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا ﴿٣٢﴾ وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُ وَيَوْمَ أَمُوتُ وَيَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا ﴿٣٣﴾

پھر مریم نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ لوگوں نے کہا، ہم اس سے کس طرح بات کریں جو کہ گود میں بچہ ہے۔ بچہ بولا، میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھ کو کتاب دی اور مجھ کو نبی بنایا۔ اور میں جہاں کہیں بھی ہوں اس نے مجھ کو برکت والا بنایا ہے۔ اور اس نے مجھ کو نماز اور زکوٰۃ کی تاکید کی ہے جب تک میں زندہ رہوں۔ اور مجھ کو میری ماں کا خدمت گزار بنایا ہے۔ اور مجھ کو سرکش، بدبخت نہیں بنایا ہے۔ اور مجھ پر سلامتی ہے جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن میں مروں گا اور جس دن میں زندہ کرکے اٹھایا جاؤں گا۔ ۲۹ - ۳۳

حضرت مریم کے اشارہ کے باوجود یہود کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ ایک چھوٹے بچے سے کس طرح بات کریں۔ اس وقت حضرت مسیح خود بول پڑے۔ ان کی معجزانہ گفتگو میں ایک طرف حضرت مریم کی کامل برأت تھی۔ دوسری طرف یہ ایک پیشگی شہادت تھی۔ تاکہ یہ نومولود جب بڑا ہوکر نبوت کا اعلان کرے تو لوگوں کے لئے آپ کی نبوت پر شک کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔

ذَٰلِكَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِي فِيهِ يَمْتَرُونَ ﴿٣٤﴾ مَا كَانَ لِلَّهِ أَنْ يَتَّخِذَ مِنْ وَلَدٍ ۖ سُبْحَانَهُ ۚ إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿٣٥﴾

یہ ہے عیسیٰ ابن مریم، سچی بات جس میں لوگ جھگڑ رہے ہیں۔ اللہ ایسا نہیں کہ وہ کوئی اولاد بنائے۔ وہ پاک ہے۔ جب وہ کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔ ۳۵ - ۳۴

حضرت مسیح کی غیر معمولی پیدائش ایک انوکھا واقعہ تھا۔ اس انوکھے واقعہ کی توجیہہ میں مسیحی علماء نے عجیب عجیب عقیدے بنا لئے۔ مگر ہمیشہ توجیہہ کی ایک حد ہوتی ہے۔ اور اس حد کے اندر رہ کر ہی کسی چیز کی توجیہہ کی جا سکتی ہے۔ حضرت مسیح کی غیر معمولی پیدائش کی توجیہہ میں ان کو خدا کا بیٹا بنا دینا حد سے باہر جانا ہے کیوں کہ یہ خدا کی یکتائی کے منافی ہے کہ اس کی کوئی اولاد ہو۔

نیز یہ کہ کائنات میں بے شمار انوکھے واقعات ہیں جن کو ہم روزانہ دیکھتے ہیں۔ اس دنیا کی ہر چیز ایک انوکھا واقعہ ہے۔ اب اگر مزید ایک انوکھی چیز سامنے آئے تو انسان کو یہ کہنا چاہئے کہ خدا نے جس طرح دوسری بے شمار انوکھی چیزیں پیدا کی ہیں اسی طرح وہ اس انوکھی چیز کا بھی خالق ہے جو آج ہمارے سامنے ظاہر ہوئی ہے۔

وَإِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۚ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ۝ فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِن بَيْنِهِمْ ۖ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا مِن مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۝ أَسْمِعْ بِهِمْ وَأَبْصِرْ يَوْمَ يَأْتُونَنَا ۖ لَٰكِنِ الظَّالِمُونَ الْيَوْمَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝

اور بے شک اللہ میرا رب ہے اور تمہارا رب بھی، پس تم اسی کی عبادت کرو۔ یہی سیدھا راستہ ہے۔ پھر ان کے فرقوں نے باہم اختلاف کیا۔ پس انکار کرنے والوں کے لئے ایک بڑے دن کے آنے سے خرابی ہے۔ جس دن یہ لوگ ہمارے پاس آئیں گے۔ وہ خوب سنتے اور خوب دیکھتے ہوں گے، مگر آج یہ ظالم کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں۔ ۳۸ - ۳۶

حضرت مسیح اور دوسرے تمام پیغمبروں نے ایک ہی صراط مستقیم کی طرف لوگوں کو بلایا۔ وہ یہ کہ آدمی خدا کو اپنا رب بنائے اور اسی کی عبادت کرے۔ مگر ہمیشہ یہ ہوا کہ خود ساختہ تاویلات وتشریحات کے ذریعہ اس صراط مستقیم سے انحراف کیا گیا۔ کسی نے ایک بات نکالی اور کسی نے دوسری بات۔ اس طرح اختلاف پیدا ہوا اور ایک دین کئی دینوں میں تقسیم ہو گیا۔

دنیا میں بھی حق بات پوری طرح واضح ہے مگر یہاں انسان کو امتحان کی وجہ سے آزادی حاصل ہے۔ وہ چاہے تو مانے اور چاہے تو نہ مانے۔ اس وقتی آزادی کی وجہ سے انسان غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے۔ اور سرکشی کرنے لگتا ہے۔ اس کو دلائل کے ذریعہ بتایا جاتا ہے کہ خدا کی صراط مستقیم کیا ہے۔ مگر وہ اس کو نہیں مانتا۔ لیکن آخرت میں جب آزادی چھن چکی ہوگی، انسان کی وہی آنکھیں اور وہی کان خوب دیکھنے اور سننے والے بن جائیں گے۔ جو آج ایسے معلوم ہوتے ہیں گویا کہ وہ دیکھنا اور سننا جانتے ہی نہ ہوں۔

وَأَنذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ إِذْ قُضِيَ الْأَمْرُ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ وَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٣٩﴾ إِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْأَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَإِلَيْنَا يُرْجَعُونَ ﴿٤٠﴾

اور ان لوگوں کو اس حسرت کے دن سے ڈرا دو جب معاملہ کا فیصلہ کر دیا جائے گا، اور وہ غفلت میں ہیں۔ اور وہ ایمان نہیں لا رہے ہیں۔ بے شک ہم ہی زمین اور زمین کے رہنے والوں کے وارث ہوں گے۔ اور لوگ ہماری ہی طرف لوٹائے جائیں گے۔ ۳۹-۴۰

آدمی دنیا میں ناکامی سے دوچار ہوتا ہے تو اس کو موقع ہوتا ہے کہ وہ دوبارہ نئی زندگی شروع کر سکے۔ اس کے پاس ساتھی اور مددگار ہوتے ہیں جو اس کو سنبھالنے کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مگر آخرت کی ناکامی ایسی ناکامی ہے جس کے بعد دوبارہ سنبھلنے کا کوئی امکان نہیں۔ کیسا عجیب حسرت کا لمحہ ہوگا جب آدمی یہ جانے گا کہ وہ سب کچھ کر سکتا تھا مگر اس نے نہیں کیا۔ یہاں تک کہ کرنے کا وقت ہی ختم ہو گیا۔

ساری خرابیوں کی جڑ یہ ہے کہ آدمی یہ سمجھ لیتا ہے کہ وہ اپنا مالک آپ ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ صرف ایک درمیانی وقفہ ہے۔ پہلے بھی صرف خدا تمام چیزوں کا مالک تھا اور آخر میں بھی یہ صرف خدا ہے جو تمام چیزوں کا مالک ہوگا۔ خدا کے سوا کوئی نہیں جس کو یہاں حقیقی معنوں میں کوئی مالکانہ حیثیت حاصل ہو۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ ۚ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا ﴿٤١﴾ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنكَ شَيْئًا ﴿٤٢﴾ يَا أَبَتِ إِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِي أَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ﴿٤٣﴾ يَا أَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطَانَ ۖ

اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ۝ يٰٓاَبَتِ اِنِّىْٓ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ۝

اور کتاب میں ابراہیم کا ذکر کرو۔ بے شک وہ سچا تھا اور نبی تھا۔ جب اس نے اپنے باپ سے کہا کہ اے میرے باپ، ایسی چیز کی عبادت کیوں کرتے ہو جو نہ سنے اور نہ دیکھے، اور نہ تمہارے کچھ کام آسکے۔ اے میرے باپ میرے پاس ایسا علم آیا ہے جو تمہارے پاس نہیں ہے تو تم میرے کہنے پر چلو۔ میں تم کو سیدھا راستہ دکھاؤں گا۔ اے میرے باپ شیطان کی عبادت نہ کر، بے شک شیطان خدائے رحمان کی نافرمانی کرنے والا ہے۔ اے میرے باپ، مجھ کو ڈر ہے کہ تم کو خدائے رحمان کا کوئی عذاب پکڑ لے اور تم شیطان کے ساتھی بن کر رہ جاؤ۔ ۴۱-۴۵

حضرت ابراہیم عراق میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد آزر بت پرست تھے۔ آپ کو نبوت ملی تو آپ نے اپنے والد کو نصیحت کی کہ بتوں کی عبادت چھوڑ دو اور خدا کی عبادت کرو۔ ورنہ تم خدا کی پکڑ میں آجاؤ گے۔

شیطان کی عبادت کا مطلب خود شیطان کی عبادت نہیں ہے بلکہ شیطان کی بتائی ہوئی چیز کی عبادت ہے۔ انسان کے اندر فطری طور پر یہ جذبہ رکھا گیا ہے کہ وہ کسی کو اونچا درجہ دے کر اس کے آگے اپنے جذبات عقیدت کو نثار کرے۔ اس جذبہ کا حقیقی مرکز خدا ہے۔ مگر شیطان مختلف طریقہ سے لوگوں کے ذہن کو پھیرتا ہے۔ تاکہ وہ انسان کو مشرک بنا دے، تاکہ انسان غیر خدا کو وہ چیز دیدے جو اس کو صرف خدا کو دینا چاہئے۔

قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ۝ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ۝ وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّيْ عَسٰٓى اَلَّآ اَكُوْنَ بِدُعَاۗءِ رَبِّيْ شَقِيًّا ۝

باپ نے کہا کہ اے ابراہیم، کیا تم میرے معبودوں سے پھر گئے ہو۔ اگر تم باز نہ آئے تو میں تم کو سنگسار کر دوں گا۔ اور تم مجھ سے ہمیشہ کے لئے دور ہو جاؤ۔ ابراہیم نے کہا، تم پر سلامتی ہو۔ میں اپنے رب سے

تمہارے لئے بخشش کی دعا کروں گا، بے شک وہ مجھ پر مہربان ہے۔ اور میں تم لوگوں کو چھوڑتا ہوں اور ان کو بھی جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو۔ اور میں اپنے رب ہی کو پکاروں گا۔ امید ہے کہ میں اپنے رب کو پکار کر محروم نہیں رہوں گا۔ ۴۸-۴۶

حضرت ابراہیم نے جن بتوں پر تنقید کی، وہ سادہ معنوں میں محض پتھر کے ٹکڑے نہ تھے بلکہ وہ ان ہستیوں کے نمائندہ تھے جن کی طلسماتی عظمت ماضی کی طویل روایات کے نتیجہ میں لوگوں کے ذہنوں پر قائم ہو چکی تھی۔ اس تقابل میں "نوجوان ابراہیم" ایک معمولی شخص نظر آئے اور عراق کے بت عظمتوں کے پہاڑ دکھائی دئے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم کے والد نے حقارت کے ساتھ ان کی نصیحت کو نظرانداز کر دیا۔

حق کی دعوت ایک مقام پر شروع کی جائے اور پھر وہ اس مرحلہ میں پہنچ جائے کہ لوگ اس کو اچھی طرح سمجھ چکے ہوں مگر وہ ماننے کے بجائے جارحیت پر اتر آئیں تو اس وقت داعی اپنے مقام عمل کو تبدیل کر دیتا ہے۔ اسی کا دوسرا نام ہجرت ہے۔ مقام عمل کی یہ تبدیلی کبھی قریب کے دائرہ میں ہوتی ہے اور کبھی دور کے دائرہ میں۔

دعوت کا عمل ایک خدائی عمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جب بھی شروع ہوتا ہے ربانی نفسیات کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ مدعو اگر داعی کے ساتھ ظلم وحقارت کا معاملہ کرے تب بھی داعی کے دل میں اس کے لئے نرم گوشہ موجود رہتا ہے۔ اسی طرح داعی اگر اپنے ماحول میں بے یار و مددگار ہو جائے تب بھی وہ مایوس نہیں ہوتا کیوں کہ اس کا اصل سہارا خدا ہوتا ہے۔ وہ یقین رکھتا ہے کہ وہ بدستور اس کے ساتھ موجود ہے اور ہمیشہ موجود رہے گا۔

فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ ۖ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ﴿٤٩﴾ وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِنْ رَحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ﴿٥٠﴾

ع

پس جب وہ لوگوں سے جدا ہو گیا۔ اور ان سے جن کو وہ اللہ کے سوا پوجتے تھے تو ہم نے اس کو اسحاق اور یعقوب عطا کئے اور ہم نے ان میں سے ہر ایک کو نبی بنایا۔ اور ان کو اپنی رحمت کا حصہ دیا اور ہم نے ان کا نام

نیک اور بلند کیا۔ ۵۰-۴۹

آدمی اپنے خاندان اور اپنے گروہ کے ساتھ جیتا ہے۔ ایسی حالت میں کسی شخص کو اس کے خاندان اور اس کے گروہ سے نکال دینا گویا اس کو بربادی کے صحرا میں دھکیل دینا ہے۔ مگر حضرت ابراہیم کے واقعہ کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کے لئے دکھادیا کہ جو بندہ خالص اللہ کے لئے بے گھر کیا جائے اس کو اللہ اپنی طرف سے زیادہ اچھا گھر عطا کر دیتا ہے۔ جو شخص خالص اللہ کے لئے گم نامی میں ڈال دیا جائے اس کو اللہ زیادہ بڑے پیمانہ پر نیک نام بنا دیتا ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰٓى اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۝ وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ۝ وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ۝

اور کتاب میں موسیٰ کا ذکر کرو۔ بے شک وہ چنا ہوا تھا اور رسول نبی تھا۔ اور ہم نے اس کو کوہ طور کے داہنی جانب سے پکارا اور اس کو ہم نے راز کی باتیں کرنے کے لئے قریب کیا۔ اور اپنی رحمت سے ہم نے اس کے بھائی ہارون کو نبی بنا کر اسے دیا۔ ۵۳-۵۱

حضرت موسیٰ مدین سے چل کر مصر جا رہے تھے۔ اس سفر میں وہ کوہ طور سے گزرے۔ وہاں خدا نے انھیں پیغمبری عطا فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے پچھلے ہر دور میں اپنے پیغمبر منتخب کئے اور ان کے پاس اپنا کلام بھیجا۔ یہ کلام ہمیشہ جبریل فرشتہ کے ذریعہ آیا۔ مگر حضرت موسیٰ کے ساتھ یہ خصوصی معاملہ ہوا کہ اللہ نے ان سے براہ راست کلام کیا۔ نیز یہ بھی حضرت موسیٰ کی خصوصیت ہے کہ آپ کے لئے خدا نے ایک مزید پیغمبر (حضرت ہارون) مقرر فرمایا۔ جو آپ کا مددگار رہو۔ اس خصوصیت کی وجہ شاید وہ مخصوص حالات ہوں جن میں آپ کو اپنا پیغمبرانہ فرض انجام دینا تھا۔ کیونکہ آپ کے سامنے ایک طرف فرعون جیسا جابر بادشاہ تھا اور دوسری طرف یہود جیسی قوم جو اپنے زوال کی آخری حد کو پہنچ چکی تھی۔

رحمت و نصرت کے یہ معاملات اپنی انتہائی صورت میں صرف پیغمبروں کے لئے خاص ہیں۔ تاہم اللہ اپنے مومن بندوں کے ساتھ بھی درجہ بدرجہ اسی قسم کا معاملہ فرماتا ہے۔ وہ ان کے حسب استعداد انھیں اپنے

کسی کام کو کرنے کی توفیق دیتا ہے۔ وہ ان پر خاموشی سے اپنی بات القا کرتا ہے۔ وہ ان کے لئے ایسی خصوصی تائید کا انتظام کرتا ہے جو عام حالات میں کسی کو نہیں ملتیں۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۝ وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ۝ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ۝

اور کتاب میں اسماعیل کا ذکر کرو۔ وہ وعدہ کا سچا تھا اور رسول نبی تھا۔ وہ اپنے لوگوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا۔ اور اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ تھا۔ اور کتاب میں ادریس کا ذکر کرو۔ بے شک وہ سچا تھا اور نبی تھا۔ اور ہم نے اس کو بلند رتبہ تک پہنچایا۔ ۵۷-۵۴

حضرت اسماعیل حضرت ابراہیم کے فرزند تھے۔ حضرت ادریس ایک پیغمبر ہیں جو غالباً حضرت نوح سے پہلے پیدا ہوئے۔ ان پیغمبروں کی دو خاص صفتیں یہاں بیان کی گئی ہیں —— سچا ہونا، لوگوں کو نماز (خدا کی عبادت) اور زکوٰۃ (بندوں کے حقوق کی ادائگی) کی تلقین کرنا۔ ارشاد ہوا ہے کہ ان صفتوں نے ان کو خدا کا پسندیدہ بنا دیا اور وہ انتہائی اعلیٰ درجہ پر پہنچا دئے گئے۔

جن شخصیتوں کو خدا نے اپنی پیغمبری کے لئے چنا۔ ان کے اندر یہ صفتیں کمال درجہ میں موجود ہوتی تھیں۔ تاہم عام اہل ایمان سے بھی یہی صفات مطلوب ہیں اور ان کو بھی درجہ بدرجہ اس کے وہ ثمرات حاصل ہوتے ہیں جو خدا نے ان صفتوں کے لئے ابدی طور پر مقرر کئے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْرَآءِيْلَ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا ۝ السجدة

یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے پیغمبروں میں سے اپنا فضل فرمایا۔ آدم کی اولاد میں سے اور ان لوگوں میں سے جن کو ہم نے نوح کے ساتھ سوار کیا تھا۔ اور ابراہیم اور اسرائیل کی نسل سے اور ان لوگوں میں سے

جن کو ہم نے ہدایت بخشی اور ان کو مقبول بنایا۔ جب ان کو خدائے رحمان کی آیتیں سنائی جاتیں تو وہ سجدہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے گر پڑتے۔ ۵۸

یہاں ان پیغمبروں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو آدم کی نسل، نوح کی نسل اور ابراہیم کی نسل میں خصوصیت سے پیدا ہوئے جن کو خدا نے اس کا اہل پایا کہ ان کو اپنی خاص ہدایت سے نوازے اور ان کو لوگوں کے سامنے اپنی نمائندگی کے لئے چن لے۔

ان حضرات پر خدا نے اتنے بڑے بڑے انعامات کیوں کئے۔ فرمایا کہ اس کی وجہ ان کا یہ مشترک وصف تھا کہ وہ خدا کی خدائی کے احساس میں اتنا بڑھے ہوئے تھے کہ اس کا کلام سن کر ان کا سینہ ہل جاتا تھا اور وہ روتے ہوئے اس کے آگے زمین پر گر پڑتے تھے۔

"روتے ہوئے سجدہ میں گرنا" خدا کے عظمت وجلال کے اعتراف کا آخری درجہ ہے۔ جس کو یہ درجہ ملے اس نے گویا اس ایمان کا ذائقہ چکھا جو نبیوں اور رسولوں کے لئے خاص ہے۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۝ إِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْئًا ۝

پھر ان کے بعد ایسے ناخلف جانشین ہوئے جنھوں نے نماز کو کھو دیا اور خواہشوں کے پیچھے پڑ گئے، پس عنقریب وہ اپنی خرابی کو دیکھیں گے۔ البتہ جس نے توبہ کی اور ایمان لے آیا اور نیک کام کیا تو یہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرا بھی حق تلفی نہیں کی جائے گی۔ ۶۰-۵۹

پیغمبر کی دعوت کے ذریعہ جو افراد بنتے ہیں ان کی نمایاں خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ خواہش پرستی سے اوپر اٹھ جاتے ہیں۔ وہ اللہ کو یاد کرنے والے بن جاتے ہیں جس کی ایک متعین صورت کا نام نماز ہے۔ دین کی اصل خدا کی یاد ہے۔ اور نماز اسی خدا کی یاد کی ایک منظم صورت۔

پیغمبروں کو ماننے والوں کی اگلی نسلیں اگر خدا سے غافل ہو جائیں اور خواہش کے پیچھے چلنے لگیں تو خدا کے نزدیک وہ گمراہ لوگ ہیں۔ پیغمبروں سے وابستگی ان کو کوئی فائدہ دینے والی نہیں۔ ایسے لوگ

یقیناً اپنے انجام کو پہنچیں گے۔ ان میں سے صرف وہی لوگ بچیں گے جو دوبارہ اصل دین کی طرف لوٹیں اور حقیق معنوں میں ایمان اور عمل صالح کی زندگی اختیار کریں۔

آخرت کے لئے کوشش کرنے والے کو فوراً اپنی محنتوں اور قربانیوں کا انجام نہیں ملتا۔ اس لئے کوئی شخص شبہہ کر سکتا ہے کہ یہ راستہ ایسا ہے جس میں عمل ہے مگر عمل کا انجام نہیں۔ مگر یہ محض غلط فہمی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح دنیا کے لئے عمل کرنے والے اپنے عمل کا بدلہ پاتے ہیں اسی طرح آخرت کے لئے عمل کرنے والے بھی اپنے عمل کا بھرپور بدلہ پائیں گے۔ اس معاملہ میں کسی شک میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔

جَنّٰتِ عَدْنِ ٱلَّتِى وَعَدَ ٱلرَّحْمٰنُ عِبَادَهُۥ بِٱلْغَيْبِ ۚ إِنَّهُۥ كَانَ وَعْدُهُۥ مَأْتِيًّا ﴿٦١﴾ لَّا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا إِلَّا سَلٰمًا ۖ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَعَشِيًّا ﴿٦٢﴾ تِلْكَ ٱلْجَنَّةُ ٱلَّتِى نُورِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَن كَانَ تَقِيًّا ﴿٦٣﴾

ان کے لئے ہمیشہ رہنے والے باغ ہیں جن کا رحمان نے اپنے بندوں سے غائبانہ وعدہ کر رکھا ہے۔ اور یہ وعدہ پورا ہو کر رہنا ہے۔ اس میں وہ لوگ کوئی فضول بات نہیں سنیں گے بجز سلام کے۔ اور اس میں ان کا رزق صبح و شام ملے گا۔ یہ وہ جنت ہے جس کا وارث ہم اپنے بندوں میں سے ان کو بنائیں گے جو خدا سے ڈرنے والے ہوں۔ ۶۳ - ۶۱

موجودہ دنیا میں امتحان کی وجہ سے ہر ایک کو آزادی ملی ہوئی ہے۔ یہاں اچھائی کرنے والے بھی آزاد ہیں اور برائی کرنے والے بھی آزاد۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں ایک سچے انسان کو کبھی سکون حاصل نہیں ہوتا۔ وہ ذاتی طور پر خواہ کتنا ہی ٹھیک ہو مگر دوسرے لوگوں کی بے ٹھیک باتیں اس کو سکون لینے نہیں دیتیں۔ لوگ اپنی آزادی سے غلط فائدہ اٹھا کر ماحول کو گندی باتوں اور بری آوازوں سے بھر دیتے ہیں۔

جنت وہ بستی ہے جس سے اس قسم کے تمام انسان خارج کر دئے جائیں گے۔ وہاں صرف وہ اعلیٰ ذوق کے لوگ آباد کئے جائیں گے جنھوں نے دنیا میں یہ ثبوت دیا تھا کہ وہ کانٹوں کی مانند نہیں جیتے بلکہ پھول کی مانند رہنا جانتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے ماحول میں جو زندگی بنے گی وہ بلاشبہہ ابدی سلامتی کی جنت ہوگی۔

دنیا میں لغو چیزوں سے بچنا اور سلامتی کا پیکر بن کر زندگی گزارنا ایک سخت ترین عمل ہے۔ اس کے لئے اپنی آزاد زندگی کو خود اپنے ارادہ سے پابند زندگی بنالینا پڑتا ہے۔ یہ مشکل ترین قربانی ہے جس کا ثبوت صرف وہ شخص دے سکتا ہے جو فی الواقع اللہ سے ڈرتا ہو۔ اللہ سے ڈرنے والے ہی دنیا میں جنتی انسان بن کر رہ سکتے ہیں۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جو آخرت کی ابدی جنتوں میں داخل کئے جائیں گے۔

وَمَا نَتَنَزَّلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ ۖ لَهُ مَا بَيْنَ أَيْدِينَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذَٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴿٦٤﴾ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهِ ۚ هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا ﴿٦٥﴾

اور ہم نہیں اترتے مگر تمہارے رب کے حکم سے۔ اسی کا ہے جو ہمارے آگے ہے اور جو ہمارے پیچھے ہے اور جو اس کے بیچ میں ہے۔ اور تمہارا رب بھولنے والا نہیں۔ وہ رب ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور جو ان کے بیچ میں ہے، پس تم اسی کی عبادت کرو اور اس کی عبادت پر قائم رہو۔ کیا تم اس کا کوئی ہم صفت جانتے ہو۔ ۶۵-۶۴

اسلامی دعوت جب مخالفت کے دور میں ہو تو یہ داعی کے لئے بڑا سخت مرحلہ ہوتا ہے۔ داعی ہر روز چاہتا ہے کہ موجودہ کیفیت کو ختم کرنے کے لئے کوئی نیا اقدام کیا جائے۔ جب کہ خدا کا حکم یہ ہوتا ہے کہ صبر اور انتظار کا طریقہ اختیار کرو۔

ایسی ہی کیفیت ایک بار رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیش آئی۔ حالات کی شدت کے پیش نظر آپ خدا کی طرف سے مزید ہدایت کے منتظر تھے۔ مگر ایک روایت کے مطابق تقریباً چالیس دن تک جبریل نہیں آئے۔ پھر جب وہ آئے تو آپ نے کہا کہ اے جبریل، اتنی دیر کیوں کردی۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم خدا کی مرضی کے پابند ہیں۔ جب خدا کی طرف سے کوئی ہدایت ملتی ہے تو آتے ہیں اور جب ہدایت نہیں ملتی تو نہیں آتے۔

یہ واقعہ بیان کرکے یہاں صبر کی تلقین کی گئی ہے۔ جو صورت حال جاری ہے اس کو خدا پوری طرح دیکھ رہا ہے۔ اس کے باوجود اگر اس کی طرف سے نئی ہدایت نہیں آرہی ہے تو اس کا

مطلب یہ ہے کہ اس وقت یہی مطلوب ہے کہ اس صورت حال کو برداشت کیا جائے۔ اگر حکمت کا تقاضا کچھ اور ہوتا تو یقیناً کوئی اور حکم آتا۔ خدا سے زیادہ کوئی جاننے والا نہیں اس لئے خدا سے بہتر کسی کی رہنمائی بھی نہیں ہو سکتی۔

"رکنے" والے حالات میں "اقدام" کی آیت تلاش کرنا صحیح نہیں۔ ایسا کرنا گویا اس حکم کو قبل از وقت اتارنے کی کوشش کرنا ہے جو ابھی آدمی کے لئے نہیں اترا۔

وَيَقُولُ الْإِنسَانُ أَإِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ أُخْرَجُ حَيًّا ۝ أَوَلَا يَذْكُرُ الْإِنسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا ۝ فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيَاطِينَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ۝

اور انسان کہتا ہے کیا جب میں مر جاؤں گا تو پھر زندہ کر کے نکالا جاؤں گا۔ کیا انسان کو یاد نہیں آتا کہ ہم نے اس کو اس سے پہلے پیدا کیا اور وہ کچھ بھی نہ تھا۔ پس تیرے رب کی قسم، ہم ان کو جمع کریں گے اور شیطانوں کو بھی، پھر ان کو جہنم کے گرد اس طرح حاضر کریں گے کہ وہ گھٹنوں کے بل گرے ہوں گے۔ ۶۸ - ۶۶

عرب کے لوگ جو قرآن کے پہلے مخاطب تھے وہ زندگی بعد موت کو مانتے تھے۔ مگر یہ ماننا صرف رسمی ماننا تھا، وہ حقیقی ماننا نہ تھا۔ قرآن میں آخرت سے متعلق جتنے الفاظ ہیں وہ سب پہلے سے ان کی زبان میں موجود تھے۔ مگر ان کی زندگی پر اس ماننے کا کوئی اثر نہ تھا۔ ان کی عملی زندگی ایسی تھی گویا کہ وہ زبان حال سے کہہ رہے ہوں کہ ـــــ زندگی تو بس یہی دنیا کی زندگی ہے۔ مرنے کے بعد کون ہم کو اٹھائے گا اور کون ہمارا حساب لے گا۔

مگر یہ غفلت یا انکار صرف اس لئے ہے کہ آدمی سنجیدگی کے ساتھ غور نہیں کرتا۔ اگر وہ غور کرے تو اس کی پہلی پیدائش ہی اس کے لئے اس کی دوسری پیدائش کی دلیل بن جائے۔

یہاں "شیاطین" سے مراد برے لیڈر ہیں۔ یہ لیڈر پر فریب الفاظ بول کر عوام کو بہکاتے ہیں۔ اس اعتبار سے وہ وہی کام کرتے ہیں جو شیطان کرتا ہے۔ موجودہ دنیا میں یہ لیڈر عظمت کے مقام پر کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس لئے لوگ ان کو نظر انداز نہیں کر پاتے۔ مگر آخرت میں ان کی عظمت ختم ہو جائے گی۔ وہاں یہ بڑے لوگ بھی اسی طرح ذلت کے گڑھے میں ڈال دئے جائیں گے جس

طرح ان کے چھوٹے لوگ۔

ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيعَةٍ أَيُّهُمْ أَشَدُّ عَلَى الرَّحْمَٰنِ عِتِيًّا ﴿٦٩﴾ ثُمَّ لَنَحْنُ أَعْلَمُ بِالَّذِينَ هُمْ أَوْلَىٰ بِهَا صِلِيًّا ﴿٧٠﴾ وَإِنْ مِنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ حَتْمًا مَقْضِيًّا ﴿٧١﴾ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوْا وَنَذَرُ الظَّالِمِينَ فِيهَا جِثِيًّا ﴿٧٢﴾

پھر، ہم ہر گروہ میں سے ان لوگوں کو جدا کریں گے جو رحمان کے مقابلہ میں سب سے زیادہ سرکش بنے ہوئے تھے۔ پھر ہم ایسے لوگوں کو خوب جانتے ہیں جو جہنم میں داخل ہونے کے زیادہ مستحق ہیں اور تم میں سے کوئی نہیں جس کا اس پر سے گزر نہ ہو، یہ تیرے رب کے اوپر لازم ہے جو پورا ہو کر رہے گا۔ پھر ہم ان لوگوں کو بچالیں گے جو ڈرتے تھے اور ظالموں کو اس میں گرا ہوا چھوڑ دیں گے۔ ۶۹ - ۷۲

حق کو نہ ماننا جرم ہے مگر حق کو نہ ماننے کی تحریک چلانا اس سے بھی زیادہ بڑا جرم ہے۔ جو لوگ حق کے خلاف تحریک کے قائد بنیں وہ خدا کی نظر میں بدترین سزا کے مستحق ہیں۔ ان کو آخرت میں عام لوگوں کے مقابلہ میں دگنی سزا دی جائے گی۔

قرآن کے الفاظ سے اور بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمام لوگوں کو جہنم سے گزارے گا۔ یہ گزر نا جہنم کے اندر سے نہیں ہوگا بلکہ اس کے اوپر سے ہوگا۔ یہ ایسا ہی ہوگا جیسے گہرے دریا کے اوپر آدمی کھلے پل کے ذریعہ گزر جاتا ہے۔ وہ دریا کی خطرناک موجوں کو دیکھتا ہے مگر وہ اس میں غرق نہیں ہوتا۔ اسی طرح قیامت میں تمام لوگ جہنم کے اوپر سے گزریں گے۔ جو نیک لوگ ہیں وہ آگے جا کر جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ اور جو برے لوگ ہیں وہ آگے نہ بڑھ سکیں گے۔ جہنم انھیں پہچان کر ان کو اپنی طرف کھینچ لے گی۔

اس تجربہ کا مقصد یہ ہوگا کہ جنت میں داخل کئے جانے والے لوگ خدا کی اس عظیم نعمت کا واقعی احساس کر سکیں کہ اس نے کیسی بری جگہ سے بچا کر انھیں کیسی بہتر جگہ پہنچا دیا ہے۔

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا أَيُّ الْفَرِيقَيْنِ خَيْرٌ مَقَامًا وَأَحْسَنُ نَدِيًّا ﴿٧٣﴾ وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْنٍ هُمْ أَحْسَنُ أَثَاثًا

وَّرِءۡيًا۝

اور جب ان کو ہماری کھلی کھلی آیتیں سنائی جاتی ہیں تو انکار کرنے والے ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں کہ دونوں گروہوں میں سے کون بہتر حالت میں ہے اور کس کی مجلس زیادہ اچھی ہے۔ اور ان سے پہلے ہم نے کتنی ہی قومیں ہلاک کردیں جو ان سے زیادہ اسباب والی اور ان سے زیادہ شان والی تھیں۔ ۷۳-۷۴

جو لوگ حق ناحق کی بحث میں نہ پڑیں۔ جو آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی مصلحتوں کو اہمیت دیں۔ جو خدا کو خوش کرنے سے زیادہ عوام کو خوش کرنے کا اہتمام کرتے ہوں۔ ایسے لوگ ہمیشہ زیادہ کامیاب رہتے ہیں۔ ان کے گرد زیادہ رونق اور نشان جمع ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف جو لوگ ہر معاملہ میں یہ دیکھیں کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا۔ جو دنیا کی مصلحتوں کو نظر انداز کریں اور آخرت کی مصلحتوں کو ترجیح دیں۔ جو عوامی رجحان سے زیادہ خدا کا لحاظ کریں۔ ایسے لوگ اکثر ظاہری شان و شوکت والی چیزوں سے محروم رہتے ہیں۔

یہ فرق بہت سے لوگوں کے لئے غلط فہمی کا سبب بن جاتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جو لوگ دنیوی اعتبار سے بہتر ہیں وہ خدا کے پسندیدہ ہیں اور جو لوگ دنیوی اعتبار سے بہتر نہیں وہ خدا کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں۔ مگر یہ معیار سراسر غلط ہے۔ اور ماضی کی تاریخ اس کی تردید کرنے کے لئے کافی ہے۔ کتنے پرفخر سر زمین کے نیچے دفن ہو گئے۔ کتنے محل ہیں جو آج کھنڈر کے سوا کسی اور صورت میں دیکھنے والوں کو نظر نہیں آتے۔

قُلۡ مَنۡ كَانَ فِي ٱلضَّلَٰلَةِ فَلۡيَمۡدُدۡ لَهُ ٱلرَّحۡمَٰنُ مَدًّاۚ حَتَّىٰٓ إِذَا رَأَوۡاْ مَا يُوعَدُونَ إِمَّا ٱلۡعَذَابَ وَإِمَّا ٱلسَّاعَةَ فَسَيَعۡلَمُونَ مَنۡ هُوَ شَرّٞ مَّكَانٗا وَأَضۡعَفُ جُندٗا۝

کہو کہ جو شخص گمراہی میں ہوتا ہے تو رحمان اس کو ڈھیل دیا کرتا ہے یہاں تک کہ جب وہ دیکھ لیں گے اس چیز کو جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے، عذاب یا قیامت، تو ان کو معلوم ہو جائے گا کہ کس کا حال برا ہے اور کس کا جتھا کمزور۔ ۷۵

سرکش آدمی کو سرکشی کا موقع ملنا مہلت امتحان کی وجہ سے ہوتا ہے نہ کہ کسی حق کی بنا پر۔ مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اس فرق کو سمجھ نہیں پاتا۔ وہ وقتی مہلت کو اپنی مستقل حالت سمجھ لیتا ہے۔ اس کی آنکھ اس وقت تک نہیں کھلتی جب تک مدت کے خاتمہ کا اعلان نہ ہو جائے اور اس سے سرکشی کا حق چھین نہ لیا جائے۔

خدا اپنی مصلحت کے تحت کسی کو دنیا ہی میں یہ تجربہ کرا دیتا ہے۔ کوئی اسی حال پر باقی رہتا ہے۔ یہاں تک کہ موت اس کو وہ چیز دکھا دیتی ہے جس کو وہ زندگی میں دیکھنے پر تیار نہ ہوا تھا۔

وَيَزِيدُ اللَّهُ الَّذِينَ اهْتَدَوْا هُدًى ۗ وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَخَيْرٌ مَرَدًّا ﴿٧٦﴾

اور اللہ ہدایت پکڑنے والوں کی ہدایت میں اضافہ کرتا ہے اور باقی رہنے والی نیکیاں تمہارے رب کے نزدیک اجر کے اعتبار سے بہتر ہیں اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر۔ ۷۶

ہدایت یاب ہونا یہ ہے کہ آدمی کا شعور صحیح رخ پر جاگ اٹھے۔ ایسے آدمی کے سامنے کوئی صورت حال آتی ہے تو وہ اس کی صحیح توجیہ کر کے اس کو اپنی غذا بنا لیتا ہے۔ اس طرح اس کی ہدایت میں یقین اور کیفیت کے اعتبار سے برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس کی ہدایت جامد چٹان کی طرح نہیں ہوتی بلکہ زندہ درخت کی مانند ہوتی ہے جو برابر بڑھتا چلا جائے۔

جس طرح دنیا کے پیش نظر عمل کرنے والا برابر ترقی کرتا رہتا ہے، اسی طرح آخرت کو سامنے رکھ کر عمل کرنے والے کا عمل بھی مسلسل اضافہ پذیر ہے۔ یہ اضافہ پذیری چونکہ آخرت میں ذخیرہ ہو رہی ہے۔ اس لئے وہ دنیا میں نظر نہیں آتی۔ مگر قیامت جب پردہ پھاڑ دے گی تو ہر آدمی دیکھ لے گا کہ ہدایت پانے والے کی ہدایت کس طرح بڑھ رہی تھی اور اسی کے ساتھ اس کا عمل بھی۔

أَفَرَأَيْتَ الَّذِي كَفَرَ بِآيَاتِنَا وَقَالَ لَأُوتَيَنَّ مَالًا وَوَلَدًا ﴿٧٧﴾ أَطَّلَعَ الْغَيْبَ أَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمَٰنِ عَهْدًا ﴿٧٨﴾ كَلَّا ۚ سَنَكْتُبُ مَا يَقُولُ وَنَمُدُّ لَهُ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ﴿٧٩﴾

وَنَرِثُهُ مَا يَقُولُ وَيَأْتِينَا فَرْدًا ﴿٨٠﴾

کیا تم نے اس کو دیکھا جس نے ہماری آیتوں کا انکار کیا اور کہا کہ مجھ کو مال اور اولاد مل کر رہیں گے۔ کیا اس نے غیب میں جھانک کر دیکھا ہے یا اس نے اللہ سے کوئی عہد لے لیا ہے، ہرگز نہیں، جو کچھ وہ کہتا ہے اس کو ہم لکھ لیں گے اور اس کی سزا میں اضافہ کریں گے۔ اور جن چیزوں کا وہ مدعی ہے اس کے وارث ہم بنیں گے اور وہ ہمارے پاس اکیلا آئے گا۔ ۸۰ ۔ ۷۷

جب آدمی کے پاس دولت اور طاقت کا کوئی حصہ آتا ہے تو اس کے اندر غلط قسم کی خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ ایسی روش اختیار کرتا ہے جو اس کی واقعی حیثیت سے مطابقت نہیں رکھتی۔ وہ ایسی باتیں بولنے لگتا ہے جو اس کو نہیں بولنا چاہئے۔

ایسا ہی ایک واقعہ مکہ میں ہوا۔ عاص بن وائل مکہ کا ایک مشرک سردار تھا۔ حضرت خباب بن الارت کی کچھ رقم اس کے ذمہ باقی تھی۔ انھوں نے رقم کا مطالبہ کیا تو عاص بن وائل نے کہا کہ میں تمہاری رقم اس وقت دوں گا جب کہ تم محمد کا انکار کرو۔ ان کی زبان سے نکلا کہ میں ہرگز محمد کا انکار نہیں کروں گا یہاں تک کہ تم مرو اور پھر پیدا ہو۔ عاص بن وائل نے یہ سن کر کہا کہ جب میں دوبارہ پیدا ہوں گا تو وہاں بھی میں مال اور اولاد کا مالک رہوں گا، اس وقت تم مجھ سے اپنی رقم لے لینا۔

یہ سب جھوٹی خود اعتمادی کی باتیں ہیں اور جھوٹی خود اعتمادی کسی کے کچھ کام آنے والی نہیں۔

وَاتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ آلِهَةً لِيَكُونُوا لَهُمْ عِزًّا ﴿٨١﴾ كَلَّا ۚ سَيَكْفُرُونَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُونُونَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴿٨٢﴾

اور انھوں نے اللہ کے سوا معبود بنائے ہیں تاکہ وہ ان کے لئے مدد بنیں۔ ہرگز نہیں، وہ ان کی عبادت کا انکار کریں گے اور ان کے مخالف بن جائیں گے۔ ۸۲ ۔ ۸۱

انسان یہ چاہتا ہے کہ وہ دنیا میں جو چاہے کرے، مگر اس کو اس کی بدعملی کا انجام نہ بھگتنا پڑے۔ اس قسم کی حفاظت کسی کو اللہ سے نہیں مل سکتی تھی۔ اس لئے اس نے ایسی ہستیاں تجویز کر لیں جو اللہ کی محبوب ہوں اور اس کی طرف سے اللہ کے یہاں سفارشی بن سکیں۔

مگر یہ سب بے بنیاد قیاسات ہیں جو کسی کے کچھ کام آنے والے نہیں۔ حتی کہ وہ ہستیاں جن کو آدمی نے شریک فرض کر کے ان کے لئے عبادتی مراسم ادا کئے تھے وہ بھی قیامت کے دن اس سے برأت کریں گی۔ انسان کو ان سے نفرت کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہو سکے گا۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّاۤ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ﴿۸۳﴾ فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ﴿۸۴﴾ يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا ﴿۸۵﴾ وَّنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا ﴿۸۶﴾ لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۸۷﴾

وقف لازم

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ ہم نے منکروں پر شیطانوں کو چھوڑ دیا ہے، وہ ان کو خوب ابھار رہے ہیں۔ پس تم ان کے لئے جلدی نہ کرو۔ ہم ان کی گنتی پوری کر رہے ہیں۔ جس دن ہم ڈرنے والوں کو رحمان کی طرف مہمان بنا کر جمع کریں گے۔ اور مجرموں کو جہنم کی طرف پیاسا ہانکیں گے۔ کسی کو شفاعت کا اختیار نہ ہوگا مگر اس کو جس نے رحمان کے پاس سے اجازت لی ہو۔ ۸۷ - ۸۳

آدمی کے سامنے حق اپنی واضح صورت میں آئے مگر وہ اس کو نظر انداز کر دے تو ایسا عمل شیطان کو اپنے اندر راہ دینے کا سبب بن جاتا ہے۔ اس کے بعد آدمی کا ذہن بالکل مخالف سمت میں چل پڑتا ہے۔ اب ہر دلیل اس کے ذہن میں جا کر الٹ جاتی ہے۔ خدا کی نشانیاں اس کے سامنے آتی ہیں۔ مگر وہ ان کی خود ساختہ توجیہہ کر کے ان کو اپنی سرکشی کی غذا بنا لیتا ہے۔

جو شخص جھوٹے سہاروں کو اپنا سہارا سمجھ لے وہ ہمیشہ اسی قسم کی نادانی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مگر جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں وہ صرف اللہ کو اپنا سہارا سمجھتے ہیں۔ اللہ کا ڈر ان کی نظر میں ان تمام ہستیوں کو حذف کر دیتا ہے جن کو جھوٹا سہارا بنا کر لوگ گمراہ ہوتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو آخرت میں اللہ کے باعزت مہمان بنائے جائیں گے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ؕ﴿۸۸﴾ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْـًٔا اِدًّا ﴿۸۹﴾ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿۹۰﴾ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿۹۱﴾ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ؕ﴿۹۲﴾

اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ رحمان نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔ یہ تم نے بڑی سنگین بات کہی ہے۔ قریب ہے کہ اس سے آسمان پھٹ پڑیں اور زمین ٹکڑے ہو جائے اور پہاڑ ٹوٹ کر گر پڑیں، اس پر کہ لوگ رحمان کی طرف اولاد کی نسبت کرتے ہیں۔ حالاں کہ رحمان کی یہ شان نہیں کہ وہ اولاد اختیار کرے۔ ۸۸ – ۹۲

خدا کے لئے اولاد ماننا دو وجہوں سے ہو سکتا ہے۔ یا تو یہ کہ خدا کو اپنے لئے مددگار کی ضرورت ہے یا وہ عام انسانوں کی طرح اولاد کی تمنا رکھتا ہے۔ اس لئے اس نے اپنی اولاد بنائی ہے۔ یہ دونوں باتیں بے بنیاد ہیں۔

زمین و آسمان کی بناوٹ اتنی کامل ہے کہ یہ بالکل ناقابلِ تصور ہے کہ اس کو بنانے اور چلانے والا خدا ایسا ہو جو انسانوں کی طرح کی کمیاں اپنے اندر رکھتا ہو۔ مخلوقات اپنے خالق کا جو تعارف کرا رہی ہیں اس میں خدا کی اولاد کا تصور کسی طرح چسپاں نہیں ہوتا۔

إِن كُلُّ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا آتِي الرَّحْمَٰنِ عَبْدًا ﴿٩٣﴾ لَّقَدْ أَحْصَاهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ﴿٩٤﴾ وَكُلُّهُمْ آتِيهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَرْدًا ﴿٩٥﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَٰنُ وُدًّا ﴿٩٦﴾

آسمانوں اور زمین میں کوئی نہیں جو رحمان کا بندہ ہو کر نہ آئے۔ اس کے پاس ان کا شمار ہے اور اس نے ان کو اچھی طرح گن رکھا ہے اور ان میں سے ہر ایک قیامت کے دن اس کے سامنے اکیلا آئے گا۔ البتہ جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کئے ان کے لئے خدا محبت پیدا کر دے گا۔ ۹۳ – ۹۶

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو لوگ بے آمیز حق لے کر اٹھتے ہیں وہ عوام کے نزدیک مبغوض ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ملاوٹی سچائی پر قائم ہونے والے لوگ بے ملاوٹ والی سچائی کے علم بردار کو وحشت کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔

مگر یہ صرف موجودہ دنیا کا معاملہ ہے۔ آخرت کا معاملہ اس کے بالکل مختلف ہوگا۔ وہاں کا سارا ماحول انھیں لوگوں کے ساتھ ہوگا جو بے آمیز حق پر اپنے آپ کو کھڑا کریں۔ آخرت کی دنیا میں عزت

اور مقبولیت تمام تر ان اشخاص کے حصہ میں آئے گی جنہوں نے موجودہ دنیا کی عزت و مقبولیت سے بے پروا ہو کر اپنے آپ کو بے آمیز سچائی کے ساتھ وابستہ کیا تھا۔

ملاوٹی سچائی کی دنیا میں ملاوٹی سچائی پر کھڑا ہونے والا عزت پاتا ہے۔ اسی طرح بے آمیز سچائی کی دنیا میں اس کو عزت ملے گی جو بے آمیز سچائی کی زمین پر کھڑا ہوا تھا۔

فَإِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴿۹۷﴾ وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ ۭ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ أَحَدٍ أَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴿۹۸﴾

پس ہم نے اس قرآن کو تمہاری زبان میں اس لئے آسان کر دیا ہے کہ تم متقیوں کو خوش خبری سنا دو۔ اور ہٹ دھرم لوگوں کو ڈرا دو۔ اور ان سے پہلے ہم کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں کیا تم ان میں سے کسی کو دیکھتے ہو یا ان کی کوئی آہٹ سنتے ہو۔ ۹۸ - ۹۷

خدا کی کتاب انسان کی قابل فہم زبان میں ہے۔ اسی کے ساتھ اس کے مضامین میں ان تمام پہلوؤں کی پوری رعایت موجود ہے جو کسی کتاب کو اس قابل بناتے ہیں کہ وہ اس سے رہنمائی لے سکے۔ مگر ان سب کے باوجود قرآن انھیں لوگوں کے لئے رہنمائی کا ذریعہ بنتا ہے جو سنجیدہ ہوں اور جن کو یہ کھٹک ہو کہ وہ حق اور ناحق کو جانیں۔ وہ ناحق سے بچیں اور حق کے مطابق اپنی زندگی کی تعمیر کریں۔ جو لوگ سنجیدگی اور طلب سے خالی ہوں وہ قرآن کی تعلیمات کو سن کر صرف بے معنی بحثیں کریں گے، وہ اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔

جو لوگ دعوت حق کے مخالف بن کر کھڑے ہوتے ہیں وہ ہمیشہ اس غلط فہمی میں رہتے ہیں کہ ایسا کرنے سے ان کا کچھ بگڑنے والا نہیں۔ ان کے گرد و پیش مخالفین حق کی تباہی کے واقعات موجود ہوتے ہیں مگر وہ ان سے عبرت نہیں لیتے۔ وہ آخر وقت تک یہی سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہوا وہ صرف دوسروں کے لئے تھا۔ ان کے اپنے ساتھ کچھ ہونے والا نہیں۔

مگر اللہ کے قانون میں کوئی استثنا نہیں۔ یہاں ہر آدمی کے ساتھ وہی ہونے والا ہے جو دوسرے کے ساتھ ہوا، اچھوں کے لئے اچھا اور بروں کے لئے برا۔

سُوْرَةُ طٰهٰ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ مِائَةٌ وَّخَمْسٌ وَّثَلٰثُوْنَ اٰيَةً بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ وَثَمَانُ رُكُوْعَاتٍ

طٰهٰ ﴿١﴾ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ﴿٢﴾ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ﴿٣﴾ تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ﴿٤﴾ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ﴿٥﴾ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى ﴿٦﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

طٰہٰ ۔ ہم نے قرآن تم پر اس لئے نہیں اتارا کہ تم مصیبت میں پڑ جاؤ ۔ بلکہ ایسے شخص کی نصیحت کے لئے جو ڈرتا ہو ۔ یہ اس کی طرف سے اتارا گیا ہے جس نے زمین کو اور اونچے آسمانوں کو پیدا کیا ہے ۔ وہ رحمت والا ہے ، عرش پر قائم ہے ۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور جو ان دونوں کے درمیان ہے اور جو کچھ زمین کے نیچے ہے ۔ ۱ - ۶

قرآن اگرچہ صرف ایک یاددہانی ہے ۔ مگر وہ مدعو کے لئے قابل حجت یاددہانی اس وقت بنتا ہے جب کہ اس کی دعوت دینے والا اپنے آپ کو اس کی راہ میں کھپا دے ۔ دوسروں کی خیر خواہی میں وہ اپنے آپ کو اس حد تک نظر انداز کر دے کہ یہ کہا جائے کہ اس نے تو لوگوں کو حق کی راہ پر لانے کی خاطر اپنے آپ کو مشقت میں ڈال لیا ۔

تاہم دعوت کو خواہ کتنا ہی کامل اور معیاری انداز میں پیش کر دیا جائے ، عملاً اس سے ہدایت صرف اس بندۂ خدا کو ملتی ہے جو حق شناس ہو ۔ جس کے اندر یہ صلاحیت ہو کہ دلیل کی سطح پر بات کا واضح ہونا ہی اس کی آنکھ کھولنے کے لئے کافی ہو جائے ۔

جس ہستی نے عالم کی تخلیق کی ہے اسی نے قرآن کو بھی نازل کیا ہے ۔ اس لئے قرآن اور فطرت میں کوئی تضاد نہیں ۔ قرآن ایک ایسی حقیقت کی یاددہانی ہے جس کو پہچاننے کی صلاحیت فطرت انسانی کے اندر پہلے سے موجود ہے ۔

وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى ﴿٧﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ﴿٨﴾

اورتم چاہے اپنی بات پکار کر کہو، وہ چپکے سے کہی ہوئی بات کو جانتا ہے۔ اور اس سے زیادہ خفی بات کو بھی۔ وہ اللہ ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ تمام اچھے نام اسی کے ہیں۔ ۸-۷

دنیا میں ایک طرف وہ لوگ ہیں جن کا مذہب دنیا سے سازگاری ہوتا ہے۔ دوسری طرف بے آمیز حق کا داعی ہے جس کا مذہب خدا سے سازگاری پر قائم ہوتا ہے۔ پہلا گروہ اپنے ماحول میں ہر طرف اپنے ساتھی اور مددگار پالیتا ہے۔ اس کو کبھی تنہا ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس حق کا داعی جس معبود کے اوپر کھڑا ہوا ہے وہ آنکھوں سے اوجھل ہوتا ہے۔ حالات کے طوفان میں بار بار اس کا دل تڑپ اٹھتا ہے۔ وہ کبھی اپنے دل میں خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور کبھی اس کی زبان سے بآواز بلند دعا کے کلمات نکل جاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بھری ہوئی دنیا میں وہ اکیلا ہے۔ کوئی اس کا ساتھی اور مددگار نہیں۔

مگر یہ صرف ظاہری حالت ہے۔ حقیقت کے اعتبار سے حق کا داعی سب سے زیادہ مضبوط سہارے پر کھڑا ہوتا ہے۔ وہ ایسے خدا کو پکار رہا ہے جو تنہائی کے الفاظ اور دل کی سرگوشیوں تک سے باخبر ہے۔ وہ اس خدا کو اپنا سہارا بنائے ہوئے ہے جو ان تمام قابل قیاس اور ناقابل قیاس قوتوں کا مالک ہے جو کسی کی مدد کے لئے درکار ہیں۔

وَهَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ مُوسَىٰ ۝٩ إِذْ رَأَىٰ نَارًا فَقَالَ لِأَهْلِهِ امْكُثُوا إِنِّي آنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّي آتِيكُم مِّنْهَا بِقَبَسٍ أَوْ أَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ۝١٠

اور کیا تم کو موسیٰ کی بات پہنچی ہے۔ جب کہ اس نے ایک آگ دیکھی تو اپنے گھر والوں سے کہا کہ ٹھہرو، میں نے ایک آگ دیکھی ہے، شاید میں اس میں سے تمہارے لئے ایک انگارہ لاؤں یا اس آگ پر مجھے راستہ کا پتہ مل جائے۔ ۱۰-۹

حضرت موسیٰ مصر میں پیدا ہوئے۔ وہاں ایک موقع پر ایک قبطی ان کے ہاتھ سے ہلاک ہوگیا۔ اس کے بعد وہ مصر سے نکل کر مدین چلے گئے۔ وہاں وہ کئی سال تک رہے۔ وہیں ایک خاتون سے نکاح کیا اور پھر اپنی اہلیہ کو لے کر واپس مصر کے لئے روانہ ہوئے۔ اس وقت

آپ کے ساتھ بکریاں بھی تھیں۔

حضرت موسیٰ اس سفر میں جزیرہ نمائے سینا کے جنوب میں وادی طور کے علاقے سے گزر رہے تھے۔ رات ہوئی تو تاریکی میں راستہ کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ مزید یہ کہ یہ سخت سردی کا موسم تھا۔ اسی دوران انھیں دکھائی دیا کہ دور ایک آگ جل رہی ہے۔ یہ دیکھ کر حضرت موسیٰ اس کے رخ پر روانہ ہوئے تاکہ سردی کا مقابلہ کرنے کے لئے آگ حاصل کریں اور وہاں کچھ لوگ ہوں تو ان سے راستہ معلوم کریں۔

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِیَ یٰمُوْسٰی ﴿۱۱﴾ اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴿۱۲﴾ وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا یُوْحٰى ﴿۱۳﴾ اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ ﴿۱۴﴾ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِیَةٌ اَكَادُ اُخْفِیْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰى ﴿۱۵﴾ فَلَا یَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا یُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ﴿۱۶﴾

پھر جب وہ اس کے پاس پہنچا تو آواز دی گئی کہ اے موسیٰ۔ میں ہی تمہارا رب ہوں، پس تم اپنے جوتے اتار دو کیوں کہ تم طویٰ کی مقدس وادی میں ہو۔ اور میں نے تم کو چن لیا ہے۔ پس جو وحی کی جارہی ہے اس کو سنو۔ میں ہی اللہ ہوں۔ میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ پس تم میری ہی عبادت کرو اور میری یاد کے لئے نماز قائم کرو۔ بے شک قیامت آنے والی ہے۔ میں اس کو چھپائے رکھنا چاہتا ہوں۔ تاکہ ہر شخص کو اس کے کئے کا بدلہ ملے۔ پس اس سے تم کو وہ شخص غافل نہ کردے جو اس پر ایمان نہیں رکھتا اور اپنی خواہشوں پر چلتا ہے کہ تم ہلاک ہو جاؤ۔ ۱۶-۱۱

حضرت موسیٰ کو جو آگ نظر آئی وہ عام قسم کی آگ نہ تھی بلکہ خدا کی تجلی تھی۔ چنانچہ جب وہ وہاں پہنچے تو انھیں احساس دلایا گیا کہ وہ اس وقت کہاں ہیں۔ ان کو تواضع کے ساتھ پوری طرح متوجہ ہونے کے لئے جوتا اتارنے کا حکم ہوا۔ پھر آواز آئی کہ اس وقت تم خدا سے ہم کلام ہو اور خدا نے تم کو اپنی پیغمبری کے لئے چنا ہے۔

اس وقت حضرت موسیٰ کو جو تعلیم دی گئی وہ وہی تھی جو تمام پیغمبروں کو ہمیشہ تعلیم کی گئی ہے۔ یعنی ایک خدا کو معبود بنانا۔ اسی کی عبادت کرنا۔ اسی کو ہر موقع پر یاد رکھنا۔ پھر حضرت موسیٰ کو زندگی کی اس حقیقت کی خبر دی گئی کہ موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ ایک خاص مدت تک کے لئے خدا نے حقیقتوں کو غیب میں چھپا دیا ہے۔ قیامت میں یہ پردہ پھٹ جائے گا۔ اس کے بعد انسانی زندگی کا اگلا دور شروع ہوگا جس میں ہر آدمی اس عمل کے مطابق مقام پائے گا جو اس نے موجودہ دنیا میں کیا تھا۔

جب ایک آدمی پر خواہشوں کا غلبہ ہوتا ہے اور وہ آخرت سے بے پروا ہو کر دنیا کے راستوں میں چل پڑتا ہے تو وہ اپنے اس فعل کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے نظریات وضع کرتا ہے۔ وہ اپنی روش کو خوبصورت الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ اس کو سن کر دوسرے لوگ بھی آخرت سے غافل ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں مومن کو اپنے بارہ میں سخت چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ اسے اپنے آپ کو اس سے بچانا ہے کہ وہ خدا سے غافل اور آخرت فراموش لوگوں کو دیکھ کر ان سے متأثر ہو جائے۔ یا ان کی خوبصورت باتوں کے فریب میں آکر آخرت پسندانہ زندگی کو کھو بیٹھے۔

وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يٰمُوسٰى ﴿۱۷﴾ قَالَ هِيَ عَصَايَ أَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِي وَلِيَ فِيهَا مَآرِبُ أُخْرٰى ﴿۱۸﴾ قَالَ أَلْقِهَا يٰمُوسٰى ﴿۱۹﴾ فَأَلْقٰهَا فَإِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ﴿۲۰﴾ قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولٰى ﴿۲۱﴾

اور یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے اے موسیٰ، اس نے کہا، یہ میری لاٹھی ہے۔ میں اس پر ٹیک لگاتا ہوں اور اس سے اپنی بکریوں کے لئے پتے جھاڑتا ہوں۔ اس میں میرے لئے دوسرے کام بھی ہیں۔ فرمایا کہ اے موسیٰ اس کو زمین پر ڈال دو۔ اس نے اس کو ڈال دیا تو یکایک وہ ایک دوڑتا ہوا سانپ بن گیا۔ فرمایا کہ اس کو پکڑ لو اور مت ڈرو، ہم پھر اس کو اس کی پہلی حالت پر لوٹا دیں گے۔ ۱۷-۲۱

"تمہارے ہاتھ میں کیا ہے" یہ سوال حضرت موسیٰ کے شعور کو زندہ کرنے کے لئے تھا۔

اس کا مقصد یہ تھا کہ لاٹھی کا لاٹھی ہونا حضرت موسیٰ کے ذہن میں تازہ ہو جائے۔ تاکہ اگلے لمحہ جب وہ خدا کی قدرت سے سانپ بن جائے تو وہ پوری طرح اس کی قدر و قیمت کا احساس کر سکیں۔

حضرت موسیٰ کی لکڑی کا سانپ بن جانا ویسا ہی ایک انوکھا واقعہ تھا جیسا مٹی اور پانی کا لکڑی بن جانا۔ وہ سب کچھ جو ہم زمین پر دیکھ رہے ہیں وہ سب ایک چیز سے دوسری چیز میں تبدیل ہو جانے کا ہی دوسرا نام ہے ـــــ گیس کا پانی میں تبدیل ہونا، مٹی کا درخت میں تبدیل ہونا وغیرہ۔ عام حالات میں تبدیلی کا یہ عمل تدریجی طور پر ہوتا ہے۔ اس لئے انسان اس کو محسوس نہیں کر پاتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لکڑی نے دفعۃً سانپ کی صورت اختیار کر لی اس لئے وہ عجیب معلوم ہونے لگی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ ہے یا ہو رہا ہے وہ سب کا سب خدا کا معجزہ ہے۔ خواہ وہ زمین سے لکڑی کا نکلنا ہو یا لکڑی کا سانپ بن جانا۔ پیغمبروں کے ذریعہ "غیر معمولی" معجزہ صرف اس لئے دکھایا جاتا ہے تاکہ آدمی "معمولی" معجزات کو دیکھنے کے قابل ہو جائے۔

وَاضْمُمْ يَدَكَ إِلَىٰ جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ آيَةً أُخْرَىٰ ﴿٢٢﴾ لِنُرِيَكَ مِنْ آيَاتِنَا الْكُبْرَى ﴿٢٣﴾ اذْهَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ ﴿٢٤﴾ ع ۱۰

اور تم اپنا ہاتھ اپنی بغل سے ملا لو، وہ چمکتا ہوا نکلے گا بغیر کسی عیب کے۔ یہ دوسری نشانی ہے تاکہ ہم اپنی بڑی نشانیوں میں سے بعض نشانیاں تمہیں دکھائیں۔ تم فرعون کے پاس جاؤ۔ وہ حد سے نکل گیا ہے۔ ۲۴ - ۲۲

پچھلے نبیوں کے واقعات بائبل میں بھی ہیں اور قرآن میں بھی۔ مگر بہت سے مقامات پر قرآن اور بائبل میں بہت بامعنیٰ فرق ہے۔ مثلاً یہاں بائبل میں ہے ـــــ موسیٰ نے اپنا ہاتھ اپنے سینہ پر رکھ کر اسے ڈھانک لیا اور جب اس نے اسے نکال کر دیکھا تو اس کا ہاتھ کوڑھ سے برف کی مانند سفید تھا (خروج ۴ : ۷)

بائبل حضرت موسیٰ کے ہاتھ کی سفیدی کو "کوڑھ" بتا رہی ہے۔ ایسی حالت میں قرآن میں یدِ بیضاء کے معجزہ کو بیان کرتے ہوئے "مِنْ غیر سوء" کا اضافہ واضح طور پر بتا رہا

ہے کہ قرآن بائبل سے ماخوذ نہیں۔ بلکہ یہ خدائے عالم الغیب کی طرف سے ہے جو بائبل کی تحریفات کی تصحیح کر رہا ہے۔

حضرت موسیٰ کو دو خاص معجزے دئے گئے۔ سانپ کا معجزہ آپ کے لئے گویا طاقت کی علامت تھا۔ اور ید بیضا، کا معجزہ اس بات کی علامت کہ آپ ایک روشن صداقت پر قائم ہیں۔

فرعون کا حد سے گزر جانا یہ تھا کہ اس کو اقتدار ملا تو اس نے اپنے کو خدا سمجھ لیا۔ فرعون کے لفظی معنی ہیں سورج کی اولاد۔ قدیم مصری سورج کو سب سے بڑا دیوتا (رب اعلیٰ) سمجھتے تھے۔ چنانچہ فرعون نے اپنے کو سورج دیوتا کا زمینی مظہر بتایا۔ اس نے اپنے اسٹیچو اور بت بنوا کر مصر کے تمام شہروں میں رکھوا دئے جو باقاعدہ پوجے جاتے تھے۔

اقتدار خدا کی ایک نعمت ہے۔ اس نعمت کو پاکر آدمی کے اندر شکر کا جذبہ ابھرنا چاہئے۔ مگر سرکش انسان اقتدار کو پاکر خود اپنے آپ کو خدا سمجھ لیتا ہے۔

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ﴿٢٥﴾ وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ﴿٢٦﴾ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ﴿٢٧﴾ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ﴿٢٨﴾ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ﴿٢٩﴾ هٰرُوْنَ اَخِي ﴿٣٠﴾ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ﴿٣١﴾ وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ﴿٣٢﴾ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ﴿٣٣﴾ وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ﴿٣٤﴾ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ﴿٣٥﴾ قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ﴿٣٦﴾

موسیٰ نے کہا کہ اے میرے رب، میرے سینہ کو میرے لئے کھول دے۔ اور میرے کام کو میرے لئے آسان کر دے۔ اور میری زبان کی گرہ کھول دے۔ تاکہ لوگ میری بات سمجھیں۔ اور میرے خاندان سے میرے لئے ایک معاون مقرر کر دے، ہارون کو جو میرا بھائی ہے۔ اس کے ذریعہ سے میری کمر کو مضبوط کر دے۔ اور اس کو میرے کام میں شریک کر دے تاکہ ہم دونوں کثرت سے تیری پاکی بیان کریں اور کثرت سے تیرا چرچا کریں۔ بے شک تو ہم کو دیکھ رہا ہے۔ فرمایا کہ دے دیا گیا تم کو اے موسیٰ تمہارا سوال۔ ۳۶ - ۲۵

پیغمبری ملنے کے بعد ایک صورت یہ تھی کہ حضرت موسیٰ کے اندر احساس فخر پیدا ہو۔ مگر اس

وقت انھوں نے جو کچھ اللہ سے مانگا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے پیغمبری کو فخر کی چیز نہیں سمجھا بلکہ ذمہ داری کی چیز سمجھا۔ اس وقت انھوں نے جو الفاظ کہے وہ سب وہ ہیں جو دعوت کی نازک ذمہ داری کا احساس کرنے والے کی زبان سے نکلتے ہیں۔

داعی کے لئے سینہ کا کھلنا یہ ہے کہ حسب موقع اس کے اندر مؤثر مضامین کا ورود ہو۔ معاملہ کا آسان ہونا یہ ہے کہ مخالفین کبھی دعوت کی راہ بند کرنے میں کامیاب نہ ہوسکیں۔ زبان کی گرہ کھلنا یہ ہے کہ بڑے سے بڑے مجمع میں بلا جھجک دعوت پیش کرنے کا ملکہ پیدا ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو پیغمبرانہ ذمہ داری ادا کرنے کے لئے یہ سب کچھ دیا۔ اسی کے ساتھ ان کی درخواست کے مطابق ان کے بھائی کو ان کے لئے ایک طاقتور معاون بنا دیا۔

نصرت کا یہ خصوصی معاملہ جو پیغمبر کے ساتھ کیا گیا، ہی غیر پیغمبر داعی کے لئے بھی ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ دعوت کے کام سے اپنے آپ کو اس طرح کامل طور پر وابستہ کرے جس طرح پیغمبر نے اپنے آپ کو کامل طور پر وابستہ کیا تھا۔

"تسبیح اور ذکر" ہی دین کا اصل مقصود ہے۔ مگر تسبیح اور ذکر سے مراد کسی قسم کا لفظی ورد نہیں ہے۔ اس سے مراد وہ کیفیت ہے جو حق کی یافت کے بعد بالکل قدرتی طور پر پیدا ہوتی ہے۔ اس وقت انسان کا وجود اللہ کے صفات کمال کا اس طرح تجربہ کرتا ہے کہ وہ اس میں نہا اٹھتا ہے۔ وہ خدائی احساس سے اس طرح سرشار ہوتا ہے کہ وہ اس کا مبلغ بن جاتا ہے۔

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرَىٰٓ ﴿۳۷﴾ إِذْ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰٓ أُمِّكَ مَا يُوحَىٰٓ ﴿۳۸﴾ أَنِ اقْذِفِيهِ فِى التَّابُوتِ فَاقْذِفِيهِ فِى الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَأْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّى وَعَدُوٌّ لَّهُۥ ۚ وَأَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّى وَلِتُصْنَعَ عَلَىٰ عَيْنِىٓ ﴿۳۹﴾ إِذْ تَمْشِىٓ أُخْتُكَ فَتَقُولُ هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ مَن يَكْفُلُهُۥ ۖ فَرَجَعْنَٰكَ إِلَىٰٓ أُمِّكَ كَىْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ۚ وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنَٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنَّٰكَ فُتُونًا ۚ فَلَبِثْتَ سِنِينَ فِىٓ أَهْلِ مَدْيَنَ ثُمَّ جِئْتَ عَلَىٰ قَدَرٍ يَٰمُوسَىٰ ﴿۴۰﴾

اور ہم نے تمہارے اوپر ایک بار اور احسان کیا ہے جب کہ ہم نے تمہاری ماں کی طرف وحی

کی جو وحی کی جا رہی ہے، کہ اس کو صندوق میں رکھو، پھر اس کو دریا میں ڈال دو، پھر دریا اس کو کنارے پر ڈال دے۔ اس کو ایک شخص اٹھائے گا جو میرا بھی دشمن ہے اور اس کا بھی دشمن ہے۔ اور میں نے اپنی طرف سے تم پر ایک محبت ڈال دی۔ اور تاکہ تم میری نگرانی میں پرورش پاؤ۔ جب کہ تمہاری بہن چلتی ہوئی آئی، پھر وہ کہنے لگی، کیا میں تم لوگوں کو اس کا پتہ دوں جو اس بچے کی پرورش اچھی طرح کرے۔ پس ہم نے تم کو تمہاری ماں کی طرف لوٹا دیا تاکہ اس کی آنکھ ٹھنڈی ہو اور اس کو غم نہ رہے۔ اور تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا۔ پھر ہم نے تم کو اس غم سے نجات دی۔ اور ہم نے تم کو خوب جانچا۔ پھر تم کئی سال مدین والوں میں رہے۔ پھر تم ایک اندازہ پر آگئے اے موسیٰ۔ ۴۰ - ۳۷

مصر کے اصل باشندے قبطی تھے جن کا سیاسی اور مذہبی نمائندہ فرعون تھا۔ وہاں کی دوسری قوم بنی اسرائیل تھی جو حضرت یوسف کے زمانہ میں باہر سے آکر یہاں آباد ہوئی تھی۔ حضرت موسیٰ جس زمانہ میں بنی اسرائیل کے ایک گھر میں پیدا ہوئے۔ اس زمانہ میں فرعون نے اسرائیل کی نسل ختم کرنے کے لئے یہ حکم دے دیا تھا کہ اسرائیل کے گھروں میں جتنے بچے پیدا ہوں سب قتل کر دئے جائیں۔ حضرت موسیٰ کی ماں نے بچہ کو قتل سے بچانے کے لئے خدائی الہام کے تحت یہ کیا کہ اس کو ٹوکری میں رکھ کر دریائے نیل میں ڈال دیا۔

یہ ٹوکری بہتے ہوئے فرعون کے محل کے پاس پہنچی۔ وہاں فرعون اور اس کی بیوی نے اس کو دیکھا تو ان کو چھوٹے بچہ پر رحم آگیا۔ انھوں نے اس کو نکال کر محل کے اندر رکھ لیا۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ کی بہن کی نشاندہی پر آپ کی ماں آپ کو دودھ پلانے کے لئے مقرر ہوئیں۔ —— یہ خدا کا ایک کرشمہ ہے کہ جس فرعون کو موسیٰ کا سب سے بڑا دشمن بننا تھا اسی فرعون کے ذریعہ حضرت موسیٰ کی پرورش اور تربیت کرائی گئی۔

حضرت موسیٰ بڑے ہوئے تو ایک قبطی اور ایک اسرائیلی کے جھگڑے میں انھوں نے قبطی کو تنبیہ کی۔ غیر متوقع طور پر وہ قبطی مر گیا۔ اس کے بعد حکومت کی طرف سے حکم جاری ہوا کہ موسیٰ کو گرفتار کر لیا جائے۔ مگر حضرت موسیٰ خفیہ طور پر مصر سے نکل کر مدین پہنچ گئے۔ وہاں کے صحرائی ماحول میں وہ زندگی کے مزید تجربات سے آشنا ہوئے۔ قبطی کی ہلاکت کے بعد حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ سے غیر معمولی دعائیں کیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس

حادثہ کو ان کے لئے مزید تربیت اور تعلیم کا ذریعہ بنا دیا۔

وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِي ۝ اذْهَبْ أَنْتَ وَأَخُوكَ بِآيَاتِي وَلَا تَنِيَا فِي ذِكْرِي ۝ اذْهَبَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ ۝ فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَيِّنًا لَعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ ۝

اور میں نے تم کو اپنے لئے منتخب کیا۔ جاؤ تم اور تمہارا بھائی میری نشانیوں کے ساتھ۔ اور تم دونوں میری یاد میں سستی نہ کرنا۔ تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ کہ وہ سرکش ہو گیا ہے۔ پس اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا، شاید وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے۔ ۴۴-۴۱

مختلف تجربات سے گزر کر حضرت موسیٰ جب تکمیل شعور کے آخری مرحلہ میں پہنچ گئے تو اللہ تعالیٰ نے انھیں پیغمبرانہ دعوت کی ذمہ داری سونپ دی۔ اس وقت حضرت موسیٰ کو دو خاص نصیحتیں کی گئیں۔ ایک خدا کے ذکر میں کمی نہ کرنا۔ دوسرے دعوت میں نرم انداز اختیار کرنا۔

خدا کے ذکر سے مراد یہ ہے کہ آدمی کے قلب و دماغ میں خدا کا یقین اس طرح شامل ہو گیا ہو کہ وہ بار بار اسے یاد آتا رہے۔ آدمی کا ہر مشاہدہ اور اس کی زندگی کا ہر واقعہ اس کے خدائی شعور سے جڑ کر اس کو جگانے والا بن جائے۔ عام انسان مادی غذاؤں پر جیتے ہیں۔ حق کا داعی خدا کی یاد میں جیتا ہے۔ خدا کی یاد مومن کا سرمایہ ہے اور اسی طرح داعی کا بھی۔

دوسری ضروری چیز دعوت میں نرم انداز اختیار کرنا ہے۔ فرعون جیسے سرکش انسان کے سامنے بھیجتے ہوئے یہ ہدایت کرنا ثابت کرتا ہے کہ دعوت کے لئے نرم اور حکیمانہ انداز مطلق طور پر مطلوب ہے۔ مدعو کی طرف سے کوئی بھی سختی یا سرکشی داعی کو یہ حق نہیں دیتی کہ وہ اپنی دعوت میں نرمی اور شفقت کا انداز کھو دے۔

قَالَا رَبَّنَا إِنَّنَا نَخَافُ أَنْ يَفْرُطَ عَلَيْنَا أَوْ أَنْ يَطْغَىٰ ۝ قَالَ لَا تَخَافَا ۖ إِنَّنِي مَعَكُمَا أَسْمَعُ وَأَرَىٰ ۝ فَأْتِيَاهُ فَقُولَا إِنَّا رَسُولَا رَبِّكَ فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ۖ قَدْ جِئْنَاكَ بِآيَةٍ مِنْ رَبِّكَ ۖ وَالسَّلَامُ عَلَىٰ مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَىٰ ۝ إِنَّا

قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى

دونوں نے کہا کہ اے ہمارے رب، ہم کو اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر زیادتی کرے یا سرکشی کرنے لگے۔ فرمایا کہ تم اندیشہ نہ کرو۔ میں تم دونوں کے ساتھ ہوں، سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں پس تم اس کے پاس جاؤ اور کہو کہ ہم دونوں تیرے رب کے بھیجے ہوئے ہیں، پس تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دے۔ اور ان کو نہ ستا۔ ہم تیرے رب کے پاس سے ایک نشانی بھی لائے ہیں۔ اور سلامتی اس شخص کے لئے ہے جو ہدایت کی پیروی کرے۔ ہم پر یہ وحی کی گئی ہے کہ اس شخص پر عذاب ہوگا جو جھٹلائے اور اعراض کرے۔ ۴۵ - ۴۸

فرعون نہایت متکبر تھا۔ اقتدار پاکر وہ اپنے آپ کو خدا سمجھنے لگا تھا۔ اس لئے حضرت موسیٰ کو اندیشہ ہوا کہ جب وہ دیکھے گا کہ اس کے سوا کسی اور خدا کا پیغام اس کو سنایا جارہا ہے تو وہ غصہ میں بھڑک اٹھے گا۔ مگر خدا کا پیغمبر مکمل طور پر خدا کی حفاظت میں ہوتا ہے۔ اس لئے حکم ہوا کہ تم جاؤ اور یہ یقین رکھو کہ فرعون اپنی ساری طاقت اور جبروت کے باوجود تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

بنی اسرائیل قدیم زمانہ کے مسلمان تھے۔ وہ اصلاً ایک موحد قوم تھے۔ مگر مصر کی مشرک قوم کے درمیان رہتے ہوئے وہ مشرکانہ تہذیب سے بری طرح متاثر ہو گئے تھے۔ مزید یہ کہ مشرک حکمرانوں نے بنی اسرائیل کو اس طرح محنت مزدوری میں لگا رکھا تھا کہ وہ اس قابل نہیں رہے تھے کہ وہ توحید اور آخرت کی اعلیٰ حقیقتوں کے بارہ میں سوچ سکیں۔ اس لئے حضرت موسیٰ کو حکم ہوا کہ بنی اسرائیل کو مشرکانہ ماحول سے نکالو اور ان کو الگ خطۂ زمین میں آباد کرو۔ تاکہ شرک اور جاہلیت کی فضا سے کٹ کر ان کی تربیت ممکن ہو سکے۔

قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ۝ قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۝ قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ۝ قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ۝

فرعون نے کہا، پھر تم دونوں کا رب کون ہے، اے موسیٰ۔ موسیٰ نے کہا، ہمارا رب وہ ہے جس نے

ہر چیز کو اس کی صورت عطا کی، پھر رہنمائی فرمائی۔ فرعون نے کہا، پھر اگلی قوموں کا کیا حال ہے۔ موسیٰ نے کہا۔ اس کا علم میرے رب کے پاس ایک دفتر میں ہے۔ میرا رب نہ غلطی کرتا ہے اور نہ بھولتا ہے۔ ۴۹ - ۵۲

"تمہارا رب کون ہے" فرعون کا یہ جملہ اس معنی میں نہ تھا کہ وہ اپنے سوا کسی خدا سے بے خبر تھا یا کسی برتر خدا کا سرے سے قائل نہ تھا۔ اس کا یہ جملہ دراصل موسیٰ کی بات کی تحقیر تھا نہ کہ اس کا سرے سے انکار۔

مصر میں حضرت یوسف علیہ السلام نے توحید کی تبلیغ کی تھی۔ اب بھی بنی اسرائیل وہاں لاکھوں کی تعداد میں موجود تھے۔ جو خدائے واحد پر عقیدہ رکھتے تھے۔ اس طرح مصر میں اگرچہ خدائے برتر کا عقیدہ موجود تھا مگر عملاً وہاں سارا زور اور شان و شوکت فرعون کے گرد جمع تھا۔ وہ مصریوں کے عقیدہ کے مطابق ان کے سب سے بڑے دیوتا (سورج) کا زمینی مظہر تھا۔ وہ مصر کا اوتار بادشاہ (God-king) تھا اور اس کے بت اور اسٹیچو سارے مصر میں پرستش کی چیز بنے ہوئے تھے۔ اس کے مقابلہ میں موسیٰ بنی اسرائیل کے ایک فرد تھے جو مصر میں غلاموں اور مزدوروں کی ایک قوم سمجھی جاتی تھی۔ اور اس بنا پر اس کا مذہبی عقیدہ بھی مصر میں ایک ناقابل ذکر عقیدہ کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔

دنیا میں بے شمار چیزیں ہیں مگر ہر چیز کی ایک منفرد بناوٹ ہے اور ہر چیز کا ایک متعین طریق عمل ہے۔ نہ اس بناوٹ میں کوئی تبدیلی ممکن ہے اور نہ اس طریق عمل میں۔ اس سے خود فرعون جیسا سرکش بادشاہ بھی مستثنیٰ نہیں۔ یہ واقعہ واضح طور پر ایک بالاتر خالق کا وجود ثابت کرتا ہے۔

حضرت موسیٰ نے یہ بات کہی تو فرعون نے محسوس کیا کہ اس کے پاس اس بات کا کوئی براہ راست جواب نہیں ہے۔ اب اس نے بات کو پھیر دیا۔ دلیل کے میدان میں اپنے کو کمزور پا کر اس نے چاہا کہ تعصب کے جذبات کو بھڑکا کر لوگوں کے درمیان اپنی برتری قائم رکھے۔ چنانچہ اس نے کہا کہ اگر تمہاری بات صحیح ہے تو ہمارے پچھلے بڑوں کا انجام کیا ہوا جو تمہارے نظریہ کے مطابق گمراہ حالت میں مر گئے۔ حضرت موسیٰ نے اس کے جواب میں اعراض کا طریقہ اختیار کیا۔ انھوں نے کہا کہ گزرے ہوئے لوگوں کو خدا کے حوالے کرو اور اب اپنے بارہ میں غور کرو۔

الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَکَ لَکُمْ فِیْهَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۭ فَاَخْرَجْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ۝ كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ۭ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰى ۝ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِیْهَا نُعِیْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ۝

وہی ہے جس نے تمہارے لئے زمین کا فرش بنایا۔ اور اس میں تمہارے لئے راہیں نکالیں اور آسمان سے پانی اتارا۔ پھر ہم نے اس کے ذریعہ سے مختلف قسم کی نباتات پیدا کیں۔ کھاؤ اور اپنے مویشیوں کو چراؤ۔ اس کے اندر اہل عقل کے لئے نشانیاں ہیں۔ اسی سے ہم نے تم کو پیدا کیا ہے اور اسی میں ہم تم کو لوٹائیں گے اور اسی سے ہم تم کو دوبارہ نکالیں گے۔ ۵۵ - ۵۳

زمین کی پیدائش، بارش کا نظام، نباتات کا اگنا، اور دوسرے اہتمامات جس نے موجودہ دنیا کو زندہ چیزوں کے لئے قابل رہائش بنایا ہے وہ حیرت ناک حد تک عظیم ہیں۔

یہ ایک "نشانی" ہے جو ثابت کرتی ہے کہ اس دنیا کا خالق و مالک ایک عظیم خدا ہے۔ موجودہ دنیا جیسی دنیا کو وجود میں لانے کے لئے اتنی بڑی قدرت درکار ہے جو نہ کسی "سورج" کو حاصل ہے اور نہ کسی "بادشاہ" کو۔ ایسی حالت میں یہ ماننے بغیر چارہ نہیں کہ اس کو بنانے اور چلانے والا ایک برتر خدا ہے۔

پھر اسی سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ دنیا عبث دنیا نہیں ہے جو یوں ہی پیدا ہو اور یوں ہی ختم ہو جائے۔ بامعنی دنیا لازمی طور پر ایک بامعنی انجام چاہتی ہے۔ اس طرح دنیا کا مشاہدہ بیک وقت توحید کو بھی ثابت کر رہا ہے اور آخرت کو بھی۔

وَلَقَدْ اَرَیْنٰهُ اٰیٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَاَبٰى ۝ قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ یٰمُوْسٰى ۝ فَلَنَاْتِیَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَیْنَنَا وَبَیْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَلَآ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ۝

اور ہم نے فرعون کو اپنی سب نشانیاں دکھائیں تو اس نے جھٹلایا اور انکار کیا۔ اس نے کہا کہ اے موسیٰ، کیا تم اس لئے ہمارے پاس آئے ہو کہ اپنے جادو سے ہم کو ہمارے ملک سے نکال دو۔ تو ہم تمہارے مقابلہ میں ایسا ہی جادو لائیں گے۔ پس تم ہمارے اور اپنے درمیان ایک وعدہ مقرر کرلو، نہ ہم اس کے خلاف کریں اور نہ تم۔ یہ مقابلہ ایک ہموار میدان میں ہو۔ ۵۸ - ۵۶

حضرت موسیٰ کی دعوت فرعون کے اوپر لمبی مدت تک جاری رہی۔ اس دوران آپ نے اس کے سامنے عقلی دلائل بھی پیش کئے اور حسی معجزے بھی دکھائے۔ مگر وہ حضرت موسیٰ پر ایمان نہ لایا۔ حضرت موسیٰ کی سچائی کا اقرار فرعون کے لئے اپنی نفی کے ہم معنی ہوتا۔ اور فرعون کی متکبرانہ نفسیات اس میں مانع ہوگئی کہ اپنی نفی کی قیمت پر وہ سچائی کا اقرار کرے۔

حضرت موسیٰ کے عقلی دلائل کو فرعون نے غیر متعلق باتوں کے ذریعہ بے اثر کرنے کی کوشش کی۔ اور آپ کے معجزات کے بارہ میں اس نے کہا کہ یہ جادو ہے۔ یعنی ایک ایسی چیز جس کا خدا سے کوئی تعلق نہیں۔ ہر آدمی مہارت پیدا کرکے اس قسم کا کرشمہ دکھا سکتا ہے۔ اپنی اس ڈھٹائی کو نباہنے کے لئے مزید اس کو یہ کرنا پڑا کہ اس نے کہا کہ ہم بھی اپنے جادوگروں کے ذریعہ ویسا ہی کرشمہ دکھا سکتے ہیں جیسا کرشمہ تم نے ہمیں دکھایا ہے۔ گفتگو کے بعد بالآخر یہ طے ہوا کہ آنے والے قومی میلے کے دن ملک کے جادوگروں کو جمع کیا جائے اور سب کے سامنے موسیٰ اور جادوگروں کے درمیان مقابلہ ہو۔

قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَأَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴿٥٩﴾ فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ﴿٦٠﴾ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ﴿٦١﴾

موسیٰ نے کہا، تمہارے لئے وعدہ کا دن میلہ والا دن ہے اور یہ کہ لوگ دن چڑھے تک جمع کئے جائیں۔ فرعون وہاں سے ہٹا، پھر اپنے سارے داؤ جمع کئے۔ اس کے بعد وہ مقابلہ پر آیا۔ موسیٰ نے کہا کہ تمہارا برا ہو، اللہ پر جھوٹ نہ باندھو کہ وہ تم کو کسی آفت سے غارت کردے۔ اور جس نے خدا پر جھوٹ باندھا وہ ناکام ہوا۔ ۶۱ - ۵۹

فرعون نے سارے ملک میں آدمی بھیج کر تمام ماہر جادوگروں کو بلایا۔ جب یہ لوگ میلے کے میدان میں جمع ہوئے تو مقابلہ پیش آنے سے پہلے حضرت موسیٰ نے ایک تقریر کی۔ یہ تقریر لوگوں کے لئے بالکل نئی چیز نہ تھی بلکہ یہ ایک قسم کی یاددہانی تھی۔ اس سے پہلے حضرت موسیٰ کی دعوت کے ذریعہ جادوگر اور دوسرے حضرات یقیناً اس بات سے آگاہ ہو چکے تھے کہ موسیٰ کا پیغام کیا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ موسیٰ شرک کے مقابلہ میں توحید کی دعوت لے کر کھڑے ہوئے ہیں۔

اس پس منظر میں حضرت موسیٰ نے اتمام حجت کے طور پر آخری نصیحت کی۔ حضرت موسیٰ نے فرعون اور جادوگروں سے کہا کہ اس معاملہ کو تم لوگ جادو کا معاملہ نہ سمجھو۔ خدا کی نشانی کو جادو کہنا اور انسانی جادو کے ذریعہ اس کو زیر کرنے کی کوشش کرنا بے حد سنگین بات ہے۔ یہ ایک واقعی حقیقت کا مقابلہ ایک سراسر بے حقیقت چیز کے ذریعہ کرنا ہے جس کا یقینی نتیجہ ہلاکت ہے۔ تم بظاہر مجھ کو جھوٹا ثابت کرنا چاہتے ہو مگر یہ خود خدا کو نعوذ باللہ جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ جو لوگ اس قسم کی سرکشی کریں وہ خدا کی دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

فَتَنَازَعُوٓا۟ أَمْرَهُم بَيْنَهُمْ وَأَسَرُّوا۟ ٱلنَّجْوَىٰ ﴿٦٢﴾ قَالُوٓا۟ إِنْ هَٰذَٰنِ لَسَٰحِرَٰنِ يُرِيدَانِ أَن يُخْرِجَاكُم مِّنْ أَرْضِكُم بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيقَتِكُمُ ٱلْمُثْلَىٰ ﴿٦٣﴾ فَأَجْمِعُوا۟ كَيْدَكُمْ ثُمَّ ٱئْتُوا۟ صَفًّا ۚ وَقَدْ أَفْلَحَ ٱلْيَوْمَ مَنِ ٱسْتَعْلَىٰ ﴿٦٤﴾

پھر انھوں نے اپنے معاملہ میں اختلاف کیا۔ اور انھوں نے چپکے چپکے باہم مشورہ کیا۔ انھوں نے کہا یہ دونوں یقیناً جادوگر ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ اپنے جادو کے زور سے تم کو تمہارے ملک سے نکال دیں اور تمہارے عمدہ طریقہ کا خاتمہ کر دیں۔ پس تم اپنی تدبیریں اکٹھا کرو۔ پھر متحد ہو کر آؤ اور وہی جیت گیا جو آج غالب رہا۔ ۶۴ - ۶۲

حضرت موسیٰ کی ابتدائی تقریر سے جادوگروں کی جماعت میں اختلاف پڑ گیا۔ ان کے ایک گروہ نے کہا کہ یہ جادوگر کا کلام نہیں ہے بلکہ یہ نبی کا کلام ہے۔ دوسرے لوگوں نے کہا کہ نہیں۔ یہ شخص ہماری ہی طرح کا ایک جادوگر ہے (تفسیر ابن کثیر)

جادوگر یقینی طور پر اپنے ہم جنسوں کو پہچانتے تھے۔ ان کے تجربہ کار افراد نے محسوس

کرلیا کہ یہ جادو کا معاملہ نہیں ہے بلکہ معجزہ کا معاملہ ہے۔ چنانچہ وہ مقابلہ کی ہمت کھو بیٹھے۔ مگر فرعون اور اس کے پرجوش ساتھیوں کے اکسانے پر وہ مقابلہ کے لئے راضی ہوگئے۔

"طریقۃ مثلیٰ" کا مطلب ہے افضل طریقہ۔ اس وقت مصریوں کی زندگی کا پورا ڈھانچہ مشرکانہ عقائد کے اوپر قائم تھا۔ سب سے بڑے دیوتا (سورج) کے جسمانی مظہر کی حیثیت سے فرعون کی شخصیت ان کے سیاسی اور سماجی نظام کی بنیاد بنی ہوئی تھی۔ فرعون نے تعصب کے جذبات کو ابھار کر کہا کہ یہ نظام ہمارا قومی نظام ہے۔ اب اگر توحید کے ان علم برداروں کی جیت ہوگئی تو ہمارا پورا قومی نظام اکھڑ جائے گا۔

قَالُوا يٰمُوسٰى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى ﴿۶۵﴾ قَالَ بَلْ اَلْقُوْا فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ﴿۶۶﴾ فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ﴿۶۷﴾ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ﴿۶۸﴾ وَاَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ۭ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ۭ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى ﴿۶۹﴾ فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى ﴿۷۰﴾

انھوں نے کہا کہ اے موسیٰ یا تو تم ڈالو یا ہم پہلے ڈالنے والے بنیں۔ موسیٰ نے کہا کہ تم ہی پہلے ڈالو تو یکایک ان کی رسیاں اور ان کی لاٹھیاں ان کے جادو کے زور سے اس کو اس طرح دکھائی دیں گویا کہ وہ دوڑ رہی ہیں۔ پس موسیٰ اپنے دل میں کچھ ڈر گیا۔ ہم نے کہا کہ تم ڈرو نہیں تم ہی غالب رہو گے۔ اور جو تمہارے داہنے ہاتھ میں ہے اس کو ڈال دو، وہ اس کو نگل جائے گا جو انھوں نے بنایا ہے۔ یہ جو کچھ انھوں نے بنایا ہے یہ جادوگر کا فریب ہے۔ اور جادوگر کبھی کامیاب نہیں ہوتا، خواہ وہ کیسے آئے۔ پس جادوگر سجدہ میں گر پڑے۔ انھوں نے کہا کہ ہم ہارون اور موسیٰ کے رب پر ایمان لائے۔ ۶۵ ۔ ۷۰

مقابلہ اس طرح شروع ہوا کہ جادوگروں نے پہلے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں میدان میں پھینکیں تو ان کی رسیاں اور لاٹھیاں سانپ بن کر چلتی ہوئی دکھائی دیں۔ تاہم یہ صرف نظربندی کا معاملہ تھا۔ یعنی رسیاں اور لاٹھیاں فی الواقع سانپ نہیں بن گئی تھیں بلکہ جادوگروں نے نظر بندی کے عمل سے حاضرین کی قوت خیالی کو اس طرح متاثر کیا کہ انھیں وقتی طور پر دکھائی دیا کہ رسیاں اور لاٹھیاں سانپ کی

مانند میدان میں چل رہی ہیں۔

اس وقت اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت موسیٰ نے اپنی لاٹھی میدان میں پھینکی۔ ان کی لاٹھی فوراً بہت بڑا سانپ بن کر میدان میں دوڑنے لگی۔ اس نے ان جادوگروں کے نظر بندی کے طلسم کو نگل لیا۔ وہ چیزیں جو سانپوں کی شکل میں چلتی ہوئی نظر آتی تھیں وہ اس کے چھوتے ہی محض رسّی اور لاٹھی ہوکر رہ گئیں۔

جادوگر حضرت موسیٰ کا کلام سن کر پہلے ہی اس سے متاثر ہو چکے تھے۔ اب جب عملی مظاہرہ ہوا تو انھوں نے حضرت موسیٰ کی صداقت کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ انھوں نے یقین کے ساتھ جان لیا کہ موسیٰ کے پاس جو چیز ہے وہ کوئی انسانی جادو نہیں ہے بلکہ وہ خدائی معجزہ ہے۔ یہ یقین اتنا گہرا تھا کہ انھوں نے اسی وقت حضرت موسیٰ کے دین کو اختیار کرنے کا اعلان کر دیا۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۭ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ۡ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى ۝۷۱

فرعون نے کہا کہ تم نے اس کو مان لیا اس سے پہلے کہ میں تم کو اجازت دیتا۔ وہی تمہارا بڑا ہے جس نے تم کو جادو سکھایا ہے۔ تو اب میں تمہارے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کٹواؤں گا۔ اور میں تم کو کھجور کے تنوں پر سولی دوں گا۔ اور تم جان لوگے کہ ہم میں سے کس کا عذاب زیادہ سخت ہے اور زیادہ دیر تک رہنے والا ہے۔ ۷۱

یہ مقابلہ محض دو قسم کے آدمیوں کے کرتب کا مقابلہ نہ تھا بلکہ وہ توحید اور شرک کا مقابلہ تھا یعنی اس کے ذریعہ سے یہ فیصلہ ہونا تھا کہ صداقت شرک کی طرف ہے یا توحید کی طرف۔ چونکہ فرعون کی بڑائی کی بنیاد تمام تر شرک کے اوپر قائم تھی اس لئے وہ شرک کی شکست کو برداشت نہ کر سکا اور جادوگروں کے لئے اس سخت ترین سزا کا حکم سنا دیا جو مصر میں قدیم زمانہ میں رائج تھی۔

فرعون جب دلیل کے میدان میں ہار گیا تو اس نے یہ کوشش کی کہ طاقت کے ذریعہ حق کو دبا دے۔ یہ ہر زمانہ میں ارباب اقتدار کی عام نفسیات رہی ہے، خواہ وہ شاہانہ اختیار رکھنے والے ارباب اقتدار ہوں یا غیر شاہانہ اختیار رکھنے والے۔

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ۭ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝

جادوگروں نے کہا کہ ہم تجھ کو ہرگز ان دلائل پر ترجیح نہیں دیں گے جو ہمارے پاس آئے ہیں۔ اور اس ذات پر جس نے ہم کو پیدا کیا ہے، پس تجھ کو جو کچھ کرنا ہے اسے کر ڈال۔ تم اسی دنیا کی زندگی کا کرسکتے ہو۔ ہم اپنے رب پر ایمان لائے تاکہ وہ ہمارے گناہوں کو بخش دے اور اس جادو کو بھی جس پر تم نے ہمیں مجبور کیا۔ اور اللہ بہتر ہے اور باقی رہنے والا ہے۔ ۷۲ - ۷۳

جادوگروں کے سامنے ایک طرف حضرت موسیٰ کی دلیل تھی۔ اور دوسری طرف فرعون کی جابرانہ شخصیت۔ یہ دلیل اور شخصیت کا مقابلہ تھا۔ جادوگروں نے شخصیت پر دلیل کو ترجیح دی۔ اگرچہ وہ جانتے تھے کہ اس ترجیح کی قیمت — انھیں انتہائی مہنگی صورت میں دینی پڑے گی۔

جادوگروں کا ایمان کوئی نسلی یا رسمی ایمان نہ تھا۔ ان کا ایمان ان کے لئے دریافت کے ہم معنی تھا۔ اور جو ایمان کسی آدمی کو دریافت کے طور پر حاصل ہو وہ اتنا طاقتور ہوتا ہے کہ اس کے بعد ہر دوسری چیز اس کو ہیچ نظر آنے لگتی ہے، خواہ وہ کوئی بڑی شخصیت ہو یا کوئی بڑی دنیوی مصلحت۔

اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ۭ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ۝ وَمَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ۝ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ جَزٰۗؤُا مَنْ تَزَكّٰى ۝

بے شک جو شخص مجرم بن کر اپنے رب کے سامنے حاضر ہوگا تو اس کے لئے جہنم ہے، اس میں وہ نہ مرے گا اور نہ جئے گا۔ اور جو شخص اپنے رب کے پاس مومن ہو کر آئے گا جس نے نیک عمل کئے ہوں، تو ایسے لوگوں کے لئے بڑے اونچے درجے ہیں۔ ان کے لئے ہمیشہ رہنے والے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور یہ بدلہ ہے اس شخص کا جو پاکیزگی اختیار کرے۔ ۷۴ - ۷۶

مجرم بنا کیا ہے۔ مجرم بنا یہ ہے کہ آدمی کے سامنے خدا کی نشانی آئے مگر وہ اس سے نصیحت حاصل نہ کرے۔ اس کے سامنے دلائل کی زبان میں حق کو کھولا جائے مگر وہ اس کو نظر انداز کر دے۔ وہ ظاہری قوتوں اور مادی مصلحتوں سے باہر نکل کر حقیقت کا اعتراف نہ کر سکے۔

ایسے لوگوں کے لئے آخرت میں سخت ترین سزا ہے۔ دنیا کی کوئی مصیبت، خواہ وہ کتنی ہی بڑی ہو، بہرحال وہ محدود ہے۔ اور موت کے ساتھ ایک نہ ایک دن ختم ہو جاتی ہے۔ مگر آخرت وہ جگہ ہے جہاں مصیبتوں کا طوفان ہر طرف سے آدمی کو گھیرے ہوئے ہوگا۔ مگر آدمی کے لئے وہاں سے بھاگنا ممکن نہ ہوگا۔ اور نہ وہاں موت آئے گی جو ناقابل بیان مصیبتوں کا سلسلہ منقطع کر دے۔

جنت اس کے لئے ہے جو اپنے آپ کو پاک کرے۔ پاک کرنا یہ ہے کہ آدمی غفلت کی زندگی کو ترک کرے اور شعور کی زندگی کو اپنائے۔ وہ اپنے آپ کو ان چیزوں سے بچائے جو حق سے روکنے والی ہیں۔ مصلحت کی رکاوٹ سامنے آئے تو اس کو نظر انداز کر دے۔ نفس کی خواہش ابھرے تو اس کو کچل دے۔ ظلم اور گھمنڈ کی نفسیات جاگے تو اس کو اپنے اندر ہی اندر دفن کر دے۔

یہی لوگ سچے ایمان والے ہیں۔ دنیا میں ان کا ایمان عمل صالح کے باغ کی صورت میں اگا تھا، آخرت میں وہ ابدی جنتوں کے روپ میں سرسبز و شاداب ہو کر انھیں واپس ملے گا۔

وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى ۙ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ﴿۷۷﴾ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ﴿۷۸﴾ وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى ﴿۷۹﴾

اور ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ رات کے وقت میرے بندوں کو لے کر نکلو۔ پھر ان کے لئے سمندر میں سوکھا راستہ بنا لو، تم نہ تعاقب سے ڈرو اور نہ کسی اور چیز سے ڈرو۔ پھر فرعون نے اپنے لشکروں کے ساتھ ان کا پیچھا کیا پھر ان کو سمندر کے پانی نے ڈھانپ لیا۔ جیسا کہ ڈھانپ لیا اور فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا اور اس کو صحیح راہ نہ دکھائی۔ ۷۷ - ۷۹

جادوگروں سے مقابلہ کے بعد حضرت موسیٰ کئی سال مصر میں رہے۔ ایک طرف انھوں نے فرعون اور قوم فرعون پر اپنی تبلیغ جاری رکھی۔ دوسری طرف انھوں نے مطالبہ کیا کہ مجھ کو اجازت دیدو

کہ میں اپنے ساتھیوں کو لے کر مصر سے باہر صحرائے سینا میں چلا جاؤں اور وہاں آزادی کے ساتھ خدائے واحد کی عبادت کروں۔ مگر فرعون نے نہ تو نصیحت قبول کی اور نہ حضرت موسیٰ کو باہر جانے کی اجازت دی۔

آخر کار حضرت موسیٰ نے خدا کے حکم سے خاموش ہجرت کا فیصلہ کیا۔ اس وقت مصر میں جو اسرائیلی یا غیر اسرائیلی مسلمان تھے، سب پیشگی منصوبہ کے تحت ایک خاص مقام پر جمع ہوئے اور وہاں سے رات کے وقت اجتماعی طور پر روانہ ہوگئے۔

یہ قافلہ بحر احمر کی شمالی خلیج تک پہنچا تھا کہ فرعون اپنے لشکر کے ساتھ ان کا پیچھا کرتے ہوئے وہاں آگیا۔ پیچھے فرعون کا لشکر تھا اور آگے سمندر کی مانند وسیع خلیج۔ اب حضرت موسیٰ نے خلیج کے پانی پر اپنی لاٹھی ماری۔ خدا کے حکم سے پانی دو ٹکڑے ہوگیا۔ حضرت موسیٰ اور ان کے ساتھی اس کے درمیان خشکی پر چلتے ہوئے دوسری طرف پہنچ گئے۔ یہ دیکھ کر فرعون بھی اس کے اندر داخل ہوگیا۔ مگر فرعون اور اس کا لشکر جیسے ہی درمیان میں پہنچے دونوں طرف کا پانی مل گیا۔ وہ لوگ اس کے اندر غرق ہوگئے —— ایک ہی دریا خدا کے وفادار بندوں کے لئے نجات کا راستہ بن گیا۔ اور خدا کے دشمنوں کے لئے موت کا گڑھا۔

لوگ اکثر اپنے قائدین کے بھروسہ پر حق کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مگر فرعون کی مثال بتاتی ہے کہ قائدین کا سہارا نہایت کمزور سہارا ہے۔ اس دنیا میں اصل سہارے والا وہ ہے جو خدا کی آیات کی بنیاد پر اپنی راہ متعین کرے نہ کہ قوم کے اکابر کی بنیاد پر۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۝ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ۝ وَاِنِّىْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ۝

اے بنی اسرائیل ہم نے تم کو تمہارے دشمن سے نجات دی اور تم سے طور کے دائیں جانب وعدہ ٹھہرایا۔ اور ہم نے تمہارے اوپر من وسلویٰ اتارا۔ کھاؤ ہماری دی ہوئی پاک روزی اور اس میں سرکشی نہ کرو کہ تمہارے اوپر میرا غضب نازل ہو۔ اور جس پر میرا غضب اترا وہ تباہ ہوا۔ البتہ جو توبہ کرے اور ایمان

لائے اور نیک عمل کرے اور سیدھی راہ پر رہے تو اس کے لئے میں بہت زیادہ بخشنے والا ہوں۔ ۸۲-۸۰

خلیج کو پار کرنے کے بعد حضرت موسیٰ اور ان کے ساتھی چلتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ صحرائے سینا میں پہنچ گئے۔ اس کے بعد کوہ طور کے دامن میں بلا کر خاص اہتمام سے ان کو شریعت عطا کی گئی۔ یہ لوگ چالیس سال تک صحرائے سینا میں رہے۔ یہاں ان کے لئے خصوصی نعمت کے طور پر پانی اور غذا (من وسلویٰ) کا انتظام کیا گیا جو اس وقت تک مسلسل جاری رہا جب کہ ان کی اگلی نسل فلسطین کے سرسبز علاقہ میں پہنچ گئی۔

اللہ تعالیٰ کے اوپر بندوں کا یہ حق ہے کہ وہ ہر حال میں اپنے بندوں کے لئے رزق فراہم کرے۔ اور بندوں کے اوپر اللہ کا یہ حق ہے کہ وہ کسی حال میں اس کے ساتھ سرکشی نہ کریں۔ جو لوگ خدا کی نعمتوں کے شکرگزار بن کر رہیں ان کے لئے خدا کی مزید رحمتیں ہیں۔ اور جو لوگ سرکش بن جائیں ان کے لئے خدا کا شدید عذاب ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا۔

وَمَآ أَعْجَلَكَ عَن قَوْمِكَ يَٰمُوسَىٰ ۞ قَالَ هُمْ أُولَآءِ عَلَىٰٓ أَثَرِى وَعَجِلْتُ إِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضَىٰ ۞ قَالَ فَإِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنۢ بَعْدِكَ وَأَضَلَّهُمُ ٱلسَّامِرِىُّ ۞

اور اے موسیٰ، اپنی قوم کو چھوڑ کر جلد آنے پر تم کو کس چیز نے ابھارا۔ موسیٰ نے کہا، وہ لوگ بھی میرے پیچھے ہی ہیں۔ اور میں اے میرے رب، تیری طرف جلد آگیا تاکہ تو راضی ہو۔ فرمایا تو ہم نے تمہاری قوم کو تمہارے بعد ایک فتنہ میں ڈال دیا۔ اور سامری نے اس کو گمراہ کر دیا۔ ۸۵-۸۳

مصر سے نکلنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کے لئے ایک تاریخ مقرر کی کہ اس روز وہ کوہ طور کے اسی دامن میں دوبارہ آئیں جہاں انھیں ابتداءً پیغمبری ملی تھی۔ یہاں حضرت موسیٰ کو تورات لینے کے لئے اپنی پوری قوم کے ساتھ پہنچنا تھا۔ مگر فرط شوق میں وہ تیزی سے روانہ ہو کر مقررہ تاریخ سے کچھ دن پہلے مقام موعود پر آگئے۔ اور قوم کو پیچھے چھوڑ دیا۔ قوم سے حضرت موسیٰ کی علیحدگی قوم کے لئے فتنہ بن گئی۔ قوم میں بعض مشرکانہ ذہنیت کے لوگ تھے۔ سامری ان کا لیڈر تھا۔ ان لوگوں نے حضرت موسیٰ کی غیرموجودگی سے فائدہ اٹھا کر قوم کو بہکایا اور اس کو بچھڑے کی پرستش میں مبتلا کر دیا جیسا کہ مصر میں اس زمانہ میں ہوتا تھا۔

فَرَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۚ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۚ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِيْ ۝

پھر موسیٰ اپنی قوم کی طرف غصہ اور رنج میں بھرے ہوئے لوٹے۔ انھوں نے کہا کہ اے میری قوم کیا تم سے تمہارے رب نے ایک اچھا وعدہ نہیں کیا تھا۔ کیا تم پر زیادہ زمانہ گزر گیا۔ یا تم نے چاہا کہ تمہارے اوپر تمہارے رب کا غضب نازل ہو، اس لئے تم نے مجھ سے وعدہ خلافی کی۔ ۸۶

اللہ تعالیٰ نے جب حضرت موسیٰ کو خبر دی کہ تمہاری قوم فتنہ میں مبتلا ہوگئی ہے تو وہ شدید جذبات میں بھرے ہوئے قوم کی طرف واپس آئے۔ انھوں نے ان کو یاد دلایا کہ ابھی ابھی خدا نے تمہارے اوپر اتنے احسانات کئے ہیں اور اپنی اتنی زیادہ نشانیاں تمہارے لئے ظاہر کی ہیں۔ پھر کیسے تم اتنی جلد سب بھول کر گمراہی میں پڑ گئے۔

حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کے لئے اللہ کی کتاب لینے گئے۔ اور بنی اسرائیل کی بڑی تعداد کچھ لوگوں کی باتوں میں آکر غیر اللہ کی پرستش میں مصروف ہوگئی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل مصر کے مشرکانہ ماحول سے کتنا زیادہ متاثر ہو چکے تھے۔ اور کیوں یہ ضروری ہوگیا تھا کہ دوبارہ توحید کا پرستار بنانے کے لئے انہیں مصر کے ماحول سے نکال کر باہر لے جایا جائے۔

حضرت موسیٰ نے فرعون کے مقابلہ میں جو کچھ کیا وہ دعوت دین کا کام تھا۔ اور آپ نے بنی اسرائیل کے سلسلہ میں جو کچھ کیا وہ تحفظ دین کا کام۔ دونوں کام آپ نے ساتھ ساتھ انجام دئے۔ اس سے دونوں کاموں کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ مسلمان اگر بگڑے ہوئے ہوں تو اس بنا پر دعوت عام کا کام روکا نہیں جا سکتا اور اگر دعوت عام کا کام کرنا ہو تو وہ اس طرح نہیں کیا جائے گا کہ داخلی اصلاح کا کام بند کر دیا جائے۔

قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ ۝ فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ

إِلَٰهُكُمْ وَإِلَٰهُ مُوسَىٰ فَنَسِيَ ﴿٨٨﴾ أَفَلَا يَرَوْنَ أَلَّا يَرْجِعُ إِلَيْهِمْ قَوْلًا وَلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا ﴿٨٩﴾

انھوں نے کہا کہ ہم نے اپنے اختیار سے آپ کے ساتھ وعدہ خلافی نہیں کی۔ بلکہ قوم کے زیورات کا بوجھ ہم سے اٹھوایا گیا تھا تو ہم نے اس کو پھینک دیا۔ پھر اس طرح سامری نے ڈھال لیا۔ پس اس نے ان کے لئے ایک بچھڑا برآمد کر دیا۔ ایک مورت جس سے بیل کی سی آواز نکلتی تھی۔ پھر ان نے کہا کہ یہ تمہارا معبود ہے اور موسیٰ کا معبود بھی، موسیٰ اسے بھول گئے۔ کیا وہ دیکھتے نہ تھے کہ نہ وہ کسی بات کا جواب دیتا ہے اور نہ کوئی نفع یا نقصان پہنچا سکتا ہے۔ ۸۷-۸۹

بنی اسرائیل کی عورتیں غالباً قدیم رواج کے مطابق بھاری زیورات اپنے جسم پر لادے ہوئی تھیں۔ اس سفر میں قوم نے کہیں پڑاؤ ڈالا تو انھوں نے ان زیورات کو اتار کر ایک جگہ ڈھیر کر دیا۔ ان کے درمیان ایک سامری تھا جو مصر کی قدیم صنعت بت سازی کا تجربہ رکھتا تھا۔ اس نے ان زیورات کو پگھلایا اور ان سے بچھڑے جیسی ایک مورت بنا ڈالی۔ یہ بچھڑا اندر سے خالی تھا۔ اور اس طرح ہنرمندی سے بنایا گیا تھا کہ جب اس کے اندر سے ہوا گزرتی تو بیل کی ڈکار کی سی آواز آتی۔ سامری نے بنی اسرائیل کے جاہل عوام سے کہا کہ دیکھو تمہارا معبود تو یہ ہے جو یہاں موجود ہے۔ موسیٰ معبود کی تلاش میں معلوم نہیں کس پہاڑ پر چلے گئے۔

ہر زمانہ کے "سامری" اسی طرح عوام کو بیوقوف بناتے ہیں۔ وہ کسی محسوس چیز کو نشانہ بنا کر اسی کو سب سے بڑا حق ثابت کرتے ہیں۔ اور الفاظ کے فریب میں آکر عوام کی ایک بھیڑ ان کے گرد جمع ہو جاتی ہے ـــــــ محسوس پرستی انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ خواہ وہ دور قدیم کا انسان ہو یا دور جدید کا انسان۔

وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هَارُونُ مِن قَبْلُ يَا قَوْمِ إِنَّمَا فُتِنتُم بِهِ ۖ وَإِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمَٰنُ فَاتَّبِعُونِي وَأَطِيعُوا أَمْرِي ﴿٩٠﴾ قَالُوا لَن نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عَاكِفِينَ حَتَّىٰ يَرْجِعَ إِلَيْنَا مُوسَىٰ ﴿٩١﴾

اور ہارون نے ان سے پہلے ہی کہا تھا کہ اے میری قوم، تم اس بچھڑے کے ذریعہ سے بہک گئے ہو اور

تمہارا رب تو رحمان ہے۔ پس میری پیروی کرو اور میری بات مانو۔ انھوں نے کہا کہ ہم تو اسی کی پرستش میں لگے رہیں گے جب تک کہ موسیٰ ہمارے پاس لوٹ نہ آئے۔ ۹۱-۹۰

حضرت موسیٰ کے بعد قوم کی دیکھ بھال کی ذمہ داری حضرت ہارون پر تھی۔ انھوں نے قوم کو کافی سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر قوم کے اوپر ان کا وہ دباؤ نہ تھا جو حضرت موسیٰ کا تھا۔ اس لئے ان کے منع کرنے کے بعد بھی لوگ اس سے نہ رکے۔ حضرت ہارون کا اصرار بڑھا تو لوگوں نے کہا کہ اب جو ہوگیا ہے وہ تو اسی طرح جاری رہے گا۔ موسیٰ جب لوٹ کر آئیں گے تو وہی اس کا فیصلہ کریں گے۔

حضرت ہارون اس وقت اگر کوئی سخت اقدام کرتے تو وہ نتیجہ خیز نہ ہوتا۔ کیونکہ آپ کے ساتھ جو لوگ تھے ان کی تعداد کم تھی۔ آپ نے بے نتیجہ کارروائی کرنے کے مقابلہ میں اس کو زیادہ مناسب سمجھا کہ وقتی طور پر صبر کا طریقہ اختیار کریں۔ اور لوگوں کی اصلاح کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہیں۔

قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ﴿۹۲﴾ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ؕ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ﴿۹۳﴾ قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ۚ اِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ ﴿۹۴﴾

موسیٰ نے کہا کہ اے ہارون، جب تو نے دیکھا کہ وہ بہک گئے ہیں تو تم کو کس چیز نے روکا کہ تم میری پیروی کرو۔ کیا تم نے میرے کہنے کے خلاف کیا۔ ہارون نے کہا کہ اے میری ماں کے بیٹے، تم میری داڑھی نہ پکڑو اور نہ میرا سر۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ تم کہو گے کہ تم نے بنی اسرائیل کے درمیان پھوٹ ڈال دی اور میری بات کا لحاظ نہ کیا۔ ۹۴-۹۲

حضرت موسیٰ نے اپنے بھائی کا سختی کے ساتھ محاسبہ کیا۔ حضرت ہارون نے جواب دیا کہ ایسا نہیں ہے کہ میں نے اصلاح کی کوشش نہیں کی اور جاہلوں کے ساتھ مصالحت کرلی۔ بلکہ میں نے پوری قوت کے ساتھ ان کو اس مشرکانہ فعل سے روکنے کی کوشش کی۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ قوم کی اکثریت سامری کے فریب میں آکر اس کی ساتھی بن گئی۔ میں نے اصرار کیا تو وہ لوگ جنگ و قتل پر آمادہ ہوگئے۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ اگر میں

اصرار جاری رکھتا ہوں تو قوم کے اندر باہمی خون ریزی شروع ہو جائے گی۔

معاملہ اس نوبت تک پہنچنے کے بعد اب مجھے دو میں سے ایک چیز کا انتخاب کرنا تھا۔ یا تو باہمی جنگ، یا آپ کی آمد تک اس معاملہ کو ملتوی رکھنا۔ میں نے دوسری صورت کو اہون سمجھ کر اس کو اختیار کر لیا ——
بہت سے مواقع پر دین کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ باہمی لڑائی سے بچنے کے لئے خاموشی کا طریقہ اختیار کر لیا جائے، حتیٰ کہ شرک جیسے معاملہ میں بھی۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ﴿۹۵﴾ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ﴿۹۶﴾ قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ ۪ وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ ۚ وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ۭ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ﴿۹۷﴾ اِنَّمَآ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿۹۸﴾

موسیٰ نے کہا کہ اے سامری، تمہارا کیا معاملہ ہے۔ اس نے کہا کہ مجھ کو وہ چیز نظر آئی جو دوسروں کو نظر نہیں آئی تو میں نے رسول کے نقش قدم سے ایک مٹھی اٹھائی اور وہ اس میں ڈال دی۔ میرے نفس نے مجھ کو ایسا ہی سمجھایا۔ موسیٰ نے کہا کہ دور ہو۔ اب تیرے لئے زندگی بھر یہ ہے کہ تو کہے کہ مجھ کو نہ چھونا۔ اور تیرے لئے ایک اور وعدہ ہے جو تجھ سے ٹلنے والا نہیں۔ اور تو اپنے اس معبود کو دیکھ جس پر تو برابر معتکف رہتا تھا، ہم اس کو جلائیں گے پھر اس کو دریا میں بکھیر کر بہا دیں گے۔ تمہارا معبود تو صرف اللہ ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔ ۹۸ - ۹۵

حضرت موسیٰ کو جب معلوم ہوا کہ اس فعل کا اصل لیڈر سامری ہے تو آپ نے اس سے پوچھ گچھ کی۔ سامری نے دوبارہ ہوشیاری کا طریقہ اختیار کیا اور بات بناتے ہوئے کہا کہ میں نے جو کچھ کیا ایک کشف کے زیر اثر کیا۔ اور خود رسول کے نقش قدم کی مٹی بھی اس میں برکت کے لئے شامل کر دی۔

پیغمبر کو فریب دینے کی کوشش کی بنا پر سامری کا جرم اور زیادہ شدید ہو گیا۔ بائبل کے بیان کے مطابق اس کو خدا نے کوڑھ کا مریض بنا دیا۔ اس کا جسم ایسا مکروہ ہو گیا کہ لوگ اس کو دیکھ کر دور ہی

سے اس سے کترانے لگے۔ سامری نے جھوٹ کی بنیاد پر قوم کا محبوب بننے کی کوشش کی۔ اس کی اسے یہ سزا ملی کہ اس کو قوم کا سب سے زیادہ مبغوض شخص بنا دیا گیا۔ اور آخرت کی سزا اس کے علاوہ ہے۔

بنی اسرائیل کے ذہن میں مشرکانہ مظاہر کی جو عظمت تھی اس کو ختم کرنے کے لئے حضرت موسیٰ نے یہ کیا کہ لوگوں کے سامنے بچھڑے کو جلا ڈالا اور پھر اس کی خاک کو سمندر کی موجوں میں بہا دیا۔

كَذَٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنبَاءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ آتَيْنَاكَ مِن لَّدُنَّا ذِكْرًا ﴿٩٩﴾ مَّنْ أَعْرَضَ عَنْهُ فَإِنَّهُ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وِزْرًا ﴿١٠٠﴾ خَالِدِينَ فِيهِ ۖ وَسَاءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حِمْلًا ﴿١٠١﴾ يَوْمَ يُنفَخُ فِي الصُّورِ ۚ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا ﴿١٠٢﴾ يَتَخَافَتُونَ بَيْنَهُمْ إِن لَّبِثْتُمْ إِلَّا عَشْرًا ﴿١٠٣﴾ نَّحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَقُولُونَ إِذْ يَقُولُ أَمْثَلُهُمْ طَرِيقَةً إِن لَّبِثْتُمْ إِلَّا يَوْمًا ﴿١٠٤﴾

ع ۵ ۱۵ ۱۴

اسی طرح ہم تم کو ان کے احوال سناتے ہیں جو پہلے گذر چکے۔ اور ہم نے تم کو اپنے پاس سے ایک نصیحت نامہ دیا ہے۔ جو اس سے اعراض کرے گا وہ قیامت کے دن ایک بھاری بوجھ اٹھائے گا۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بوجھ قیامت کے دن ان کے لئے بہت برا ہوگا۔ جس دن صور میں پھونک ماری جائے گی اور مجرموں کو اس دن ہم اس حال میں جمع کریں گے کہ خوف سے ان کی آنکھیں نیلی ہوں گی۔ آپس میں چپکے چپکے کہتے ہوں گے کہ تم صرف دس دن رہے ہوگے۔ ہم خوب جانتے ہیں جو کچھ وہ کہیں گے۔ جب کہ ان کا سب سے زیادہ واقف کار کہے گا کہ تم صرف ایک دن ٹھہرے۔ ۹۹ - ۱۰۴

پیغمبروں کا انکار کرنے والوں کا جو انجام ہوا وہ گویا دنیا میں اس فیصلہ الٰہی کا جزئی ظہور تھا جو قیامت میں کلی طور پر تمام نوع انسانی کے لئے پیش آنے والا ہے۔ قرآن اسی حقیقت کی ایک یاد دہانی ہے۔

دنیا میں آدمی جب حق کو نظر انداز کرتا ہے تو بظاہر یہ بہت ہلکی سی چیز معلوم ہوتی ہے۔ مگر آخرت میں آدمی کا یہ فعل اس کے لئے نہایت بھاری بوجھ بن جائے گا۔ جب خدائی بگل (صور) یہ اعلان کرے گا کہ امتحان کی مدت ختم ہو چکی، اس وقت اچانک لوگ اپنے آپ کو ایک اور دنیا میں پائیں گے۔ جب آدمی پر یہ کھلے گا کہ جس دنیا کو وہ اپنی دنیا سمجھے ہوئے تھا وہ دراصل خدا کی دنیا تھی تو اس پر اس

قدر دہشت طاری ہوگی کہ اس کی ہیئت تک بدل جائے گی۔

موجودہ دنیا میں آدمی آخرت کو اس طرح نظر انداز کرتا ہے جیسے وہ کوئی بہت دور کی چیز ہو۔ مگر قیامت آنے کے بعد آدمی کو ایسا معلوم ہوگا جیسے دنیا کی زندگی تو بس گنتی کے چند روز کی تھی۔ اس کے بعد ساری لمبی زندگی وہی تھی جو آخرت کے عالم میں گزرنے والی تھی۔

وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا ﴿١٠٥﴾ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ﴿١٠٦﴾ لَا تَرَىٰ فِيهَا عِوَجًا وَلَا أَمْتًا ﴿١٠٧﴾ يَوْمَئِذٍ يَتَّبِعُونَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهُ ۖ وَخَشَعَتِ الْأَصْوَاتُ لِلرَّحْمَٰنِ فَلَا تَسْمَعُ إِلَّا هَمْسًا ﴿١٠٨﴾

اور لوگ تم سے پہاڑوں کی بابت پوچھتے ہیں۔ کہو کہ میرا رب ان کو اڑا کر بکھیر دے گا۔ پھر زمین کو صاف میدان بنا کر چھوڑ دے گا۔ تم اس میں نہ کوئی کجی دیکھو گے اور نہ کوئی اونچان۔ اس دن سب پکارنے والے کے پیچھے چل پڑیں گے۔ ذرا بھی کوئی کجی نہ ہوگی۔ تمام آوازیں رحمان کے آگے دب جائیں گی، تم ایک سرسراہٹ کے سوا کچھ نہ سنو گے۔ ۱۰۵ - ۱۰۸

قیامت میں موجودہ زمین ایک وسیع اور ہموار فرش کی مانند بنا دی جائے گی۔ اس وقت یہاں نہ پہاڑوں کی بلندیاں ہوں گی اور نہ دریاؤں کی گہرائیاں۔ تمام انسان دوبارہ پیدا ہو کر اس زمین پر جمع کئے جائیں گے۔ دنیا میں خدا کی آواز خدا کے داعی کی زبان سے بلند ہوتی ہے تو لوگ اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مگر قیامت میں جب خدا براہ راست لوگوں کو پکارے گا تو سارے انسان کسی ادنیٰ انحراف کے بغیر اس کی آواز کی طرف چل پڑیں گے۔ لوگوں پر اس قدر ہول طاری ہوگا کہ کسی کی زبان سے کوئی لفظ نہیں نکلے گا۔ لوگوں کے چلنے کی سرسراہٹ کے سوا کوئی اور آواز نہ ہوگی جو اس وقت لوگوں کو سنائی دے۔

يَوْمَئِذٍ لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا ﴿١٠٩﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا ﴿١١٠﴾ وَعَنَتِ الْوُجُوهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّومِ ۖ وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ﴿١١١﴾ وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ

مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا ﴿۱۱۲﴾

اس دن سفارش نفع نہ دے گی مگر ایسا شخص جس کو رحمان نے اجازت دی ہو اور اس کے لئے بولنا پسند کیا ہو۔ وہ سب کے اگلے اور پچھلے احوال کو جانتا ہے۔ اور ان کا علم اس کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ اور تمام چہرے اس حی و قیوم کے سامنے جھکے ہوں گے۔ اور ایسا شخص ناکام رہے گا جو ظلم لے کر آیا ہوگا۔ اور جس نے نیک کام کئے ہوں گے اور وہ ایمان بھی رکھتا ہوگا تو اس کو نہ کسی زیادتی کا اندیشہ ہوگا اور نہ کسی کمی کا۔

۱۰۹ — ۱۱۲

سفارش کا مستقل بالذات مؤثر ہونا سراسر باطل ہے۔ خدا نہ تو بندوں کے احوال سے بے خبر ہے کہ کوئی اس کو کسی کے بارہ میں بتلائے اور نہ وہ کمزور ہے کہ کوئی اس پر دباؤ ڈال سکے۔ البتہ بعض خاص احوال میں خود اللہ تعالیٰ ہی کی یہ منشا ہوسکتی ہے کہ وہ کسی کی زبان سے جاری ہونے والی ایک قابل لحاظ درخواست کو عزت قبول عطا فرمائے۔

قیامت میں اصل اہمیت اس کی ہوگی کہ کون شخص خود کیا لے کر آیا ہے۔ جس شخص نے موجودہ دنیا میں اپنی زندگی ناحق پر کھڑی کی ہوگی اس کا آخرت میں ناکام ہونا یقینی ہے۔ وہاں صرف وہی لوگ کامیاب ہوں گے جنھوں نے حالت غیب میں اپنے رب کو پہچانا اور اپنی زندگی کو اس کی مرضی کے مطابق ڈھال لیا۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّصَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ﴿۱۱۳﴾ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۚ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿۱۱۴﴾

اور اسی طرح ہم نے عربی کا قرآن اتارا ہے اور اس میں ہم نے طرح طرح سے وعید بیان کی ہے تاکہ لوگ ڈریں یا وہ ان کے دل میں کچھ سوچ ڈال دے۔ پس برتر ہے اللہ، بادشاہ حقیقی۔ اور تم قرآن کے لیے میں جلدی نہ کرو جب تک اس کی وحی تکمیل کو نہ پہنچ جائے۔ اور کہو کہ اے میرے رب میرا علم زیادہ کردے۔ ۱۱۳ — ۱۱۴

خدا نے اپنی کتاب جس میں ہر قسم کے دلائل ہیں، انسانی زبان میں اتاری ہے۔ اور اس زبان کو ہمیشہ کے لئے ایک زندہ زبان بنا دیا ہے۔ اس طرح خدا کی ہدایت کو ایک ایسی چیز بنا دیا گیا ہے جس کو ہر زمانہ کا آدمی پڑھ اور سمجھ سکے۔

داعی جب حق کی دعوت لے کر اٹھے تو اس کے سامنے نتیجہ کے اعتبار سے دو چیزیں ہونی چاہئیں۔ پہلی مطلوب چیز تو یہ ہے کہ سننے والے کے اندر نفسیاتی انقلاب پیدا ہو اور وہ اللہ سے ڈرنے والا بن جائے۔ دوسری اس سے کمتر بات یہ ہے کہ داعی کی بات سننے والے کے ذہن میں سوال بن کر داخل ہو جائے۔

مکہ میں دعوتی مہم کے دوران روزانہ لوگوں کی طرف سے سوالات اٹھائے جاتے تھے اور نئے نئے مسائل پیدا ہوتے تھے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خواہش فطری طور پر یہ ہوتی تھی کہ قرآن کا وقفۂ نزول کم ہو تاکہ آپ کو جلد جلد خدائی رہنمائی ملتی رہے۔ فرمایا کہ قرآن جس تدریج سے اتر رہا ہے وہ خدا کا طے شدہ منصوبہ ہے۔ وہ اسی طرح اترے گا اور بہر حال اپنی تکمیل تک پہنچے گا۔ تم مستقبل کے قرآن کو حال میں اتارنے کے خواہش مند نہ بنو۔ البتہ یہ دعا کرو کہ خدا تمہارے فہم قرآن میں اضافہ کرے۔ قرآن کی آیتوں میں جو وسیع مضامین چھپے ہوئے ہیں ان کا ادراک کرنے کی صلاحیت پیدا کر دے۔ قرآن کی اگلی آیتوں کے بارہ میں تعجیل کے بجائے تمہیں اس حکمت کو جاننے کا خواہش مند ہونا چاہئے کہ قرآن کے نزول میں ترتیب و تدریج کیوں رکھی گئی ہے۔

اس سے یہ نکلتا ہے کہ داعی کو کبھی جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہئے۔ دعوت کے حالات میں جہاد کے مسائل بیان کرنا۔ اصلاح افراد کے دور میں اجتماعی اقدام کے احکام سنانا۔ جن مواقع پر صبر مطلوب ہے ان مواقع پر قتال کی آیتوں کے حوالے دینا، یہ سب اسی کے ذیل میں داخل ہے۔ اور اس سے پرہیز کرنا داعی کے لئے لازمی طور پر ضروری ہے۔

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ إِلَىٰٓ ءَادَمَ مِن قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُۥ عَزْمًا ﴿١١٥﴾ وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَـٰٓئِكَةِ ٱسْجُدُوا۟ لِـَٔادَمَ فَسَجَدُوٓا۟ إِلَّآ إِبْلِيسَ أَبَىٰ ﴿١١٦﴾ فَقُلْنَا يَـٰٓـَٔادَمُ إِنَّ هَـٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ ٱلْجَنَّةِ فَتَشْقَىٰٓ ﴿١١٧﴾

اور ہم نے آدم کو اس سے پہلے حکم دیا تھا تو وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم نہ پایا۔ اور جب

ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس کہ اس نے انکار کیا۔ پھر ہم نے کہا کہ اے آدم، یہ بلاشبہ تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے تو کہیں وہ تم دونوں کو جنت سے نکلوا نہ دے پھر تم محروم ہو کر رہ جاؤ۔ ۱۱۵ - ۱۱۷

خدا کے حکم پر قائم رہنے کے لئے مضبوط ارادہ انتہائی طور پر ضروری ہے۔ آدمی اگر غیر متعلق چیزوں سے متاثر ہو جایا کرے تو وہ یقیناً خدا کے راستہ سے ہٹ جائے گا۔ خدا کے راستہ پر قائم رہنے کے لئے صرف خدا کے حکم کو جاننا کافی نہیں، بلکہ یہ عزم بھی لازمی طور پر ضروری ہے کہ آدمی حکم خداوندی کے خلاف باتوں سے مزاحمت کرے اور ان کو اپنے اوپر اثر انداز نہ ہونے دے۔

خدا نے آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تو فرشتے فوراً سجدہ میں گر گئے۔ مگر شیطان نے سجدہ نہیں کیا۔ اس فرق کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فرشتوں نے اس معاملہ کو خدا کا معاملہ سمجھا۔ اس کے برعکس ابلیس نے اس کو انسان کا معاملہ سمجھا۔ جب معاملہ کو خدا کا معاملہ سمجھا جائے تو آدمی کے لئے ایک ہی ممکن صورت ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ وہ اس کی اطاعت کرے۔ مگر جب معاملہ کو انسان کا معاملہ سمجھ لیا جائے تو آدمی یہ کرے گا کہ وہ سامنے کے انسان کو دیکھے گا۔ اگر وہ اس سے طاقت ور ہے تو وہ جھک جائے گا۔ اور اگر وہ اس سے طاقت ور نہیں ہے تو وہ جھکنے سے انکار کر دے گا، خواہ حق کا واضح تقاضا یہی ہو کہ وہ اس کے آگے اپنے آپ کو جھکا دے۔

إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ ﴿١١٨﴾ وَأَنَّكَ لَا تَظْمَأُ فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ ﴿١١٩﴾ فَوَسْوَسَ إِلَيْهِ الشَّيْطَانُ قَالَ يَا آدَمُ هَلْ أَدُلُّكَ عَلَىٰ شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلَىٰ ﴿١٢٠﴾ فَأَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْآتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِن وَرَقِ الْجَنَّةِ ۚ وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَىٰ ﴿١٢١﴾ ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَىٰ ﴿١٢٢﴾

یہاں تمہارے لئے یہ ہے کہ تم نہ بھوکے رہو گے اور نہ تم ننگے ہو گے۔ اور تم یہاں نہ پیاسے ہو گے، اور نہ تم کو دھوپ لگے گی۔ پھر شیطان نے ان کو بہکایا۔ اس نے کہا کیا میں تم کو ہمیشگی کا درخت بتاؤں۔ اور ایسی بادشاہی جس میں کبھی کمزوری نہ آئے۔ پس ان دونوں نے اس درخت کا پھل کھا لیا تو ان دونوں کے ستر ایک دوسرے کے سامنے کھل گئے۔ اور دونوں اپنے آپ کو جنت کے پتوں سے

ڈھانکنے لگے۔ اور آدم نے اپنے رب کے حکم کی خلاف ورزی کی تو بھٹک گئے۔ پھر اس کے رب نے اس کو نوازا پس اس کی توبہ قبول کی اور اس کو ہدایت دی۔ ۱۲۲ - ۱۱۸

آدم اور ان کی بیوی کو جس جنت میں رکھا گیا تھا وہاں زندگی کی تمام ضرورتیں ان کو بفراغت حاصل تھیں۔ غذا، لباس، پانی، سایہ (مکان) یہ سب چیزیں وہاں خدا کی طرف سے بالکل مفت مہیا کی گئی تھیں۔ موجودہ دنیا میں یہ چیزیں آدمی کو پُر مشقت کسب کے ذریعہ ملتی ہیں، جنت میں یہ چیزیں ان کو کسی مشقت کے بغیر حاصل تھیں۔

ایک درخت کا پھل کھانا آدم کے لئے ممنوع تھا۔ شیطان نے اس درخت کے پھل میں ابدی فائدے بتائے۔ بالآخر آدم اس کی باتوں سے متاثر ہوگئے اور انھوں نے اس درخت کا پھل کھالیا۔ اس کے فوراً بعد انھوں نے محسوس کیا کہ وہ ننگے ہوگئے ہیں۔ یہ گویا ایک علامت تھی کہ خدا کی وہ ضمانت ان سے اٹھالی گئی جس کی وجہ سے وہ اب تک بلا کسب روزی کے مالک تھے۔ اس کے بعد توبہ اور دعا کی وجہ سے آدم کی معافی ہوگئی۔ تاہم وہ بلا کسب کی روزی والی دنیا سے نکال کر کسب کی روزی والی دنیا میں پہنچا دئے گئے۔ اس طرح زمین پر موجودہ نسل انسانی کا آغاز ہوا۔

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۖ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ ۝ وَمَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ ۝ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِي أَعْمَىٰ وَقَدْ كُنتُ بَصِيرًا ۝ قَالَ كَذَٰلِكَ أَتَتْكَ آيَاتُنَا فَنَسِيتَهَا ۖ وَكَذَٰلِكَ الْيَوْمَ تُنسَىٰ ۝ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي مَنْ أَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِن بِآيَاتِ رَبِّهِ ۚ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَشَدُّ وَأَبْقَىٰ ۝

خدا نے کہا کہ تم دونوں یہاں سے اترو۔ تم ایک دوسرے کے دشمن ہوگے۔ پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے تو جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ محروم رہے گا۔ اور جو شخص میری نصیحت سے اعراض کرے گا تو اس کے لئے تنگی کا جینا ہوگا۔ اور قیامت کے دن ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا کہ اے میرے رب، تو نے مجھ کو اندھا کیوں اٹھایا میں تو آنکھوں والا تھا۔

ارشاد ہوگا کہ اسی طرح تمہارے پاس ہماری نشانیاں آئیں تو تم نے ان کا کچھ خیال نہ کیا تو اسی طرح آج تمہارا کچھ خیال نہ کیا جائے گا۔ اور اسی طرح ہم بدلہ دیں گے اس کو جو حد سے گزر جاتے اور اپنے رب کی نشانیوں پر ایمان نہ لائے۔ اور آخرت کا عذاب بڑا سخت ہے اور بہت باقی رہنے والا۔ ۱۲۷ - ۱۲۳

خدا نے آدم اور ابلیس دونوں کو زمین پر بسایا۔ اس نے ابتدا ہی میں یہ تنبیہہ کر دی کہ قیامت تک تم دونوں کے درمیان ایک دوسرے سے مقابلہ جاری رہے گا۔ ابلیس انسانی نسل کو بہکانے میں اپنی ساری کوشش لگا دے گا۔ اس کے جواب میں انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ اپنا سب سے بڑا دشمن ابلیس کو سمجھے اور اس کے وسوسوں سے آخری حد تک دور رہنے کی کوشش کرے۔

انسان کی مزید ہدایت کے لئے خدا نے یہ انتظام کیا کہ مسلسل اپنے پیغمبر بھیجے جو انسان کی قابل فہم زبان میں اس کو زندگی کی حقیقت سے باخبر کرتے رہے۔ اب انسان کی کامیابی اور ناکامی کا دار ومدار اس پر ہے کہ وہ پیغمبر کی ہدایت کو مانتا ہے یا نہیں مانتا۔ جو شخص اس کو مانے گا اس کو دوبارہ جنت کی راحت سے بھری ہوئی زندگی دیدی جائے گی۔ اور جو شخص نہیں مانے گا اس کی زندگی سخت ترین زندگی ہوگی جس سے وہ کبھی نکل نہ سکے گا۔

ہدایت سے اعراض کرنے والے لوگ آخرت میں اس طرح اٹھیں گے کہ وہ دونوں آنکھوں سے اندھے ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو آنکھیں اس لئے دی گئی تھیں کہ وہ خدا کی نشانیوں کو دیکھ کر اسے پہچانیں مگر ان کا حال یہ ہوا کہ ان کے سامنے خدا کی نشانیاں آئیں اور انھوں نے ان کو نہیں پہچانا۔ اس طرح انھوں نے ثابت کیا کہ وہ آنکھ رکھتے ہوئے بھی اندھے ہیں۔ پھر خدا فرمائے گا کہ ایسے اندھوں کو آنکھ دینے کی کیا ضرورت۔

اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴿۱۲۸﴾ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّاَجَلٌ مُّسَمًّى ﴿۱۲۹﴾ۭ فَاصْبِرْ عَلٰي مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَمِنْ اٰنَاۗئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ﴿۱۳۰﴾

ع ۷ / ۱۳ / ۱۶

کیا لوگوں کو اس بات سے سمجھ نہ آئی کہ ان سے پہلے ہم نے کتنے گروہ ہلاک کر دیے۔ یہ ان کی بستیوں میں چلتے ہیں

بے شک اس میں اہل عقل کے لئے بڑی نشانیاں ہیں۔ اور اگر تمہارے رب کی طرف سے ایک بات پہلے طے نہ ہو چکی ہوتی۔ اور مہلت کی ایک مدت مقرر نہ ہوتی تو ضرور ان کا فیصلہ چکا دیا جاتا۔ پس جو یہ کہتے ہیں اس پر صبر کرو۔ اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، سورج نکلنے سے پہلے اور اس کے ڈوبنے سے پہلے، اور رات کے اوقات میں بھی تسبیح کرو۔ اور دن کے کناروں پر بھی۔ تاکہ تم راضی ہو جاؤ۔ ۱۲۸ — ۱۳۰

کسی قوم کو زمین پر عروج حاصل ہو اور پھر وہ ہلاک یا مغلوب کر دی جائے تو اس کی وجہ ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ اس نے بندگی کی حد سے تجاوز کیا۔ ہر تباہ شدہ قوم اپنے بعد والوں کے لئے درس عبرت ہوتی ہے۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس طرح کے واقعات سے درس حاصل کرتے ہوں۔

یہاں تسبیح اور نماز کی جو تلقین کی گئی ہے وہ مکی دور کے انتہائی سخت حالات میں کی گئی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انکار اور مخالفت کے سخت ترین حالات میں نماز اور خدا کی یاد مومن کی ڈھال ہے۔ اس سے راہیں ہموار ہوتی ہیں۔ اور فتوحات کے دروازے کھلتے ہیں۔ اس سے سب کچھ اتنی بڑی مقدار میں مل جاتا ہے کہ آدمی اس کو پا کر راضی ہو جائے۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ۚ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ﴿۱۳۱﴾ وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ۖ لَا نَسْأَلُكَ رِزْقًا ۖ نَّحْنُ نَرْزُقُكَ ۗ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوَىٰ ﴿۱۳۲﴾

اور ہرگز ان چیزوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو جن کو ہم نے ان کے کچھ گروہوں کو ان کی آزمائش کے لئے انھیں دے رکھا ہے۔ اور تمہارے رب کا رزق زیادہ بہتر ہے اور باقی رہنے والا ہے۔ اور اپنے لوگوں کو نماز کا حکم دو اور اس کے پابند رہو۔ ہم تم سے کوئی رزق نہیں مانگتے۔ رزق تو تم کو ہم دیں گے اور بہتر انجام تو تقویٰ ہی کے لئے ہے۔ ۱۳۲ - ۱۳۱

ان آیات کا خطاب اگرچہ بظاہر پیغمبر سے ہے مگر اس کے مخاطب تمام اہل ایمان ہیں۔ دنیا میں ایک شخص ایمان اور دعوت کی زندگی اختیار کرتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں اس کی زندگی مشقتوں کی زندگی بن جاتی ہے۔ دوسری طرف یہ حال ہے کہ جو لوگ اس قسم کی ذمہ داریوں سے آزاد ہیں وہ آرام اور راحت

میں اپنے صبح و شام گزار رہے ہیں۔ اس صورت حال کو نمایاں کر کے شیطان آدمی کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے۔ وہ مومن اور داعی کو بے قدر ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

لیکن گہرائی سے دیکھا جائے تو اس ظاہری فرق کے آگے ایک اور فرق ہے اور وہ فرق زیادہ قابل لحاظ ہے۔ وہ فرق یہ کہ دنیا پرست لوگوں کو جو چیز ملی ہے وہ محض امتحان کے لئے ہے اور سراسر وقتی ہے۔ اس کے بعد ابدی زندگی میں ان کے لئے کچھ نہیں۔ دوسری طرف مومن اور داعی کو خدا سے وابستگی اختیار کرنے کے نتیجہ میں جو چیز ملی ہے وہ تمام دنیا کی چیزوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ وہ ہے اللہ کی یاد، آخرت کی فکر، عبادت اور تقویٰ کی زندگی، خدا کے بندوں کو آخرت کی پکڑ سے بچانے کے لئے فکرمند ہونا۔ یہ بھی رزق ہے۔ اور یہ زیادہ اعلیٰ رزق ہے کیوں کہ وہ آخرت میں ایسی بے حساب نعمتوں کی شکل میں آدمی کی طرف لوٹے گا جو کبھی ختم ہونے والی نہیں۔

وَقَالُوا لَوْلَا يَأْتِينَا بِآيَةٍ مِّن رَّبِّهِ ۚ أَوَلَمْ تَأْتِهِم بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ ﴿١٣٣﴾ وَلَوْ أَنَّا أَهْلَكْنَاهُم بِعَذَابٍ مِّن قَبْلِهِ لَقَالُوا رَبَّنَا لَوْلَا أَرْسَلْتَ إِلَيْنَا رَسُولًا فَنَتَّبِعَ آيَاتِكَ مِن قَبْلِ أَن نَّذِلَّ وَنَخْزَىٰ ﴿١٣٤﴾ قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوا ۖ فَسَتَعْلَمُونَ مَنْ أَصْحَابُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدَىٰ ﴿١٣٥﴾

ع ۸ ۱۷

اور لوگ کہتے ہیں کہ یہ اپنے رب کے پاس سے ہمارے لئے کوئی نشانی کیوں نہیں لاتے۔ کیا ان کو اگلی کتابوں کی دلیل نہیں پہنچی۔ اور اگر ہم ان کو اس سے پہلے کسی عذاب سے ہلاک کر دیتے تو وہ کہتے کہ اے ہمارے رب تو نے ہمارے پاس رسول کیوں نہ بھیجا کہ ہم ذلیل اور رسوا ہونے سے پہلے تیری نشانیوں کی پیروی کرتے۔ کہو کہ ہر ایک منتظر ہے تو تم بھی انتظار کرو۔ آئندہ تم جان لوگے کہ کون سیدھی راہ والا ہے اور کون منزل تک پہنچا۔ ۱۳۳-۱۳۵

پیغمبر آخر الزماں کی بعثت سے پہلے اللہ تعالیٰ نے یہ اہتمام کیا کہ پچھلے نبیوں کی زبان سے آپ کی آمد کا پیشگی اعلان کیا۔ یہ پیشین گوئیاں آج بھی تمام تحریفات کے باوجود، پچھلی آسمانی کتابوں میں موجود ہیں۔ یہ پیغمبر آخر الزماں کی صداقت کی سب سے بڑی دلیل تھی۔ مگر دلیل کی قوت کو سمجھنے کے لئے سنجیدگی کی ضرورت ہوتی ہے، اور یہ وہ چیز ہے جو ہمیشہ سب سے کم پائی گئی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِىْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۝ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ ۝ لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاَسَرُّوا النَّجْوَى ۖ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ڰ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ۝ قٰلَ رَبِّيْ يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِى السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ ۡ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

لوگوں کے لئے ان کا حساب نزدیک آپہنچا۔ اور وہ غفلت میں پڑے ہوئے اعراض کر رہے ہیں۔ ان کے رب کی طرف سے جو بھی نئی نصیحت ان کے پاس آتی ہے وہ اس کو ہنسی کرتے ہوئے سنتے ہیں۔ ان کے دل غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور ظالموں نے آپس میں یہ سرگوشی کی کہ یہ شخص تو تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہے۔ پھر تم کیوں آنکھوں دیکھے اس کے جادو میں پھنستے ہو۔ رسول نے کہا کہ میرا رب ہر بات کو جانتا ہے، خواہ وہ آسمان میں ہو یا زمین میں۔ اور وہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ ۴-۱

ہر آدمی جو دنیا میں ہے وہ زندگی سے زیادہ موت سے قریب ہے۔ اس اعتبار سے ہر آدمی اپنے روزِ حساب کے عین کنارے کھڑا ہوا ہے۔ مگر انسان کا حال یہ ہے کہ وہ کسی بھی یاددہانی پر توجہ نہیں دیتا، خواہ وہ پیغمبر کے ذریعہ کرائی جائے یا غیر پیغمبر کے ذریعہ۔ حق کے داعی کی بات کو وہ بس "ایک انسان" کی بات کہہ کر نظر انداز کر دیتا ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں جب قرآن کے ذریعہ دعوت شروع کی تو قرآن کا خدائی کلام لوگوں کے دلوں کو مسخر کرنے لگا۔ یہ وہاں کے سرداروں کے لئے بڑی سخت بات تھی۔ کیوں کہ اس سے ان کی قیادت خطرہ میں پڑ رہی تھی۔ قرآن توحید کی دعوت دیتا تھا، اور مکہ کے سردار شرک کے اوپر اپنی سرداری قائم کئے ہوئے تھے۔ انھوں نے لوگوں کے ذہن کو اس سے ہٹانے کے لئے یہ کیا کہ لوگوں سے کہا کہ اس کلام میں بظاہر جو تاثیر تم دیکھ رہے ہو وہ اس لئے نہیں ہے کہ وہ خدا کا کلام ہے۔ اس کا زور صداقت کا زور نہیں بلکہ جادو کا زور ہے۔ یہ جادو بیانی کا معاملہ ہے نہ کہ آسمانی کلام کا معاملہ۔

اس قسم کی بات کہنے والے لوگ اگرچہ خدا کا نام لیتے ہیں مگر انھیں یقین نہیں کہ خدا انھیں دیکھ اور سن رہا ہے۔ اگر انھیں خدا کے عالم الغیب ہونے کا یقین ہوتا تو وہ ایسی غیر سنجیدہ بات ہرگز اپنی زبان سے نہ نکالتے۔

بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۭ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۚ فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ۝ مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ۚ اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ ۝

بلکہ وہ کہتے ہیں، یہ پراگندہ خواب ہیں۔ بلکہ اس کو انھوں نے گھڑ لیا ہے۔ بلکہ وہ ایک شاعر ہیں۔ ان کو چاہئے کہ ہمارے پاس اس طرح کی کوئی نشانی لائیں جس طرح کی نشانیوں کے ساتھ پچھلے رسول بھیجے گئے تھے۔ ان سے پہلے کسی بستی کے لوگ بھی جن کو ہم نے ہلاک کیا، ایمان نہیں لائے تو کیا یہ لوگ ایمان لائیں گے۔ ۶-۵

حق کا داعی ہمیشہ حق کی دعوت کو دلیل کے زور پر پیش کرتا ہے۔ مخالفین جب دیکھتے ہیں کہ وہ دلیل سے اس کا توڑ نہیں کرسکتے تو وہ طرح طرح کی باتیں نکال کر عوام کو اس سے برگشتہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ یہ شاعرانہ کلام ہے۔ یہ ادبی ساحری ہے۔ یہ ایک دیوانے کے تخیلات ہیں۔ یہ اپنے جی سے بنائی ہوئی باتیں ہیں۔ وغیرہ۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے چونکہ اہل مکہ کے سامنے کوئی حسی معجزہ نہیں دکھایا تھا۔ اس لئے آپ کی رسالت کو مشتبہ کرنے کے لئے وہ یہ بھی کہتے تھے کہ یہ اگر خدا کے بھیجے ہوئے ہیں تو پچھلے پیغمبروں کی طرح خدا کے پاس سے کوئی معجزہ لے کر کیوں نہیں آئے۔

مگر تاریخ کا تجربہ بتاتا ہے کہ جو لوگ دلیل سے بات کو نہ مانیں وہ معجزہ کو دیکھ کر بھی اس کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ اس لئے لوگوں کے ساتھ خیر خواہی یہ ہے کہ دلیل کی زبان میں ان کی نصیحت جاری رکھی جائے نہ کہ معجزہ دکھا کر ان پر اتمام حجت کر دی جائے۔ کیوں کہ معجزہ سے نہ ماننے کے بعد دوسرا مرحلہ صرف ہلاکت ہوتا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْــَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ

كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ۝ ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَيْنٰهُمْ وَمَنْ نَّشَآءُ وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ ۝

اور تم سے پہلے بھی جس کو ہم نے رسول بنا کر بھیجا، آدمیوں ہی میں سے بھیجا۔ ہم ان کی طرف وحی بھیجتے تھے پس تم اہل کتاب سے پوچھ لو، اگر تم نہیں جانتے۔ اور ہم نے ان رسولوں کو ایسے جسم نہیں دئے کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں۔ اور وہ ہمیشہ رہنے والے نہ تھے۔ پھر ہم نے ان سے وعدہ پورا کیا۔ پس ان کو اور جس جس کو ہم نے چاہا بچالیا۔ اور ہم نے حد سے گزرنے والوں کو ہلاک کر دیا۔ ۹ - ۷

جو لوگ یہ کہہ کر پیغمبر کا انکار کرتے تھے کہ یہ تو ہماری طرح کے ایک انسان ہیں، ان سے کہا گیا کہ اگر تم اپنے اس اعتراض میں سنجیدہ ہو تو تمہارے لئے معاملہ کو سمجھنا کچھ مشکل نہیں۔ بہت سی گزری ہوئی ہستیاں جن کو تم پیغمبر تسلیم کرتے ہو، ان کے جاننے والے موجود ہیں۔ پھر ان جاننے والوں سے تحقیق کر لو کہ وہ انسان تھے یا غیر انسان۔ اگر وہ انسان تھے تو موجودہ پیغمبر کو تم صرف اس بنا پر کیسے رد کر سکتے ہو کہ وہ ایک ماں باپ کے ذریعہ عام انسان کی طرح پیدا ہوئے ہیں۔

گزشتہ پیغمبروں کی تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان کا اقرار یا انکار لوگوں کے لئے محض سادہ قسم کا اقرار یا انکار نہ تھا۔ اس نے دونوں گروہوں کے لئے واضح طور پر الگ الگ نتیجہ پیدا کیا۔ اقرار کرنے والوں نے نجات پائی اور انکار کرنے والے ہلاک کر دئے گئے۔ اس لئے اس معاملہ میں تم کو حد درجہ سنجیدہ ہونا چاہئے۔

ع لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ۝ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ۝ؕ لَا تَرْكُضُوْا وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ ۝ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ ۝

ہم نے تمہاری طرف ایک کتاب اتاری ہے جس میں تمہاری یاددہانی ہے، پھر کیا تم سمجھتے نہیں۔ اور کتنی ہی ظالم بستیاں ہیں جن کو ہم نے پیس ڈالا۔ اور ان کے بعد دوسری قوم کو اٹھایا۔ پس جب انھوں نے ہمارا عذاب آتے دیکھا تو وہ اس سے بھاگنے لگے۔ بھاگو مت۔ اور اپنے سامان عیش کی طرف اور اپنے مکانوں کی طرف واپس چلو، تاکہ تم سے پوچھا جائے۔ انھوں نے کہا، ہائے ہماری کم بختی، بے شک ہم لوگ ظالم تھے۔ پس وہ یہی پکارتے رہے۔ یہاں تک کہ ہم نے ان کو ایسا کر دیا جیسے کھیتی کٹ گئی ہو اور آگ بجھ گئی ہو۔ ۱۵-۱۰

خدا کی کتاب عام معنوں میں محض ایک کتاب نہیں وہ ایک یاددہانی ہے۔ وہ اس بات کی چیتاونی ہے کہ موجودہ دنیا میں انسان کا آنا اتفاق سے نہیں ہے وہ ایک خدائی منصوبہ ہے۔ اور وہ منصوبہ یہ ہے کہ انسان کو آزمائش کے لئے وقتی آزادی دی جائے۔ اس کے بعد آدمی جیسا عمل کرے اس کے مطابق اس کو بدلہ دیا جائے۔ اس حقیقت کا جزئی ظہور ظالم قوموں کی ہلاکت کی صورت میں بار بار ہوتا رہا ہے۔ اور اس کا کلی ظہور قیامت میں ہوگا۔ جب کہ تمام اگلے پچھلے انسان دوبارہ پیدا کرکے جمع کئے جائیں گے۔

جب خدا کی پکڑ ظاہر ہوتی ہے تو وہ تمام مادی ساز و سامان آدمی کو مصیبت معلوم ہونے لگتے ہیں جن کے بل پر اس سے پہلے وہ حق کی دعوت کو نظر انداز کر دیتا تھا۔ مادی سامان جب تک ساتھ نہ چھوڑ دیں وہ غفلت سے نکلنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ اور جب یہ سامان اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اس وقت اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ مگر اس وقت آنکھ کا کھلنا اس کے کام نہیں آتا۔ کیوں کہ اس وقت تمام چیزیں اپنی طاقت کھو چکی ہوتی ہیں۔ اس کے بعد صرف خدا کسی کے کام آتا ہے نہ کہ جھوٹے معبود۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِينَ ﴿١٦﴾ لَوْ أَرَدْنَا أَنْ نَتَّخِذَ لَهْوًا لَاتَّخَذْنَاهُ مِنْ لَدُنَّا إِنْ كُنَّا فَاعِلِينَ ﴿١٧﴾ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۚ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُونَ ﴿١٨﴾

اور ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل کے طور پر نہیں بنایا۔ اگر

ہم کوئی کھیل بنانا چاہتے تو اس کو ہم اپنے پاس سے بنا لیتے، اگر ہم کو یہ کرنا ہوتا۔ بلکہ ہم حق کو باطل پر ماریں گے تو وہ اس کا سر توڑ دے گا تو وہ دفعتہً جاتا رہے گا اور تمہارے لئے ان باتوں سے بڑی خرابی ہے جو تم بیان کرتے ہو۔ ۱۸ – ۱۶

جو لوگ خدا کی دعوت کے بارہ میں سنجیدہ نہ ہوں وہ گویا موجودہ دنیا کو ایک قسم کا خدائی کھلونا سمجھتے ہیں۔ جس کا وقتی تفریح کے سوا اور کوئی مقصد نہ ہو۔ مگر موجودہ دنیا اپنی بے پناہ حکمت ومعنویت کے ساتھ اپنے خالق کا جو تعارف کراتی ہے اس کے لحاظ سے یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کا خالق کوئی ایسا خدا ہو جس نے اس دنیا کو محض کھیل کے طور پر بنایا ہو۔

موجودہ دنیا میں انسان جیسی انوکھی مخلوق ہے جس کی فطرت میں حق و باطل کی تمیز پائی جاتی ہے دنیا میں ایسی مخلوق کا ہونا جو ایک طریقہ کو حق اور دوسرے طریقہ کو باطل سمجھے اور پھر حق و باطل کے نام پر بار بار مقابلہ پیش آنا ظاہر کرتا ہے کہ یہاں کوئی ایسا وقت آنے والا ہے جب کہ آخری طور پر یہ بات کھل جائے کہ فی الواقع حق کیا تھا اور باطل کیا۔ اور پھر جس نے حق کا ساتھ دیا ہو اس کو کامیابی حاصل ہو اور جس نے حق کا ساتھ نہ دیا ہو وہ ناکام کر دیا جائے۔ جس دنیا میں ایسا "پتھر" ہو جو ایک شخص کے "سر" کو توڑ دے وہاں کیا ایسا حق نہ ہوگا جو باطل کو باطل ثابت کر سکے۔

وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ۝ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ۝

اور اسی کے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ اور جو اس کے پاس ہیں وہ اس کی عبادت سے سرتابی نہیں کرتے اور نہ کاہلی کرتے ہیں۔ وہ رات دن اس کو یاد کرتے ہیں، کبھی نہیں تھکتے۔ ۲۰ – ۱۹

زمین و آسمان کی ہر چیز مخلوق ہے۔ ہر چیز وہی کرتی ہے جس کا اسے اوپر سے حکم دیا گیا ہو ساری کائنات میں صرف انسان ہے جو سرکشی کرتا ہے۔ جو لوگ خدا کو نہیں مانتے وہ یہ کہہ کر سرکشی کرتے ہیں کہ ہمارے اوپر کوئی مالک اور حاکم نہیں۔ ہم آزاد ہیں کہ جو چاہیں کریں۔

جو لوگ خدا کو مانتے ہیں وہ بھی سرکشی کرتے ہیں۔ البتہ ان کے پاس اپنی سرکشی کی توجیہہ دوسری ہوتی ہے۔ وہ خدا کے سوا کسی اور کو اپنا شفیع اور وسیلہ مان لیتے ہیں۔ وہ کسی کو خدا کا مقرب مان کر یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ہم ان کے لئے عقیدت و احترام کا اظہار کرتے رہیں تو وہ خدا کے یہاں ہمارے لئے نجات کی سفارش کر دیں گے۔ کچھ لوگ فرشتوں کو اپنا شفیع اور وسیلہ مان لیتے ہیں اور کچھ لوگ کسی دوسری ہستی کو۔

مگر اس قسم کے تمام نظریے مضحکہ خیز حد تک باطل ہیں۔ اگر کسی کو وہ نگاہ حاصل ہو کہ وہ کائناتی سطح پر حقیقت کو دیکھ سکے تو وہ دیکھے گا کہ مفروضہ ہستیاں خود تو خدا کی ہیبت سے اس کے آگے جھکی ہوتی ہیں اور انسان ان کے نام پر دنیا میں سرکش بنا ہوا ہے۔

أَمِ اتَّخَذُوا آلِهَةً مِّنَ الْأَرْضِ هُمْ يُنشِرُونَ ۝ لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ ۝ لَا يُسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْأَلُونَ ۝

کیا انھوں نے زمین میں سے معبود ٹھہرائے ہیں جو کسی کو زندہ کرتے ہوں۔ اگر ان دونوں میں اللہ کے سوا معبود ہوتے تو دونوں درہم برہم ہو جاتے۔ پس اللہ، عرش کا مالک، ان باتوں سے پاک ہے جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں۔ وہ جو کچھ کرتا ہے اس پر وہ پوچھا نہ جائے گا اور ان سے پوچھ ہوگی۔ ۲۳-۲۱

زمین بقیہ کائنات سے الگ نہیں ہے۔ وہ وسیع تر کائنات کے ساتھ مسلسل طور پر مربوط ہے۔ زمین پر زندگی اور سرسبزی اسی وقت ممکن ہوتی ہے جب کہ بقیہ کائنات اس کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگی کرے۔ زمین و آسمان کا یہ متوافق عمل ثابت کرتا ہے کہ زمین و آسمان کا انتظام ایک ہی ہستی کے ہاتھ میں ہے۔ اگر وہ دو کے ہاتھ میں ہوتا تو یقیناً دونوں کے درمیان بار بار ٹکراؤ ہوتا اور زمین پر موجودہ زندگی کا قیام ممکن نہ ہوتا۔

کائنات اپنی بے پناہ عظمت اور معنویت کے ساتھ اپنے جس خالق کا تعارف کراتی ہے وہ یقینی طور پر ایسا خدا ہے جو ہر قسم کی کمیوں سے یکسر پاک ہے۔ یہ موجودہ کائنات کا کمتر اندازہ ہے

کہ اس کا خالق ایک ایسی ہستی کو مانا جائے جس کے ساتھ کمیاں اور کمزوریاں لگی ہوئی ہوں۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِیَ وَ ذِكْرُ مَنْ قَبْلِیْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْۤ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝

کیا انھوں نے خدا کے سوا اور معبود بنائے ہیں۔ ان سے کہو کہ تم اپنی دلیل لاؤ۔ یہی بات ان لوگوں کی ہے جو میرے ساتھ ہیں اور یہی بات ان لوگوں کی ہے جو مجھ سے پہلے ہوئے۔ بلکہ ان میں سے اکثر حق کو نہیں جانتے۔ پس وہ اعراض کر رہے ہیں۔ اور ہم نے تم سے پہلے کوئی ایسا پیغمبر نہیں بھیجا جس کی طرف ہم نے یہ وحی نہ کی ہو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس تم میری عبادت کرو۔ ۲۵-۲۴

ایک خدا کے سوا دوسرے معبود فرض کرنا کسی واقعی دلیل کی بنیاد پر نہیں ہے۔ بلکہ سراسر لاعلمی کی بنیاد پر ہے۔ جو لوگ خدا کے لئے شرکاء مانتے ہیں ان کے پاس اپنے عقیدۂ شرک کے حق میں کوئی دلیل نہیں، نہ علم انسانی میں اور نہ وحی آسمانی میں۔ وہ توحید کے دلائل سن کر ان سے اعراض کرتے ہیں تو اس کی وجہ ان کا استدلالی یقین نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ صرف ان کا تعصب ہے۔ اپنے متعصبانہ مزاج کی وجہ سے وہ اپنے عقیدہ میں اتنا پختہ ہو گئے ہیں کہ استدلال کے اعتبار سے بے حقیقت ہونے کے باوجود وہ اس کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتے۔

وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۝ لَا یَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَ هُمْ بِاَمْرِهٖ یَعْمَلُوْنَ ۝ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ وَ لَا یَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی وَ هُمْ مِّنْ خَشْیَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ۝ وَ مَنْ یَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّیْۤ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِیْهِ جَهَنَّمَ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِی

الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾

اور وہ کہتے ہیں کہ رحمٰن نے اولاد بنائی ہے، وہ اس سے پاک ہے، بلکہ (فرشتے) تو معزز بندے ہیں۔ وہ اس سے آگے بڑھ کر بات نہیں کرتے۔ اور وہ اسی کے حکم کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ اللہ ان کے اگلے اور پچھلے احوال کو جانتا ہے۔ اور وہ سفارش نہیں کرسکتے مگر اس کے لئے جس کو اللہ پسند کرے۔ اور وہ اس کی ہیبت سے ڈرتے رہتے ہیں۔ اور ان میں سے جو شخص کہے گا کہ اس کے سوا میں معبود ہوں تو ہم اس کو جہنم کی سزا دیں گے۔ ہم ظالموں کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔ ۲۶ - ۲۹

ایک چیز کو حق اور دوسری چیز کو باطل سمجھنا آدمی سے اس کی آزادی چھین لیتا ہے۔ اس لئے انسان ہمیشہ اس کوشش میں رہا ہے کہ وہ ایسا نظریہ دریافت کرے جس سے حق و باطل کا فرق مٹ جائے۔ جس سے اس کو یہ اطمینان حاصل ہو کہ وہ دنیا میں خواہ جس طرح بھی رہے اس سے یہ پوچھ نہیں ہونے والی ہے کہ تم نے ایسا کیوں کیا اور ویسا کیوں نہیں کیا۔ غیر مذہبی لوگوں نے یہ تسکین انکار آخرت کے ذریعہ حاصل کرنے کی کوشش کی ہے اور مذہبی لوگوں نے مشرکانہ عقیدہ کے ذریعہ۔

فرشتے ایک غیبی مخلوق ہیں۔ پیغمبروں کے ذریعہ انسان کو فرشتوں کی موجودگی کی خبر دی گئی تاکہ وہ خدا کی قدرت کا احساس کرے۔ مگر اس نے فرشتوں کو خدا کی بیٹی بنا کر عجیب و غریب طور پر یہ عقیدہ گھڑ لیا کہ وہ فرشتوں کے نام پر کچھ عبادتی رسوم ادا کرتا رہے، اور وہ آخرت میں اپنے باپ سے سفارش کرکے اس کی بخشش کرادیں گے۔

اس قسم کے تمام عقیدے خدا کی خدائی کی نفی ہیں۔ خدا اسی لئے خدا ہے کہ وہ ایسی تمام کمیوں سے پاک ہے۔ اگر وہ ان کمیوں میں مبتلا ہوتا تو وہ خدا نہ ہوتا۔

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ۭ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاۗءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۭ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۰﴾